

# تجھ سنگ نکھروں میں

## از قلم حسنی حسین

مکمل ناول

"غضب خدا کا اب یہاں کی کوئی یونی تمہارے شایان شان نہیں رہی، جو ہم، تمہارا اسلام آباد ایڈمیشن کروائیں۔"

وہ اسکی نئی نئی فرمائش پر خاصی چڑ چکی تھیں۔ پلیٹ کو میز پر پٹختے، ساتھ ہی اسے اچھی ڈانٹ بھی پلائی، جو آنکھوں میں ناراضی لیے انہیں ہی دیکھ ہی تھی۔

"مریم!"

ایک دفعہ اس کی بھی سن لو۔"

رحیم صاحب اپنی بیٹی کا پھولا ہوا چہرہ دیکھتے منت بھرے لہجے میں اپنی زوجہ سے گویا ہوئے۔

"رحیم!"

آپ کے لاڈپیار نے ہی اسے بگاڑ دیا ہے۔"  
 رحیم صاحب کی بات سن کر مریم بیگم نے انہیں بھی لپیٹ میں لیا تھا۔  
 اور وہ رحیم صاحب کی تازہ تازہ عزت افزائی پہ اشارے سے اپنے بابا کو ماں کی سختیاں بتانے لگی۔

"اور تم!

یہ یوں یوں کیا کر رہی ہو؟  
 تمہارے جتنی لڑکیاں ہوتی ہیں کہ سارا گھر سنبھال لیتی ہیں۔  
 وہ مسز احمر کی بیٹی، اس کی تو شادی بھی ہو گئی ہے تم سے صرف ایک سال بڑی ہے اور  
 تمہاری خود کی کزنز سب کو دیکھا ہے یہیں لاہور کی یونیورسٹی سے بی بی اے کیا ہے اور  
 کتنے پراعتماد طریقے سے بات کرتی ہیں اور ایک تم ہو۔ دو بندے دیکھے نہیں اور بس رونا  
 شروع۔"

وہ اسکی اعتماد کی کمی سے خاصی چڑی ہوئی تھیں۔ اور وقتاً فوقتاً اسے احساس دلاتی رہتی  
 تھیں۔ جس سے احساس آنا تو دور کی بات وہ مزید پست ہو جایا کرتی تھی۔ پر یہ بات ماں کو کون  
 سمجھائے۔

"اما میں یہاں نہیں پڑھ سکتی۔

یہاں سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔

مجھے اسلام آباد کی یونیورسٹی میں ہی ایڈمیشن لینا ہے۔"

قدرے ضدی لہجے میں کہتی وہ رونے کو ایک بار پھر سے تیار تھی۔

اور مریم بیگم نے اب کی بار انگلی سے اشارہ کر کے، اسے رونے سے باز رکھا تھا۔

وہ اس کے بات پہ بات رونے سے بھی کافی تنگ تھیں۔

پر وہ کیا کرتی اسے اپنی بے بسی پر رونے اور کڑھنے کے علاوہ آتا ہی کیا تھا۔

"کوئی نہیں جارہی تم اسلام آباد۔ یہاں سب مذاق اڑاتے ہیں تو وہاں کونسا پھولوں کے ہار پہنائیں گے؟"

مریم بیگم کو اسکی منطق ہی سمجھ نہیں آرہی تھی، تبھی دو لوگ جواب دے کر کچن میں چلی گئیں۔

تو اس نے بھی پیچھے سے ہانک لگانا ضروری سمجھا۔

"میں اکیلی نہیں جارہی، ہم سب ساتھ اسلام آباد جائیں گے۔"

اور یہاں بیٹھے بھی اسے کچن سے زور سے کچھ پٹختے جانے کی آواز آئی تھی جس پر دونوں باپ بیٹی نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے تھے۔  
مریم بیگم نے بھی وہیں سے ہانک لگائی تھی۔

"کوئی کہیں نہیں جا رہا۔"

اور ان کے جواب پر وہ بے بسی اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے بابا کو دیکھنے لگی۔ جیسے ساری غلطی انہیں کی ہو۔

"دیکھ لیں آپ، اپنی بیوی کے کام۔"

دبی دبی آواز میں رحیم صاحب سے ان کی زوجہ کی شکایت لگاتی وہ مزید ناک منہ چڑھا گئی۔  
اور رحیم صاحب وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئے۔ جب بھی ماں بیٹی میں بحث ہوتی، وہ خاموش تماشائی بنے دونوں طرف سے گولہ باری کی زد میں آتے تھے۔

"جتنے سر جوڑ کر کوششیں کرلو، میں نے کہہ دیا ہے، نہ تو نہ۔"

دونوں باپ بیٹی کو سر جوڑے دیکھ کر انہیں خطرے کی بو محسوس ہوئی، پھر سے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

لیکن وہ یہ بھی اچھے سے جانتی تھیں۔ گھر پر جتنی ان کی حکمرانی صحیح، آخری فیصلہ تو انکے شوہر جناب کا ہی ہوتا تھا۔

"ماما....!"

وہ بے بسی کی تصویر بنی اب التجا پر اتر آئی تھی لیکن مریم بیگم پر اس کی بے بسی کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔

"نہیں۔"

اسکی امیدوں کو وہیں ڈھیر کرتے، وہ کھانا پیش کرنے لگیں۔ اور وہ ناراضی سے پلیٹ کھسکا کر ڈائینگ ٹیبل سے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ یعنی اب اسکا بھوک ہڑتال کا ارادہ تھا۔ جس پر مریم بیگم نے محض کڑے تیور لیے گھورنے پر اکتفا کیا۔

"عینا!"

بیٹا میری بات سنیں۔"

پیچھے سے رحیم صاحب آوازیں لگاتے رہے، پر عینا گھر کے مرکزی دروازے سے نکلتی باہر چلی گئی۔

"مریم!"

جب وہ کہہ رہی ہے وہ یہاں نہیں پڑنا چاہتی تو تم کیوں ضد کر رہی ہو؟"

رحیم صاحب کی توپوں کا رخ مریم بیگم کی طرف تھا، جن کی توپ اب خاموش تھی، وہ صرف عینا کی موجودگی میں ہی بول سکتی تھیں۔ اور عینا کی غیر موجودگی میں وہ آج بھی اپنے شوہر کے دبے دلے میں آجاتی تھیں۔

"رحیم!"

ہم لاہور میں رہتے ہیں، یہاں سے اسلام آباد جائیں یہ کون سی منطق ہے۔ اگر یہاں کوئی اچھا انسٹیٹ نہ ہوتا تو بھی بات مانی جاسکتی تھی۔"

مریم بیگم نے انہیں حقیقت دکھانی چاہی۔

"پر اگر وہ نہیں چاہتی تو ہم اس پر زبردستی نہیں کر سکتے۔ اور ویسے بھی تم جو اپنی بھانجیوں کی مثالیں دے رہی ہو۔ ان میں اور عینا میں فرق ہے۔ تم کیوں اس کی سینسٹو نیچر کو نظر انداز کر دیتی ہو؟"

رحیم صاحب سختی سے کہتے ہی باہر کی طرف بڑھ گئے جہاں سے عینا گئی تھی۔

اور مریم بیگم بس اپنی بچی کے مستقبل کی فکر میں گھلتیں کھانے کو گھورتی رہیں جو ٹھنڈا ہو رہا تھا پر اسے تناول کرنے والا کوئی نہ تھا۔

\*\*\*\*\*

رحیم صاحب کو مریم خان سے پہلی نظر میں ہی پیار ہو گیا اور پھر کیا تھا کہ دو الگ برادریوں سے تعلق ہوتے ہوئے بھی رحیم صاحب کی محبت جیت گئی۔

وہ مریم خان سے مریم رحیم ہو گئیں۔ شادی کے چار سال بعد ان کے گھر میں رحمت نازل ہوئی جس کا نام انہوں نے عینا رحیم رکھا۔

گندمی رنگت کی حامل گول مسٹل سی، گھنگریالے بالوں والی عینا، اپنے ددھیال میں سب سے حسین تصور کی جانے لگی۔ پر ننھیال کی طرف جہاں سب خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہاں عینا کی سنہری رنگت پر اوس پڑ جاتی اور یہیں سے اس کی خود اعتمادی پہ کاری ضرب لگی۔ پہلے پہل تو عینا سب کو پیاری لگتی تھی کیونکہ عینا، مریم جو کہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، ان کی بیٹی تھی۔ پر جب اپنے بچے خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بول چال میں بھی اچھے ہوں تو عینا کے اٹک اٹک کر بولنے پر ہزاروں نصیحتیں مریم کو سننی پڑتی اور وہ بجائے اپنی بیٹی کی مشکل سمجھنے کے خود ہی اس کی فکر میں گھلتی رہتیں۔

اس کی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچانے میں آدھے سے زیادہ کردار اسکی کزنز کا بھی تھا۔ جو اس سے عمر میں لگ بھگ برابر تھیں۔

اسے باقاعدہ احساس دلایا جاتا تھا کہ اس میں صرف خامیاں ہیں اور کچھ نہیں۔

اور کچھ ہاتھ ماں کی بے جا سختیوں کا بھی تھا کہ عینا دن بہ دن سب سے کٹتی رہی اور اب وہ اپنے بابا اور ماما کے علاوہ کسی سے بھی کھل کر بات نہیں کر پاتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اسکا نہ کوئی دوست تھا اور نہ ہی کوئی سمجھنے والا، سوائے اس کے بابا کے جن کے ساتھ وہ اپنی ماں سے بھی زیادہ قریب تھی۔

رحیم صاحب کی طبیعت میں جتنا بھی رعب و دبدبا تھا، پر عینا کے سامنے آتے ہی سب جھاگ کی طرح اڑ جاتا اور وہ نرم دل رکھنے والے انسان بن جاتے جن کی کل کائنات ان کی بیٹی تھی۔

\*\*\*\*\*

"چھوٹے سائیں!

آپ کے لیے کھانا لگا دوں!"



ہاتھ باندھے مؤدب انداز میں چالیس، بیاس سال کے شکیل کاکا نے کہا۔  
جس پر موبائل پر چلتی انگلیاں رکیں اور سر اٹھا کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں، کھانا میں باہر کھاؤں گا۔

آپ میرے کپڑے نکال دیجیے۔"

ضیغم ظفر شاہ، شکیل کاکا کے چھوٹے سائیں نے گنہیر آواز میں اپنا حکم سنایا، جس پر بغیر  
ہاتھ پر شکن لائے وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے چل پڑے۔

"اور میرا انتظار مت کیجیے گا، میں رات کا کھانا کھا کر آؤں گا۔

آپ کھانا کھا لیجیے گا۔"

موبائل پر سینڈ کے بٹن کو دبایا اور میسج ارسال ہوتے ہی اس نے مزید کہا۔

پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس بات پر کاکا کے چہرے پر تفکر کے ساتھ مسکان بھی تھی کہ ان کے چھوٹے سائیں کو

ان کا ہر پل خیال رہتا تھا۔

ایسا ہی تھا ضیغم ظفر شاہ، ناریل جیسا، باہر سے کھردرا شاہوں کا وارث پر اندر سے ایک نرم دل

رکھنے والا چھوٹا سائیں۔

ضیغم ظفر شاہ، ظفر شاہ کا اکلوتا اور لاڈلہ بیٹا تھا۔ جو اپنی خواہش کے مطابق حیدرآباد کی حویلی میں رہنے کی بجائے اسلام آباد کی فضاوں میں آ بسا۔

بچپن سے وہاں کا نظام، مؤدب ہاتھ باندھے لوگوں کی فوج اس کے سر پر مسلط رہتی تھی اور مزارعوں کا سر جھکائے رہنا، جس سے اکتا کر وہ بہت دور اسلام آباد آگیا جہاں اسکے بابا سائیں کا راج نہیں چلتا تھا۔

وہ ایک عام شخص کی طرح زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ پر پھر بھی بابا سائیں کے حکم کے مطابق تشکیل کا کا کی شکل میں ایک مؤدبانہ باڈی گارڈ کم اور جاسوس زیادہ، اس کی زندگی میں داخل کر دیا گیا۔

\*\*\*\*\*

عینا رحیم، وہ یہاں سے دور جانا چاہتی تھی۔ بہت دور کہ کوئی اس کے رنگ، اس کے کرل بالوں، اس کے اٹک کر بولنے کا مذاق نہ اڑائے۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ سب کی طرح اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہہ سکے پر یہ تو طے تھا کہ ان سب لوگوں کی موجودگی میں وہ کبھی آگے نہیں بڑھ پائے گی۔

اور تبھی اسے یہاں سے دور اسلام آباد جانے کی سوجھی، اسلام آباد شروع سے ہی اسے اپنے دل کے قریب لگتا تھا۔ چھٹیوں پر وہ اسلام آباد اور مری ہی جاتی پر وہاں بھی جو سکون وہ چاہتی تھی اپنی کزنز کی موجودگی میں وہ اسے میسر نہیں تھا، پھر بھی اسکا مرجھایا چہرہ اسلام آباد کی فضاوں میں کھل جاتا۔

نوبصورت نظارے اور اس سے بڑھ کر ہریالی چاروں طرف اس شہر کو ڈھکے ہوئے تھی۔ جو دیکھنے والوں کی آنکھوں اور دل کو ٹھنڈک بخشتی تھی۔

بس پھر کیا تھا جیسے ہی ایف ایس سی کے پیپر ختم ہوئے اس نے اعلان کر دیا کہ بی بی اے وہ ایک ہی شرط پر کرے گی اگر اسے اسلام آباد کی کسی یونی میں ایڈمیشن لے کر دیا جائے۔

پڑبائی میں وہ بس ٹھیک ہی تھی، پر مریم بیگم کی شدید خواہش تھی کہ ان کی بیٹی ایم بی اے کر کے اپنے بابا کے ساتھ ان کے آفس میں ہی کام کرے جیسے ان کے بھائی کی بیٹیاں کر رہی تھیں۔

لیکن وہ یہ بھول گئی تھیں کہ دوسرے کے سرخ گال دیکھ کر خود کے گال تھپڑ سے سرخ نہیں کیے جاتے۔

مریم بیگم نے ہمیشہ عینا کو اپنی جھانجیوں جیسا بننے کی تلقین کی، اور یہی تلقین عینا کی خود اعتمادی کو ریزہ ریزہ کر گئی۔ وہ خود سے بہت کوشش کرتی تھیں کہ عینا اپنے سمٹے ہوئے خول سے باہر آئے پر وہ کوششیں اسے مزید ایک محدود دائرے میں قید کر دیتی تھیں۔

"ہمارا بے بی یہاں روٹھ کر بیٹھا ہے۔"

وہ وہاں سے اٹھ کر لان میں آگئی تھی جہاں وہ اکثر ناراض ہو کر آجاتی تھی، پیچھے پیچھے رحیم صاحب بھی آگئے۔ اور اسے یوں اداس دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ عینا ہر وقت خوش رہے پر مصروفیت کی وجہ سے وہ زیادہ دھیان نہیں دے پائے کہ ان سب کے پیچھے وجوہات کیا ہیں۔

"آپ نے دیکھا آپ کی بیوی مجھے کیسے ڈانٹ رہی تھی۔"

عینا نے ناراضی ظاہر کرتے ہوئے ان کی بیوی کی شکایت کی۔ جس پر وہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

"ابھی اپنی بیوی کی کلاس لے کر آرہا ہوں۔"

عینا کے کان میں سرگوشی کی جس پر عینا نے ہنہ کہہ کر بات ہوا میں اڑائی۔  
عینا کے بقول اسکے بابا ماما سے ڈرتے تھے، کیونکہ اس نے جو ان کے درمیان رہ کر دیکھا تھا اس کے مطابق مریم بیگم گھر کی جلا دتھیں۔ جب کہ حقیقت صرف رحیم صاحب اور مریم بیگم ہی جانتی تھیں کہ گھر میں سخت طبعیت کا مالک، ہے کون؟

اور کچھ رحیم صاحب کی بھی کرم فرمائی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ عینا کے سامنے مظلوم شوہر بننے کی آداکاری کی تھی اور اس دوران مریم بیگم کی جھنجھلاہٹ انہیں لطف دیتی تھی۔

"سچی بچے، بھلا میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔"  
دو انگلیوں سے اسکا چہرہ اپنی طرف کرتے، شفقت سے کہا جس پر مزید وہ ناراضی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا بابا۔"

پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں۔"

وہ یک دم سے ان کے گلے لگتی زاوہ قطار رونے لگی، جس پر رحیم صاحب پریشانی سے اسکی پیٹھ تھپکنے لگے۔

"میری جان!

آپکو کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

عینا کا رویہ انہیں پریشان کر رہا تھا۔

اس کی اسلام آباد جانے کی ضد کو وہ صرف اسکی اس شہر سے لگاؤ تصور کر رہے تھے۔ پر عینا کا رونا انہیں مزید خدشات کا شکار کر رہا تھا۔

"یہاں سب.. م.. میرا مذاق اڑاتے ہیں... م.. مجھے عجیب نا... ناموں سے بلاتے ہیں۔ مجھے نہیں رہنا یہاں۔"

روتے ہوئے اسکی آواز رندھ گئی تھی۔ اور لفظ اٹک کر ادا ہوئے تھے۔

رحیم صاحب ان کا تو دل کٹ رہا تھا اپنے جگر کے گوشے کو یوں روتا دیکھ کر۔

"کون مذاق اڑاتا ہے، میرے بچے کا۔"

اسکا چہرہ اوپر کرتے پوچھنے لگے۔

"سب۔"

یہ کہہ کر وہ پہر سے انکے سینے سے لگی سوں سوں کرتے سسکیاں بھرنے لگی۔

"پھر بھی کون کہتا ہے، اور کیا کہتا ہے آپ کو؟  
بتاؤ مجھے۔"

انہیں اندازہ تو تھا کہ اس کی خود میں رہنے والی عادت کا سب مذاق اڑاتے ہوں گے پر پھر بھی وہ اس کے منہ سے سننا چاہتے تھے۔

ان کے سوال پر وہ ان سے علیحدہ ہوتی، آنکھوں کو مسل کر صاف کرنے لگی، تو رحیم صاحب نے اس کا ہاتھ روک کر چشمے کو اتارا اور اپنی قمیض کے گھیرے سے چشمہ صاف کرنے لگے۔

"بتاؤ نا۔"

چشمے کو صاف کرتے وہ اسے بولنے کا کہہ رہے تھے۔ تو عینا کو کچھ دن پہلے کی ہوئی بات یاد آگئی۔ اور پھر وہ انہیں بتانے لگی۔

"عینا یہ ریڈ کلر تم پہ سوٹ نہیں کرے گا، یہ مجھ پر بہت اچھا لگے گا، دیکھو میرے وائٹ کلر کے ساتھ بہت اچھا لگے گا نا". زارا (بڑے ماموں کی بیٹی) نے اسکے ہاتھ سے تقریباً چھینتے ہوئے کپڑا لیا اور خود پر لگا کر دیکھنے لگی۔

"ارے یہ کتنا پیارا ہے، یہ تو بالکل میرے لیے بنا ہے۔ ادھر دینا اسے"۔  
 زارا کی زیادتی پر منہ بسورتی، اس کی ستائشی نظریں فیروزی رنگ کے شارٹ فراک کی طرف پڑی جو سلور رنگ کے باریک کام سے مزین تھا۔ اسے ہاتھ بڑھا کر اپنے ساتھ لگانے ہی لگی تھی کہ نشاء چیخ پڑی۔  
 عینا کی ایک اور پسند، اسکی کزن نے اپنے نام کر لی۔

اس پر بھی وہ خاموشی سے آنکھوں میں غصہ لیے، دل مسوس کے رہ گئی کیونکہ وہ ان سب کو کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی اور اگر غلطی سے کہہ دیتی تو سب نے مل کر اسے وہ نصیحتیں کرنی تھیں، جو شاید ان کو خود بھی یاد نہیں رہتی ہوں گی۔

آخر میں اس کی نظر ایک سادہ سی شرٹ پر گئی۔ سفید رنگ کی چکن کی شرٹ اسے کافی پسند آئی پر اسکے لینے سے پہلے ہی آئمہ ٹپک پڑی۔



"عینا، یہ تمہارے کلر کے ساتھ میچ نہیں کرے گی۔ تم کوئی اور ہلکا سا رنگ دیکھ لو۔ یہ بالکل میرے رنگ کے ساتھ جمے گا۔

ہیں نا؟"

دودھیاں رنگت کی حامل آئمہ جسے اپنے رنگ کا زعم تھا۔ اور عینا کو ہمیشہ اسکی سنہری چمکتی رنگت پر نصیحتوں کی آڑ میں باتیں سناتی تھی پھر سے اسے اس کی کمزوری کا بتاتی، اس کی پسند چھین کر یہ جا وہ جا، اور عینا وہ مسلسل آنکھیں جھپکتی اپنے اد آنے والے آنسوں پر بند باندھنے کے جتن کر رہی تھی۔  
 بغیر کچھ خریدے، بغیر کچھ اور پسند کیے وہ خالی ہاتھ ہی گھر واپس آئی۔

سوں سوں کرتی عینا سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر گئی جس پر وہ تاسف سے اپنی پری کو دیکھے گئے۔

"نہ میرا بچہ..

اب اور رونا نہیں۔"

اسکی آنکھوں پر چشمہ درست کرتے اسے سینے سے لگاتے وہ چپ کروانے لگے جس پر وہ رونا بند کرنے کی بجائے اور روتی چلی گئی۔

"سب ایسا ہی کرتے ہیں میرے ساتھ بابا۔"  
وہ ان کے سینے سے لگی مزید شکایتیں لگا رہی تھی۔

"اور آپ کی بیوی بھی میرا ساتھ نہیں دیتی۔"  
ان کی قمیض سے اپنی آنکھیں اور ناک صاف کرتی وہ بولی جس پر رحیم صاحب دل کھول کر مسکرائے اور وہیں مریم بیگم کے گلا کھنکھارنے کی آواز آئی یقیناً وہ عینا کی گل آفشانی سن چکی تھیں۔

"مریم!"

ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔

جیسا عینا کہے گی ہم ویسا ہی کریں گے۔"

مریم بیگم کو دیکھتے، رحیم صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا جس پر عینا اپنے بابا کو دیکھنے لگی۔

"سچی بابا..."

آپ کی بیوی مان جائیں گیں؟"

خوشی سے چلاتی آخری جملہ ان کے کان میں بولا جس پر وہ ہنستے ہوئے مریم بیگم کو دیکھنے لگے۔

"کیوں مریم آپ کو اب کوئی اعتراض ہے؟"

ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی پر آنکھوں میں سخت تنبیہ کے وہ انکار نہیں سنیں گے۔  
مریم بیگم نے زندگی کے 22 سال انکے ساتھ گزارے تھے ان کے ہر اشارے کو وہ سمجھتی تھیں۔

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

جیسا عینا کہے گی ہم ویسا ہی کریں گے۔"

عینا کے ایک طرف رحیم صاحب تھے تو دوسری طرف مریم بیگم بیٹھ کر اسے اپنے گلے سے لگائے کہنے لگیں۔ جس پر عینا خوشی سے انہیں مزید خود میں بھینچ گئی۔

"Thankyou mama!

I loveyou".

"اے! یہ چیٹنگ ہے، میں نے آپ کی ماما کو راضی کیا ہے، تو صرف ماما کو تھینک یو کیوں؟"  
مصنوعی ناراضگی سے کہتے وہ عینا کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر گئے۔

"I love you Baba!"

انکے گلے سے لگتی وہ ان سے بھی اپنی محبت کا اظہار کرنے لگی۔  
اور اس کی یہ خوشی سے بھری، کھلتی مسکراہٹ ان کے دل کو سکون بخشنے لگی۔

\*\*\*\*\*

پورا دن مصروف گزار کر وہ اب لوٹا تھا۔ مصروفیت کوئی خاص بھی نہ تھی، دوستوں کے ساتھ  
لنچ، پھر گروپ آسائنمنٹ پر اچھا خاصا وقت لگا کر، لائبریری اور نیٹ سے کتابیں کھنگالنے کے بعد  
وہ مواد اکٹھا کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔  
پر وہ جانتا تھا کہ شکیل کا اس کے گھر پہنچنے سے پہلے کبھی کھانا نہیں کھائیں گے۔ بس پھر  
تھکا ہارا وہ گھر آ ہی گیا۔

ابھی ڈوپلیکیٹ چابی سے مین ڈور کھولا ہی نہ تھا کہ پہلے ہی شکیل کا کا نے دروازہ کھول دیا تھا۔ جس کا مطلب تھا وہ اسی کے انتظار میں تھے۔ ضیغم کے دل میں انکے اس عمل پر جہاں احترام جاگا تھا وہیں وہ اس حد کی فرمانبرداری سے چڑا بھی تھا۔

"آپ سے کہا بھی تھا کہ سو جائیے گا۔"

آواز میں بیزاری تھی، پر لہجے میں احترام برقرار تھا۔

اور پھر کہہ کر کچن کی طرف گیا، کا کا بھی اسکے پیچھے ہی ہو لیے۔

اس کی بات کو سرے سے نظر انداز کیے وہ کھانا گرم کرنے لگے۔

اور ضیغم بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا، کہ تبھی اسکا موبائل بجنے لگا۔ جس پر بابا سائیں کالنگ لکھا تھا۔

ایک نظر شکیل کا کا کو دیکھ کر اس نے موبائل کان سے لگایا۔

"السلام علیکم بابا سائیں۔"

وہ مہذب اور شائستگی سے بات کرتا کہیں سے بھی اپنی مرضی کا مالک ضیغم ظفر شاہ نہیں لگا تھا۔

"جی بابا سائیں،..."

جی...

نہیں میں آگیا تھا۔

جی گھر پر ہی کھاؤں گا..

جی..

صحیح ہے بابا سائیں۔

جی اللہ حافظ۔"

مسلسل فرمانبرداری سے انکی بات سنتے اور تحمل سے جواب دیتے وہ سخت نظروں سے تشکیل کا کا کو بھی گھور رہا تھا جو سر جھکائے کھانا اس کے سامنے رکھ رہے تھے۔

"کا کا!"

کسی دن آپ کو میں نے حویلی مہیچا دینا ہے۔"

ہمیشہ سے بولا گیا جملہ وہ آج بھی کہہ کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔

ضیغم، کا کا کی جاسوس طبیعت سے سخت تنگ تھا، جب کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ان کا کام ہے، چھوٹے سائیں کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ بڑے سائیں کا حکم ماننا بھی انہوں نے خود پر فرض کیا تھا۔

"جو حکم چھوٹے سائیں".

وہی فرمانبردار لہجہ، جس پر ضیغم مزید کھول اٹھا پر ضبط کا دامن تھامے وہ کھانا کھانے لگا۔  
آخر کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، شکیل کا کا بچپن سے اسکے ساتھ تھے، وہ کیسے انہیں کچھ  
سخت سنا سکتا تھا؟

\*\*\*\*\*

عینا رحیم کی قسمت کا در بھی کھلنے لگا تھا۔  
کبھی کبھی شخصیت میں بدلاؤ کے لیے، ہستی کے گرد بنائی گئی دیواریں گرانی پڑتی ہیں اور یہ  
دیواریں بیٹھے بھٹائے نہیں گرتیں، بہت سے پہلو اس عمل میں اثر انداز ہوتے ہیں۔  
جگہ کا بدلاؤ بھی شخصیت کی بناوٹ پر گہرا رنگ چھوڑتا ہے۔ اور یہی عینا رحیم کے ساتھ ہونا تھا  
کیسے اس کی زندگی میں پھیلے اندھیرے کی چھانٹ ہو کر اجالے کی کرن پھیلے گی؟  
یہ دیکھنا باقی تھا۔

پھر کیا تھا کچھ ہی دنوں میں رحیم صاحب، مریم بیگم اور عینا کے ہمراہ سب سمیٹ کر اسلام آباد رہنے چلے گئے۔

عینا نے اسلام آباد کی یونیورسٹیز میں آپلائے کیا تھا پر اس کے نمبروں کی بدولت ایک یونیورسٹی کو ترس آہی گیا اور عینا کو ایڈمیشن مل گیا۔

رحیم صاحب تو ویسے بھی زیادہ وقت اسلام آباد میں موجود اپنی مین برانچ میں ہوتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ عینا کو پہلے وہ وقت نہیں دے پاتے تھے جو اسکا حق تھا۔ اور اب انہیں بزنس کے حوالے سے کوئی زیادہ مشکل پیش نہ ہوئی تھی۔

اس طرح عینا ایک نئے سفر پر چل پڑی تھی، جہاں بہت سے پر خلوص رشتے اسکے منتظر تھے۔ اس کی تاریکی میں ڈوبی زندگی کو روشنی کی کرن دیکھانے کے لیے، اسکے دگمگاتے قدموں کو سہارا دینے کے لیے، اسکی آواز بننے کے لیے، نئے شہر میں جا کے وہ نئی عینا بننے جارہی تھی پہلے سے زیادہ پر اعتماد....

عینا رحیم!

کیا واقع ایسا ہی ہونا تھا؟

\*\*\*\*\*



"یہ کیا پہن کر جا رہی ہو؟"

وہ گہرے نیلے رنگ کا کرتا پہنے جس کے دونوں اطراف جیب لگی تھیں۔ کرتے کے بازو کہنیوں تک اوپر چڑھائے، ساتھ میں ٹراؤزر اور سکارف کو گلے میں مفلر کی صورت میں لپیٹے، بیگ کو کندھے پر لٹکائے ناشتے کی میز پر موجود تھی۔

"کیا پہن لیا؟"

پہلا لقمہ چباتے اس نے اچھنبے سے خود کو دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں پہن سکتی تھی۔ کچھ تو لڑکیوں والے کام کرلو تم۔"  
اس کے لڑکوں جیسے حلیے کو دیکھ کر، وہ کلس کر بولی تھیں۔

"یہ بھی لڑکیوں والا ہی کام ہے۔"

سامنے بنے ناشتے کی طرف اشارہ کرتی وہ انہیں جتلا رہی تھی۔

"ہاں تو یہ تمہارا کام ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام آنے چاہیے۔"

میں تو تمہارے پہننے اوڑھنے کے ڈھنگ سے کافی تنگ ہوں۔"  
اس کے باب کٹ بالوں کی طرف اشارہ کرتی وہ ناگواری سے بولیں۔  
تائشہ نے گہری سانس لی۔

"آج پہلا دن ہے یونی کا، آج تو سکون سے ناشتہ کر لینے دیں۔"  
وہ چڑ کر کہتی ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکی تھی۔

"ہاں تو کھاؤ میں نے منع کیا ہے، کیا؟  
ماں ہوں تمہیں پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ میں نہیں سیکھاؤں گی تو کون سکھائے گا؟"  
وہ رنجیدہ لہجے میں کہتیں خاموشی سے اٹھنے لگیں۔

"اچھا سوری نا۔"

ان میں کیا خرابی ہے، مجھ سے نہیں یہ لڑکیوں والے کپڑے سنبھالے جاتے۔"  
اسکے الفاظ اسکی آواز کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ تائشہ کی امی، مسرت بیگم نے دکھ سے اسے  
دیکھا تھا۔

"کس سے جھوٹ بول رہی ہو تائشہ۔"

ماں تھی جانتی تھی اسے!

"خود سے۔"

بڑبڑاتی بیگ اٹھائے جانے کو تیار تھی۔

"اچھا اب چلتی ہوں میں۔"

انکے سر پر بوسہ دیتی کہہ کر پلٹی۔

"تائشہ!"

خبردار اگر یونی میں بھی لڑائی جھگڑا شروع کیا تو۔"

انہوں نے اس کی پشت تکتے ایک اور نصیحت کی تھی۔

تائشہ نے لب بھیغے۔

"میں کہاں جھگڑتی ہوں۔"

کندھے اچکا کر معصومیت سے کہا۔

"ہاں جھگڑا خود چل کر تمہارے پاس آتا ہے نا۔"  
 انہوں نے گھورتے ہوئے کہا تھا۔  
 تائشہ ان کے انداز پر آنکھ دباتے گھر سے باہر چلی گئی۔  
 پیچھے وہ اسے اللہ کی امان میں دیتے، اسی کے ہاتھ کا بنا ناشتہ کرنے لگی تھیں۔

تائشہ اپنی امی، مسرت بیگم کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک بڑی بہن تھی جس کی تین سال پہلے شادی  
 کی جاچکی تھی۔ اور اب یہ دونوں ماں بیٹی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔

\*\*\*\*\*

"اٹھ جاو۔۔۔!"  
 آج پہلا دن ہے، اور کتنا سوؤں گی۔  
 اٹھ بھی جاو۔"

وہ مسلسل آتی آوازوں سے تنگ آکر مزید کمر میں سر دیے، آنکھیں بند کر کے نیند کے مزے  
 لینے لگی۔

بھابھی کمرے میں بکھری چیزیں سنبھالتی کوئی دس دفعہ اسے زبانی کلامی اٹھنے کا کہہ چکی تھیں۔ جس کا مقابل پر چنداں اثر نہ ہوا تھا۔

"تمہارے بھائی کو دکان سے دیر ہو رہی ہے۔

اٹھتی کیوں نہیں ہو؟"

کمبل کو چہرے سے ہٹاتی وہ اب جھنجھلا کر بولی تھیں۔

اس نے کمبل کھینچ کر پھر سے منہ پر پھینکا تھا۔

"تو چلے جائیں نا میں سیف بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

ساتھ پڑے تکیے پر سر پٹختی وہ کمبل کے اندر ہی بڑبڑائی تھی۔

"وہ چلے گئے ہیں۔"

"تو فیضی بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

کمبل سے ہاتھ نکال کر انہیں جانے کا اشارہ کرتے کہا۔

"وہ بھی چلے گئے ہیں۔ صرف عادل گھر پر ہیں۔ اور کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"  
 کھینچ کر کمبل اس سے دور کرتے، اب کی بار انہوں نے اسے اٹھنے پر مجبور کر ہی دیا تھا۔  
 وہ بھی کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھتی آنکھیں مسلنے لگی۔

"کیا ہے بھابھی، سونے بھی نہیں دیتیں۔"  
 منہ پر ہاتھ رکھے، جمائی روکتی وہ خفا ہوئی تھی۔

"اور کتنا سوؤں گی تم، ٹائم دیکھا ہے نو بج گئے ہیں۔ اس وقت تمہیں یونی ہونا چاہیے تھا۔ اور تم ہو  
 کہ اس وقت اٹھ رہی ہو۔"  
 تیزی سے ہاتھ چلاتیں وہ کمبل سمیٹ کر رکھ رہی تھیں۔

"اچھا پلیز۔"

دوسری اماں نہ بنیں۔"

بیزاریت سے کہہ کر وہ پھر سے بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اس سے پہلے کہ سچ مچ میں اصلی اماں یہاں آجائیں۔

جا کر تیار ہو جاؤ۔"

اسکے کپڑے نکال کر ہاتھ میں پکڑتے زبردستی بیڈ سے اتارا تھا۔

اور وہ بھی آلس پن کا اشتہار بنی منہ بناتے ہوئے کوفت سے سر جھٹکتی تیار ہونے لگی تھی۔

"اٹھ گئی مہارانی۔"

وہ کمرے سے جیسے ہی نکلی تھی اس کے قدم رکھتے ہی، اماں نے طنز چھوڑا تھا۔

اور اس نے منہ بنایا۔

"یہ کیا پہن رکھا ہے۔ خدا کا کوئی خوف ہے کہ نہیں ہے، کس کی بارات پر جا رہی ہے؟ جو یہ

کریب کا لال دوپٹہ پہن لیا ہے۔"

تسبیح کے دانے پھیرتے وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں، جو بغیر کسی شرمندگی کے ان کے پاس سے گزر رہی تھی۔

سفید رنگ کی شلوار قمیض، اسکے ساتھ لال کریب کا دوپٹہ شانوں پر پھیلائے۔ کندھوں سے

بالشت بھر نیچے آتے بالوں کو کھلا چھوڑے، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں اور ایک ہاتھ میں لال

رنگ کی چوڑیاں ڈالے۔ وہ نک سک سے تیار تھی چہرے پر بھی ہلکی پھلکی زینت کی گئی تھی۔

اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹھکی تھیں، آخر کو پڑھنے جا رہی تھی، گھومنے پھرنے تو نہیں جو اتنا سچ سنو کر باہر آئی تھی۔

"کیا ہے اماں؟

ہر چیز میں نقص نہ نکالا کرو۔

اسکے ساتھ لال نہ پہنوں تو اور کیا نیلا پیلا پہنوں؟

دیکھو کتنی اچھی میچنگ بن رہی ہے۔"

ہاتھ نچا کر جواب دیتی، اپنے دوپٹے کو مزید پھیلا کر گھومی تھی۔

اماں نے گہورا، جبکہ بھابھیوں نے ہنسی دبائی۔

"منخوس ماری، ایک تو میری مت ماری گئی تھی۔ جو تجھے یہ سوٹ بنوا کر دے دیا۔

چل دفعہ ہو جا کر بدل آ۔"

اماں نے سخت لہجے میں اسے ڈپٹتے کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہے اماں؟



تم تو چاہتی ہی ہو کہ میں لیٹ ہو جاؤں۔  
 پہلے بھی لیٹ اٹھایا۔ اور اب پھر لیٹ کرنا چاہتی ہو۔ بتاتی ہوں عادی بھائی کو جاکر۔"  
 سارا الزام ان پر ڈالتی وہ دہمکی دینے لگی تھی۔  
 اماں نے نخوت سے ہونٹ سکڑے تھے۔

"ہیرا!

ناشتہ کرلو!"

بات بگڑتے دیکھ کر بڑی بھابھی نے اسے متوجہ کیا تھا۔  
 جھٹکے سے گھوم کر انکی طرف متوجہ ہوئی تھی، بھوک تو اسے زوروں کی لگی تھی۔ فوراً سے ناشتہ  
 کی میز پر پہنچی تھی۔ ہمیشہ کی طرح لچھے دار پراٹھا اور چیز آملیٹ اسکا منتظر تھا۔

"نہ کھانے کا ڈھنگ ہے نہ بنانے کا۔

بس ایک قینچی کی طرح زبان ہے جو کتر کتر چلتی ہے۔"  
 وہ بڑبڑاتیں پھر سے تسبیح کے دانے پھیرنے لگی تھیں۔

"ہاں ہاں سارے سلیقے تو اماں تمہاری بھانجیوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ اتنے کوٹ کر بھرے ہیں، کہ ہمیں تو بھی نظر ہی نہیں آتے۔"

نوالہ جلدی سے نگلتی، اماں کی بڑبڑاہٹ کا جواب پیش خدمت تھا۔

"ہزار دفعہ اسکے بھائیوں سے کہا، کوئی فائدہ نہیں اس کو آگے پڑھانے کا۔ بارہ جماعتیں پڑھ کر بھی تمیز نہ آئی بڑوں سے بات کرنے کی، میڈم ایم بی اے کرے گی۔"

بھانجیوں کے ذکر پر وہ بھی ترخ کر بولی تھیں۔

ہیر نے جلدی سے نوالہ ٹھونسا تھا۔

"ہاں تو میں کونسا پڑھنے کے لیے مر رہی ہوں۔ میں تو بارہ بھی نہ کرتی وہ تو بھائیوں نے لاڈپیار سے کروا دیں۔"

میں نے تو کہا تھا کہ کوئی رشتہ دیکھ لو میرے لیے۔ پر تمہیں کہاں اپنی اس خوبصورت بیٹی کے لیے کوئی خوبصورت لڑکا ملتا ہے۔ اٹھالاتی ہو اپنے خاندان میں سے سکڑے ہوئے آلو اور پھنسی ہوئی ناک والے۔"

وہ ہاتھ نچا نچا کر فراٹے بھرتی زبان چلاتی۔ پھر سے ناشتے کے ساتھ مکمل انصاف کرنے لگی تھی۔

تخت پوش پر بیٹھی اماں نے تسبیح روک کر کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔  
 "او بے حیا، بے شرم کر لا کوئی حیا کر لا  
 (او بے حیا، بے شرم کر لو کوئی حیا کر لو)  
 کیسے منہ پھاڑ پھاڑ کر بکواس کر رہی ہے۔"

"حیا تو تمہاری بھانجیوں میں ہے بھئی۔ ہم میں کہا سے آئی حیا۔  
 اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میری مرحوم دادی کو ایک وہی تھی، جو ہیر یوسف کو  
 سمجھتی تھیں۔  
 میری سگی ماں کو نہ لاج آئی، نہ مجھ بدنصیب کا خیال۔"  
 ہاتھ اٹھائے دادی کے لیے دعا کرتی، وہ اونچی آواز میں اماں کو جلا رہی تھی۔  
 جنہیں ہیر دوسری ساس سے کم نہیں لگتی تھی۔

"ایک تو، اور ایک تیری مرحوم دادی دونوں نے میری زندگی عذاب کی ہے۔  
 آلینے دو تیرے بھائیوں کو واپس، آج کے آج بات کرتی ہوں ان سے، یہ گز بھر کی زبان پکڑا  
 دی ہے اسے، اوپر سے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔"  
 اس کی پشت گھورتیں وہ بھی اونچی آواز میں بڑبڑائی تھیں۔

ہیر نے نوالہ آملیٹ پر اچھی طرح مسئلہ تھا اور پھر منہ میں رکھتے پلیٹ کھسکائی تھی۔

"اماں سیدھے سے بول دے کہ تو نہیں چاہتی میں گہر کا کھا پی کر جاؤں، تو نہیں کھاتی۔  
یہ لو تم کھا لو!"

پلیٹ کھسکا کر بیگ کرسی سے اٹھاتی کندھے پر درست کرتی، بھا بھی کے ہاتھ سے چادر لے کر  
شانوں پر لپیٹتی اماں کے تخت پوش کے پاس آئی تھی۔

اماں نے اسکی بات پر سر ہوا میں مارا تھا جیسے وہ تو جانتی نہ ہوں کہ ناشتہ چٹ کر کے آئی  
ہے۔

بھا بھی نے بھی اپنے سامنے پڑی آملیٹ والی پلیٹ دیکھی جس پر چند ذرے باقی تھے۔ اور پراٹھے  
کی کناریاں بچی تھیں۔

"او بہو!"

نند کی خوشامد ہو گئی ہو تو میرے لیے بھی چائے لے آ، اس منحوس ماری نے تو سر میں درد کر دیا  
ہے۔"

گاوتیکے سے ٹیک لگاتی وہ ماتھا مسلنے لگی۔

ہیر سے صبح صبح منہ ماری کرنا کوئی آسان کام تھوڑی نہ تھا۔

"بھابھیاں میری ہیں تو میری ہی خوشامدیں کرینگی اور کیا اب تمہاری بھانجیوں کی کریں۔"  
ان کی بات پر وہ جو جانے کو تیار کھڑی تھی چٹخ کر بولی تھی۔

اماں نے گھورا تھا، پھر ہاتھ بڑھا کر چپل اٹھائی اور تاک کر نشانہ باندھا تھا۔ اس سے پہلے کے نشانہ اسکی کمر پر جا کر چھاپ چھوڑتا وہ ستون کے پیچھے جا چکی تھی۔

"اس عمر میں بھی تمہارا نشانہ خطا نہیں ہوتا اماں۔"

شرارتا آنکھ دبا کر کہتی، وہ جلدی سے باہر نکلی تھی۔

مبادہ اماں دوسری چپل شریف بھی اسکی جانب نہ اچھال دیں۔

باہر عادل بھائی گھنٹے بھر سے اسکا انتظار کر رہے تھے، اور اب اسکے آتے ہی بنا ماتھے پر شکن لائے مسکراتے ہوئے، اسے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔

ہیر بھائیوں کے لیے ایسی ہی تھی۔ انکی گریا، جس کے منہ سے نکلتی ہر خواہش انکے لیے حکم ہوتی تھی جب تک ہیر کے والد زندہ تھے چھ بھائی اور ایک باپ کی محبت نے اسے دنیا کی ہر خوشی دی تھی۔ باپ کے اس دنیا سے جانے کے بعد بھائیوں نے اس ریت کو توڑا نہ تھا۔

ہیر چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بھائی شادی شدہ تھے۔ ایک ہیر تھی جس کی شادی کی فکر میں اسکی ماں گھل رہی تھی۔ لیکن ہیر اپنے آپ میں جینے والی لڑکی، جو خواب بنتی تھی، اور خوابوں میں شہزادہ دیکھتی تھی۔ اور جو نقشہ وہ کھینچتی تھی اس کا اصل زندگی میں ملنا مشکل تھا۔ لیکن اسے امید تھی کہ اسے اپنا شہزادہ ضرور ملے گا۔ اور یہ تو مقدر کے کھیل ہیں، کبھی کبھی خواب حقیقت بن کر سامنے آ بھی جاتے ہیں۔ بس انہیں پرکھ کر اپنانے کی دیر ہوتی ہے۔

\*\*\*\*\*

"یونی جا رہے ہو؟"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہال سے گزر کر جانے لگا تھا۔ پیچھے سے آئی آواز نے قدم روک لیے۔

"جی امی۔"

کیوں، کچھ کام تھا؟"

کندھے پر لٹکے بیگ کو انکے سامنے رکھے صوفے پر دھرتا۔ وہ ان کے پاس ہی چلا آیا۔

"نہیں۔

کام تو نہیں تھا۔

ناشتہ نہیں کرو گے؟"

چائے کی پیالی سامنے میز پر رکھتیں، وہ استفسار کر رہی تھیں۔

"نہیں ابھی تھوڑی دیر بعد فٹ بال کا میچ ہے۔ اس لیے ابھی کچھ نہیں کھا سکتا۔  
آپ بتائیں، صرف چائے کیوں پی رہی ہیں؟"  
وہ تفصیلاً اپنا بتاتا، ان سے پوچھنے لگا تھا۔

وہ اس کے سوال پر ہلکے سے مسکرائی تھیں۔

ضامن نواز، ان کا چھوٹا بیٹا ایسا ہی تھا۔ انکے لیے حد درجہ حساس...

"ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔"

وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔

"امی نہار منہ چائے پینا اچھا نہیں ہے، آپ جوس لے لیتیں۔  
بابا کہاں ہیں؟ نظر نہیں آرہے۔"  
انہیں سمجھاتا، وہ ارد گرد نظر ڈال کر نواز صاحب کے متعلق پوچھنے لگا۔

"وہ تو آفس چلے گئے ہیں۔  
تمہیں بھی دیر ہو رہی ہوگی یونی سے۔"  
ملاؤمت سے کہتیں وہ چائے کا گھونٹ بھرنے لگیں۔

"ہاں دیر تو ہو رہی ہے۔

اچھا اب میں چلتا ہوں اور ناشتہ لازمی کر لیجیے گا۔"  
وہ سامنے دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نظر ڈالتا، ان کے ماتھے پر محبت بھرا احساس چھوڑ کر کھڑا ہوا تھا۔

"ضامن!"

فکر میں ڈوبی آواز نے ایک بار پھر اسکے قدم روکے تھے۔



وہ ان کی پکار پر مڑ کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔  
وہ کچھ الجھی سی سوچ میں ڈوبی لگ رہی تھیں۔

"یاسر سے بات ہوئی؟"

انکے لہجے میں امید تھی، جس آسرے پر سوال کیا گیا تھا۔

ضامن نے گہرا سانس بہرا تھا۔ اب کیا بتاتا کہ انکی امید ابھی تک آدھوری ہی تھی۔  
"وہ.."

ابھی تک تو نہیں، شاید بھائی بڑی ہونگے۔

ابھی مجھے لیٹ ہو رہا ہے۔ واپسی پر انہیں کال کرونگا۔"

وہ انہیں ٹالتا، لمبے دُگ بھرتا باہر کو چل دیا۔

اگر کچھ دیر مزید رکتا تو ماں کی آنکھوں میں ٹہری اداسی اس کا دل کاٹنے لگتی۔

نواز خان صاحب اور صلہ بیگم کو اللہ نے دو بیٹوں سے نوازہ تھا۔

ایک یاسر نواز، انکا بڑا بیٹا اور دوسرا ضامن نواز، انکا چھوٹا بیٹا۔

یاسر نواز شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ پردیس گئے تو پھر واپس آنا ہی بھول گئے۔

اور پیچھے ضامن نواز ہی اب اپنے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ ضامن اور نواز صاحب نے تو اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔

جب کہ صلہ بیگم ابھی تک اس کو ماننے سے انکاری تھی، ضامن اور نواز صاحب نے بھی انکی طبیعت کے پیش نظر انکی امیدوں کو توڑا نہیں تھا

یاسر سے تو وہ خاص محبت رکھتی تھیں، اور اسکے پردیس میں جا بسنے کے غم نے انہیں پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اب صرف ایک ہی امید تھی کہ کبھی تو وہ واپس ان سے ملنے آئے۔ پہلے تو چند لمحوں کے لیے آواز سننے کو مل جاتی تھی کہ ممتا کی بے قراری کو کچھ قرار آجاتا تھا۔ اب تو کچھ وقت سے آواز بھی سننے کو نہیں ملی تھی۔

\*\*\*\*\*

سورج کی کرنیں، کھرکی پر لٹکے دبیز پردوں سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں جس کے باعث مدقوق سی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔

کمرے کے بیڈ پر لحاف سر تک تانے، وہ وجود گدھے گھوڑے بیچ کر ہر فکر سے آزاد اپنی نیند پوری کر رہا تھا۔

مسلسل بجتا فون ایک بار بج کر خاموش ہو چکا تھا، لیکن بیڈ پر سوئے وجود میں ذرا جنبش نہ ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ فون پھر سے بجاتا تھا۔

متواتر سے آتی آواز پر اس کی نیند میں خلل آیا تھا۔ وہ کسلمندی سے کروٹ بدلتا پھر سے نیند کی وادی میں غرق ہونے لگا۔ تبھی تیسری بار فون کی گھنٹی پر اس نے آنکھیں مسل کر فون اٹھایا اور کان سے لگایا تھا۔

"نیند کے پجاری!

آپ اٹھ گئے ہوں، تو یونی بھی چکر لگا لیں۔ اور ہمیں بھی اپنا رخ شریف دکھا کر فیض یاب کریں۔

وہ کیا ہے نا، موصوف صاحب ہم پچھلے آدھے گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

صرف آپ جناب کی وجہ سے میچ طوالت کا شکار ہے۔"

اس کے فون اٹھاتے ہی ضامن نے دانت پیستے ہوئے اسے عزت دی تھی۔

"اتنا آپ جناب نہ کر۔

ہم کمزور دل کے لوگ ہیں۔ کہاں برداشت کر سکیں گے؟"

سر کھجاتا اپنی عزت افزائی پر ڈھیٹوں کی طرح ہنستا ضامن کو پتنگے لگا گیا۔

"شیری!"

ابھی کے ابھی یونی پہنچو۔

ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"تجھ سے برا پہلے بھی کوئی نہیں ہے۔ کتنا خوبصورت خواب دیکھ رہا تھا۔

اور تو نے اپنی منحوسیت دکھا دی۔"

خواب کو پھر سے محسوس کرتے، مسکراتے ہوئے لحاف اپنی ٹانگوں سے سرکاتا، وہ ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"تیرے خوابوں والی بھی جلد مل جائے گی۔ پہلے یونی تو آجا۔"

وہاں انکی ٹیم اور مخالف ٹیم کے کھلاڑی اسی کے انتظار میں تھے۔

اور شہریار عالم تھا کہ وہ ابھی تک اپنے بستر پر بیٹھا کھلی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔

"تیرے منہ میں گھی شکر۔"

وہ خوشی سے چمکا تھا۔

"چل ویٹ کر دس منٹ میں آرہا ہوں۔"

چپل میں پاؤں اڑساتے، جواب دے کر، فون کاٹ دیا تھا۔

اپنے قول کے برعکس وہ آدھے گھنٹے بعد انکے سامنے موجود تھا۔

بلیک ٹراوز اور گرے ٹی شرٹ پہنے، بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے، جب کہ آنکھوں میں ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔

اس کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ ابھی بستر چھوڑ کر آیا ہو۔

"آگیا تو!"

کر لیا ہم پر احسان؟"

ضیغم بھی اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیتے، خفگی سے بولا تھا۔

"دس منٹ کا کہہ کر آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ اور آیا بھی تو ویسا ہی پیچھے بن کر۔"

ضامن نے اس کے حلیے پر چوٹ کی تھی۔

خیر یہ تو روز کا معمول تھا۔

"میں بال بناؤں کس کے لیے؟

میں بال بناؤں کس کے لیے؟"

بے ڈھنگی آواز میں گانے کے دو بول گنگنائے اور ماتھے پر بکھرے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا تھا۔

"صبح، صبح کان کے پردے نہ بھاڑ۔"

ضیغم نے کان میں انگلی ٹھونسے اسے ڈپٹا تھا۔ جس پر وہ آنکھ دباتا، مسکراتا ہوا انکے پاس سے گزرا۔

"اب میچ شروع کر لیں؟

کب سے وقت ضائع کر رہے ہو۔"

اپنی ٹیم کے پاس پہنچ کر ان سے ہاتھ ملاتا وہ کچھ فاصلے پر کھڑے ضامن اور ضیغم سے بولا تھا۔  
جو اس جھوٹ پر ایک دوسرے کو دیکھتے تاسف سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

"آج کا میچ تو کسی کے خوابوں کی نظر ہو گیا۔

اب پریکٹس ہی کر لیتے ہیں۔"

صیغہ نے شیریں کے ہاتھ سے فٹبال لے کر ہوا میں اچھالی تھی۔

ساتھ میں جتنا بھی نہیں بھولا تھا۔

ایک گھنٹے سے انتظار کرتے، مخالف ٹیم کے کھلاڑی باتیں سنا کر جا چکے تھے۔

شہیار عالم بھی دوستوں کی لعن طعن کا اثر لیے بغیر پریکٹس کے لیے میدان میں اتر گیا۔

\*\*\*\*\*

آنکھوں پر گول چشمہ لگائے، بھورے گھنگریالے بال جن کے بے ترتیب سے کرل بنے ہوئے تھے۔ تھان بھر کا سویٹر پہنے وہ نظریں جھکائے سہم کر چلتی، کبھی چشموں کو درست کرتی تو کبھی کتابوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتی ہوئی گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اور تبھی فٹبال اسکے پیروں کے پاس سے ہو کر گزری۔ جس پر وہ بلی سادل رکھنے والی، اچھل کر پیچھے ہٹی اور اس پیچھے ہٹنے پر توازن برقرار نہ رکھ پائی تو چشمہ اور کتابیں زمین پر گر گئیں۔

اپنی اس بزدلی پر کڑھتی بڑبڑا کر کتابوں کو ایک دوسرے پر پٹختی، اپنا نظر کا چشمہ اٹھا کر لگانے لگی۔

اس کے پیچھے سے آتی مردانہ آواز نے اسکی بڑبڑاہٹ کو خاموشی میں بدلا۔

"hey!

pass the ball".

اس جھمٹے پر وہ کتابیں اٹھاتی پیچھے مڑی تھی، اور اپنے سامنے لڑکے کو دیکھ کر مزید بدحواس ہوئی۔

"او ہو!..."

نوڈلز پلس بیٹری نے بھی یونی میں ایڈمیشن لیا ہے۔"

ضامن اسکی گھبراہٹ کو بانو بی سمجھ رہا تھا۔ جونئیرز کا حال پہلے دن تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور سینیئرز اپنے جونئیرز کو تنگ نہ کریں، یہ کہاں ممکن تھا۔

"میں.. میں بیٹری نہیں ہوں۔"



اسے تو پہلے ہی ڈھیروں نام مل چکے تھے اب اس نئے نام پہ تو اسے پتنگے لگنے ہی تھے۔ ساری جھجھک ہوا ہوئی تھی اور اٹک اٹک کر بولتی وہ اپنے لیے ہی مشکل کھڑی کر گئی۔

"بالکل تم بیڑی، نوڈلز پلس

میں۔۔۔ میں۔۔۔ کرنے والی بکری بھی ہو۔"

وہ قہقہے پہ قہقہ لگاتے ہنستا جا رہا تھا۔

ضامن کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر ضیغم اور شہیار بھی اس تک پہنچے تھے اور اسکی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

تینوں کسی بڑے گھر کے امیر لڑکے لگتے تھے، خوبصورتی صرف عورتوں کے لیے ہی نہیں مختص مرد بھی خوبصورت ہوتے ہیں اور آج اس پر ادراک ہوا تھا کہ مقابل بلاشبہ وجیہ اور دلکش نقوش کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ گورے رنگ کے حامل بھی تھے۔ جس سے وہ مزید گہراہٹ کا شکار ہو رہی تھی، شکل و صورت کے اعتبار سے تو وہ معمولی تھی پر ایک چیز جو اس میں خاص تھی وہ اسکی معصومیت جو چہرے پر اپنا نقش چھوڑے ہوئے تھی۔

وہ ہکلاتی نہیں تھی پر جب غصہ یا گھبراہٹ کا شکار ہوتی تو لفظ ٹوٹ کر ادا ہوتے تھے۔

"میں..

آئی ایم..م ناٹ آبکری".

مسلسل گونجتے قمتوں سے اسے ہتک کا احساس ہونے لگا جس پر اسکی آنکھیں ضبط کے مراحل طے کرتی چھلکنے کو تیار تھ بھیں۔

"او ہو۔

mama's girl

رو رہی ہیں۔"

شاید جونیرز کو تنگ کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ تبھی شہریار بھی ضامن کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتا اس کے منہ بسور نے پرچوٹ کر گیا۔ وہ باری باری ان دونوں کو دیکھ رہی تھی، جو اس پر ہنس رہے تھے۔

اور پھر اچانک سے کوئی اس کے اور ان لڑکوں کے درمیان دیوار بن کر آن ٹپکی۔ جیسے تپتی دھوپ میں گھنا سایہ دار درخت خود چل کر آیا ہو۔ فی الوقت تو عینا کو ایسا ہی لگا۔

"اے یو!"

کیا سمجھ رکھا ہے لڑکی کو؟

تنگ کیوں کر رہے ہو؟"

وہ چٹکی بجا کر انگلی دکھاتی تنبیہ کرنے کے انداز میں، چھوٹی پر خطرناک شیرینی لگ رہی تھی۔

"چھوٹا پیکٹ!"

ضامن نے اب کی بار اس نئی اینٹری کے قد پر پوٹ کی تھی، باقی سب تو حیرانی سے اس نئے بن بلائے مہمان کو دیکھ رہے تھے۔

"او ہیلو!..."

کس کو بولا چھوٹا پیکٹ، تم خود ہو گے بڑا پیکٹ، بلکہ نہیں۔

تم لمبو، کنبے ہو گے۔"

چھوٹا پیکٹ کی تان تو اس کے سر پہ لگی اور تالو پہ بجی تھی۔ پھر کیا تھا کہ اس کا نہ بند ہونے والا ریڈیو شروع ہو چکا تھا۔ اور اس تیز چھری کو چاروں ہی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ اور اب انکی باقاعدہ ہونق بنی شکلوں کو دیکھ کر وہ ہنسنے لگی تھی۔

"تم ان جیسوں سے ڈر رہی تھی، دیکھا کیسے چپ کروا دیا  
mama's boy!".

تالی مارتی وہ اپنی ہی بات سے لطف لے رہی تھی۔

وہ شاید نہیں یقیناً بہت بولتی تھی اور صرف بولتی نہیں بلکہ لمبی بھی ہانکتی تھی۔ اس بات کا  
اندازہ بھی ان چاروں نے ہی لگا لیا۔



"اے!

جونئیر ہو تو جونئیر بن کر رہو۔

پوہیا!

زیادہ اچھلنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ...".

ضامن نے بھی اب کوئی لحاظ نہیں رکھا تھا، آخر کو دوستوں کے سامنے وہ اسکی اچھی خاصی  
عزت افزائی کر چکی تھی۔

وہ بھی اسکی جو اس کام میں ماہر تھا۔ دوسروں کو تنگنی کا ناچ نچانا کوئی ضامن نواز سے  
سیکھے۔ اور چار فٹ کی تائشہ و سمیم خان اس پر ہی الٹے طنز کے نشتر چلا چکی تھی۔



"چوہیا کس کو بولا؟

اور ورنہ کیا؟

ہاں!..

کیا کرو گے؟"

بھنویں اچکاتے وہ بچ میں ہی اس کی بات اچک گئی۔

اسے تو بولنے کی بیماری کے ساتھ ساتھ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کا بھی شوق تھا۔

"ورنہ چوہیا!

تمہیں جنگل میں پھینک آؤں گا۔ وہاں کے شکاری کتے تمہاری ہڈیاں بھی نہیں چھوڑینگے۔"

اتنی سی دیر میں اس لڑکی نے ناک میں دم کر دیا تھا، لڑکی ذات تھی لیکن اس کا حلیہ اور تیز چلتی زبان اسے کہیں سے لڑکی نہیں لگنے دے رہی تھی۔

تبھی دانت پیستے وہ اس کی آنکھوں میں خوف ڈالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"ک۔۔ کتوں کے آگے؟"

وہ حیرانی اور ڈر کے مارے، آنکھیں بڑی کیے اس سے استفسار کم اور ہکلا زیادہ رہی تھی۔

اگر وہ شیر کے آگے ڈالنے کی بات کرتا پھر بھی قابل قبول تھا، پر کتوں سے تو اسکی پیدائشی جان جاتی تھی۔

"ہم۔۔۔ چلتے۔۔۔ ہیں۔"

چھوڑوں انہیں۔"

ضامن کو دوبارہ میدان میں آتا دیکھ، وہ تائشہ کو بازو سے کھینچتی لے جانے لگی، اور تینوں نے ان دونوں لڑکیوں کو ایک نظر دیکھ کر سر جھٹکا تھا کہ کیسے کیسے عجوبے اس یونی میں آرہے ہیں۔

\*\*\*\*\*

"تم مجھے کیوں لے آئی، ابھی انہیں بتاتی کہ کن ک۔۔۔ کتوں کے آگے ڈالیں گے مجھے۔"

وہ جب کچھ فاصلے پر ہوئے، تو اس سے بازو چھڑواتی گویا ہوئی۔

اب ڈر کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ پر کتوں کا نام لینے سے بھی وہ گر بڑا گئی۔

"اچھا چھوڑو نا۔"

ان لڑکوں کے نظر سے دور ہوتے ہی، عینا ہی سکھ کا سانس لینے لگی۔

"وہ تمہیں تنگ کیوں کر رہے تھے؟"  
تائشہ اب تفتیشی، تھانیدارنی بنی اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے پوچھنے لگی۔

"میں نیو ایڈیشن ہوں نا۔ شاید تبھی۔"  
اس کی نظروں سے وہ پہر سے گہرا رہی تھی۔  
منہ بگاڑتے وہ اسے بتانے لگی جس پر تائشہ نے اس کے گال پر زور دار چٹکی کاٹی۔

"How cute, you are!"  
اور وہ کراہ کے رہ گئی۔ اتنے میں ہی اس کا گال سرخ ہو چکا تھا۔

"میں تائشہ وسیم۔"

اور تم؟"

اسکی غصے بھری گھوریوں کی پرواہ کیے بغیر وہ ہاتھ آگے بڑھاتی اپنا تعارف کروانے لگی۔

"عینا رحیم۔"

اس نے کچھ توقف کے بعد نرمی سے مسکراتے اسکے ہاتھ کو تھام چکی تھی

"او..

مینا!"

منہ کو گول کیے، اسے ایک اور نام دے چکی تھی۔ اور وہ جو باقی سب کے اسے الٹے ناموں سے پکارنے پر خاموش آنسو بہاتی تھی۔ اس کے یوں کہنے پر ناصر غصے بھری نظروں سے اسے دیکھا بلکہ احتجاج بھی کیا۔

"no it's Aina".

عینا پر زور دیتی وہ ہر لفظ چبا کر کہہ رہی تھی۔  
جس پر تالشہ کا قہقہہ برجستہ تھا اور عینا کی چیخیں کیونکہ وہ اسکے گال کو پھر سے چٹکی کی مدد سے کھینچ چکی تھی۔

"فرینڈز".

اسے یہ معصوم سی گڑیا بہت پسند آئی تھی۔ تبھی دوستی کی خواہاں تھی۔



"پر ایک شرط پہ،  
نہیں بلکہ دو شرطوں پہ۔"  
عینا اپنے آگے پھیلی ہتھیلی پر نظر ڈال کر بولی تھی۔

"کونسی شرطیں۔"  
تائشہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی پوچھنے لگی۔

"تم مجھے مینا نہیں بولو گی اور میرے گال بھی نہیں کھینچو گی۔"  
اپنی طرف سے تو اس نے بہت سمجھداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ جس پر تائشہ نے کچھ سوچ کر  
منظور ہے، کا گرین سگنل دیا اور عینا بھی خوشی سے اسکا ہاتھ تھام چکی تھی۔

"میں تمہیں مینا بالکل نہیں کہونگی بلکہ اب میں تمہیں

donut

(ڈونٹ)

کہونگی، بیٹھا بیٹھا ڈونٹ اور میں تمہارے گالوں پر چٹکی نہیں کاٹوں گی بلکہ اپنے ڈونٹ کو چکی  
کاٹ کر کھاؤں گی۔"

تائشہ کے جواب نے تو عینا کی آنکھوں کو مزید کھول دیا۔ جس پر تائشہ نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ اور پوری فضا تائشہ کے قہقہوں اور عینا کی نہ نہ کی تفرار سے گونج اٹھی تھی۔

\*\*\*\*\*

"یار چھوڑ اسے، ہو گی کوئی ٹام بوائے ٹائپ چیز۔ کیوں اپنا ٹیمپرز لوز کر رہا ہے۔ ویسے اسے تجھے کھمبا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

شہریار عالم کب سے ضامن کو سمجھا رہا تھا بلکہ بھڑکا رہا تھا۔ جو تائشہ کی باتوں کو کافی سنجیدہ لے چکا تھا۔

"اس چوہیا کا تو میں وہ حشر کروں گا، یاد کرے گی۔" اور ضامن کا غصہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

تینوں دوست اس وقت کلاس بنک کیے دہوپ میں پارکنگ ایریا میں موجود تھے۔ جہاں ضامن اور شہریار گاڑی کی بونٹ سے ٹیک لگائے تائشہ کی بد تعمیزوں پر ڈھیروں لیکچر دے رہے تھے۔ وہیں ضعیف ظفر شاہ گاڑی کی بونٹ پر لیٹا ان کی چک چک سن رہا تھا۔

اور اب اس کی برداشت ختم ہونے کو آئی تھی۔

"چپ کر جاو دونوں، اس چوہیا نے کہا کیا ہے؟  
چھیڑا پہلے تو نے تھا، نہ ڈالتا شیرنی کے کچھال میں ہاتھ۔ اب بھگت!"  
کھینچ کر اس کی کنپٹی پہ ایک جھاپڑ جڑنا، ضیغم جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا۔

"شاہ!"

کیا ہو گیا تجھے؟

اپنے یار کی بے عزتی کر گئی ہے وہ!"

شہریار یاروں کا یار، اپنے بھائی جیسے دوست کی بے عزتی برداشت نہیں کر پایا تھا یا شاید بار بار یہ  
ذکر چھیڑ کر ضامن کو بے عزتی کا دگنا بھی نہیں پہونگنا احساس دلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔  
ابھی بھی اس نے تیل میں تیلی جھونکی تھی۔

"شیری ایک دوںگانا تجھے، عقل ٹھکانے آجائے گی۔ جان بوجھ کر اسے تنگ نہ کر۔"  
ضیغم اسکی ساری کارستانیاں اچھے سے سمجھتا تھا، تبھی اسے بھی گھر کا اور ضامن کو پھر سے  
لپیٹے میں لیا۔

"اے مجنوں کے وارث!

منہ سیدھا کر لے۔ نہیں تو مکا مار کے مزید ٹیڑھا کر دوں گا کہ سب سے منہ چھپاتا پھرے گا۔"

"ویسے اچھا ہو گیا جو وہ چوہیا اسکی عزت افزائی ہمارے سامنے کر گئی۔ اگر یونی میں سے کوئی اور

یہ دل فریب منظر دیکھ لیتا، تو یہ واقع سب سے منہ چھپاتا پھرتا

کیوں کھمبے؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

شہریار ہنستا ہوا ضامن کو پھر سے چھیرنے لگا جس پر ضامن نے مکا اسکی طرف کیا، جسے بچ میں ہی ضیغم نے گرفت میں لیا۔

شہریار قہقہہ لگا کر خود کے بچاؤ کے لیے دور ہوا۔

شہریار کی بتیسی کو بریک تب لگی جب غیر ارادی طور پر ہی پہلی نظر یونیورسٹی کے لان میں موجود اپسرا پر پڑی، وہ ہو بہو اس کے تخیل کی حور تھی۔

سفید کرتی پاجامہ پہنے، لال کریب کے دوپٹے کو پھیلا کر لیے، سبج سبج کر کھسے میں موجود پاؤں رکھتی کسی اور جہاں کی مخلوق تھی یقیناً کوئی پنجابی مٹیارن جو دل فریب حسن لیے پہلی ہی نظر

میں شہریار عالم عرف شیری کے دل کے تاروں کو اس زور سے چھیڑ گئی تھی کہ گھنٹی کیا، دل میں گھنٹیوں کے شور اٹھنے لگے۔  
وہ ساکت کھڑا رہ گیا اس خوبصورت تخلیق کو فرصت سے نہانے میں مصروف تھا جو آس پاس سے بے گانہ چلتی ہی چلی جا رہی تھی۔

"شیری!"

شیری --- "۔"

ضیغم اور ضامن شہریار کو اپنے ساتھ نہ پا کر مڑ کر دیکھنے لگے تو وہ انہیں چہرے پہ مسکان لیے سامنے کھڑا دکھا۔ جو بنا پلک جھپکائے سامنے دیکھ رہا تھا، جہاں ایسا بھی کچھ خاص نہیں تھا کہ دیدے پھاڑ کر دیکھا جائے، پر کوئی شہریار عالم سے پوچھتا کیا خاص تھا سامنے والی میں، اس کی تو سپنوں میں بستی رانی جیتی جاگتی اس کے سامنے تھی۔

ضامن کے، صبح کی دی گئی دعا میں کہے الفاظ، سچ کا روپ دھارے کھڑے تھے  
پر اس سے پہلے کے وہ اس نئے جذبے کے احساس کے تحت اس تک پہنچتا دوستوں کی پکار  
نے بدمزگی پھیلاتے اسے حسین منظر سے باہر نکالا۔ جس پر وہ کوفت سے منہ بناتے انہیں  
دیکھنے لگا۔

"میں تو مجنوں کا وارث ہو گیا، اب یہ جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے یہ کس کا وارث ہوا؟" ضامن کو تو اپنا غم کھائے جا رہا تھا، اور اسکے ایسا بولنے پر اب کی بار شہریار نے مکا ہوا میں لہرایا، ارادہ منہ توڑنے کا تھا پر قسمت اچھی رہی کہ ضیغم نے اس بار بھی پیچ میں ہی اس وار کو روک دیا۔

"یہ...."  
رانجھے کا وارث ہے۔"  
جواب ضیغم کی طرف سے تھا، جو ضامن کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گیا، اور شہریار وہ بس منہ بسور کے رہ گیا۔

شیری نے ان کے قہقہوں سے تنگ آکر دوبارہ رخ سامنے کیا، پر منظر اب حسین نہ رہا تھا کہ وہ خوابوں کی شہزادی غائب ہو چکی تھی۔

"او اولے!"

رانجھے کا منہ تو دیکھو کیسے لٹک گیا، ہیر جی سے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے نا۔"

یہ ضامن تھا جو اب اپنے پر ہوئے وار کے بدلے میں جوانی کاروائی کر رہا تھا۔

"تم لوگوں کی وجہ سے ملاقات ہوئی کہاں ہے؟"

وہ نہایت تپے ہوئے انداز میں اسے ڈھونڈنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا۔

"ہماری وجہ سے نہیں، تم اپنی وجہ سے نہیں مل پائے۔"

کس نے کہا تھا یوں ٹکر ٹکر دیکھتے رہو، دیدے پھاڑنے کی بجائے اگر پاؤں کو حرکت دیتے تو ملاقات کا شرف حاصل ہو ہی جاتا۔"

ضیغم نے دہموکا جڑتے ہوئے اسے حقیقت سے ہمکنار کروایا۔

"اچھا چل، کوئی نا۔"

رانجھے کی ہیر کو سب مل کر ڈھونڈتے ہیں۔

شکر ہے یونی چھوڑنے سے پہلے کسی کو تو کوئی مل گئی۔"

ضامن اسے آس دلاتا، خود کے آلمانوں پر پانی ڈالتے ہوئے بولا جس کی تردید شہریار نے یوں کی۔

"کسی ایک کو کہاں۔"

اپنے ضیغم کی بھی تو ایک ہے نا۔"  
اور پھر دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

"ضیغم، آئی مسڈ یو سوچ گچی گچی۔"  
اور پھر قہقہہ لگا کر لان میں بھاگنے لگے کیونکہ ضیغم غضب ناک تاثرات کے ساتھ ان کے پیچھے  
دوڑا تھا۔

\*\*\*\*\*

"اچھا ڈونٹ یہ بتاؤ تمہاری اور کوئی دوست نہیں ہے ساتھ کیا۔"  
وہ دونوں اتفاقاً ایک ہی کلاس کی اسٹوڈنٹس نکلی اور اب کلاس لینے کے بعد کینٹین سے جوس  
اور سینڈوچ لیے دوبارہ سے کلاس میں جانے لگی تھیں کہ راستے میں باتوں ہی باتوں میں تالشہ  
نے بات چھیڑی جس پر عینا نے ناک منہ چڑایا۔ اسے خود کو ڈونٹ کہا جانا بالکل پسند نہیں آیا  
تھا۔

"نہیں میری کوئی دوست نہیں ہے۔"



اداسی سے کہتی جوس کا گھونٹ حلق سے اتارا۔

"کیوں، کوئی دوست نہیں ہے؟"

تائشہ باقاعدہ کی۔ اور اسے دیکھ کر استفسار کرنے لگی جس پر وہ پھر سے گھبرائی۔

"مجھے پسند نہیں ہے دوستی کرنا۔"

شہادت کی انگلی سے چشمے کو آنکھوں پر جماتے وہ بولی تو آواز میں حسرت کی ملاوٹ اور انگور کھٹے ہیں کی داستان صاف چھلک رہی تھی۔

"اور کیوں پسند نہیں ہے؟"

وہ دونوں کوریڈور سے بلڈنگ کے اندر جا رہے تھے جب تائشہ نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔  
وہ اسکا جھوٹ پکڑ چکی تھی۔

"مجھ سے کوئی دوستی کرتا ہی نہیں۔"

تالشہ کے ڈھیٹ پن کو سمجھتے ہوئے وہ بھی اونچی آواز میں تنگ آ کر بولی کہ آس پاس سے گزرنے والوں نے مڑ کر اس لڑکی کو دیکھا جو پھر سے گھبراتی چشمے کو آنکھوں پر درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔

"کیونکہ تمہیں دوستی کرنا پسند نہیں۔"

اب دونوں سیڑھیوں کی جانب جانے لگیں کہ تالشہ نے جواباً عینا کی ہی بات اسے لٹائی۔

"نہیں۔"

کیونکہ سب کو لگتا ہے میں پیاری نہیں ہوں۔

میرے بال نوڈلز جیسے ہیں۔ یہ کتنے عجیب ہیں۔ گلاس لگا کر میں بیڑی لگتی ہوں۔

سب میرا مذاق اڑاتے ہیں، کوئی دوستی نہیں کرتا مجھ سے۔۔۔۔۔"

وہ منہ بسورتی اپنے اندر کی خامیاں بتانے لگی جس کی بنیاد پر اس کی ہم جماعت لڑکیاں اور لڑکے اسکا مذاق بناتے تھے یہاں تک کہ کزنز بھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ خاموش احتجاج کی بنا پر ان سے قطع تعلق کر لیتی تھی تو پھر دوستی کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

"او شٹ"۔۔

عینا کی بات پر وہ یک لخت کی تھی کہ سامنے آنے والی لڑکی سے بری طرح ٹکرائی، جو سفید کرتی اور پٹیالہ کے ساتھ سرخ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے ماڈلنگ کرتی آرہی تھی۔ اور اب اس کے سرخ دوپٹے کی کناری تائشہ کے بیگ کی زپ میں پھنس گئی۔

"ہائے او رہا!..."

کہاں میں نے سوچا تھا ناول کی ہیروئن کی طرح میرا دوپٹہ کسی ہینڈسم سے ہیرو کی گھڑی میں پھنسے گا، اور کہاں اس لڑکے نما لڑکی کے بیگ میں پھنس گیا۔ یہ نکل کیوں نہیں رہا؟"

وہ جھنجھلا کر دہائیاں دیتی اپنا دوپٹہ نکالنے کی تگ و دو میں لگی تھی۔  
پر اس کے تیز تیز چلتے ہاتھ کناری کے دھاگوں کو زپ میں مزید الجھا رہے تھے۔

"او مس ڈرامہ کوئٹن..."

یہ لڑکے نما لڑکی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

تائشہ کا تو کام تھا میدان جنگ میں کودنا اور سامنے بیٹھی لڑکی جو اپنے دوپٹے کو قید سے رہائی دلانے کی کوشش میں تھی، اس نے خود سے اسے یہ دعوت دی تھی۔

"دیکھو میں نے بالکل عالیہ بھٹ کے جیسا، یہ سوٹ سلوایا تھا۔ اگر اس کا دوپٹہ خراب ہو گیا تو دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔"

اسے شاید دوپٹے کے پہننے کا شدید غم تھا کہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی بھی اترنے لگی۔ اور اسکے نینوں میں تیرتی نمی کو دیکھ کر تائشہ نے جھٹکے سے اپنا بیگ کھینچا اور پھر کیا تھا، چررر کی آواز سے دوپٹے کی کناری چاک ہو گئی۔

"اور ایکٹر۔"

ایک اور لقب سے نوازتی وہ کندھے پر بیگ ڈالتی فرصت سے سینڈوچ کھانے لگی۔

وہیں اسے سانپ سونگ گیا۔

اپنے دوپٹے کو ہاتھ میں لیے وہ اس کی ادھڑی ہوئی کناری کو آنکھیں پھیلائے دیکھ رہی تھی۔ لبوں کو باہر نکالے روہانسی ہوئی۔

عینا جو کب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی۔ اسے رونے کی تیاری پکڑے دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھی، وہ جو خود سے کبھی کسی سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ آج تائشہ کی وجہ سے معذرت خواہ لہجے میں کسی اور کی غلطی کی معافی مانگنے کو بڑھی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

آپ پلیز روئیں مت۔ اس سے غلطی سے ہو گیا۔"

ابھی اس کی بات جاری ہی تھی کہ تائشہ نے مکمل سچائی سے کام لیا۔

"میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔"

ہر لفظ پر زور دیتے، جتلاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ جو عینا کی نرمی سے کہی بات پر اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔ اب خونخوار نظروں سے تائشہ کو گھور رہی تھی۔ جس کا تائشہ پر تو کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

"یہ مذاق کر رہی ہے، آپ پلیز مائیئنڈ نہ کریں۔"

معاملہ بگڑتے دیکھ کر عینا نے پھر سے بات سنبھالنی چاہی۔

"اٹس اوکے۔"

عینا کی معصومیت اور نرم سے لہجے پر اسے ڈھیروں پیار آیا کہ وہ تائشہ کی بد تعمیزی اور اپنے دوپٹے کا غم بھی بھول گئی۔ لیکن تائشہ کو گھورنا نہیں بھولی تھی۔

"ہنسہ۔"

چلو، کلاس میں چلتے ہیں۔"

اسکی گھوریوں پر ہنکار بھرتی عینا کو گھسیٹتی اپنے ساتھ لے گئی۔ عینا کھسیانی مسکراہٹ سجائے، اسے دیکھنے لگی جس پر وہ بھی زبردستی کا مسکراتے نیچے بڑھ گئی۔ پر اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے کو ہاتھ کی مٹھی میں چھپانا نہیں بھولی۔

"ہائے۔ میرا دوپٹہ۔"

دل سے سرد آہ نکلی تھی، پر اب تو وہ پھٹ چکا تھا۔

\*\*\*\*\*

"کیا ضرورت تھی۔ اس پیاری سی لڑکی کا پیارا سا دوپٹہ خراب کرنے کی؟"

اسے دوپٹہ اوڑھنا پسند نہیں تھا، کیونکہ وہ انہیں سنبھال نہیں پاتی تھی۔ پر اسے ڈرامے کی اداکاروں کی طرح تھان بھر کے دوپٹے لپیٹی ہوئی لڑکیاں بہت پسند آتی تھیں۔

"ہسنہ!"

پیاری لڑکی، اور ایکٹنگ کی دکان تھی۔

اور تم نے دیکھا نہیں، اس نے مجھے لڑکے نما لڑکی بولا۔ بجائے اس کے کہ تم میرا ساتھ دے کر اس کا منہ توڑتی، تم الٹا مجھ سے لڑنے لگ گئی ہو۔"

کلاس میں اکا دکا ہی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ اور وہ دونوں جب سے کلاس میں داخل ہوئی تھیں، اسی بات پر بحث جاری تھی کہ تالشہ نے اب جھنجھلا کر اسے صحیح سمت دکھانی چاہی۔

"میں تمہارے ساتھ مل کر کسی کا بھی منہ نہیں توڑوں گی۔"

معصومیت سے منہ پھلائے اس نے باور کروانا چاہا۔

تالشہ کی جھگڑالو طبیعت اس کے گرد خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ جس سے پہلے ہی وہ کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔ لڑائی جھگڑے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔

"وہ تو دیکھی جائے گی۔"

اس کی ناک پر اٹکے چشمے کو شہادت کی انگلی سے زور دیتی شرارتا بول کر، اسے مزید ڈرا گئی۔ جو اب لب بھینچ کر رجسٹر پر جھکی تھی۔

آہستہ آہستہ کلاس اسٹوڈنٹس سے بھرتی جا رہی تھی۔

"اچھا تم کیا کہہ رہی تھی کہ تم پیاری نہیں ہو۔"

بیگ کی جیب سے ببل گم نکالتی وہ اسی کے جھکے سر کو دیکھ رہی تھی پیاری نہیں ہو پر زور دیتی وہ اس کی ہر حرکت کو نوٹ کیے ہوئے تھی۔ اور وہیں عینا کے بھی ہاتھوں کی حرکت کی اور وہ اسے دیکھنے لگی۔ جواب میں صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"اور اسی وجہ سے تم سے کوئی دوستی کرنا پسند نہیں کرتا۔"  
وہ اس کے کسے الفاظ لٹا رہی تھی کہ جو اس نے سنا تھا، وہ صحیح تھا؟  
ایک بار پھر عینا نے صرف ہاں میں سر ہلانا ہی ضروری سمجھا۔

"اور یہ سب تم سے کس نے کہا ہے؟"

ببل گم چباتے وہ طنزیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی جس پر عینا نے ناک سکیرٹی یہ اعلانیہ تھا کہ تائشہ کا انداز اسے پسند نہیں آیا۔

"مجھے پتہ ہے۔"

گردن اکڑا کر کہا، جیسے بہت بڑی معلومات حاصل ہوں۔



"تمہیں غلط پتہ ہے۔"

تائشہ اس کی معلومات کو رد کرتی، اس کے سر پر چپت لگا گئی۔ جس پر ایک بار پھر عینا نے ناک سکیرٹی، اور چشمے کو ناک پر جمایا تھا۔

"تم بہت زیادہ والی پیاری ہو کہ میں تمہیں کھا جاؤں۔ یہ گول چہرہ اس پر گول آنکھیں اور گول آنکھوں پر گول ہی چشمے، کوئی ہے یہاں پر تم سے زیادہ پیارا۔"

عینا کی خوبصورتی الگ رنگ لیے ہوئے تھی جس پر معصومیت کی چھاپ اور اس کا غصہ میں منہ پھلانا، دیکھنے والے کے دل کو دوبارہ دہڑکنے کا موقع نہ دے۔

وہ لڑکی ہو کر اس کی اداوں پر جان دینے لگی تھی، جن اداوں سے عینا خود بھی انجان تھی کہ کسی کی راتوں کی نیند حرام کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں وہ....!

"پر میرے بال۔"

نچلے ہونٹ کو باہر نکالے، وہ آنکھوں میں نمی لیے، خود کی اور خامی بتلانے لگی، جس پر تائشہ نے باقاعدہ آنکھیں حیرت سے بڑی کیں۔

"کیا ہوا تمہارے بالوں کو۔"

اس کے چہرے پہ ہاتھ رکھ کر دیکھتی وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

"یہ دیکھو کتنے عجیب ہیں۔ میرے کرلی بال اور انکا رنگ کتنا عجیب ہے۔"

تمہیں پتہ ہے میری کزنز کے کالے بال، بڑے بڑے اور سٹریٹ ہیں۔ اور میرے بال دیکھو۔" اپنے بالوں سے بھی اسے مسئلہ تھا۔ جب کہ یہ منفرد بال تو ہر کسی کے ہوتے بھی نہیں۔ پر یہ اسے بتلائے کون؟ اور اگر کوئی بتانے کی جسارت کر بھی لے تو عینا رحیم نے کہاں یقین کر لینا تھا۔

"میری پیاری ڈونٹ!۔"

ایسے بالوں کو عجیب نہیں بلکہ یونیک کہتے ہیں۔"

تائشہ نے نرمی سے، اسکی ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھتے، کہا تھا۔

نظریں اسکے چہرے پر مرکوز تھیں جو بالکل بے داغ تھا، بلکہ ایسا لگتا تھا وہ موم سے بنی گڑیا ہو، چھوٹی سی ناک، کٹاودار گلابی ہونٹ، گول آنکھوں پر لمبی خم دار پلکیں، شفاف پیشانی پر بکرے کرلی بال۔

پھٹانی حسن تو تائشہ پر بھی چھاپ چھوڑ گیا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اس معیار پر خوبصورتی کو تولا ہی نہ تھا۔

"پر سب کو تو عجیب ہی لگتا ہے۔"  
عینا کو بھی دوسروں کی فکر تھی۔

"سب کو چھوڑو۔"

کیا تمہیں بھی عجیب لگتا ہے؟"  
تائشہ نے استفسار کیا۔

بال اس کے تھے تو معیار بھی اسے طے کرنا چاہیے تھا کہ وہ منفرد ہے یا عجیب۔

"ہاں۔"

منہ موڑے اقرار کیا۔

اور تائشہ نا سمجھی کا تاثر لیے اسے دیکھنے لگی۔

ابھی وہ اس سے کچھ کہتی، اس سے پہلے ہی عینا نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"دیکھو!"

وہ پیاری سی ہیروئن، ہماری کلاس کی ہی اسٹوڈنٹ ہے۔"

عینا سامنے سے آتی لڑکی کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلاتی، اسے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی۔ تالشہ نے بھی فی الوقت نا سمجھی کو جھٹکتے دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں وہی سیرٹھیوں پر ٹکرانے والی لڑکی، کھڑی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو دونوں نے ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ناک سکیرٹی۔

"اسے یہاں مت بلاؤ۔"

تالشہ نے دبی آواز میں احتجاج کیا تھا، جس کا عینا نے اثر نہ لیا۔ اتنی دیر میں وہ بھی انکے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

یہاں تک کہ عینا نے اسے اپنے ساتھ والی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جس پر وہ مسکراتی بیٹھ بھی گئی۔

عینا کے ہر انداز سے لگتا تھا کہ اسے یہ ہیروئن جیسی دکھتی لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ اس سے دوستی کی خواہاں بھی تھی۔ اور تالشہ اسکے ساتھ بیٹھنے پر مزید کھسک کر دور ہوئی اور رخ موڑ گئی۔

"آپکا نام کیا ہے؟"

عینا کے خود سے سوال کرنے پر تائشہ نے حیرت سے اپنی ڈونٹ کو دیکھا تھا۔

"ہیر۔"

ہیر نے جواب میں پیاری سی مسکان کے ساتھ اسے کہا۔ اور عینا تو خوشگوار حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہیر نام جیسے بنا بھی بالکل اس کے لیے ہی تھا۔

"آپکا نام 'ہیر' ہے؟"

حیرت کی زیادتی سے آنکھیں کھولے، وہ پوچھنے لگی جس پر ہیر نے ہنس کر ہاں میں گردن ہلائی۔

"ہیر!"

انٹرسٹنگ، بہت اچھا نام ہے۔"

گردن کو جھلاتی وہ تائشہ کو دیکھنے لگی جس نے پھر سے نخت سے سر جھٹکا اور وہ تائشہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر بدمزگی کا شکار ہوتے، ہیر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

ہیر کے سوال پر عینا ہلکا سا مسکرائی کہ چشمے کے پار آنکھیں بھی اس شفاف مسکراہٹ کا ساتھ دینے لگیں۔

"میرا نام عینا ہے اور یہ تائشہ ہے۔"

اپنے ساتھ ساتھ تائشہ کو بھی گھسیٹا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ ہیر کے ساتھ دوستی رکھنا چاہتی تھی پر تائشہ کے بغیر نہیں۔

تائشہ نے اتنے سے وقت میں اسے بہت تنگ کیا تھا۔ پر تائشہ کے ساتھ رہ کر اسے حفاظت اور اپنے پن کا احساس بھی ہوا تھا۔

"فرینڈز۔"

ہیر نے ہاتھ بڑھا کر دوستی کا سوال کیا، جسے خوشی سے عینا نے فوراً تھام لیا۔

"میری باری تو تمہیں بہت شرطیں یاد آرہی تھیں۔ اور اس کی باری۔۔۔۔۔۔"

عینا کو دبی آواز میں جھڑکتے، وہ سخت نظروں سے ہیر کو بھی گہور رہی تھی اور ہیر بھی تائشہ کو ہی گھورنے میں مصروف تھی۔

"پلیز".

عینا نے وہی ہتھیار استعمال کیا جس سے وہ خود بھی نا آشنا تھی۔ پر اس کا کام بن گیا کہ تائشہ کے تنے نقوش ڈھیلے پڑ گئے۔

ہونٹوں کو باہر نکالے وہ التجا کر رہی تھی، جبکہ آنکھوں میں موجود ہلکی سی نمی دیکھ کر تائشہ مجبوراً ہار مانتی ہیر سے مخاطب ہوئی۔

"اوکے آئی ایم سوری".

احسان کرنے کے انداز میں ہیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ عینا دونوں کو ہی امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

تائشہ کے مان جانے پر وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اور ہیر کو آس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ عینا کا اشارہ سمجھتے ہیر نے بھی سچے دل سے تائشہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"اُس اوکے، فرینڈز؟"

ہیر کے سوال پر دوبارہ سے تائشہ نے عینا کو دیکھا جو اسے ہاں کا اشارہ دے رہی تھی۔ تائشہ نے بھی بادل نا خواستہ اس کی تقلید کرتے ہاں میں گردن ہلا دی۔

ان دونوں کو دوست بننے دیکھ کر عینا خوشی سے دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھلکھلائی۔ اور دونوں اس کی خوشی میں خوش اپنی تازہ بنی دشمنی کو ختم کر چکی تھیں۔ تینوں آپس میں دیکھتیں مسکرا رہی تھیں کہ کلاس میں سناٹا ہو گیا۔

تینوں ایک بار پھر دروازے کی طرف متوجہ ہوئی جہاں ان کے ٹیچر کلاس میں داخل ہو رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

آج اس کالونیورسٹی میں پورا دن بہت خوشگوار گزرا تھا، جتنا وہ ڈری ہوئی تھی اب اتنی ہی خوش گھر داخل ہوئی تھی، پر تھکان کے باعث سونے چلی گئی۔

اور مریم بیگم اس کے چہرے پر تمانت اور سکون دیکھ کر دل سے اس کے یوں ہی مسکرانے کی دعا کرنے لگیں، پہلے تو جب بھی وہ باہر سے گھر آتی تھی تو منہ پر بارہ ہی بچے ہوتے تھے۔ لیکن آج اسے ہنستا مسکراتا دیکھ کر مریم بیگم کو بھی اس کے فیصلے پر خوشی ہوئی۔

"عینا کہاں ہے؟"



شام کی چائے پر عینا کو نہ پا کر رحیم صاحب نے اسفستار کیا۔

"میں یہاں ہوں بابا۔"

وہ پیچھے سے آکر لاڈ بھرے انداز سے انکے گلے میں بازو ڈالے، کھڑی ہو گئی۔

"میرا بچہ!"

پچکارتے، اس کے ماتھے پر بوسہ لیا اور اسے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا۔ اور مریم بیگم آنکلوں میں محبت لیے دونوں باپ بیٹی کے پیار کو دیکھ رہی تھیں۔

"کیسا رہا آج کا دن؟"

مریم بیگم سے انہیں خبر مل چکی تھی۔ پر وہ اس کی زبانی سننا چاہتے تھے۔

"بابا بہت بہت اچھا، آپ کو پتہ ہے۔ میری دو فرینڈز بھی بن گئیں۔"

خوشی سے چمکتی وہ انہیں آج ہوئے سارے قصے سنانے لگی۔ اور اپنی دونوں دوستوں کی ڈھیروں تعریف کرنے لگی۔ جس پر اس کے ماما بابا دونوں اسکی باتوں کو غور سے سنتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لینے لگے۔

\*\*\*\*\*

وہ کل کا پورا دن یونیورسٹی کی خاک چھانتا رہا تھا، لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ضامن نے اس بات پر الگ اس کا ریکارڈ لگایا، پر اسے پرواہ کہاں تھی۔ اور ضیغم اس رانجھی کی پہلی نظر کی محبت کو کوفت سے دیکھتا، اور پھر نظر انداز کرتا اپنے گھر کو چلا گیا۔

کلاس شروع ہوئے دوسرا دن تھا۔ اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ وہ فرسٹ سمسٹر میں ہوگی، پر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کس ڈیپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ضامن بھی اس کی مدد کم اور اسے تنگ زیادہ کرنے کے چکر میں یونیورسٹی کے لان میں کھڑا ہر آنے جانے والی لڑکی کو اسکی ہیر سے زیادہ خوبصورت بتا رہا تھا پر شریار تو پہلی نظر میں ہی اسی حسینہ پر دل ہار بیٹھا تھا۔

"تم لوگوں نے کلاس نہیں لینی۔"  
 ضیغم ظفر شاہ اچانک سے انکے پیچ آن وارد ہوا تھا۔

"او سائیں صاحب!"

آج تو بچلیاں گرا رہے ہو۔"

ضامن نے اسکے کلف لگے سفید شلوار سوٹ پر چوٹ کی، جس پر شہریار تو خوب ہنسا پر ضیغم نے فقط گھورنے پہ ہی اکتفا کیا۔

"سائیں صاحب!

آپ کہیں موصوفہ کی نظروں کے ذریعے دل کو تڑپانے کی جستجو تو نہیں کر رہے۔" شہریار نے بھی حیدر آبادی لہجہ اپنائے اسے تنگ کرنے کی نیت سے کارخیر میں حصہ ڈالا تھا۔

ضیغم نے بھی اس کے اشاروں کو بانٹوپی سمجھ آنکھیں گھمائیں۔ پر حساب بے باک کرنا نہ بھولا۔

"رانجھے صاحب!

اگر دیدار ہو گیا ہو تو کلاس میں بھی اپنے مکھڑے شریف کی رخ نمائی کر دیں۔" وہ شہریار کی دیوداس جیسی حالت سے دو دن میں ہی چڑچکا تھا۔ اس محبت نے اسکے اچھے خاصے دوست کو پاگل کر کے رکھ دیا تھا تبھی تپے لہجے میں کہتا، وہ تو آگے بڑھ گیا پر شہریار جب تک اسے دیکھ نہ لیتا کیسے کلاس میں جاسکتا تھا اور ضامن کہاں شہریار کو سکون سے اس کی ہیر کا دیدار کرنے دے سکتا تھا۔ تو وہ بھی اسکے ساتھ ہی کھڑا رہا۔

\*\*\*\*\*

"اندھی ہو کیا دیکھ کر نہیں چل سکتی؟"

وہ تینوں، کسی بات پر ہنستی کلاس سے باہر نکل رہی تھیں کہ عینا کی ٹکریونی کی مشہور، خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بدتمیز لڑکی سے ہوئی، یعنی کہ منہا وارث بخش سے۔۔۔ پھر کیا تھا، عینا تو آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے منہا کو دیکھ رہی تھی جو اسے ناجانے کیا کیا کہہ رہی تھی، پر اس سے پہلے کہ تائشہ آگے بڑھ کر عینا کا دفع کرتی۔ ان کے ہر گرد ہجوم کھڑا دیکھ کر ضیغم جو کلاس لے کر باہر کی طرف جا رہا تھا رک گیا اور ہجوم کی طرف بڑھا جہاں اسے منہا کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں۔"

انلی رعب دار لہجہ اپنائے وہ سٹوڈنٹس کو دہکیتا منہا تک پہنچا۔

اور بس منہا کے تو طور طریقے ہی بدل گئے وہ جو پہلے عینا کو اندھی ہونے کا طعنہ دے رہی تھی۔ اب لفظوں کو بنا بنا کر بہت نفاست کے ساتھ اپنی بات ضیغم کو جھوٹ سچ ملا کر بیان کر رہی تھی۔ جب کہ اسکا انداز خالصتاً بناوٹی تھا۔

"دیکھو ضیغم!"

پہلے تو یہ مجھ سے آکر ٹکرائی اور بجائے سوری کہنے کے مجھے ہی اندہی بول رہی ہے۔  
دیکھو کیسے آنکھیں دکھا رہی ہے۔"

منہا کے جھوٹ پر عینا آنکھوں میں آنسو لیے، حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
اور ضیغم بھی اب عینا کو دیکھنے لگا جو نچلا ہونٹ دانتوں میں سختی سے دبائے، نینوں میں موجود  
پانی کو باہر چھلکنے سے روک رہی تھی۔

"آپ جھوٹ مت بولیں، ڈونٹ۔"

میرا مطلب ہے، عینا نے نہیں، آپ نے اسے اندہی بولا ہے۔"

عینا کی حالت کے پیش نظر تائشہ اب باقاعدہ منہا کے سامنے آئی جس پر منہا نے گھور کر اپنے  
سے چھوٹی لڑکی کو دیکھا جو اس سے قد اور عمر دونوں میں ہی چھوٹی تھی۔ کچھ منہا کی ہیلز کا بھی  
اثر تھا کہ وہ کافی قدآور لگ رہی تھی۔

جب کہ تائشہ کی بات پر عینا، ضیغم کو دیکھتے ہوئے زور زور سے سر ہلانے لگی کہ جو تائشہ کہہ  
رہی ہے وہی سچ ہے۔

اور بہتیروں کو بیک وقت اس خوبصورتی پر رشک آیا، معصومیت سے بھرپور خوبصورتی پر۔۔  
 وہیں منہا کے دل میں کوٹے جلے تھے کہ اس کی اس معصوم ادا سے ضیغم ظفر شاہ گھائل نہ  
 ہو جائے۔ جس کی تمنا پچھلے تین سال سے وہ کر رہی تھی، ضیغم کے سامنے اس نے خود کو کتنا  
 ہی اچھا کیوں نہ ثابت کیا ہو وہ اسکے دل کا راستہ نہیں پہچان پائی تھی۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی  
 کہ ان سخت دل و دیروں کو ایسی ہی معصوم صورتیں بھاتی ہیں ناکہ شہر کی تیز طرار لڑکیاں اور  
 یہاں اسے عینا کھٹکنے لگی، ضیغم کا ٹکٹکی باندھے اس کی آنکھوں میں دیکھنا، منہا کو کانٹوں پر کھڑا  
 کر گیا۔

"ضیغم!"

منہا نے کندھے سے ہلا کر اسکی محویت توڑنے کی کوشش کی جس پر وہ چونک کر اسے دیکھنے  
 لگا۔ اور پھر خود کو سنبھالتا تائشہ کی طرف مڑا۔

"آپ لوگ جائیں۔ اور آپ سب بھی، یہاں کوئی تماشہ نہیں لگا ہوا۔"

تائشہ سے کہہ کر وہ ارد گرد موجود ہجوم کو کہنے لگا، جبکہ سچ تو یہ تھا کہ اگر وہ نہ آتا تو انہیں اچھا  
 خاصا تماشا دیکھنے کو ملنا تھا۔

"And you minha! plz behave like seniors."

کھر دے انداز میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا اور منہ انگاروں پر لوٹتی اسے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگی۔

"ہائے بے بی! کیا کہہ رہا تھا تمہارا ضیغم؟"

منہ کی دو چمچیاں، مطلب کے سہیلیاں اس کے ارد گرد آ کر رازداری سے ضیغم کے متعلق پوچھا وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقع سے ناواقف تھیں، تبھی انہیں تو یہی لگا کہ منہ اور ضیغم آپس میں کوئی بات کر رہے ہونگے۔ وہ تو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی تھیں پر تب تک ضیغم جا چکا تھا۔

ردا اور عالیہ کے سوال پر وہ ان دونوں کو گھورتی پیر پٹخ کر چلتی بنی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں کہ آخر ایسا بھی کیا کہہ دیا؟

\*\*\*\*\*

"شیری!"

وہ دیکھ سامنے۔"

سامنے سے آتی فیروزی سوٹ میں گلابی دوپٹہ پھیلا کر لیے، ہیر عینا کو لپٹائے چلتی آرہی تھی۔ اور شیریں وہ پھر سے اسے نہارنے میں مصروف ہو گیا۔ آج بھی شاید وہ موقع گنوا بیٹھتا اگر ضامن اسے ٹھوکا نہ مارتا۔

"چل نا، ہمیں سے تارنے کا ارادہ ہے کیا؟"

وہ دونوں ہیر کے پاس پہنچ چکے تھے۔

جہاں شہریار چہرے پر مسکراہٹ لیے انکے سامنے کھڑا ہوا وہیں ضامن کا تائشہ کو دیکھ کر منہ بن گیا، جیسے کڑوا بادام منہ میں آگیا ہو۔

"تمہارے منہ میں زبان نہیں تھی کیا، بولی کیوں نہیں اس وقت؟"

تائشہ وقفے وقفے سے عینا پر برس رہی تھی جو ہیر کے ساتھ لگی مسلسل تائشہ کو گھورے جارہی تھی۔

"بس کرو تشو، کیوں تنگ کر رہی ہو اسے، پہلے ہی ڈری ہوئی ہے۔"

عینا کی پیٹھ سہلاتے وہ تائشہ کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی پر تائشہ وہ کہاں چپ رہنے والی تھی، ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ وہی کل جن سے منہ ماری ہوئی تھی، آن ٹپکے۔



"ہائے، میں شہریار ہوں۔"

وہ گویا ہوا۔

"جی؟"

ہیر مخاطب ہوئی۔ جب کہ عینا اور تائشہ نے تو نو لفٹ کا بورڈ چہرے پر سجایا تھا۔

"وہ۔"

میں۔۔۔ دراصل۔۔۔"

تھوک نگلتا وہ ہکلا یا۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیسے؟

دل دھک دھک کرتا اسکی دھڑکنیں تیز کر رہا تھا۔ تبھی ضامن نے ہمیشہ کی طرح ٹانگ اڑائی۔

"وہ دراصل یہ میرا دوست ہے۔ کیا ہے نا کہ اسے قدرتی حسن اپنی طرف بہت کھینچتا ہے۔

اور ماشاء اللہ آپ تو حسن کا شاہکار ہیں۔ بس تبھی یہ آپ کی تعریف کرنے کے لیے آیا ہے۔

کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟

اور تو اور یہ تو مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ کی ڈریسنگ واللہ کیا مائزہ اور کیا مایا سب کو پیچھے چھوڑ گئی ہیں آپ۔

شیری، بولنے دے نا۔

یہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آپ کسی بھی ہیروئن سے کم نہیں ہیں، بالکل کسی اپسرا جیسی لگتی ہیں۔

ٹھیک کہانا میں نے؟

بول بھی۔"

وقفے وقفے سے شہریار نے ضامن کی چلتی زبان کو بند کرنے کی کوشش کی۔ آخر کو وہ ایسی تھرد کلاس باتیں کہہ کر اسے، اس کی نظر میں مشکوک کر رہا تھا۔  
لیکن ضامن نہ رکا، وہ جو صبح سے شہریار کے ساتھ جس چکر میں خوار ہو رہا تھا، آخر اسے بھی تو پورا کرنا تھا۔

لیکن ضامن نواز یہ نہیں جانتا تھا کہ اسکا پالا کس چیز سے پڑا تھا۔

"سچی!...."

ہائے اولے ربا!"

نوشی سے چیخ مارتی ان ساری تعریفوں کا چٹھارا لیا۔ جس پر ضامن کی تو آنکھیں پھٹی ہی تھیں، شہریار تو مانوں پلک جھپکنا بہول گیا۔

"ویسے آپ صحیح ہی کہہ رہے ہیں، مجھے نا ہیروئن بننے کا بڑا ہی شوق ہے۔ اور یہ ماڑہ اور مایا ان سے تو میں اچھی ہی دکھتی ہوں۔

اور ایسا ہی سوٹ ڈرامے والی نے پہنا ہوا تھا، بالکل سیم لٹو سیم بنوایا ہے۔" ہیر تو بولتی چلی گئی، عینا اور تائشہ نے خاص غور نہ کیا، آخر کو کل سے اس کے خوابوں اور خواہشوں کی فہرست سنتی آرہی تھیں۔ پر ضامن اور شہریار کی بے یقینی حد سے سوا تھی۔

شہریار تو سکتے میں آگیا، ہیر کے کہے الفاظ کانوں میں بج رہے تھے اور شہریار کا دل لمحے بھر کو رکا تھا اور پھر سست روی سے دھڑکنے لگا۔

"ہیر جی! آپ تو واقع ہیروئن بننے کے قابل ہیں۔"

ہوش کی دنیا میں لوٹتے ہی، ضامن نے رانجھے کی ہیر کو مخاطب کم اور رانجھے کو طعنہ زیادہ دیا پر رانجھا تو ہونق بنا اپنی ہیر کو ہی دیکھی جا رہا تھا۔

"ہائے میں مرجاواں..."

آپ کو میرا نام بھی پتہ ہے؟

ہے نا ہیروئٹوں والا نام، ہائے مجھے اپنا ہیرو مل جائے تو لائف سیٹ ہو جائے۔"

وہ مزید خوش ہوتی، بولتی چلی گئی یہ خیال کیے بنا کہ کیا بول رہی ہے پر جب احساس ہوا تو جھینپ مٹانے کو کھسیانی ہنسی ہنسنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

"کیا \*ہیر\* آپ کا نام ہے؟

ارے واہ پھر تو آپکے لیے رانجھا ہی ٹھیک رہے گا۔"

نام سنتے ہی وہ پل بھر کو اس اتفاق پر حیران ہوا تھا۔

ہیر سے تصدیق چاہتے، آخری بات شہیار کے کندھے پر بازو پھیلاتے کہی تھی۔ جس پر شہیار، ہیر کی کہی گئی باتوں کو ذہن سے جھٹکتا ضامن کو دیکھنے لگا، جو ہنسی ضبط کرنے کے چکروں میں سرخ ہو رہا تھا، اور شہیار کے دیکھنے پر آنکھ دبائی جس پر شہیار کلس کر رہ گیا۔

اور ہیر وہ تو اپنے رانجھے کے ذکر پر دوپٹے کی کناری کو انگلی پہ لپیٹتی مشرقی حسن کا شاہکار لگ رہی تھی۔ شہیار جو ہیر کی باتیں سن کر دل برداشتہ ہوا تھا، اس کا یہ گلنار روپ دیکھ کر ایک بار پھر اسی راہ کا مسافر ہو گیا جس سے وہ کچھ لمحے پہلے لوٹ رہا تھا۔

تالشہ افسوس سے ہیر کا یہ شرمانا دیکھ رہی تھی کہ ابھی تو رانجھے کا ذکر ہوا ہے، اور اسکا یہ حال ہے، جب کہ عینا تو مسکرا کر اسکو دیکھ رہی تھی۔

"تو ہیر جی!

اگر آپ برا نہ منائیں، تو ایک مشورہ ہے۔"

ضامن کی بات پر ہیر نے نا سمجھی سے سر ہلا دیا۔

جب کہ تالشہ بازو لپیٹے چہرے پر بیزاری سجائے ضامن اور شہیار کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ میرا دوست کیسا رہے گا، ہیرو۔"

دیکھیں بالکل ہیرو جیسا قد کاٹھ، ویسا ہی گورا چٹا رنگ۔ آپ کو منظور ہے یہ ہیرو؟

ضامن کے کہنے کی دیر تھی کہ شیریں کو اپنے دوست پر ڈھیروں پیار آیا۔

اور ضامن کی بات پر چھاتی تانے اکڑ کر کھڑا ہو گیا، اپنی ہر تعریف پر گویا ساتویں آسمان پر پہنچنے لگا، پر ہیر کے لفظوں نے ساتویں آسمان سے منہ کے بل زمین پہ گرایا۔

"ہیں... یہ ہیرو؟

کہاں سے لگتے ہیں یہ آپ کو ہیرو؟

نہ داڑھی ہے نہ مونچھ نہ ہی کوئی ڈولے شولے، اور نہ ہی ہیرو والی چال ڈھال ہے۔

ان کی تو نیلی آنکھیں بھی نہیں ہیں، یہ نہیں بن سکتے ہیرو۔

ارے، انکے تو ہاتھ میں گھڑی بھی نہیں ہے۔

ہیرو تو وہ ہوگا جو کاٹن کا کرکڑاتا سوٹ پہنے، جس کی سلیقے سے داڑھی، مونچھ اور بال بنے ہوں۔ ہاتھ میں گھڑی ہو۔

اور پھر میرا دوپٹہ اڑ کر اسکی گھڑی میں اٹکے گا، اور پھر پورا فلمی سین ہوگا!"

ضامن کی بات سن کر ہیر کو تو جھٹکا لگا اور پھر کیا تھا، وہ شہریار میں خامیاں نکالنے کے ساتھ ہی حسرت سے تخیل میں اپنے ہیروں کی چھوی کو لفظوں کا سہارا دینے لگی۔ اور شہریار کو پھر سے ہونق زدہ کر کے یہ جا وہ جا...!

ضامن جو کب سے سنجیگی کا تاثر دینے کی کوشش میں ہلکان تھا، ان کے جانے پر اپنے قہقہے کو مزید روک نہ کر سکا۔

ضامن کے قہقہوں میں ضیغم کے قہقہے بھی شامل تھے۔ وہ بھی ہیرو کی داستان سن چکا تھا۔

شہریار پر تو جیسے منوں بوجھ آن پڑا تھا۔ کیسے لمحوں میں جزبات بدل رہے تھے۔ مغلوب احساسات کے زیر اثر وہ محض انہیں گھور رہا تھا۔

جی بھر کر ہنس لینے کے بعد دونوں اسکی طرف متوجہ ہوئے، جو دونوں کو آنکھوں ہی آنکھوں سے نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا، جیسے کہ ساری غلطی انہیں کی ہو۔ شہریار کے سخت تیور دیکھتے دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور پھر یک زبان بولے۔

"ہائے شیریں!"

تو کیسا رانجھا ہے، جس کی نہ داڑھی ہے نہ مونچھ؟"  
 اتنا کہتے ہی فلک شکاف قہقہے پھر سے گونجے تھے۔ اور وہ دونوں اس سے دور بہاگے تھے کیونکہ وہ بھی اپنی تازہ تازہ عزت افزائی کا بدلہ انہیں سے ہی لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

\*\*\*\*\*

"ویری گڈ ہیئر!"

ان کے ساتھ ایسے ہی کرنا چاہئے تھا۔  
 ان کی ہمت کیسے ہوئی تم پر لائن مارنے کی۔"

تائشہ کو ہیر کا جواب سن کر دلی اطمینان پہنچا تھا۔ اور اب پہلے دن والی تلخی بھی کافی حد تک کم ہو گئی تھی کہ وہ ہیر سے بھی عینا جیسا ہی رویہ رکھنے لگی تھی اور آج ہیر کے جواب پر تو اسے خوشی ہوئی تھی

"ہاں نا۔ پہلے اپنے آپ کو دیکھیں تو سہی۔ ایسے ہی اٹھ کر آ جاتے ہیں۔"

بالوں کو جھٹکتی وہ بھی تائشہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی جبکہ عینا کو شاید یہ سب پسند نہیں آیا تھا تبھی بولی۔

"پر ہیر تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"یوں؟"

کیا نہیں کہنا چاہیے تھا؟"

ہیر کے بجائے تائشہ نے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

جس پر ہمیشہ کی طرح وہ گھبرا کر چشمہ درست کرنے لگی۔ اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر آج شاید پہلی دفعہ وہ خود کی رائے کسی کے سامنے رکھنے لگی تھی، اور یقیناً یہ ایک مثبت قدم تھا۔



"یہی ان کی شکل اور لکس پر کمیٹ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ انہیں فیل ہوگا۔ ایسے کسی کو کہہ کر ہرٹ نہیں کرتے۔"

اس کی نظروں کے سامنے سے شہریار کا وہ لٹکا ہوا منہ ہی نہیں جا رہا تھا کہ کیسے ہیر کے جواب پر وہ اتنا سامنے لے کر رہ گیا۔

اور کچھ خود پر بیٹی کی وجہ سے بھی وہ اس کا دکھ زیادہ اچھے سے سمجھ پا رہی تھی۔

"میں نے کوئی لکس پر بات نہیں کی۔ میں نے صرف اپنے آئیڈیل کے بارے میں بتایا ہے۔ یہ ہر لڑکی کا حق ہوتا ہے، اور ویسے بھی انہوں نے سیدھی لائن آکر ماری چاہی اور میں نے وہی لائن ٹیڑھی کر دی۔"

ہیر نے بھی اپنے تمہیں صحیح کیا تھا۔

کوئی بھی آکر چند بول تعریف کے کہہ کر اسکے ساتھ کا خواہشمند ہو تو وہ اس کی طرف پیش قدمی تو نہیں کر سکتی اور انکار کا کچھ تو جواز بنتا ہے۔

عینا کو پھر بھی یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ مزید کچھ بول نہیں پائی، شاید لفظوں کی کمی تھی یا حوصلے کی پر وہ یہ کہہ نہیں پائی کہ انکار کے لیے کوئی اور جواز بھی پیش کیا جاسکتا تھا، بجائے ذہنیات پر اترنے کے، پر وہی اذلی ڈرپوکی اور بزدلی آڈے آئی، جو اب تک قائم تھی۔

اور ہیر، اس نے تو بچپن سے ایک شہزادے، اپنے رانجھے کے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ گھر بھر میں اس کے اس خواب کا تمسخر اڑایا جاتا تھا پر اسے یقین تھا کہ کوئی دیوانہ اس کی چاہ میں بھی نکل آئے گا۔ یہ ساری خرافات ڈراموں اور ناولوں کی ہی مرہون منت تھی۔  
 پر کبھی کبھی ہماری دعاؤں اور ریاضتوں کا اثر ضائع نہیں جاتا ویسے ہی ہیر کے خوابوں کو بھی تعبیر نصیب ہونے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

\*\*\*\*\*

"ارے ارے پوزے!"

کہاں جارہے ہو؟

داؤد بہائی کو سلام ٹھو کو...

شاباش!۔ شاباش!"

آج جونیئرز کا دوسرا دن تھا، سنئیر کے ہر گروپ سے انکی اچھی خاصی زلالت ہو چکی تھی جب کہ سینیئرز کے لیے تو یہ دن عید کے تھے۔

وہیں داؤد اکرم کی سربراہی میں گروپ اس تہوار کو فرصت سے منا رہا تھا۔ اپنے پیسے پر غرور کے ساتھ ساتھ، طاقت کے نشے کا الگ سرور تھا۔

گویا جونئیرز تو جونیرز اپنے کلاس میٹ تک کے ناک میں دم کیا ہوا تھا۔  
 پر داؤد بھائی کے نام سے مشہور ڈرپوک ڈان کی دم پر پاؤں صرف ضیغم ظفر شاہ رکھ سکتا تھا۔ داؤد اور ضیغم کی شروع دن سے نہیں بنی، داؤد جو وقفے وقفے سے ضیغم کو ٹریپ کرنے کی کوشش کرتا تھا پر ہمیشہ منہ کی ہی کھانی پڑی۔ کیونکہ داؤد صرف نام اور دکھاوے کی ہیروگری جانتا تھا۔ جب بھی حقیقت میں ایسا کوئی آنا سامنا ان کے درمیان ہوا تھا، تو اسے دم دبا کر بھاگنا پڑتا تھا۔ پر پھر بھی خصلت سے مجبور وہ ضیغم کی راہ میں اٹکنا چھوڑتا نہیں تھا۔

ضیغم اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر ہیڈ آفس کی بلڈنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں رونی (داؤد کا چیلہ) کی آواز آئی، ریگنگ تو وہ بھی کرتے تھے، پر ایک حد تک، داؤد کا گینگ ہر حد پار کر جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے کئی وارننگز بھی مل چکی تھیں پر وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس، انہیں کون پوچھ سکتا تھا۔

رونی کی آواز پر وہ بیچ پر بیٹھے داؤد اور اس کے اطراف کھڑے اس کے چمچوں کو ناگوار نظروں سے دیکھنے لگا، جو سامنے موجود دو لڑکوں سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کروانے لگے۔

"ارے شاہ سائیں آئے ہیں..

آئیے آئیے سائیں جی!-

کیا منگواؤں آپ کے لیے شاہ جی؟"

داود کی نظر جب سامنے کھڑے ضیغم پر پڑی تو اپنی جگہ سے اٹھ کر خالصتا تمسخرانہ انداز میں اسکی طرف بڑھتے، ہاتھ کو ماتھے پہ لے جا کر سلامی پیش کی جسے کوفت سے ضیغم نے دیکھا وہ ایسے ہی مزاق اڑانے والے انداز میں اسے زچ کرتا تھا۔

"میرے منہ کم ہی لگو، تو اچھا ہوگا۔ شاید پچھلے مہینے والی عزت بھول گئے ہو۔"

ضیغم اتنا کہہ کر آگے بڑھنے لگا کہ داود کے ایک ساتھی نے اس کا راستہ روکا۔ اور وہیں داود کا بے ہنگم قہقہہ ابھرا۔

"ارے کہاں شاہ سائیں!-

وہ عزت بھولا ہی تو نہیں ہوں۔ تھی آج سوچا، ذرا آپ کی بھی عزت کر ہی دوں۔ کیا خیال ہے ساتھیوں؟"

ہنستے ہوئے اس نے، اپنے چمچوں سے تائید چاہی۔ جس پر وہ بھی بھوندے انداز میں ہنستے ہاں میں سر ہلانے لگے۔

"داود بھائی! موقع بھی ہے اور دستور بھی۔ کیوں نا دو دو ہاتھ کیے جائیں۔"

رونی ایک ہاتھ کے ٹکے کو دوسرے پر مسلتے بولا تھا۔ راستہ بالکل سنسان تھا اور ضیغم صرف ایک تھا جبکہ داود کے ساتھ تقریباً آٹھ نو لوگ تھے۔

ان کے مطابق آج وہ پچھلی مار کا بدلہ باآسانی لے سکتا تھا۔ آج تو اسکے دوست بھی اسکے ساتھ نہیں تھے جبکہ وہ بھول گیا تھا کہ ضیغم ظفر شاہ دس دس کو اکیلے نبھانے کی صلاحیت رکھتا تھا، کسرتی وجود اس کے باڈی بلڈز ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

"منہ کی کھاو گے داؤد۔"

سختی سے جبرے بھیجے آنکھوں میں تسخیر لیے وہ داؤد سے مخاطب ہوا۔ داؤد اپنے ہی زعم میں اسکی بات ہوا میں اڑا گیا۔ پر جب اسکے ایک چیلے نے آگے بڑھ کر ضیغم کا گریبان پکڑنا چاہا تو لگے ہی پل وہ چیلہ زمین بوس ہوا پڑا تھا۔ یکے بعد دیگرے اسکے ساتھی منہ کی کھا رہے تھے، کسی کا منہ سوج چکا تھا تو کوئی ڈر کے مارے بھاگ نکلا تھا۔

اب صرف ضیغم اور داود ہی موجود تھے۔ داود نے تھوک نگلا وہ جانتا تھا، ضیغم سے الجھنا اب خطرے سے خالی نہیں اور ویسے بھی اسے اپنا چہرہ بڑا عزیز تھا۔ لیکن ضیغم کے تیور دیکھ کر لگ رہا تھا وہ اسے کوئی رعایت نہیں دے گا تبھی وہ بچنے کی راہ تلاشنے لگا۔

ابھی اس نے بھاگنے کے لیے قدم پیچھے رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے دو ہاتھ اس کے کالر کو سختی سے دبوچ گئے۔

وہیں ضیغم اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا، مسکرا رہا تھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو، کہا تھا نا منہ نہ لگو۔

"داود بھائی!"

یہ کیا ہم سے تو ملے ہی نہیں، اور جا بھی رہے ہو۔"

ضامن اور شہریار دونوں نے مل کر داود کو گھیرا ہوا تھا۔ اور وہ ان تینوں کے چنگل میں بری طرح پھنسا تھا۔ شہریار کے داود بھائی کہنے پر ضیغم کو ہنسی آئی جسے روکنے کی اس نے کوشش نہیں کی۔

"شیری یار!"

بھائی کی کوئی سیوا کر۔ کیا ایسے ہی ٹائم پاس کر رہا ہے۔"

دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ڈرامے تھے۔ شیری اور ضامن کے بیچ داود کا کیا حال ہونے والا تھا، یہ سوچ کر ہی ضیغم کی بتیسی اندر نہیں جا رہی تھی۔

"تم دونوں اپنے بھائی کی سیوا کرو، میں ذرا ریست کر لوں۔"

ضیغم اتنا کہہ کر پھیل کر داود کی جگہ پر بیٹھ گیا، گویا اعلان تھا کہ شو شروع کیا جائے اور خود خراشوں کا جائزہ لینے لگا جو چھینا جھپٹی کے دوران اسے آئی تھیں، وہ کوئی سپر ہیرو تو تھا نہیں کہ بغیر خروش آئے آٹھ نو کو بھاگنے پر مجبور کر دے پر ہیرو سے کم بھی نہیں تھا...!

اور ضیغم کی طرف سے ملتے گرین سگنل پر دونوں اپنے طریقے سے داود کی وہ درگت بنا رہے تھے کہ داود معافیاں مانگنے پر مجبور ہو گیا، اور ضیغم تو انکے انداز پر ہنس کر دھرا ہو گیا۔

"ہائے۔۔۔"

میں تو تھک گیا۔ جاو۔ داود بھائی!  
آج کے لیے اتنا کافی ہے۔"

آخر کار تھک کر دونوں نے آزادی کا پروانہ داود کو لکھ ہی دیا اور بس اس پروانے کے ملنے پر وہ گدھے کے سر پر سے سینگ کی مانند ایسا غائب ہوا کہ ایک بار پھر تینوں کے قہقہے بلند ہوئے۔

"آج تیری ٹریننگ کام کر گئی۔"

ضامن نے ضیغم کو مخاطب کیا، جس پر ہاں میں گردن ہلاتا شیریں بھی بازو پھیلا کر دونوں کو گلے لگنے کا عندیہ دے رہا تھا۔ اور پھر تینوں اس جیت کی خوشی منانے لگے۔

ضیغم، شہریار اور ضامن تینوں اے لیولز میں ایک دوسرے سے ملے اور پھر اتنی گہری دوستی ہوئی کہ اب ان کا گزارا ایک دوسرے کے بنا ناممکن تھا۔ زبان سے یہ اظہار تو کسی ایک نے بھی نہیں کیا پر عمل سے ایک دوسرے کی اہمیت کا اندازہ ہو ہی جاتا تھا۔

ضیغم کا تعلق حیدر آباد سے، جاگیرداروں میں سے تھا۔ جب کہ شہریار اور ضامن کے والد بزنس پارٹنرز تھے، یہ اتفاق ہی تھا کہ بچے بھی آپس میں دوست بن گئے۔

ارادہ تو تینوں کا باہر سے بزنس پڑھ کر آنے کا تھا، پر ضیغم باہر نہیں جاسکا، جس کی اہم وجہ اسکے بابا سائیں تھے۔ اتنا بھی بھلا تھا کہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور رہنے کی اجازت دے رہے تھے، گو کہ اب وہ اسے ملک سے باہر بھیجتے۔

ضیغم کے ساتھ ساتھ شہریار اور ضامن نے بھی اسلام آباد سے ہی ایم بی اے کرنے کا فیصلہ لیا اور اب ان کا آخری سال تھا۔

ایک سال بعد ڈگری لے کر تینوں کا خود کا بزنس سٹارٹ کرنے کا ارادہ تھا۔ جبکہ ضیغم جب بھی انکی پلاننگ سنتا، تو بس سوچ کے رہ جاتا۔ اسے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ بابا سائیں کو



اس بارے میں منانے کے لیے اسے ہر بار سے زیادہ کوشش کرنی ہوگی، اور کیا یہ کوشش  
کارآمد ہوگی یہ سب سے بڑا سوالیہ نشان تھا؟

\*\*\*\*\*

"بھابھی!

یہ کیبل کیوں نہیں چل رہی؟"

ہیر دھپ دھپ فرش پر پاؤں رکھتی لاونج میں بیٹھی اماں اور چھوٹی بھابھی کو نظر انداز کیے چیختی  
ہوئی کچن کی طرف جانے لگی۔

اس سے پہلے کہ بھابھی کچن سے باہر آکر اسے جواب دیتیں۔

اماں جو رات کے کھانے کی سبزی اپنی نگرانی میں کٹوا رہی تھیں۔ پالک کے پتے صاف کرتے  
ہوئے، چتا کر بولیں۔

"کٹوا دی ہے۔"

جتنے سکون سے اماں نے کہا تھا۔ اتنے ہی اکھڑپن سے ہیر گردن کو بل دیتی، انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیوں؟"

وہ ایک ہاتھ کمر پر دھرے، آگے کو آئی چٹیا پیچھے پھینکتی اماں کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"منخوسیت پھیلی ہوئی تھی تو کٹوا دی۔"

پالک کی گڈی کھولتے وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔

بڑی بھا بھی جو ہیر کی چلاتی آواز پر کچن سے باہر آئی تھی۔ سر جھلاتے واپس کو مڑیں، یہ تو ہر مہینے کا تماشہ تھا۔

ماں کیبل کٹواتی تھی تو بیٹی بھی ضد کی پوری تھی۔ کیبل پھر سے چالو ہو جاتی۔

نہ اماں نے کٹوانا روکا، نہ بیٹی نے کیبل دیکھنا۔

"تم نے کس سے پوچھ کر کیبل کٹوائی، اماں!۔"

6 بچے شو آنا تھا۔ اب کہاں دیکھوں میں؟۔

وہ اماں کے سامنے کھڑی استفسار کر رہی تھی۔ انہوں نے آنکھیں چھوٹی کیے اسے گھورا اور گڈی کو لوگری میں بٹھا۔

"تو میری اماں لگتی ہے، جو میں تجھ سے پوچھوں؟  
جا کچن سے چھری لے آ اور بھا بھی کے ساتھ بیٹھ کر پالک کتر۔  
کیا دیکھوں؟

اس منحوسیت کو دیکھ کر اب تک ملا کیا ہے، جو دیکھنے کی بڑی چاہ ہو رہی ہے؟"  
سختی سے اسے ڈپٹتے، وہ ایک نیا کام اس کے ذمے لگا چکی تھیں۔  
ہیر بھی ان کے حکم کو نظر انداز کیے، دانت پیستے پیر پٹخ کر کمرے میں جانے لگی، پھر کی۔

"میں بھی دیکھتی ہوں، یہ منحوسیت کب تک گھر سے دور رہے گی؟  
بھا بھی!

فیضی بھائی کہاں ہیں؟"  
پہلے اماں کو جتلیا اور پھر بھا بھی سے سوال پوچھا۔

"وہ اور عادل تو دکان کا سامان لوڈ کروانے گئے ہیں۔ اور سیف بھائی دکان پر ہیں۔"  
 بھابھی نے گڑبڑا کر اماں کو دیکھا اور پھر اماں کی پڑھائی پٹی من و عن سنا دی۔

"آ لینیے دو بھائیوں کو۔ آج کے آج کیبل نہ لگوائی تو میرا نام بھی ہیر یوسف نہیں۔"  
 اسکی دھمکی پر اماں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"آ لینیے دو تیرے بھائیوں کو، آج انہیں بھی یاد دلاؤنگی کہ انکی ماں کون ہے۔  
 اور تو باریک باریک کاٹ اسے، تیرا بھی دھیان کسی اور کی طرح کام میں نہیں لگتا اب۔"  
 ہیر کو باور کروائیں، بھابھی کو ڈپٹا جب کہ طنز صرف ہیر کے نام تھا۔

"ہاں بھابھی۔ سلمہ، ستارا کا بھی دھیان سوائے چھتیں ناپنے کے کہیں نہیں جاتا۔"  
 اماں کی بھانجیوں کا ذکر کر کے اس نے بھی طنز کا ادھار نہ رکھا۔

"بات کرتی ہوں اختری (رشتہ کروانے والی) سے دیکھے اس بے حیا کے لیے رشتہ، جائے اپنے  
 گھر، جب دو چھتر پڑیں گے نا وہاں تو سارے دھیان سیدھے ہونگے۔"  
 وہ جو کمرے میں جانے لگی تھی۔ اماں کی اونچی بڑبڑاہٹ کو سنتی پھر سے کی تھی۔

"ہاں ہاں کہہ دو اسے، پر میری شرطیں بھی بتا دینا۔ تاکہ بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہو۔"

مصنوعی بے پرواہ انداز اپنائے، اس نے مہینہ پہلے رشتے کے لیے آئے مہمانوں کے ساتھ جو کیا تھا، اس کی طرف اشارہ دلا گئی تھی۔

"شرطیں تو سنو۔ اس ہیروئن کی، نہ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لٹھا۔  
ارے کمبخت!"

اللہ کی تخلیق ہیں سب، اب تیرے لیے آرڈر دے کر بنوائیں؟"

اسکی شرطیں یاد کرتیں، اماں نے گھورتے ہوئے اسے لتاڑا تھا۔ جس پر ہیر نے بے پرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

"آرڈر دے کر بنوانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ نے بنائے ہیں مجھ جیسے حسین لوگ۔ بس ان آنکھوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہے اماں!"

وہ خوبصورت تھی، وہ جانتی تھی، اور مانتی بھی تھی۔ اسے کسی کی طرف سے سند کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"نام ہیر رکھ لینے سے تو ہیروئن نہیں بن گئی۔"  
ہر بار کی کہی بات انہوں نے پھر سے یاد دلائی تھی۔

"تمہارے بس میں ہوتا نا اماں!

تو سلمہ، ستارہ کی طرح میرا نام بھی نوراں، بختاں رکھ دیتی۔

وہ تو بھلا ہو میری دادی مرحومہ کا جنہوں نے مجھے ہیر نام دیا۔ تم تو میری شکل کے ساتھ نام کا بھی کباڑا کر دیتی۔"

دونوں ماں بیٹی میدان میں آمنے سامنے تھیں، بھابھیاں روز کی طرح اس چک چک کو نظر انداز کیے کام میں لگن رہیں۔

پتہ تھا کہ شام ڈھلتے ہی، جب ہیر کے بھائی آئیں گے تو وہی آکر دونوں اطراف جنگ بندی کریں گے۔

\*\*\*\*\*

رات کی تاریکی کے سائے کہیں بہت دور رہ گئے، دن کا اجالا بہت دہیرے سے ایک ایک کرن دنیا کے باسیوں پر پھینکتا، اپنے ہونے کا ہر ذی روح کو احساس دلانے لگا۔ سب نیند کی

وادی سے جاگے اپنے رزق کی تلاش میں مگن تھے چاہے وہ انسان ہوں یا چرند پرند۔ سب ہی خدا کا شکر بجالانے کے بعد دنیا کی مسخوکن وادی میں غرق سے ہونے لگے۔ وہیں وہ جو پوری رات جاگی سوئی سی کیفیت میں رہا تھا اپنے اگلے پچھلے تمام اہداف کو توڑے، نک سک سے تیار اپنی الگ ترنگ میں ڈانٹیک ٹیبل پر موجود تھا۔ گھر کے مالک تو مالک، سب نوکر چاکر بھی منہ کی کھڑکیاں کھولے اور آنکھوں کی پتیلیاں پھیلائے اس حیران کن منظر کو دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔

"کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟

زلیخا!"

آنکھیں جھپک جھپک کر وہ اپنے بر خوردار کو دیکھ رہے تھے جس نے ان کے طنز بھرے سوال پر اپنے پر پڑتی حیران نظروں کو گھورتے ہوئے، چٹکی اپنے ڈیڈ کے بازو پر بھری۔ وہ کراہ گئے۔ یقیناً وہ خواب نہیں دیکھ رہے تھے اور یہ حرکت ان کا ہی بیٹا کر سکتا تھا۔

"آہ!

نالائق!"

عالم صاحب غصے سے اسے گھورتے گویا ہوئے۔

"ڈیڈ!"

صبح نہ اٹھوں تو بھی شکوہ، اٹھ جاؤں تو بھی۔ کبھی تو بخش دیں۔"  
ان کی کراہٹ کو نظر انداز کرتے وہ اپنی کسے گیا۔

"ویسے شیریں بیٹا!"

یہ آج سورج مغرب سے کیسے نکل آیا؟"  
زلیخا عالم، عالم صاحب کی بیوی اور شہریار عالم کی مام، انتہائی حیرت کے تاثرات لیے گویا ہوئیں۔

"اب ایسا بھی کیا کر دیا۔ مام؟"

پلیز مجھے ٹیز کرنا بند کریں۔ آپ کو کیا لگتا ہے میں صبح، صبح اٹھ نہیں سکتا؟"  
شہریار عالم جس کو صبح صبح اٹھانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اسکی اس گل افشانی پر عالم صاحب اور زلیخا بیگم کے ساتھ ساتھ گھر کے ملازم بھی بتیسی نکالے ہنسنے لگے۔  
اور شیریں اس نے تو جیسے غلطی کردی تھی جلدی اٹھ کر آنے پر، اٹھ کر بھی کیا آیا تھا وہ سویا ہی کہاں تھا۔



"اگر آپ لوگوں نے ہنسنا بند نہ کیا تو میں ناشتہ نہیں کروں گا۔"  
 بریڈ پر جمیم لگاتے ہوئے اسی چھری کی مدد سے انہیں وارن کیا تو زلیخا بیگم نے اشارے سے عالم  
 صاحب کو چپ رہنے کا کہا۔

"تم کھاؤ شاباش!"

اور آپ بھی ناشتہ کریں۔"

وہ ہنسی کو مشکل سے چھپاتے گویا ہوئیں۔

ناشتے کے بعد وہ یونیورسٹی کے لیے نکل گیا یہ بھی ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا تھا کہ وہ وقت سے  
 پہلے یونیورسٹی کا گیٹ پار کرے گا۔ اس نے تو کبھی وقت پر سکول کا گیٹ پار نہ کیا تھا اور  
 اس سلسلے میں کتنی ہی وارننگ اسے مل چکی تھیں پر وہی مرغی کی ایک ٹانگ، اس پر نہ پہلے  
 اثر ہوا تھا اور نہ اب۔

پر یہ محبت.....

یہ بہت ظالم شے ہے انسان سے وہ کچھ کروا دیتی ہے جو پہلے کبھی نہ کیا ہو۔ اب کل رات  
 کی ہی بات لے لو، شہریار عالم عرف شیریں جس نے لالی ووڈ کیا، بالی ووڈ کی بھی مشہور فلمیں تک

نہ دیکھی ہوں۔ ماسوائے ہالی ووڈ کی فلموں کے، پوری رات یوٹیوب پر وحید مراد سے لے کر شاہد کپور تک، ہر ہیرو کی ہیروگری دیکھ چکا تھا۔ بھلا ہو اس یوٹیوب اور گوگل کا کہ ایک ہی رات میں اس نے مشہور فلموں کے مشہور سین دیکھ لیے تھے۔ اب جب وہ محبت کی منزل کا مسافر ہوا ہی تھا۔ تو ایمانداری سے اس سفر کو پائے تکمیل تک بھی تو پہنچانا تھا۔

ہیر کو اس کا رانجھا چاہئے تھا تو ہیر رانجھے پر بنی فلموں سے ایک چیز تو طے کر لی تھی کہ اسکی کہانی ہیر رانجھے جیسے نہیں ہوگی، جہاں محبت کی منزل پچھڑنا ہی ہو۔ اور ویسے بگی حقیقت میں لازم نہیں کہ ہر کہانی کا موڑ وہیں اکر کے جہاں پچھڑنا ہو کبھی کبھی کہانیاں خوشگوار موڈ بھی لیتی ہیں جہاں حجاب و قبول کے خوبصورت لمحات ہوتے ہیں اور اس کے بعد کی خوبصورت زندگی...!

"ضیغم!"

وہاں دیکھ۔ اپنا شیر ہی ہے نا؟۔"

آنکھیں سکیڑے وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی طرف بڑھتا شخص یقیناً ان کا دوست شیر ہی ہے، تو ضیغم کی توجہ بھی اس معجزے کی طرف مبذول کروائی اور ضیغم نے جیسے ہی نظریں سامنے اٹھائیں تو اسکا بھی حال ضامن سے کم نہ تھا۔

کہاں وہ آدھا دن گزار کر آتا تھا اور آج کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی آن وارد ہوا۔ اس سے بڑھ کر حیران کن اس کا تیار شدہ روپ تھا۔ وہ جو لیٹ آنے کے باوجود ملگجے سے حلیے میں ٹپک پڑتا تھا۔ ایک عدد ٹی شرٹ ساتھ میں جینز ڈالے بالوں کو بھی برش کرنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ اور آج کالے رنگ کے شلوار سوٹ میں موجود، ہاتھ میں گھڑی، بالوں کو نفاست سے سیٹ کیے، دبلا دبلا نکھرا سا چہرہ جیسے کڑی محنت کی ہو اسے سنوارنے میں، ایسی تیاری تو وہ عید کے عید ہی کرتا تھا تو حیران ہونا ان کا پیدائشی حق تھا۔

"کھرکی بند کر لے، مکھی چلی جائے گی۔"

شیری ان کے پاس پہنچ کر دونوں کے کھلے منہ کو ہاتھ کی مدد سے بند کرتا انکے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے، تو نے اس لڑکی کی باتوں کو زیادہ سنجیدہ لے لیا۔"

ضیغم ہوش میں آتا اسے جانچتی نظروں سے دیکھتا پوچھنے لگا۔ جس پر وہ ڈھیٹوں کی طرح مسکراتا ہاں میں سر ہلا گیا۔

"مطلب کہ تیرا پکا اس جنگ میں شہید ہونے کا ارادہ ہے۔"

ضامن کو یقین نہیں آ رہا تھا کل کی ہیر کی چرب زبانی کے بعد بھی اس کا دوست آنکھوں  
دیکھی مکھی نکلنے جا رہا تھا۔  
تو بہ اس لڑکی کی زبان۔

"بلکواس نہ کر۔"

ضامن کو دھموکا جڑتے بولا۔

"دیکھ، تو سچ میں ہی..."

ضیغم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک لڑکی کے لیے وہ خود کو بدل رہا ہے۔ پر وہ یہ نہیں جانتا  
تھا کہ کتنا کچھ وہ خود اپنی محبت میں کرنے والا تھا اس کے مقابلے میں یہ کچھ نہ تھا۔

"ہاں۔"

یار میں نے بہت سوچا، اور بس وہی میری ہیر بنے گی۔ یہ طے ہوا۔"

قطعی لہجے میں کہتے اس نے اپنا فیصلہ سنایا تو ضیغم نے بھی کندھے اچکا دیئے جب وہ خود  
حلال ہونا چاہتا تھا تو اسے کیا اعتراض تھا۔

پر ضامن، اسے اعتراض ضرور تھا جس کا اظہار کرتے اسے لاج بھی نہ آئی۔

"تو نے کل دیکھا وہ چوہیا، بھی ہیر جی کے ساتھ تھی جس نے تیرے بہائی، تیرے جگر کو باتیں سنائیں۔ تو پھر بھی.."

"ہاں پھر بھی۔"

کوئی سو ڈھیٹ مرے ہوں گے تو شہریار جیسا سپوت پیدا ہوا ہوگا، وہ اسی ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرایا۔

"بڑے بڑے بے غیرت دیکھے پر تجھ جیسا نہیں دیکھا۔"  
ضامن تپا۔

"ڈرامے نہ کر۔"

ضیغم نے ہی ضامن کی لگام کھینچی تب جا کر اسے چین آیا۔ اور تبھی شہریار بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

سہر؟

ابھی کلاس میں ٹائم ہے۔"

شہریار کو قدم بڑھاتے دیکھ کر وہ دونوں بھی اس کی تقلید میں ہوئے۔

"ہیر جی سے ملنے۔"

گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔"

ضامن پھر سے تیار تھا، آج تو اسے خطرات تھے کہ کہیں سچ میں ہاں نہ کروا آئے۔

"نہیں..."

ضیغم اسے پکڑ کر رکھ اگر یہ آیا نہ تو پھر دیکھنا۔"

وہ چیختا اسے آنے سے باز رکھ رہا تھا تبھی ضیغم نے ضامن کو جانے سے روکا۔

"شاوا وے شاوا۔"

کل کی لڑکی کے لیے دوست کو آنے سے روکے گا۔"

ضامن چڑنا اپنا آپ چھڑوانے لگا، جو ضیغم کے چنگل سے چھڑوانا تو مشکل تھا۔

"ہاں جی".

اشبات میں سر ہلاتے شیریں دل کی صدا پہ کن کہتا وہاں سے غائب ہوا۔

"اب چھوڑ بھی".

شہریار کے جاتے ہی ضامن نے چھڑوانے کے لیے ہاتھ جھٹکا اور ضعیف نے بھی بغیر مزاحمت کے چھوڑ دیا۔

دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ساتھ ہی شہریار کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ شیریں کی زندگی میں یہ کہاں ممکن تھا کہ اس کے اتنے بڑے دن پر اس کے دوست ساتھ نبھانے کے لیے نہ سہی تماشہ دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوں۔

\*\*\*\*\*

یہ کیسا حسین اتفاق تھا کہ وہ بھی کالا رنگ زیب تن کیے سنہری چمکتی صاف رنگت کے ساتھ سنہری دھوپ کی کرنوں میں نہائی مزید چمک کر اسکی آنکھوں کی چمک بڑھا رہی تھی۔ اور وہ دل کی آواز پر کن کہتا ایک ٹک اس حسین منظر کو آنکھوں کے رستے دل میں پیوست کر رہا تھا، آج

بھی شاید وہ یہ موقع گنوا دیتا اگر دماغ اپنی ضد پر اڑ کر اسے اس دلفریب سحر کی جکڑ سے آزاد نہ کرواتا، اور ہیر سے ملنے اور بات کرنے کی چاہ نہ دکھاتا۔

پھر کیا تھا، قدم بڑھاتا وہ اس کے قریب پہنچا جو کسی بات پر گلنار ہوتی، گھنیری ٹوکدار پلکوں کو جھکاتی، اناری ہوئے ہونٹوں پر تبسم بکھیرتی مسخوڑ کن لمحات میں اسے قید کر گئی۔ کیسی کیسی جزلوں سے چور ہوتی خواہشات سر اٹھانے لگیں جن کو بے دردی سے وہ کچلتا ابھی صرف ان ہونٹوں پر رقصاں چند لفظوں کی بازگشت سننا چاہتا تھا۔

"کیسی ہو؟"

وہ جو تائشہ کی بات پر مسکرا رہی تھی، کسی کے سوال پر پلکوں کی باڑ اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے وجاہت سے بھرپور شخص کو دیکھا جو لگ بھگ اس کی ہیرو کی اصطلاح پر پورا اترتا تھا۔ ہاں ایک دو چیزوں کی کمی تھی پر اگر ان کو نظر انداز کیا جائے تو ایسی بھی کوئی خامی نہیں تھی۔ چند پل غور سے دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ یہ سامنے کھڑا کوئی کردار نہیں بلکہ وہی ہے جو کل آیا تھا۔ لیکن دونوں ہی کے حلیے بالکل مختلف تھے ماسوائے چہرے کے خدو خال اور جسامت کے۔



"آپ پھر آگئے؟"

اسے پہچانتے ہی سوال داغا جس پر شہریار عالم کے دل و دماغ پر پھولوں کی ٹھنڈی پتیوں کی برسات ہوئی ہو، گویا وہ یاد رکھے ہوئے تھی اسے۔

"جی..."

آپ نے کل اپنی ڈیمانڈز رکھی تھیں۔ انہیں ڈیمانڈز کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیسی لگی یہ کوشش؟

تجاہل آفرانہ سے کہتے وہ اپنی سماعتوں کو تعریفی کلمات سے تیار رکھے ہوئے تھا۔ جب اس کے کانوں نے وہ سنا جس کی قطعاً امید نہیں تھی۔

"یہ کوئی بچوں کا کھیل ہے کیا ہیرو بننا؟ آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے آج نہا کر آجائیں گے بالوں کو جیل سے سیٹ کر لیں گے اور یہ شلوار سوٹ پہن لیں گے تو ہیرو بن جائیں گے، ہیرو بننے کے لیے گٹس کی ضرورت ہوتی ہے، گٹس کی۔"

نہ مونچھ نہ داڑھی چلے ہیں ہیرو بننے۔

اور اپنی باڈمی دیکھی ہے، کہیں سے ہیرو لگتے بھی ہیں بھلا۔"

مبالغہ ارائی کی حدوں کو چھوتی فرست سے ہیرو پر لیکچر دیتی، اس نے آج پھر سے شہریار عالم کو خوش فہمیوں کی اڈان سے زمین پر لا بٹھا تھا۔

"پر..."

ابھی شہریار کچھ کہتا تائشہ ہر بار کی طرح اس بار بھی بیچ میں بول پڑی۔

"پرور کچھ نہیں بھائی صاحب ایک بار جب اس نے بول دیا کہ آپ اسے پسند نہیں تو بات ختم، مزید بات کو بڑھانے کا کیا فائدہ؟"

اور ضامن جو کب سے ہنسی روکے شہریار کے پیچھے کھڑا اس پر ہوئی گولہ باری سے لطف اندوز ہو رہا تھلھا۔ تائشہ کی بات پر خود بھی میدان میں کوندا جب کہ عینا اور ضعیف بے خاموش تماشائی ہونے کا فرض پورا کر رہے تھے۔

"بات، اب تمہارے قد کی طرح تو نہیں ہے کہ بڑھ نہیں سکتی۔ چوہیا!"

طنزاً کہتا وہ بھی شہریار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور نخوت سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھنے لگا جو اسے بھی کچھ ویسی ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ سے بات نہیں کی میں نے۔"  
تائشہ نے دانت کچکچائے۔

"مجھ سے بات کرنے کی غلطی بھی مت کرنا، ورنہ کتوں کے سامنے ڈالنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

انگلی اٹھا کے وارن کرتا وہ اسے کچھ سخت سنانے پہ مجبور کر گیا اس سے پہلے وہ کچھ بولتی کتوں کی دہمکی سے خائف ہو کر خاموشی میں ہی عافیت جانی کیا پتہ تھا اس سنکی انسان کا، سچ میں ہی کتوں کے آگے ڈال دیا تو...!

"ہیر جی، میرا دوست آپ کے معیار کے مطابق بننے کے لیے جی توڑ کوشش کر رہا ہے۔ پلیز ایسے تو نہ کریں اسکے ساتھ۔"

ضامن اب ہیر سے مخاطب ہوا۔ اور شہریار جو پہلے غصے سے اسے تائشہ سے لڑتا دیکھ رہا تھا اب اپنے حق میں بولتا دیکھ پھر سے بشاشت سے اسے دیکھنے لگا آخر کو دوست تھا، پر تھا تو کمینہ ہی...!

"اگر آپ انکار کرنا چاہتی ہیں تو پھر ایک دم ہی کر دیں اس طرح ہیرو پر لیکچر دیتی رہیں گی تو اسے لگے گا آپ اسے موقع دے رہی ہیں۔"

میسنا پن تو شاید کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ضامن میں، لگے پچھلے تمام بدلے وہ آج ہی چکانا چاہتا تھا جہاں شہریار اس کے بازی بلٹنے پر حیران تھا وہیں ضیغم نے اس کے کایا بلٹنے پر ضامن کو چپ کروانے کی کوشش کی اور خود بولا۔

"نہیں!۔"

اسکا مطلب ہے کہ شہریار اپنی فیلنگس میں کھرا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ سچ میں آپ کے لیے ہی فیل کرتا ہے اگر آپ کو پسند نہیں ہے۔ تو اس کا بھی حل ہے، جو آپ کی پسند ہے وہ اس میں ڈھل جائے گا۔ آپ ایک دفعہ موقع دے کر تو دیکھیں۔ کیوں شیری؟"

تحمیل سے شہریار کا وکیل بن کر ساری بات ہیر کے گوش گزار کی اور اختتام پر شہریار سے بھی تائید چاہی جس پر زور و شور سے شہریار نے سر ہلایا۔

ہیر کے لیے یہ واقعہ بالکل نیا تھا۔ کل تو اسے لگا شاید ریگنگ کے لیے یا پھر جو ہوا وہ صرف ایک مذاق ہوگا پر آج تو سیدھا پروپوزل آیا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں سمجھ آرہی تھی کہ اس میں سچائی

کتنی ہے کسی کے کہہ دینے سے کہ وہ اپنے جزیوں میں کھرا ہے تھوڑی مان لیا جاتا ہے۔ وہ اس سب پر کیسے قابو پائے اسے اس کی سمجھ بوجھ ہی نہیں تھی۔ ڈراموں میں دیکھ کر تو کتنا اچھا لگتا ہے جب ہیرو اپنی ہیروئن کو پروپوز کرتا ہے۔ جب وہ اسے اپنے جذبات کا احساس دلاتا ہے پر حقیقت میں ڈر، خوف، گھبراہٹ ان سب کے ملے جلے احساسات سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کر دیتے ہیں۔

"ہیر...!"

پہلی بار اس کا نام محبت کی چاشنی میں گھول کر لیا تھا، اسے مسلسل نظریں نیچے کیے کسی سوچ میں گم دیکھ کر شہیار نے اس کی محویت توڑنے کے لیے اسے پکارا، اس نے بھی جھکی پلکوں کو اٹھا کر ایک نظر اسے دیکھا سمجھ سے باہر تھا کہ کیا کہے اور کیا نہیں۔ پر دل کہتا تھا کہ ایک موقع دے دے تو دماغ انکاری تھا کہ دو ملاقاتوں میں اقرار کی سند نہیں پکڑائی جاتی۔ پر کیسے، زبان سے وہ ادا ہوا جو شاید دل میں تھا، یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔

"میں سوچ کر بتاؤں گی آپ کو"۔

ضیغم کو دیکھتے وہ شہیار کو خوش ہونے کی وجہ دے گئی۔

پراس خوشی پر کسی کی چیخوں کی قبر کھودنی تھی شہریار عالم نے، اور وہ کوئی اور نہیں بلکہ ضامن نواز ہی تھا۔

\*\*\*\*\*

"سیدہ سیدہ کہہ نہیں سکتی تھی، کہ بھائی صاحب اپنا راستہ ناپیں، یہاں آپ کی دال نہیں گلنے والی۔"

کیا منہ اٹھا کر کہہ آئی ہو سوچ کر بتاؤں گی۔ کوئی عقل ہے تم میں کہ نہیں۔"  
کلاس میں آنے تک وہ اسے کوسی جارہی تھی اور اب لیکچر کے دوران بھی سرگوشی نما آواز میں اسے ڈانٹ رہی تھی۔ آخر کو ضامن کی کہی بات کا غصہ کہیں تو اتارنا تھا۔

"تو کیا ہو گیا تشو؟"

اس نے کہا ہے جواب دے گی، دیا تو نہیں نا"

ہیر خاموش بیٹھی بظاہر سامنے سیٹج پر دیے جانے والے لیکچر کو سن رہی تھی پر خود ہی وہ اپنے اندر ہوئی ایک جنگ سے لڑ رہی تھی دل کچھ کہہ رہا تھا اور دماغ وہ الگ ملامت پر اتر آیا تھا۔ اوپر

سے تائشہ کے کوسنے، پر عینا جو ہیر کے ایک طرف تھی آگے کو جھک کر تائشہ سے نرمی سے بولی۔

"یہ کیا جواب دے گی ہاں؟

اس وقت تو بول نہیں سکی، جب وہ کھمبہ مجھے باتیں سنا رہا تھا اوپر سے کہہ کر آئی ہے، سوچ کر بتاؤں گی۔"

تائشہ کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا، الٹا غصے کا گراف مزید بڑھ چکا تھا۔

"تو تم بھی بیچ میں مت بولتی۔۔۔۔۔"

عینا نے جیسے ہی بات مکمل کرنی چاہی تائشہ کی زبردست گھوری پر گھبرا کر نظریں پھیرنے ہی والی تھی کہ اس کی پیشانی پر چاک کی ضرب آن لگی، جس سے ناک پر ٹکا چشمہ جھپاکے سے نیچے گرا۔

"مس عینا، باتیں کرنے کے لیے آپ کی زبان بہت چلتی ہے پر کچھ سناتے وقت آپ کی آواز کہاں چلی جاتی ہے؟"

عینا جو تائشہ کو جواب دے رہی تھی، بد قسمتی سے اکنامکس کے سر نعیم کی نظر اس پر پڑھ گئی اور اب لیکچر میں دخل پڑنے پر وہ عینا کو نشانے پر رکھ چکے تھے۔

"س.. سو.. سوری سر"

پیشانی پر لگنے والی ضرب شدید تھی کہ اسے اپنی پیشانی سن ہوتی محسوس ہوئی اوپر سے چشمہ بھی گر چکا تھا۔ وہ بھرائی آنکھوں سے دہنڈلا منظر دیکھ رہی تھی اور اس پر تضاد کلاس میں دبی دبی ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔

ہیر اور تائشہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھیں، جو رونے کے در پہ تھی۔

"سائنس کلاس۔"

اینڈ یو آؤٹ فرام مائی کلاس۔"

سر نعیم غصہ ضبط کرتے اسے باہر جانے کا اشارہ کرنے لگے، تب تک ہیر نے چشمہ اٹھا کر اسے پکڑا یا جس کے ایک شیشے پر دراڑ پڑ چکی تھی۔ وہ ابھی بھی بت بنی نظریں جھکائے اسی جگہ موجود تھی۔

اسے کوئی حرکت نہ کرتے دیکھ کر، وہ اب کی بار چیخے تھے۔



"مس عینا!

آوٹ فرام دا کلاس".

ان کی تیز آواز پر وہ سہم کر چشمہ آنکھوں پر لگاتی کلاس سے باہر نکل گئی۔  
 باہر آتے ہی ضبط کی ساری دیواریں دھڑا دھڑا گر گئیں۔ اور ہچکولے لیتے وہ رونے لگی۔ اب کی  
 بار تو کوئی اپنا بھی نہ تھا جو اسے چپ کرواتا، پر کبھی کبھی کوئی اپنا جھولے بھٹکے مل ہی جاتا  
 ہے۔

اس سے یکسر انجان وہ ایک خالی گوشے میں جا کر تیز آواز میں روتی، آنسو بہانے لگی۔

\*\*\*\*\*

"ہیر کے سامنے کیا بک رہا تھا؟

بہت ہی کوئی بے غیرت انسان ثابت ہوا ہے، آستین کے سانپ"۔  
 ضامن کی گردن دبوچے، شہریار اپنی تمام تر بھڑاس اس پر اتار رہا تھا۔

"آہ!..

چھوڑ، اے چھوڑ نا"۔

اسکے ہاتھوں پر جھپٹتا خود کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے ہی پکڑ میں نرمی آئی۔ ضامن نے خود کو شیریں کے شکنجے سے کو باہر نکالا۔

"مارنا تھا کیا،

پاگل تو نہیں ہو گیا۔"

کھانستے ہوئے گردن کو سہلاتے وہ شہیار سے بولا، جو اب بھی غضب ناک تاثر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور ساتھ میں ضیغم بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ضیغم، اس سے کہہ دے یہ آخری دفعہ تھا، جو اس نے کیا۔ اب اگر میرے اور ہیر کے بیچ آئے گا۔ تو مجھ سے برا نہیں ہوگا۔"

شہیار نے ضیغم کو کہتے اصل وارنگ ضامن کو دی تھی جو اس کی بات سنتے فوراً سے پہلے میدان میں کوندا۔

"تجھ سے برا کوئی ہو بھی سکتا ہے بھلا، ایک لڑکی کے لیے، بلکہ اس دیرھ فٹ کی چوہیا کی دوست کے لیے تو اپنے دوست کے ساتھ ایسا کر رہا ہے۔"

"زیادہ فلمی ڈانٹاگ نہ مار۔"

ضیغم نے اسکی اداکاری سے چڑتے سر پر چپت لگائی اور مزید ایسے جوہر دیکھانے سے باز رکھا۔

"تو بتا ہی دے، تجھے ہیر سے مسئلہ ہے یا اس چوہیا سے؟"

شیری نے استفسار کیا۔

"مجھے ہیر سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پر مسئلہ اس کا اس چوہیا کی دوست ہونے پر ہے۔"

تنفر سے کہتا وہ شیری سے منہ موڑ گیا۔

"تو پھر میری لو سٹوری کے بیچ میں ولن کیوں بن رہا ہے؟"

شیری کے بے بسی سے کہنے پر ضامن کے ساتھ ساتھ ضیغم کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"یار ضامن!"

کیوں اس کی اکلوتی لو سٹوری میں ولن بن رہا ہے۔ جانے دے نا

اور شیری اب یہ کچھ نہیں کہے گا تو اپنی لو سٹوری پہ دھیان دے۔"

ضیغم کے لو سٹوری کہنے پر پھر سے دونوں ہنسے، جس پر شہریار محض انہیں گھور کے رہ گیا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ نہیں سدھریں گے۔

"اس کی لو سٹوری میں ولن اس کی اپنی ہیروئن ہے۔ اسے ہماری کیا ضرورت؟" ضامن نے پھر سے شہریار کو چڑانے کا سامان کیا جس پر وہ خاموش رہا، جانتا تھا کچھ بھی بولا تو جواباً وہ دو ہاتھ آگے ہی بولے گا۔

"ویسے شیریں یار جیسی تیری شکل ہے نا..." ہاتھ سے اسکا چہرہ پکڑ کے ناقدانہ معائنہ کرتے ہوئے مزید بولا۔

"اس پر داڑھی مونچھ آنے میں خاصا وقت لگے گا۔ کیوں ضیغ؟" اور پھر کیا تھا قہقہوں کی ایک روش تھی جو پھوٹ پڑی۔ اور شہریار، وہ مکوں سے اسے مارنے کے لیے دوڑا تھا جو خود کے بچاؤ کے لئے اور تیز بھاگ رہا تھا۔ گراؤنڈ میں موجود تمام طلباء و طالبات ان کی اس بھاگ دوڑ پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئے تھے

اور جب وہ نظروں سے بھی دور نکل گئے، تو ضیغم بھی نفی میں سر جھٹکتا کلاس لینے کی نیت سے بیگ کو کندھے پر لگاتے بلڈنگ کے اندر جانے لگا۔

ابھی وہ بلڈنگ میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی نظر سیرہیوں کے دہانے پر بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ جو باآواز رونے میں مصروف تھی، وہ جگہ قدرے سنسان تھی اور وہ اکیلی ناجانے کس غم میں رو رہی تھی۔ اسے نظر انداز کیے وہ سیرہیوں سے گزرنے ہی لگا تھا کہ لڑکی نے سر اٹھایا۔

کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے ہاتھوں سے ڈبکے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ تو بھگی بھگی آنکھیں، کرل بالوں کی چند آوارہ لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں، عجیب ویرانی، لیکن پرکشش سا منظر تھا کہ ضیغم اس معصومیت میں ڈہلی خوبصورتی کو دیکھے گیا۔

چشمہ آنکھوں پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ سامنے کھڑے لڑکے کو پہچان نہیں پائی، ہاتھ بڑھا کر ساتھ رکھا ٹوٹا چشمہ پہن کر دیکھنے لگی۔

چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہی اس کے گول موٹل بھگے نین، پیچھے چپ گئے تھے اور ایک طرف کا ٹوٹا شیشہ اوپر سے اسکا آنکھیں پٹپٹا کر دیکھنا، نجانے کیوں پر اسے وہ مینڈک لگی، نکین پانی سے

بھری آنکھیں، اس پر تضاد سوں سوں کرتی ناک، سرخ ہوتے گال، وہ ٹوٹے چشمے کے ساتھ کچھ حد تک مزاحیہ لگ رہی تھی، تبھی وہ لاشعوری میں باآواز اسے یہ خطاب دے گیا۔  
 "بینڈک۔"

اور عینا اپنے سامنے کھڑے اسی لڑکے کو جس کے دوستوں نے اسے پہلے ہی دن ڈھیر سارے ناموں سے پکارا تھا اب ایک اور القاب پر بجائے گھبرانے کے بلکہ غصے بھری آنکھوں سے اسے گھورنے لگی۔ جس پر وہ اپنی ہنسی روکتا، ڈرنے کی ناکام اداکاری دکھاتا اسکے ساتھ بیٹھ گیا۔

اسکے بیٹھتے ہی عینا سرک کر دور ہوئی۔ اور اس کے جگہ چھوڑنے پر ضیغم نے اپنا بیگ کندھے سے ہٹا کر اسی جگہ پہ رکھ دیا۔

"او سوری، نوڈل۔"

او۔ چشمش۔

نام کیا ہے تمہارا؟"

بیٹھتے ہی وہ بے دہیانی میں معافی مانگتے ہی اسے پرانے القابات سے پکارا۔ جس پر عینا نے پھر سے اسکی جانب غصے سے دیکھا۔ پہلے ہی ہتک کا احساس غالب آیا تھا اور یہ غصہ کہیں تو نکلنا تھا۔

ہاتھ کی پشت ناک اور چہرے پر پھیر کر آنسو صاف کیے۔  
یہ سب کرتی وہ واقع ہی بہت معصوم اور بے ضرر لگی، اس بات کا اعتراف ضیغم نے دل میں ضرور کیا۔

"عینا"۔

کچھ توقف کے بعد اس کی مہیگی آواز آئی جس پر ضیغم نے ستائشی انداز میں اس کے نام کو سراہا۔

"نالس نیم"۔

عینا جو بیزاریت سے اسے اپنے ساتھ بیٹھا دیکھ رہی تھی۔ ضیغم کے کسے لفظوں پر حیرانی اور خوشی ساتھ میں جھلکی اور ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر جب کہ مہیگی آنکھوں میں خاص چمک ابھر آئی۔ اور دھوپ چھاؤں کا یہ دل فریب منظر، ضیغم نے شاید ہی پہلے دیکھا ہو تبھی تبسم چہرے پر لائے وہ نظریں پھیر گیا۔

"رو کیوں رہی تھی۔"

نرمی سے اس سے پوچھتا، وہ عینا کو پہلے دن والے لڑکے سے کافی مختلف لگا۔

"نہیں۔"

میں.. نہیں رو.. رہی تھی۔"

اٹکتے ہوئے کہتی آخر میں سسکی بھر گئی۔

اور ضیغم وہ جان گیا تھا کہ یہ لڑکی عام نہیں ہے، اور عام سا رویہ شاید برداشت بھی نہ کر سکے، تبھی ناچاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھ گیا تھا اور تو خود سے نرمی سے مخاطب بھی کیا تھا یہ ضیغم ظفر شاہ کا تو شیوا نہ تھا۔

"جھوٹ بولنے والے اللہ کو پسند نہیں ہیں۔"

اسے خود پر بھی ہنسی آرہی تھی کہ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے کسی بچے سے کر رہا ہو۔ ہاں ذہنی لحاظ سے وہ شاید اب بھی بچی ہی تھی۔



اور عینا کے دل میں کیا آن سمائی کہ وہ روتی ساتھ ساتھ اسے کلاس میں ہوئے واقع کا بتانے لگی۔

ضیغم تاسف سے ساتھ بیٹھی چھوٹی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو واقع ہی اپنی عمر سے کافی چھوٹی تھی۔ اور کافی حد تک حساس بھی۔

"سر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میں بات کروں گا سر سے!"

اس کی ساری بات سن کر دلاسہ دیتے کہا تو عینا سارا رونا بھلائے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نو!"

پلیز آپ۔۔ سر سے نہ کہنا وہ پھر ڈانٹیں گے!"

وہ پچھلے طعنے سے ہی کافی غمزہ ہوئی تھی کہ وہ پوچھے گئے سوالوں کے جواب کیوں نہیں دیتی۔ اگر اب ضیغم، سر سے بات کرتا تو یقیناً سر ایسا ہی کوئی جملہ پھر سے دہراتے۔

"اوکے نہیں کہتا۔"

اسکی بات کا مقصد سمجھتے وہ مان گیا، اور اس کا ایسا کچھ کرنے ارادہ تھا بھی نہیں۔ ویسے بھی پرائے پھڑے میں کیوں ٹانگ اڑانی۔

\*\*\*\*\*

"منہا،

کافی پینے چلیں۔"

داؤد اکرم، ویسے تو یونی کی ہر لڑکی پر نظر رکھے ہوتا تھا۔ پر دل صاحب نے صرف منہا کو ہی دیا تھا۔ لیکن منہا وارث کو ضیغم میں دلچسپی تھی اور یہی وجہ تھی کہ داؤد، ضیغم کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ چھوڑتا لیکن خاک اپنے سر میں ہی ڈل جاتی، خیر جیسا قسمت کو منظور ہو۔

"ناٹ اگین،

دیکھو میرے پاس تمہارے لیے کوئی ٹائم نہیں ہے، سو پلیز گو آوے۔"

بد تعمیزی اور بیزاری سے کہتی وہ آگے بڑھ گئی پر ڈھیٹوں کے سردار نے پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسکے پیچھے ہی چل دیا۔

دفعاً مہنا کے قدموں کو بریک لگی اور وہ ساکت کھڑی سامنے دیکھنے لگی۔  
جہاں وہی لڑکی جس سے اس کی ٹکر ہوئی تھی سر جھکائے کچھ کہہ رہی تھی اور ضیغم خاموشی  
سے اسے سن رہا تھا۔ مہنا نے اپنی مٹھیوں کو بھیچ کر غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

"اگر تمہارے پاس وقت نہیں ہے، تو کیا ہوا؟

میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے تمہارے لیے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں میرے لیے صرف تم بنائی  
گئی ہو، تمہیں وقت دینا تو بنتا ہے۔"

داؤد بڑے دل سے اظہار کرتے، چاہ سے کہہ رہا تھا۔

وہاں وہ سامنے کا منظر دیکھ کر شعلوں پر چل رہی تھی اور اس کھولن کو بڑھانے کا کام داؤد کی  
بات نے کر دیا۔

"تم جیسے ٹھہکی کے لیے ناوہ سامنے دیکھ رہے ہو، وہ دبو سی لڑکی۔ وہی بنائی گئی ہے، مہنا وارث  
بخش نہیں۔"

عینا کی طرف اشارہ کرتے وہ چھاڑ کھانے کے انداز میں بولی تھی۔

داؤد نے دو قدم پیچھے لیے اور سامنے بیٹھی روتی عینا کو دیکھا وہ تو اچھا تھا کہ پیچھے ہونے سے جھاڑ اس کے اور ضیغم کے بیچ میں آگیا کہ وہ ضیغم کو نہ دیکھ پایا۔ کیا پتہ ضیغم کو نیچا دکھانے کی غرض سے وہ یہ بھی کر گزرتا، جو منہا کہہ رہی تھی۔

”کول ڈاؤن بے بی!“

اس جیسی لڑکیاں صرف ٹیز کرنے کے لیے ہوتی ہیں، لائف پارٹنر تو تمہیں ہی بنانا ہے نا۔“  
عینا کو نظر انداز کرتا وہ پھر سے منہا کی شان میں قصیدے پڑھنے لگا۔

اسے عینا کی معصومیت اور دبو جیسی فطرت سے کوئی لینا دینا نہ تھا ہر انسان کی اپنی چاہت، ترجیحات اور اپنا معیار ہوتا ہے، اپنی سوچ کے مطابق حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور داؤد اکرم کا معیار، چاہت اور ترجیح عینا رحیم تو کسی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔

منہا اس کی باتوں سے زچ آتی مزید آگے بڑھ گئی اور داؤد بھی اسی کی تقلید میں بولتے پیچھے پیچھے چل دیا۔

\*\*\*\*\*

"تم سوال کا جواب دے دیا کرو، جو وہ پوچھیں۔  
کیا یاد نہیں ہوتا؟"

ضیغم اسے مفت کا مشورہ دینے لگا، پر پھر لگا شاید پڑھائی میں وہ اتنی اچھی نہ ہو۔

اب تو دل نے یہ آفر بھی کر دی کہ کہہ ڈالو، اگر یاد نہیں ہوتا تو میں مدد کروا دوں گا۔  
اتنا دل پھینک تو نہیں تھا اس کا دل اور اب ایسا سخی پن۔ دماغ دل کے لئے لینے لگا۔

"یاد کر لیتی ہوں۔ (سوں) پر سنایا نہیں جاتا۔"  
اب اس کا رونا تو بند ہو چکا تھا، پر سوں کی آواز وہ متواتر نکال رہی تھی۔

"کیوں؟"

"پوری کلاس مجھے (سوں) دیکھ رہی ہوتی ہے (سوں) تو مجھ سے سنایا نہیں جاتا۔"  
وہ ضیغم کی نرمی سے کیے سوال کا جواب دینے لگی، جس کا جواب وہ پہلے کبھی نہیں دیتی تھی۔

یقیناً ایسے لوگ نرمی اور محبت کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔

"تو؟

اگر کلاس دیکھ رہی ہوتی ہے تو کیا ہو جائے گا؟

یہ مسئلہ تو آدھے سے زیادہ اسٹوڈنٹس کا تھا اور یہ ڈران کے اعتماد پر زنگ لگائے ہوئے تھا۔ اس ڈر سے چھٹکارا پا کر ہی وہ اپنا اعتماد بحال کر سکتے تھے

"اگر میں نے غلط جواب دیا تو، سب ہنسیں گے نا مجھ پر"۔  
عینا نے اب قدرے جھنجھلا کر بتایا اور ساتھ میں ناک کے نتھنے بھی پھلایے کہ اس انسان کو ہر بات باریکی سے بتانی پڑ رہی ہے۔ اور کچھ آنسو کے قطرے پھر سے چہرے پر پھیل گئے۔

"تو!

ہنسیں گے تو کون سی بڑی بات ہے۔ لوگوں کا کام ہے ہنسنا، اور لازمی ہے کیا کہ غلط ہو؟ صحیح بھی تو ہو سکتا ہے نا"۔

وہ شاید اسکی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

وہ روتی ہوئی یقیناً بہت پرکشش لگ رہی تھی، پر دل کو اسکا یوں رونا اچھا نہیں لگا تھا، ضیغم نے پھر سے اس بے ایمان دل کی سنتے نظریں پھیری تھیں۔

"لازمی بھی تو نہیں کہ ٹھیک بھی ہو۔"

ناراضی سے اسے جواب دیتی وہ ضیغم کو مسکرانے پر مجبور کر گئی اور پھر خود سے اس کا ہاتھ اٹھا اور عینا کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی اپنے عمل پر وہ خود بھی ششدر تھا پر عینا تو غصے سے آنکھیں پھاڑے، سر پر ہاتھ رکھے اسے گھورنے لگی۔

ابھی وہ اسے کچھ کہتی کہ سیرہیوں سے اترتی ہیر اور تائشہ ان کے پاس پہنچ گئیں۔

ان کے آتے ہی عینا، ہیر اور تائشہ کے گلے لگ کر پھر سے رونے لگی اور ضیغم بیگ اٹھاتا حیران پریشان، دنگ سا نامحسوس انداز میں وہاں سے چلا گیا۔

اس بے اختیاری پر حیران تو تھا ہی قدرے پریشان بھی تھا کہ واقع جو دل صدائے دے رہا تھا وہ درست ہیں۔ لیکن دماغ؟ اسے قطعاً یقین نہ تھا آخر ایک ہی ملاقات میں وہ اس قدر اپنی لگنے لگی، اور وہ بھی ضیغم ظفر شاہ کو جس کے لیے یہ محسوسات سوائے وقت کے ضیاع کہ کچھ بھی نہیں تھے۔

لیکن یہ قسمت بھی نا۔۔

کبھی بھی، کسی کو بھی، کہیں بھی لا کھڑا کرتی ہے...!

\*\*\*\*\*

"پیسے کتنے ہوئے بھائی؟"

کاؤنٹر پر رکھے دو لیز کے پیکٹ، دو جوس اور ایک برگر دیکھتی، وہ کینٹین بوائے سے بل کا پوچھ کر، بیگ میں سے پیسے نکالنے لگی۔

"ڈھائی سو ہو گئے۔"

"یہ لو۔"

اس سے پہلے کے ہیر پیسے نکال کر کینٹین بوائے کو پکڑاتی، مردانہ ہاتھ پیسے کاؤنٹر پر رکھ چکا تھا۔

ہیر نے اچھنبے سے اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کو دیکھا تھا، جو ہونٹوں پر مدہم مسکراہٹ لیے اسے ہی تک رہا تھا۔



کنٹین بوائے تو پیسے لے کر اور شہریار کے اشارہ کرنے پر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جب کہ ہیر نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے پیسوں کو دیکھا، اور پھر شہریار کو، ہیر کے ہونٹوں پر شہریار مسکراہٹ اپنی جھلک دکھلا کر جا چکی تھی۔

"اس سب کا مقصد؟"

پیسے بیگ میں رکھتی، کاؤنٹر پر سے چیزیں اٹھاتے وہ انجان بنتی استفسار کرنے لگی۔

"کہیں دیکھا تھا کہ ہیرو اپنی ہیروئن کا بل خود بھرتا ہے۔ بس وہی کر رہا تھا۔" شہریار نے اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملائے جتلیا تھا۔

"کوئی نہیں بچو!"

جتنی ریگنگ کرنی ہے کر لو۔ اس ریگنگ کا کچھ فائدہ تو مجھے بھی ہو۔"

ہیر نے لبوں پر گہری مسکراہٹ سجائے شہریار کو دیکھتے سوچا تھا۔ آنکھوں میں الگ شرارت امد رہی تھی، اور قہقہہ بمشکل حلق میں روکا ہوا تھا۔

تائشہ کے بقول وہ گروپ یہ سب صرف جونیئرز کو تنگ کرنے کے لیے کر رہا تھا، ہیر بھی اس کی بات سمجھتی اب اس ریگنگ سے خود کو فائدہ پہنچانے کا جواز تلاش کرنے لگی تھی۔ اور آج موقع خود چل کر پاس آیا تھا۔

اور موقع سے فائدہ اٹھانا تو ہیر یوسف بہت اچھے سے جانتی تھی۔

"وہ کل تم نے کچھ کہا تھا۔"

شہیار نے ارد گرد دیکھتے، جھجھکتے ہوئے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

وہ کنٹین سے باہر آچکے تھے، ہلکی پھلکی دھوپ کا مزہ لیتے سوڈنٹس گھوم پھر رہے تھے اور کچھ کتابیں سامنے پھیلائے دھوپ سینک رہے تھے۔

"کون سی بات؟"

نا سمجھی کا مصنوعی تاثر لیے وہ دیکھنے لگی۔

شہیار نے گہری سانس لی، کتنا مشکل مرحلہ تھا۔ کل تو ضیغم نے کشتی پار لگوا دی تھی۔ آج اسے اکیلے ہی ہمت کرنی تھی۔

"کل تم نے کہا تھا نا کہ سوچ کر بتاؤ گی۔"

"کس بارے میں؟"  
پھر وہی لاعلمی کا اظہار۔

"میرے بارے میں!۔"

اب کی بار اس کے لبوں کے کنارے پر مچلتی شریر ہنسی، شریار کی نظروں سے چھپ نہ سکی  
تبھی اسکی آنکھوں میں جھانکتا پورے حق سے سوال کیا تھا۔

ہیر لمحے بھر کو ٹھٹھکی اور پھر گھبرا کر آنکھیں پھیر گئی۔ اس قدر معنی خیز فضا سے پلو چھڑا کر  
قدم اٹھاتی اس کے پاس سے گزر کر جانے لگی۔

اسکا ٹھٹھکنا اور پھر نظریں پھیر جانا شریار کے دل کی دھڑکنوں کو منتشر کرنے کے لیے کافی  
تھا۔

"کہاں؟"

اسے جاتا دیکھ وہ سامنے آکھڑا ہوا۔

"وہ۔۔"

کلاس لینی ہے۔"

ہاتھ میں پکڑی چیزوں پر گرفت مضبوط کرتے وہ گرڑبڑائی۔

شہیار کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس وقت تمہارا کوئی لیکچر نہیں ہے جو کہ سچ تھا، دل کو شاید اس کی گھبراہٹ پر ترس آگیا تھا تبھی ہوا میں سر دھنتے، اسے جانے کا کہہ دیا۔

وہ بھی جاتے جاتے لکی تھی۔

"شکریہ۔ اس سب کے لیے۔"

ہاتھ میں پکڑی چیزوں کی طرف اشارہ کرتی وہ مسکائی تھی۔

اور شہریار عالم تو اس مسکراہٹ پر پھر سے دل ہار بیٹھا۔ دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے جھک کر اس کا تشکر قبول کیا تھا۔

شہریار کے انداز پر کھلکھلاتی ہیر رخ موڑ کر چلتی بنی۔ چیزوں کو اپنے ہاتھ میں دیکھتی وہ ہلکا سا قہقہہ لگا اٹھی۔

کھانا تو اس کی کمزوری تھا اور وہ بھی مفت کا، جو ہیر یوسف کو تمام کھانوں میں سے لذیذ لگتا تھا۔

\*\*\*\*\*

"کیا ہو رہا ہے؟"

تالشہ اور عینا سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

جب کہ نظریں رجسٹر پر تھیں اور تالشہ عینا کو آسائمنٹ کا ٹاپک سمجھا رہی تھی جو دوسری بار بھی سمجھانے پر اسے سمجھ نہ آیا تھا۔

"آگئی تم، دو ادھر۔"

سر اٹھا کر ہیر کو دیکھا اور جوس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ہیر نے بیٹھتے ہی جوس اور باقی چیزیں پیچھے کھسکا لیں۔

"یہ میرا ہے۔ تم جا کر اپنا لے آؤ۔"  
مفت کی صحیح پر تھی تو اس کی، اب اپنا رزق اٹھا کر کسی کو کیوں دینا۔

"یہ سب تم اکیلی کھاؤ گی۔"  
تائشہ حیران ہوئی ان تین دنوں میں وہ یہ تو جان گئی تھی کہ ہیر کھانے کی شوقین ہے پر اس حد تک یہ آج معلوم ہوا تھا۔

"اور نہیں تو۔"  
برگر کا نوالہ لیتے جواب دیا تھا۔

تائشہ نے تھوک نگلتے اسے دیکھا تھا۔

"یہ کھانا جاتا کہاں ہے تمہارا؟"

بالآخر وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

"معدے میں، تمہارا کہاں جاتا ہے؟"

مسخرے پن سے کہتی وہ آدھا برگر چٹ کر چکی تھی۔ جب کہ عینا اور تائشہ اس کا چلتا منہ دیکھ رہی تھیں۔

"تمہیں پتہ ہے میری اماں مجھے کیا کہتی ہیں۔" بڑا سا نوالہ جو س کی مدد سے حلق سے اتارتے وہ دونوں سے گویا ہوئی۔

"وہ کہتی ہیں،

کھاوے بکری کی طرح، لاگے سوکھی لکڑی کی طرح۔

(کھائے بکری کی طرح، لگے سوکھی لکڑی کی طرح)۔"

کہہ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔ عینا کو تو آدھی بات کی سمجھ آئی تھی اور آدھی سر کے اوپر سے گئی تھی جب کہ تائشہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"بندے کو ہونا ہی ایسا چاہیے کہ جتنا کھائے پتہ ہی نہ چلے۔"

برگر کا آخری نوالہ بھی منہ میں رکھتے اس نے بات مکمل کی تھی۔

"یعنی بکری جیسا۔"

تالشہ نے قہقہہ لگاتے اس کی کہی بات لٹائی، تو ہیر نے گھورا تھا۔

تالشہ کا پہلے سے عینا کو سمجھا سمجھا کر گلا سوکھ چکا تھا۔ اور اب ہیر کو ٹھونستے دیکھ کر پیاس کا احساس بڑھنے لگا تھا۔ جسے ضبط کرتی وہ کھلے رجسٹر پر نظریں دوڑانے لگی۔

"اب آسائمنٹ کا بھی کچھ سوچ لو۔"

اور ساتھ میں یہ کہنا بھی نہ بھولی تھی۔

"آسائمنٹ کا نام نہ لو۔ مجھے ٹینشن میں مزید بھوک لگنے لگتی ہے۔"

گھٹ گھٹ کی آواز کے ساتھ جوس کا ڈبہ ختم کرتے منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

وہیں عینا نے بھی دھپ سے اپنے سامنے کھلا رجسٹر بند کیا تھا۔



"مجھے نہیں سمجھ آ رہی۔"  
خفگی طاری کیے وہ پھولے منہ کے ساتھ بولی تھی۔

"دو دفعہ تو سمجھا چکی ہوں۔"

اب بھی؟

تالشہ نے تھکن بھری سانس لیتے قدرے حیرانی سے پوچھا تھا۔  
عینا نے بھی ناراضی سے سر ہاں میں جھکا دیا۔

"کیا کیا ارمان تھے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے، کیا کیا سنا تھا اور یہاں کیا ملا؟  
یہ آسائمنٹ۔"

ہیر کے تو اپنے دکھ بہت تھے۔ عینا نے بھی لبوں کو باہر نکالے تاغید میں سر ہلایا تھا۔  
عینا کے لیے تو یہ پتھر توڑنے سے بھی مشکل تھا۔ کالج کے فائل میں بمشکل رٹے مار کر نمبر  
لیے تھے کجا کہ اب خود سے آسائمنٹ بنانا۔

"تمہیں اور چاہیے بھی کیا، تمہارے تو ارمان پورے ہو گئے، یونیورسٹی آتے ہی ایک لڑکے کو اپنا  
دیوانہ بنا لیا۔ وہ بھی سینیئر۔"

اسے تو ادھر دو!"

اسے باتوں میں الجھا کر جوس کا ڈبہ جھپٹتی، دوسرے ہاتھ سے بیگ کو اٹھا کر بھاگی تھی۔

ہیر جب تک اس اچانک پڑنے والی افتاد کو سمجھتی تائشہ انگھوٹا دکھا کر جا چکی تھی۔

"آغیہ اچھا دے گئی ہے۔"

تائشہ کی بات پر غور کرتے وہ خود سے بڑبرائی تھی۔ عینا کو آسائمنٹ کی فکر تھی تبھی وہ ہیر کی بڑبڑاہٹ پر دھیان نہ دے پائی۔

"عینا!"

جاو پلینز جوس لیتی آو۔ مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔"  
سستی کی عظیم مثال بنی وہ مزید پھیل کر بیٹھ گئی۔  
عینا نے حیران و پریشان تاثر لیے اسے دیکھا۔

"میں؟"

انگلی خود پر کرتے وہ یقین چاہ رہی تھی۔

"ہاں نا پلیر۔"

بہت پیاس لگ رہی ہے۔"

اسے پکارتے مہیجنے کے جتن کرنے لگی۔ وہ اکیلی کنٹین کیسے جائے اور اگر چلی بھی گئی تو کسے گی کیا۔ جھرجھری لیتے وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔

"عینا۔ تم چاہتی ہو۔ میں پیاس سے مر جاؤں؟" ہیر نے اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کچھ خفگی سے کہا تھا کہ عینا کو ناچار اسکے لفظوں کے کھٹور پن پر اٹھنا ہی پڑا۔

مشکل تو تھا یہ نیا تجربہ، لیکن کرنا تو تھا۔

\*\*\*\*\*

"کیا بے ہوگی ہے یہ!"

وہ ہنستے ہوئے بے دھیانی میں پیچھے دیکھتے جارہی تھی کہ زوردار تصادم کے ساتھ، ہاتھ میں پکڑے جوس پر دباؤ بڑھا اور جوس چھلک کر مقابل پر جا گرا۔ وہیں مقابل کے پتھر بھرے سینے سے ٹکر کی صورت میں درد کی شدت سے اپنے سر کو تھام گئی۔ وہیں ضامن اپنی سفید شفاف شرٹ پر دھبہ دیکھ کر چلا اٹھا تھا۔

"تم؟"

نظریں اٹھا کر سر تھامے تائشہ کو دیکھا تو غصہ کم ہونے کی بجائے مزید عود آیا تھا۔

"آپ دیکھ کر نہیں چل سکتے۔ کھمبے۔"

تائشہ بھی ٹکر کی صورت میں سر میں اٹھتی ٹھیس کو نظر انداز کیے گھورتے ہوئے بولی۔ آخری لفظ منہ میں بر بڑایا تھا جو ضامن نہ سن سکا۔

"تمہاری آنکھیں کہاں تھیں؟ یا چوہیا نے بٹن فلکس کرواتے ہوئے ہیں؟"

ہاتھ کی پشت سے شرٹ پر سے جوس کی چھینٹے جھاڑتا، اسکے الزام پر کلس کر بولا تھا۔

"چلو میری آنکھوں میں بٹن ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں کونسے ہیرے لگے ہوئے ہیں جو مجھ سے آکر ٹکرائے۔"

آدھا ڈبہ ہیر خالی کر چکی تھی اور کچھ ضامن پر گر چکا تھا، اس لیے ڈبے کو نیچے پٹختے استفسار کیا تھا۔

"او لڑکی!"

مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم جیسی لڑکی سے ٹکرانے کا۔

ساری شرٹ کا ستیاناس کر دیا۔

اپنے کئے لفظوں کی پرواہ کیے بغیر اڈے درشتی سے ڈپٹا۔

اور پھر سے شرٹ پر لگے داغ کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھ جیسی لڑکی؟"

کیا مطلب ہے آپ کا، کیسی لڑکی ہوں میں؟

تالشہ کو بھی اسکا لہجہ اور الفاظ دونوں ناگوار گزرے تھے، تبھی چٹخ کر جواب مانگا تھا۔

"لڑکی بھی ہو کہ نہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

وہ اس کے خاص لڑکوں جیسے حلیے پر مزید چوٹ کر گیا تھا۔  
بے رحم بنا تلخ لب و لہجہ اپنائے وہ تائشہ کے ذہن میں دھماکے کر گیا۔

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

کمال ضبط کا مظاہرہ کرتی وہ سنجیدہ صورت بنائے انگلی اٹھا کر تنبیہ کر رہی تھی۔ کوئی اور ہوتی تو ایسے لفظوں کی کاٹ پر دریا بہا چکی ہوتی۔

"او پتوہیا!"

چار فٹ کی دیوار، یہ رعب کسی اور کو دکھانا ضامن نواز خان ایسی وارنگز پر عمل نہیں کرتا۔  
رد عمل یہاں سے بھی سخت ہی موصول ہوا۔  
اسکی اٹھائی انگلی پر اپنی انگلی سے ضرب لگاتے ضامن نے بھی تنبیہ کی تھی۔

"ضامن نواز خان!"

تائشہ و سیم خان پر بھی غلطی سے اپنا رعب دکھانے کی غلطی مت کرنا۔  
کچھ جتلاتا سا لہجہ تھا اور دھونس بھرا انداز، ضامن نے بے اختیار اسکے لب و لہجے پر منہ بنایا  
تھا۔ جیسے کہنا چاہ رہا ہو۔

"کیا پدی اور کیا پدی کا شور بہ۔"

\*\*\*\*\*

ان چار دنوں میں وہ پہلی بار اکیلی کینٹن کی طرف بڑھ رہی تھی، آج اس کی ساتھی وہی گھبراہٹ تھی جو پہلے دن اسکے ساتھ تھی۔

دوستوں کی سنگت میں تو ڈر، گھبراہٹ اور ہر طرح کی بیزاری چھٹ گئی تھی۔ اتنا بدلاؤ تو آیا تھا کہ وہ اب خود کے لیے نئے دروا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مکمل نہ صحیح کوشش کرنا فی الوقت بہت تھا۔

آج بھی اسی کوشش کے پیش نظر وہ خود پر قابو پاتی من من بھاری قدموں کو اٹھاتی کینٹین میں داخل ہوئی تھی۔

معمول کے مطابق ہلکی پھلکی چل پہل تھی، سب اپنی خوش گپیوں میں محو تھے۔ کسی کا بھی دھیان عینا کی جانب نہ تھا۔ پھر بھی وہ ان کی ان دیکھی آنکھوں سے گھبراتی مٹھ مٹھ کر نظریں پوری کینٹین میں دوڑا رہی تھی۔ ننھا سادل دھڑکتا کسی اپنے کی موجودگی کی دعا کرنے لگا۔ شاید یہ قبولیت کا وقت تھا، اپنا نہ صحیح، لیکن مخلص شخص اسے نظر آ ہی گیا۔

وہ جس نے کل اسے نئی راہ دکھائی تھی، جس کے نرمی سی کہی گئی بات کا اثر لیتی وہ کل کے تمام لیکچرز اچھے سے تیار کر کے آئی تھی۔ کچھ گڑبڑاتے ہوئے جوابات بھی دیے تھے۔ اور مزید اس کی حوصلہ افزائی پروفیسر کے توصیفی کلمات نے کی تھی جس پر اس میں مزید لگن پیدا ہوئی تھی۔

"بھائی"۔

عینا نے اپنے مخصوص مدہم لہجے میں اسے پاس جا کر پکارا تھا۔

وہ جو کاونٹر پر کھڑا اپنا آرڈر دے رہا تھا۔ جانی پہچانی آواز میں انجانا سا طرز تخاطب سنتے پلٹا تھا۔ اور سامنے ہی وہ کھڑی، تمام تر معصومیت کا عکس چہرے پر ڈالے، مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اسے ہی تک رہی تھی۔



کل وہ پورا دن اور پوری رات، بے اختیاری میں اٹھتے خیالات اور دل میں آتے جزبات کو جھٹکتا رہا، دماغ نے الگ دل کو ایسے بچپنے بھری خواہشات پر ڈپٹا تھا۔

جس سے نہ ملنے کا تہیہ کیا تھا، آج وہی اس کے سامنے آکر تمام طے شدہ فیصلوں کو دگمگانے کے لیے حاضر تھی۔

ضیغم نے سختی سے جبرے بھینچیں، چہرہ بے تاثر تھا۔

اور ہنکار بھرتا گویا ہوا۔

"ہوں"۔

اس ازحد سنجیگی کا جواز تو یہ تھا کہ وہ بات ہی نہیں کرنا چاہتا، پر اصلیت سے تو دل ہی واقف تھا کہ یہ سنجیگی اور سرد مہری اس لفظ بھائی کی مرہون منت تھی، جو ضیغم ظفر شاہ کے کانوں کو رتی برابر نہ بھایا تھا۔

"وہ۔۔ میں۔۔ تھینکس کہنے آئی تھی"۔

کھلتا چہرہ یکدم سے مرجھا گیا تھا، مسکراہٹ سمٹ گئی تھی، مدہم آواز میں کہہ کر وہ نظریں جھکا گئی۔

"کس لیے؟"

اسکے چہرے پر چھائی اداسی دیکھتے دل نے احتجاج کیا تھا اور وہ کچھ نرم پڑا۔

"کل آپ نے بہت ہیلپ کی نا اس لیے۔"

وہی معصومیت، بے ضرر سا احساس، گول چشمے کو انگدشت شہادت سے ٹھیک کرتی وہ نرمی سے بولی تھی۔ لیکن مسکراہٹ آنکھوں اور لبوں پر اپنی چھپ نہ دکھلا سکی۔  
ضیغ کو اپنا رویہ برا لگا تھا۔ اسکی وجہ سے وہ خوبصورت مسکراہٹ سمٹی تھی، اس ازالے کے لیے وہ اس کے جواب میں نرمی سے مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں، اگر کوئی مشکل ہو تو بتانا میں حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

دل تو خیر پہلے ہی اس کے معاملے میں سخی ہو چکا تھا۔ فی الوقت دماغ کو نیند کی گولی دے کر سلاتے وہ نرم مسکراہٹ سجالے، اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

عینا کا مرجھایا چہرہ اس نرمی پر کھل اٹھا، آنکھوں میں چمک پھر سے عود آئی، بڑی بڑی گول آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک دیکھتے، ضیغم کے دل نے بے اختیار ایک دھڑکن چھوڑی تھی۔ اور پھر ارد گرد کا خیال کرتے وہ نظریں گھما گیا۔

عینا بھی کچھ حد تک پرسکون تھی، اس کی موجودگی میں ہی جوس خریدتی۔ اسی کے ساتھ کنٹین سے باہر آئی تھی۔

ضیغم اس سے معذرت کرتا، آگے بڑھ گیا۔

عینا بھی ایسے مخلص انسان کی معذرت قبول کرتی ہیر کی طرف آئی جو اپنے گرد لڑکیوں کا جھمگٹا بنائے نجانے کون سے راز و نیاز کر رہی تھی۔

\*\*\*\*\*

آج چھٹی کا دن تھا، صبح سے ہی بھابھیاں اماں کی بدلیت پر صفائیوں میں لگی تھیں، تو بڑی بھابھی ہمیشہ کی طرح کچن میں موجود پکوان چڑھا رہی تھی، جس کی بھینی بھینی خوشبو کچن سے ہو کر لاونج تک پھیلی ہوئی تھی۔

وہ صبح کے گیارہ بجے اٹھی تھی، اور ان تیاریوں کو دیکھ کر حیران ہوئی جو اسکے اٹھنے سے بہت پہلے شروع تھیں۔

اماں الگ چہرے پر کرخنگی طاری کیے نئے نئے حکم جاری کر رہی تھیں۔ اور بھابھیاں پھرتی کا مظاہرہ کرتیں انکے حکم کی تعمیل کر رہی تھیں۔

وہیں ہیر حیران پریشان سی دیکھے جارہی تھی، بھائی اتوار کے دن جلدی ہی دکان کو چلے گئے تھے، چھٹی کا دن تھا تو گاہک کی بھرمار بھی زیادہ ہونا تھی۔ اگر وہ ہوتے تو کچھ ان سے ہی جان لیتی، کہ آخر کون سا تہوار سر پر آن کھڑا ہے جو اتنی تیاریاں کی جارہی ہیں۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے بھابھی؟"

اپنے سامنے سے گزرتی منجھلی بھابھی کو روک کر سرگوشی میں پوچھا تھا۔

"بھو!"

باتیں بگارنے کو نہیں کہا میں نے، بہت کام پڑے ہیں۔ جا کمرے سے نئے کوور نکال لے آ

شاباش۔"

اس سے پہلے کہ بھا بھی کوئی جواب دیتیں، اماں نے انہیں منظر سے غائب ہو جانے کو ایک نیا حکم دیا، وہ سمجھتی سر ہلا کر کمرے کی طرف چلی گئیں۔

"کوئی آرہا ہے کیا اماں؟"

وہ تخت پوش پر بیٹھیں خشک میوے باریک باریک کتر رہی تھیں، ہیر نے بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر تجسس بھرا سوال کیا۔ اور گرمی کا ٹکڑا منہ میں رکھنے لگی۔

"ہاتھ نہ لگا اسے۔"

اسکے ہاتھ کی پشت پر چپت لگاتی وہ اس کے سوال کو نظر انداز کر گئیں۔

"اچھا نہیں لگا رہی ہاتھ، بتاؤ نا کون آرہا ہے؟"

کہیں تمہاری وہ سلمہ ستارہ تو نہیں آرہیں؟"

تجسس کے ساتھ ساتھ خدشہ بھی تھا، جس کے اظہار میں زیادہ وقت بھی نہ لگایا۔ سلمہ ستارے کے ذکر پر منہ ایسا ہو گیا تھا، جیسے کڑوے بادام کو چکھ لیا ہو۔

"اختری کو بلایا ہے، تیرے رشتے والے آرہے ہیں۔"

اسے گھورتے ہوئے کہتیں پھر سے چھری گری کے ٹکڑے پر چلانے لگیں۔

"کیا!"

اس ذکر پر منہ کھولے، وہ اچھل پڑی۔

"آہستہ بول، کان کے پردے پھاڑے گی کیا؟"

اسے ڈپٹتے وہ بغیر اس کے احتجاج کو خاطر میں لائے اپنے کام میں مگن رہیں۔

"اماں!"

میں کہے دے رہی ہوں، میں کسی بھی ایرے غیرے، نہتو خیرے سے شادی نہیں کروں گی، یہ یاد رکھنا۔

وہ بہت کچھ جتلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بہو!"

اسے لے جا اور کوئی ڈھنگ کا سوٹ نکال دے اس کے لیے۔

اور تو خبردار اگر تو نے اس بار کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو، ٹانگیں توڑ کر گھر بیٹھا دوں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

پاس سے گزرتی بھا بھی سے کستیں وہ پھر سے ہیر کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

ہیر نے ان کی دھمکی پر ناک سکیڑ کر دائیں بائیں بلائی، پہلے کہاں ان دھمکیوں سے وہ خائف ہوئی تھی۔

"اماں!

مجھے تو لگتا ہے میں تمہاری سوتیلی اولاد ہوں۔ اور اگر ایسا ہے تو آج میں بھی سوتیلی بن کر دکھاؤں گی۔ اگر مجھے لڑکا پسند نہ آیا تو منہ پر انکار کر دوں گی، یاد رکھنا۔"

شکوہ کرتے ساتھ ہی ہیر نے بھی اپنی طرف سے دھمکی دی تھی۔

"زیادہ پٹر پٹر نہ کر میرے سامنے اور جا کر تیار ہو جا، وہ لوگ کسی بھی وقت آتے ہوں گے۔"

اماں گھٹنوں پر زور دیتے بمشکل اٹھیں۔

عمر کے اس حصے میں جوڑوں کا درد انہیں زیادہ چلنے پھرنے نہیں دیتا تھا لیکن پھر بھی گھر کی سربراہ ہونے کے ناطے وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرواتی تھیں، بھویں بھی فرمانبردار تھیں، تو زندگی اچھی گزر رہی تھی، بس ایک ہیر ہی تھی جس کے ساتھ منہ ماری ہو جاتی تھی۔

"ایسا سبق سکھاؤں گی نا انہیں کہ اماں تم بھی یاد رکھو گی۔"

ہیر ان کی ڈانٹ کو نظر انداز کرتے پیر پٹختے ہوئے کمرے میں چلی گئی، لیکن اپنی سنانا بھی نہیں بھولی تھی۔

\*\*\*\*\*

مہمان آچکے تھے، ہیر کو بھی جیسے تیے بھا بھیاں منا کر تیار کر چکی تھیں۔

ہلکے گلابی رنگ کے جوڑے میں دمکتا سنہری مائل چہرہ گلابی دوپٹے کے ہالے میں قید تھا۔ بلاشبہ وہ حسین تھی، نقوش بھی قابل دید تھے اور کچھ چہرے پر ہوئی زیب و زینت کا بھی کمال تھا کہ بھا بھیاں کے منہ سے بے اختیار ماشاء اللہ نکلا تھا۔

وہیں وہ بھی دوپٹہ کا پلو دانتوں میں دبائے شرمائی تھی۔



بھابھی کے سمجھانے پر کہ ایک دفعہ لڑکے کو دیکھ لو، کیا پتہ وہ تمہاری شرطوں پر اترتا ہو۔ وہ اس بات کے سچ ہو جانے کی دعا کرتی مان گئی تھی۔

"السلام علیکم"

بھابھیوں کی سنگت میں اس نے مہمان خانے میں قدم رکھا، اور دھیمی آواز میں سلام کیا تھا۔

وہاں بیٹھے تمام نفوس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی۔ انہیں گلابی دوپٹے کو سلیقے سے سر پر جمائے نظریں جھکائے کھڑی لڑکی بہت پسند آئی تھی، ان کی کھلی بانچھیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔

جب لڑکے کو دیکھنے کا تجسس بڑھا تو نظر کی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔ تین عورتیں ایک ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں، جس میں سے وہ ادھیڑ عمر اختری بھوا کو ہی جانتی تھی۔ اور ان کے ساتھ والے صوفے پر پچیس، چھبیس سالہ سانولے رنگ کا لڑکا بیٹھا تھا۔

ہیر نے اسے دیکھ کر بے ساختہ جھرجھری لی، وہ کہیں سے بھی اس کے خوابوں میں بسنے والا شہزادہ نہیں لگ رہا تھا۔

اختری بھولڑکے کی نوکری کا بتا رہی تھیں کسی کمپنی میں منیجر کے عہدے پر فائز ہے، باپ دکان چلاتا ہے۔

ہیر تو مانو آسمان سے زمین پر جا گری تھی، کیا سوچا تھا اور کیا نکلا۔

"بیٹا جی، کیا کرتی ہو آپ؟"

وہ منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے بنائے اختری بھولڑکی زبانی لڑکے اور ان کے خاندان کی تعریفیں سن رہی تھی کہ لڑکے کے ساتھ آئی ایک عورت نے ہیر کو مخاطب کیا تھا، شاید لڑکے کی ماں تھی، ہیر کو اس کے انداز سے تو یہی لگا۔

"جی!"

کچھ بھی نہیں۔"

دانت پیستے وہ زبردستی کا مسکرا کر بولی تھی۔ جہاں مہمانوں کے تاثرات بدلے تھے وہیں اماں کا گلا خشک ہونے لگا۔

"کچھ تو کرتی ہونگی آپ؟

آپ کی امی تو بتا رہی تھیں کہ آپ پڑھ رہی ہیں۔"

یہ غالباً لڑکے کی بہن تھی، ہیر نے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا تھا۔ انداز بتا رہے تھے کہ کافی تیز طرار ہے۔

"پڑھائی!

اسکا تو مت ہی پوچھیے۔ چیئنگ کر کے پاس کر ہی لیتی ہوں۔

وہ کیا ہے نا یہ پڑھائی مجھ سے ہوتی نہیں، اور گھر کے کام مجھے آتے نہیں، تو میں بس لمبی تان کر سو جاتی ہوں۔

ہاں ایک کام میں روزانہ کی بنیاد پر کرتی ہوں۔"

تعمیز اور حیا کا جو لبادا اوڑھا تھا، اسے کچھ دیر کے لیے پرے رکھتے وہ مکمل سچائی کا مظاہرہ کرنے لگی۔

وہیں اماں اسکی چلتی زبان پر اختری کی شکوہ کناں نظروں سے بچتے، ہیر کو گھور رہی تھیں، اور ہیر تو انہیں دیکھنے تک کی غلطی نہیں کر رہی تھی۔

"کو نسا کام؟"

اب لڑکے کو تجسس جاگا تھا، ہیر کا دل چاہا اپنے جوتے سے اس کا سر پیٹ دے اور کہے کہ تم جیسوں کو سیدھا کرنے کا کام، لیکن وہ مصنوعی شرم و حیا طاری کرتی گویا ہوئی۔

"وہ جی!"

مجھے ڈرامے اور فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے، تو یہ کام میں روز کرتی ہوں۔ ویسے آپ کے گھر کیبل تو ہے نا؟

وہ کیا ہے نا اس کے بغیر میرا گزارا نہیں۔" معصومیت سے بات ختم کرتی وہ ہاتھ کی ہتھیلی مسلتے ان کی خود پر پڑتی ہونق نظروں کو نظر انداز کر گئی، اور قہقہہ بمشکل لبوں میں دبایا۔

"بہن جی!"

معاف کیجیے گا پر آپ کی لڑکی اپنی عمر سے کافی چھوٹی ہے۔ ہمیں تو اپنے بیٹے کے لیے سگھر اور گھر گھر سستی سنبھالنے والی لڑکی چاہیے۔

میری مانیں تو ابھی اپنی بیٹی کی شادی کا نہ ہی سوچیں تو بہتر ہوگا۔"

لڑکے کی ماں اٹھتے ہوئے پرس سنبھالتی منہ پر ہی انکار کے ساتھ ساتھ مفت کا مشورہ بھی مار کر چلی گئیں۔

اختری بھی ڈھیروں شکوے کرتی بکتی جکتی ان کے پیچھے ہولی۔

اور یہاں ہیر میز پر پڑے لوازمات میں سے سموہ اٹھاتی منہ کو لگانے لگی۔ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ذرا شرم نہ آئی، ہماری عزت کو دو کوڑی کا کرتے ہوئے؟" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ چلتیں اس تک آئیں اور اس کی کمر پر ضرب لگاتیں غصے سے بولیں۔

"کیسی شرم اماں!

انہیں اپنے بیٹے کے لیے لڑکی نہیں، نوکرانی چاہیے تھی۔  
تو کیا تم بھیج دیتی مجھے کسی کے گھر کی نوکرانی بنا کر؟"  
وہ بھی اداسی طاری کیے ان سے حساب مانگ رہی تھی۔  
اماں نے جواباً منہ پھیر لیا۔

"دیکھو اماں!

تم نے رانی بنا کر رکھا ہے مجھے، میں نوکرانی بن کر نہیں رہ سکتی۔ میرے خوابوں جیسا نہیں پر  
 ان خوابوں کے پاسنگ بھی نہیں تھا وہ کالا کلوٹا۔  
 جانے دو نا اماں۔ کونسا وہ آخری رشتہ تھا۔"  
 ان کا رخ خود کی طرف موڑتی وہ مزید بولی۔  
 اماں بھی کہیں نہ کہیں اس کی بات کو سمجھ رہی تھیں۔ پر خفگی ہنوز قائم تھی۔

"اچھا غصہ تھو کو یہ سمو سے کھاؤ۔"  
 اپنے لیے بنائی سمو سے کی پلیٹ ان کے آگے رکھی تو وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی خفگی سے اٹھ کر  
 جانے لگیں۔

"نا کھاؤ، میں ہی کھا لیتی ہوں۔"  
 کندھے اچکا کر پہلا نوالہ ہی لیا تھا کہ سمو سے پلیٹ میں پھینکنے کے انداز میں رکھا۔

"کیا بھابھی!  
 یہ تو ٹھنڈے ہو گئے۔ سارا مزہ ہی خراب ہو گیا۔"  
 بھابھیاں میز پر سے تمام چیزیں سمیٹنے لگی تھیں۔ ہیر نے انہیں دیکھ کر کہا تھا۔

"میں ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔"

مسکراتے ہوئے جواب دیتیں وہ اسکے اطمینان بھرے چہرے کی نظر اتارنے لگیں۔

ہیر میں تو سب کی جان بستی تھی، جیسے بھائی جان نچھاور کرتے تھے، بھابھیاں بھی ہیر سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔ وہ تھی بھی تو دلچسپ کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنا لینے والی۔

\*\*\*\*\*

موبائل دو دفعہ بج بج کر بند ہو چکا تھا۔ گھر میں موجود دو ہی مکین تھے، جنہیں فرضت ہی نہیں تھی کہ بجتے فون کو اٹھا کر دلاسہ ہی دے دیا جائے۔

فون نے تیسری بار اپنی چنگھاڑتی آواز میں بجنا شروع کیا تو، مسرت بیگم جو کچن میں کھڑی برتن دھو کر رکھ رہی تھیں، ہاتھ دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے فون کے پاس پہنچیں، جو کسی ضدی بچے کی طرح چیخ چیخ کر بج رہا تھا۔

البتہ!

کہاں ہو بھئی؟

تمہارا فون کب سے بج رہا ہے، کوئی ہوش ہے تمہیں کہ نہیں۔"  
وہ جو کمرے میں موجود بیڈ پر کتابوں کا انبار لگائے، اوراق کو جانچا بکھیرے آسائمنٹ بنارہی  
تھی، مسرت بیگم کی آواز پر مصروف سے انداز میں سر اٹھایا۔

"امی۔ آواز ہی نہیں آئی مجھے۔

کس کا فون ہے؟"

ان کے ہاتھ سے فون پکڑتے، وہ سستی سے سکریں پر نظریں دوڑانے لگی۔

"خود ہی دیکھ لو۔ اور ہاں کام ختم کر کے کچن میں آؤ، تمہاری آپا رات کو آرہی ہیں، ڈھیر سارے

کام پڑے ہیں۔"

وہ کہہ کر پلٹیں۔

"جی امی۔ بس یہ ختم کر کے آئی۔"

فرمانبرداری سے ہاں میں ہاں ملاتی بچتے فون پر کال اٹھا کر اسے خاموش کرا چکی تھی۔



"کہاں بڑی تھی۔ جو فون ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔"  
ہیر نے چھوٹے ہی سوال داغا تھا۔ عینا کی طرف سے خاموشی تھی۔

ہیر نے تائشہ اور عینا کے ساتھ کانفرنس کال ملائی تھی۔ اب یہی دوستیں قریب تھیں تو آج کی اپنی کارستانی انہیں ہی تو بتانی تھی۔

"آسائنمنٹ بنا رہی تھی۔ تم بتاؤ کیا آفت آگئی جو بیل پر بیل دی جا رہی ہو۔"  
گہری سانس لیتے وہ تھکن سے چور ہوتی کمر ٹیک لگا کر سیدھی کرنے لگی۔

اور پھر ہیر نے من و عن آج کا سارا واقعہ ان دونوں کے گوش گزار کیا تھا۔

"وہ لوگ ایسے دم دبا کر بھاگے ہیں، مجھے نہیں لگتا اب دوبارہ اختری بھوا میرے لیے کوئی ایسا  
رشتہ لے کر آئیگی۔"

ہنستے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

تائشہ اور عینا کا حال بھی مختلف نہ تھا، ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھیں۔

"ایسا رشتہ کیا؟

وہ تمہارے لیے اب کبھی کوئی سا بھی رشتہ نہ لے کر آئیں۔"  
ہنسی کو مشکل سے دانتوں میں دباتے تالشہ نے اس کی تصحیح کی تھی۔

"ضرورت بھی نہیں ہے اختری بھوا کے لائے رشتوں کی۔

ہائے او رہا!

نجانے کہاں ہوگا میرا خوبصورت شہزادہ۔"

حسرت سے کہتی وہ عینا کو بولنے پر مجبور کر گئی۔

"ایک شہزادہ آیا تو ہے، پر تم خود ہی گھاس نہیں ڈالتی۔"

"کون؟"

ہیرا لچھی۔

"وہی سینیئر بھائی۔"

عینا کا اشارہ شہریار عالم کی طرف تھا۔ اس کی کہنے کی دیر تھی کہ تالشہ نے درشتی سے اسے لٹکا۔



"خبردار اگر اس گروپ کی بات بھی کی تو، وہ صرف اور صرف ہیر کو تنگ کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ نہیں یقین تو آزما لو۔"

"ویسے ایک بات ہے۔ وہ سینئر جیسا بھی ہے، آج کے کالے کلوٹے سے تو اچھا ہی ہے۔" تائشہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہیر اپنی سوچوں میں ہی گم تھی۔ اس نے تو اس لڑکے کی ہلکی سانولی رنگت کو سیاہ فام بنا کر رکھ دیا تھا۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا؟" یہ عینا تھی، جسے شاید شہریار عالم ہیر کے لیے پسند آچکا تھا۔ تبھی اشتیاق سے پوچھا۔

"سوچنا کیا ہے؟"

وہ صرف اسکا مزاق اڑانے کے لیے ایسی باتیں بول رہے ہیں۔ ہیر! تمہیں بھی کیا ضرورت تھی کہ ہر راہ چلتے کو اپنے ہیرو کے بارے میں بتاتی پھرو۔ ہیر کے بولنے سے پہلے ہی تائشہ، عینا اور ہیر دونوں کی کلاس لے چکی تھی۔

"اگر مزاق اڑا رہے ہیں، تو کیوں ناہم بھی ان سے تھوڑا بہت فائدہ لیں۔ پرسوں جو آسائمنٹ دینی ہے وہ اگر۔۔۔"

بیر کی بات سمجھتی جہاں عینا کی آنکھیں چمکی تھیں وہیں تالشہ نے سختی سے ٹوکا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ان جیسے چھچھوروں کے منہ لگنے کی۔

آرام سے بیٹھو اور خود آسائمنٹ کمپلیٹ کرو۔"

تھکن تو ان سے بات کرتے ہی اتر گئی۔

ان کے احتجاج کو خاطر میں نہ لائے وہ کتابیں سمیٹتی فون بند کر چکی تھی اور خود مسرت بیگم کا ہاتھ بٹانے کی نیت سے کچن میں چلی گئی۔

وہاں وہ دنیا جہان کی سستی کا عالمی اشتہار بنیں سوچ چکی تھیں کہ آسائمنٹ کس سے بہوانی ہے۔

\*\*\*\*\*

نومبر کے مہینے میں ہلکی ٹھنڈی ہوائیں ٹنڈ منڈ ہوتی شانوں کے پتے بکھیر رہی تھیں۔ سردی میں دھیرے سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آج بھی ٹھنڈ نے سورج کی تپش دیتی کرنوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ان کی تپش ماند کر دی تھی۔

وہ تینوں ٹھنڈ سے بچتیں، کلاس میں جانے کے لیے راہداری سے گزرتے ہوئے، نوٹس بورڈ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

ابھی وہ دیوار پر ٹنگے سبز بورڈ پر لگے شیشے سے اندر چسپاں نوٹس پڑھنے ہی لگی تھی کہ اسکی کمر سے کوئی آٹکرایا تھا۔

"آہ"

ہیر جو شہرتی رنگ کے جوڑے میں بالوں کو پیچھے باندھے، سفید رنگی دوپٹہ گلے میں ڈالے عینا اور تالاشہ کے سنگ گزر رہی تھی، شہریار عالم کی جب نظریں اس پر پڑیں تو وہ ایک بار پھر سے اس پر فریفتہ جمال ہوا تھا۔

قدم خود باخود اسکی جانب اٹھنے لگے تھے، جب رونی کو چہرے پر بدو ضعی سجائے ان کے پاس آتے دیکھا تھا۔ جو اپنے دوست کے ساتھ بات کرتا ہیر کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اسے دیکھتے شیری کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔ اور اس کے قدم پھرتی دکھاتے بڑھ رہے تھے۔

جبرے بھیجے وہ آج رونی کی آنکھیں نوچ ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا جو اس کی ہیر کو اوباش، بے لگام نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا، رونی اپنے لقندرے پن کا مظاہرہ کرتا جان بوجھ کر ہیر کی پشت سے جا ٹکرایا تھا۔

جہاں ہیر خود سے ٹکراتے وجود کو دیکھ کر بدحواس ہوتی ایک طرف ہوئی تھی، وہیں رونی یہ تاثر دینے لگا کہ غلطی سے اس کا بازو جا ٹکرایا۔

اور رونی کی حرکت کو دیکھ کر، شہریار عالم کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں تھیں، گردن کی نسیں تن گئیں اور وہ بھاگتا ہوا کچھ گز کا فاصلہ طے کرتا اس پر جھپٹا تھا۔

ضامن اور ضعیغ جو اسکے ساتھ تھے اس کے اچانک سے بھاگ کر جانے پر وہ دونوں بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

وہ روئی کے سر اور منہ پر تھپڑوں سے مارتا، اسے ڈھیر کر دینے کے در پر تھا۔ جب کہ ضیغم اور ضامن تو صیفی انداز اپنائے اپنے دوست کے چلتے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے، جس کے سر پر اس وقت جنون سوار تھا۔

اردگرد سے گزرتے اسٹوڈنٹس رک رک کر شیری جیسے غفلت شعار کے جنون کو دیکھ رہے تھے۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی اس سے ٹکرانے کی۔ بے غیرت انسان مار ڈالونگا تجھے۔" سرخ چہرے کے ساتھ لب بھیخے وہ بڑبڑاتا روئی کو گھٹنوں کے بل گرنے پر مجبور کر گیا تھا۔ شہیار نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پاؤں کی ٹھوک اس کے پیٹ پر ماری تھی اور اسکے بعد یہ سلسلہ رکا نہیں۔

وہ مسلسل بڑبڑاتا اس پر اپنی ٹانگوں سے ضرب لگا رہا تھا۔ وہیں ہیر سن سی کھڑی، شہیار کی اپنے لیے شیفتگی کا عالم دیکھ رہی تھی۔ عینا تو گھبرا کر تالشہ کے پیچھے جا چھپی تھی۔ اور تالشہ جیسی نڈر بھی اس حالت سے خائف ہوئی تھی۔

"چٹاخ۔"

شہریار کی بڑبڑاہٹ اور رونی کے بچاؤ کے لیے آتی آوازوں میں تھپڑ کی آواز بھی گونجی تھی۔ اور  
شہریار منہ پر ہاتھ رکھے دو قدم پیچھے ہوا تھا۔  
ہیر نے منہ پر ہاتھ رکھے وحشت سے آنکھیں پھیلائیں۔

رونی کا دوست جو شیر کی چانک رونی پر ٹوٹ پڑنے سے گھبراتا، ارد گرد بنتے جھمگٹے میں گم ہوا  
تھا۔ اب اپنے ساتھی کو آدھ موا ہوتے دیکھ ہمت کرتا پوری طاقت کے ساتھ تھپڑ رسید  
کرتا، شہریار کا جبر ہلا گیا۔

شہریار کے ہٹنے کی دیر تھی، رونی بھی اٹھتا اپنے ساتھی کی مدد سے شیر کی طرف بڑھا لیکن شہریار  
کے پیچھے ہی ضامن اور ضیغم کو سینہ تانے کھڑا دیکھ دونوں الٹے پاؤں بھاگے تھے۔

"تو ٹھیک ہے۔"

شہریار نے رونی کی پشت کو قہر بھری نظروں سے گھورتے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ضیغم نے  
اس کے کندھے پر بازو پھلاتے اسے ایسا کرنے سے روکا تھا، اور فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"جبر ہلا دیا کمینے نے۔"



اسکا بازو جھٹکتا وہ جبرے کو ہاتھ کی مدد سے دائیں بائیں ہلانے لگا کہ آنکھیں پھیلائے کھڑی ہیر کو دیکھ وہ اپنی تکلیف بھلا کر اسکی طرف بڑھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

وہی محبت کی آنچ میں تپتا لہجہ، جسے کل تک وہ صرف فریب سمجھ رہی تھی۔ آج سچائی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ساکت کھڑی تھی تھی۔

یہ کیسی محبت تھی، کیسی وارفتگی تھی اسکے انداز میں، کیسے وہ اسے تکلیف دینے والے کا حشر بگاڑ چکا تھا۔ اور اب بھی اس کی فکر میں گھل رہا تھا۔ یہی سوچتے اسکی آنکھوں کی پتیلیاں اس کے چہرے کے خدو خال پڑھتی حرکت میں آئیں۔

"ہیر!"

ٹھیک ہو۔"

جھنجھوڑنے کا حق تو نہیں رکھتا تھا پر اس کی آنکھوں میں دیکھتا اسے سکتے سے باہر لایا تھا۔

اپنی آنکھوں کو جھپک کر وہ پلکیں جھکا گئی، تالشہ کی باتوں میں آکر کتنا غلط سوچا تھا۔ شاید اس بدگمانی میں وہ ایسے شخص کو گنوا دیتی۔

"ہوں"۔

حلق سے پھنسی آواز نکلی تھی، شہریار نے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

وہ تو مفتون بن چکا تھا، اپنی ہیر کا، کوئی غلیظ نظر سے کیسے اسے دیکھ سکتا تھا، اسے کیسے چھونے کی سکت کر سکتا تھا، وہ اسکے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی محبت، شیریں کے دل میں بارش کی طرح برسائی گئی تھی جو دل کی دھرتی کو ہرا کر گئی۔

"شیریں اس سے پہلے کہ رونی داود کو لے کر ایچ او ڈی کے پاس پہنچے تو گھر چلا جا"۔

ضامن نے شیریں کان کے پاس جھکتے سرگوشی کی تھی۔

وہ جو ہیر کے سامنے اسکی جھکی پلکوں پر نظریں جمائے کھڑا تھا، ہوش میں آیا اور سوالیہ نظروں سے ضامن کو دیکھا۔

"گھر چلا جائے گا، تو ہم کہہ دینگے تو آج یونی آیا ہی نہیں تھا۔ ورنہ تو جانتا ہے بات کہاں تک جاسکتی ہے۔"

اب ضامن نے تفصیلاً اسکی سوالیہ نظروں کو جواب دیا تھا۔

ضیغم نے بھی سن کر ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ پر شیری کیا کرتا اسکا دل کسی صورت ہیر کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو نہیں کر رہا تھا۔

لیکن مجبور تھا، اس سب کی بھنک اگر یونیورسٹی کے چانسلر کو لگ جاتی تو ان سے کوئی بعید نہ تھا کہ اسے یونیورسٹی سے ہی نکال دیتے۔ ہر پہلو پر سوچتے، اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"اپنا خیال رکھنا۔"

ملائت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

آج وہ بالکل خاموش، لبوں پر قفل لگائے کھڑی تھی۔ کم ملاقاتیں ہی صحیح لیکن اسے شیری نے خاموش کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اور آج اسکی یہ خاموشی دیکھ شریار کا ایک بار پھر رونی کی چمڑی ادھیڑنے کا دل چاہا۔

اگر وہ جان لیتا ہیر کی خاموشی کی وجہ شیری کا جھلک دکھلاتا والہانہ پن ہے تو وہ مھنگڑا ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

اسے یوں ہی خود سے الجھا کر شیری تو منظر سے غائب ہو چکا تھا پیچھے وہ خفا نگاہیں اٹھائے تائشہ کو دیکھنے لگی۔ آخر کو ساری خناس اسی نے ان کے خلاف بھرا تھا۔ تائشہ اسکی خود پر پڑتی نگاہوں سے شرمندہ ہوتی، عینا کو ساتھ لگائے سر جھکا گئی۔

وہ اپنے غلط گمان پر اندر ہی اندر خود سے بھی شرمندہ تھی۔ شہریار کے انداز سے اندھا بھی جان جائے کہ وہ ہیر کے لیے کیسے جزبات رکھتا ہے اور انکی سچائی کیا ہے۔ تائشہ کے کیسے گئے حساب الٹے پڑ چکے تھے۔

"ویسے تو تم چار فٹ کی دیوار ہر اس جگہ ٹانگ اڑاتی ہو جہاں ضرورت نہیں ہوتی۔ آج کیا ہو گیا تھا؟"

ضیغم کے شہریار کے پیچھے جانے کے بعد ضامن ان کے ساتھ جانے کی بجائے تائشہ کے پاس آیا تھا اور دبی آواز میں تمسخر اڑاتا، تائشہ کو خون کے گھونٹ بھرنے پر مجبور کر گیا۔

وہ چاہتی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے ٹکا سا جواب دے سکتی تھی لیکن آج وہ خود شرمندہ صفت بنی کھڑی تھی کہ محض گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

ضامن اسکی چچی کو اپنی جیت گردانتا، ہونٹوں کے کناروں پر مسکراہٹ دبائے وہاں سے چلتا بنا۔

"تمہیں صرف کتابوں کو پڑھنا ہی آتا ہے، انسانوں کو نہیں پڑھ سکتی تم۔"  
سب کے جانے کے بعد اس سے شکایت کرتی، ہیر گھورتے ہوئے بولی تھی۔

"سوری یار۔"

مجھے لگا وہ بھی اس چھچھوند کی طرح ہوں گے۔  
وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ چکی تھی۔

\*\*\*\*\*

"بھائی۔"

ضیغم نے پھر سے اسکے وہی طرز تکلم پر آنکھیں میچ کر پھڑکتے دل کو تھپک کر چپ کروایا تھا۔

"کوئی کام تھا؟"

دید کی پیاس بجھی تھی تو دماغ کی بتی بھی جلی۔

وہ سامنے کھڑی پھر سے اس کے دل کے گرد بنائی چار دیواروں کو دھڑا دھڑا گرانے پر تلی تھی۔  
اسکے سوال پر عینا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ہوں"

ضیغم نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہنکار بھرا تھا۔

"وہ۔"

بھائی یہ آسائنٹ بنانی ہے۔ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہی یہ کیسے بنے گی۔"

گھنگریالے بالوں کو اونچی پونی میں قید کیے، صراحی دار گردن کو جھلاتے وہ پریشانی سے اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی۔

اسکے پھر سے بھائی بولنے پر ضیغم نے گہرے سانس لیا تھا۔ کوئی سخت تاثر دے کر وہ اس معصوم، بے ضرر لڑکی کے چہرے پر اداسی نہیں دیکھ سکتا تھا، تبھی سر ہلا کر آسائمنٹ کے موضوع پر نظر دوڑائی۔

"ہوں!"

اتنا مشکل تو نہیں ہے، میں اس سے متعلق مواد دے دیتا ہوں۔  
کافی مدد مل جائے گی تمہیں۔"

نرمی سے کہہ کر فائل دوبارہ اس کی طرف بڑھائی تھی۔

عینا جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ وہ اسے ناصرف آسائمنٹ سمجھا دے گا بلکہ بنا کر بھی خود دے گا، یہاں تو اس نے صاف ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔

"میں کیسے بناؤں گی، مجھے تو کچھ سمجھ بھی نہیں آتی اسکی۔"

لبوں کو باہر نکالے وہ روبانسی ہوئی تھی اور شکوہ منہ سے نکل ہی گیا۔

"سمجھنا ہے؟"

ضیغم نے مہنویں اچکائے سوال کیا۔

"مجھے آسائنٹ بنا کر دے دیں۔ تشو نے بنا بھی لی ہے کل لاسٹ ڈیٹ ہے لیکن میری اور ہیر کی آسائنٹ رہتی ہے۔"

اپنے مخصوص انداز میں انگدشت شہادت سے چشمہ آنکھوں پر درست کرتی، منت بھرا لہجہ اپنائے وہ ضیغم کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"ہوں!"

چلو آؤ لائبریری کچھ کرتے ہیں اسکا بھی۔"  
جیب سے موبائل نکالتے وہ اسے پیش کش کر گیا تھا۔

"میں بھی۔"

وہ تو یہ عذاب ضیغم کے سر دھر کر خود سکون چاہ رہی تھی۔  
لیکن یہاں تو وہ اسے ساتھ ہی گھسیٹنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں نا۔"



ٹاپک بھی سمجھا دیتا ہوں اور آسائمنٹ بنانا بھی سکھا دیتا ہوں۔ اس کے بعد تم خود بھی بنا سکو گی۔ چلو شاباش آؤ۔"

موبائل پر انگلیاں چلاتا مصروف انداز میں کہہ کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
اب یہ تو کہنے سے رہی میری آسائمنٹ آپ بنا دیں میں نہیں آؤں گی۔ ناچار اسے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا تھا۔

\*\*\*\*\*

نیا دن نئی خواہشیں، پرانے احساسات کو مزید پختہ کیے اترتا تھا۔  
جہاں وہ پوری رات کھلی آنکھوں سے شہریار کی چھوی اتارتی رہی تھی۔ وہیں یونی آتے ہی جس دھماکے نے اسکا خیر مقدم کیا تھا، ہیر نے اپنا ماتھا پیٹا۔

اگر وہ اتنی لاتعلقی کا مظاہرہ نہ کرتی، اور یوں چندر مکھی بن کر دیوداس کے خوابوں خیالوں میں رات وقف نہ کرتی تو اسے یاد رہتا کہ آج آسائمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔  
عینا اور تائشہ تو اپنی آسائمنٹ کی فائل اسکے سامنے لہرا چکی تھیں، اور وہ منہ لٹکائے خالی ہاتھ کھڑی تھی۔

"ہیر!"

تمہاری آسائمنٹ۔"

شہریار بھاگتا ہوا، پھولی سانسوں کے ساتھ نیلے رنگ کی فائل اس کے آگے بڑھاتے گویا ہوا۔

ہیر نے نا سمجھی سے پہلے شیر کی اور پھر اسکے ہاتھ میں پکڑی فائل کو دیکھا تھا۔

"میری آسائمنٹ؟"

بجائے فائل کو تھامنے کے ہیر نے الجھ کر سوال داغا۔

"ہاں تمہاری ہی ہے، یہ لو۔"

تجاہل آفرانہ سے کہتے فائل مزید آگے بڑھائی تھی۔ جو ہیر نے کچھ تردد کے بعد تھام ہی لی۔

اور جب کھول کر دیکھی تو واقع اس کو دیے گئے موضوع پر ہی آسائمنٹ تیار تھی، ہیر کا لٹکا منہ پھر سے پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

اور وہ اس کی مسکراہٹ پر دل ہی دل میں ضیغم کا شکر ادا کرنے لگا جس نے دوستی کا حق نبھاتے اسے ہیر کی آسائمنٹ کے متعلق بتایا۔

اور پھر وہ شام کا بیٹھارات تک آسائمنٹ کے چکر میں سب بھلا چکا تھا۔ یہاں تک صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی اور پھر بھاگتا دوڑتا وہ لیکچر شروع ہونے سے پہلے پہنچ ہی گیا۔

"شکریہ۔"

ہیر کے مسکرا کر کہنے پر شہریار کو لگا جیسے اسے محنت کا صلہ مل گیا ہو۔ کیونکہ جس سے محبت ہو اس کے چہرے پر جب آپ کی وجہ سے مسکراہٹ پھیلے تو وہ لمحہ حسین ترین لگنے لگتا ہے۔

"اسکی ضرورت نہیں ہے۔"

شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا

"پر مجھے اسکی (فائل) بہت ضرورت تھی۔"

آنکھوں میں تشکر بھرا تھا، اور وہ پوری سچائی سے بولی تھی۔

"جانتا ہوں"

شہریار نے سر کو خم دے کر کہا۔

اور ہیر، اس پر تو شیر کی جادو روز کے روز چل رہا تھا۔  
وہ دن بہ دن اس کے ہیرو کی اصطلاح پر پورا اتر رہا تھا  
ایسے ہی تو ہوتے ہیں ہیرو جو بن کے جان جائیں۔

ہیر کی نظروں میں شیر کی قدر مزید بڑھ گئی تھی۔

اور عینا، تالشہ تو خاموشی اختیار کیے دونوں اطراف کے جملوں پر غور کر رہی تھیں۔

\*\*\*\*\*

"کس سے پوچھ کر تو ہمارے گروپ میں ان تینوں کو شامل کر چکا ہے؟"  
ضامن درشت انداز اپنائے اس سے سوال کر رہا تھا۔

آج ہی شہریار ہیر، عینا اور تائشہ کو گروپ کا حصہ بنانے کا اعلان کر آیا تھا۔ وہاں بھی تائشہ نے اعتراض برتنا چاہا تھا پر ہیر نے اسے خاموش کروا دیا۔ لیکن ان کے جاتے ہی ضامن خاموش نہ رہا۔

"مجھے پوچھنے کی ضرورت محسوس بھی نہیں۔"  
بے پرواہی سے کندھے اچکاتے وہ ضامن کو مزید بھڑکا گیا۔

دن جیسے جیسے گزر رہے تھے، ویسے ہی وہ ہیر کو مزید سمجھنے لگا تھا۔ ہر وہ چیز کرنے لگا تھا، جو ہیر کو پسند تھی۔

ظاہری حلیے کے ساتھ ساتھ اپنی عادتوں میں بھی کافی بدلاؤ لے آیا تھا۔ ان دنوں داڑھی مونچھیں بھی آچکی تھیں۔ اس نے اب جانا تھا کہ داڑھی مونچھ وجاہت میں اضافے کے ساتھ ساتھ شخصیت کو بھی ظاہری طور پر کیسے مزید نکھار دیتی ہیں۔

"تو ٹھیک ہے پھر، جب سارے فیصلے تو نے ہی کرنے ہیں تو میرا یہاں ہونے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔"

وہ کھردرے لہجے میں کہہ کر جانے لگا۔

"کیا بلو اس ہے یہ؟

تو اچھے سے جانتا ہے کہ اس نے ہیر کو گروپ میں شامل کیوں کیا ہے۔  
اچھا ہے نا اسی بہانے انکی اچھی انڈر سٹینڈنگ ہو جائے گی۔

بجائے اس کے کہ تو دوست کے لیے اچھا سوچے تو، تو ہتے سے ہی اکھڑ رہا ہے "  
شہریار تو اسکے غصے سے جانے کا کہنے پر ہی خاموش ہو گیا تھا۔ ضعیف نے اسے روک کر کچھ ڈپٹ  
کر اور کچھ تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے ہیر سے کوئی مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی نوڈلز (عینا) سے کوئی مسئلہ ہے۔  
مسئلہ ہے تو صرف اس چار فٹ کی چوہیا سے۔"  
ضامن صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"وہ تجھے کیا کہہ رہی ہے، اپنی دوستوں کے ساتھ رہے گی، کونسا وہ ہر وقت ہمارے ساتھ  
ہوگی۔"

شہریار نے بھی تحمل سے اسے منانے کی غرض سے سمجھایا۔

"اس کی ہمت ہے؟ وہ چار فٹ کی دیوار مجھے کچھ کہہ سکے۔  
لیکن تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہو، زہر لگتی ہے مجھے وہ لڑکی، ذرا جو لڑکیوں والی بات ہو اس  
میں۔"  
کہتے کہتے آخر میں وہ جھنجھلایا تھا۔

"دیکھ۔ شیریں کے لیے اتنا تو کرنا پڑے گا۔ اب یہ تجھ پر منحصر ہے کہ تو اسے کیسے قبول کرتا  
ہے۔"

ضیغم نے آخر میں بندوق اس کے کندھے پر رکھ کر بات ہی سمیٹ دی۔

"میری ایک بات یاد رکھنا اگر اس چوہیا نے زیادہ چوں چاں کی نا تو، میں اس کی ہیر کا بھی خیال  
نہیں کروں گا، چوہیا کو اچھا سبق سکھاؤں گا۔"  
انگلی اٹھا کر انہیں پہلے سے ہی اپنے ارادوں کا بتلاتا وہ راضی ہو ہی گیا تھا۔

\*\*\*\*\*

"ہیلو!"

وہ جو تینوں بیٹھے آسائمنٹ کے نکات پر ایک دوسرے سے تبصرہ کر رہے تھے۔  
 منہا کی آواز پر تینوں نے بیک وقت سر اٹھایا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح ضیغم پر نظریں جمائے، چہرے پر آرائش کا مکمل سامان کیے خوبصورتی سے تیار  
 انکے سامنے کھڑی تھی۔  
 اور اسکی دونوں چیلیاں (دوستیں) بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔

"او منہا!

تم یہاں؟"

اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے، ضامن نے مخصوص لہجہ اپنائے استفسار کیا تھا۔

"ہاں۔ سوچا آسائمنٹ میں کچھ مدد لے لوں۔"

ایک ادا سے کہتی وہ کچھ قدم مزید قریب آئی تھی۔

ضیغم پہلے ہی سر جھکائے اپنے کام میں لگن رہا تھا، جیسے کسی کے آنے جانے سے اسے کوئی  
 فرق کی نہ پڑا ہو۔ منہا کو ایسی ناقدری پر ہمیشہ کی طرح غصہ تو آیا، پر وہ بمشکل غصہ دبا گئی۔



"مدد ہم سے یا..؟"

آنکھوں میں شرارت لیے اب کی بار شہریار نے بات آدھوری چھوڑی تھی۔  
وہیں ضیغم ان کی اس آدھوری بکواس کا مطلب سمجھتا، پین تیزی سے ورق پر چلانے لگا تھا۔

"ضئی!"

ہیلپ کرنا منہا کی۔"

ضامن نے اسے متوجہ کرتے، بھول پن کے ریکارڈ توڑتے معصومیت سے اسے گڑھے میں گرایا تھا۔

"ضیغم، کلاس میٹس کی تب ہیلپ کرے نا، جب اسے جونیئرز سے فرصت ملے تو۔"

منہا نے کھڑے کھڑے ہی لفظوں سے بہت کچھ جتلیا تھا۔

اس ذکر پر ضیغم کے ماتھے پر لکیر ابھری، سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ جواب تک اس کے جھکے سر پر نظریں ٹکائے ہوئے تھی، اسکے سر اٹھاتے ہی نگاہیں ضامن اور شہریار کی طرف مرتکز کرتے مزید کہا۔

"ضامن!"

پلیز مجھے آسائنمنٹ کے مین پوائنٹس ٹیکسٹ کر دینا۔ لگتا ہے ضیغم کچھ زیادہ ہی بڑی ہے۔"  
ضامن سے کہہ کر سرسری نگاہ ضیغم پر ڈالتی، طنز اس پر پھینکتی، بالوں کو جھٹکتے پلٹ گئی۔

"ضنی!"

یہ کس بارے میں بات کر رہی تھی۔"

جتلاتا انداز، طنزیہ لہجہ، آج تو منہا کے رنگ ڈھنگ ہی مختلف تھے۔

ضامن اور شہریار اس کے تیور دیکھ کر ہی الجھے تھے۔

کہاں وہ نرم لہجے میں میٹھاس سمائے ضیغم سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی اور کہاں  
آج اس کے انداز۔

"پتہ نہیں۔"

کندھے اچکاتا لاعلمی کا مظاہرہ کرتے، دل میں ہی بلا ٹلنے کا شکر ادا کرتے کہا۔

"تو کس جونیئر کی ہیلپ کر رہا ہے؟"

ضامن کے بعد شہریار نے بھی وہی سوال دوسرے لفظوں میں پوچھا تھا۔

"اس دن عینا کو آسائمنٹ بنا کر دی تھی۔ تمہیں بتایا تو تھا۔ شاید وہی بات کر رہی ہو۔"  
سرسری انداز اپنائے انہیں شک کا کوئی موقع نہ دیتے، اپنے کام میں لگن ہو گیا۔

"اچھا۔"

وہ دونوں بھی سمجھتے سر ہلا گئے۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سرسری لہجے کے پیچھے کیا کچھ چھپا تھا۔

عینا کی معصومیت، بھول پن اور بچپن کو ذہن میں رکھتے وہ شاید اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے تھے جو اشارہ منہا کر کے گئی تھی، اس زمرے میں عینا آ ہی نہیں سکتی تھی۔  
یہ تو انہیں لگتا تھا نا، پر ضیغم کے دل کا چور تو دن بدن منہ زور ہوتا جا رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

جب سے ہیر لوگ ان کے گروپ کا حصہ بنے تھے، روز ہی تالشہ اور ضامن کے بیچ کسی نا کسی بات پر جھگڑا ہو ہی جاتا تھا۔

نہ ضامن اسے نیچا دکھانے سے باز آیا تھا نہ ہی تائشہ نے اس کے کہے گئے جملوں پر خاموش رہنا سیکھا۔

اور یوں ان کی چوہے بلی جیسی نوک جھونک کے قصے اب ڈیپارٹمنٹ میں بھی مشہور ہو چکے تھے۔ جگہ بہ جگہ سوائے ایک دوسرے کے ساتھ الجھنے اور لڑنے کے ان دونوں کو شاید کوئی اور کام نہ تھا۔

روز کی بنیاد پر جھگڑتے یہ کیسے ممکن تھا کہ آج کا دن بھی سکھ شانتی سے گزر جاتا؟

"چا دا پو غی یون تہ ومنلہ؟"

(اس چوہیا کو یونی میں داخلہ کس نے دے دیا؟)

تائشہ ہیر اور عینا کے ساتھ ہی راہداری سے گزرتے ہوئے جارہی تھی کہ ضامن کی اونچی آواز میں کی گئی بڑبڑاہٹ پر کی تھی۔

ضامن کو تائشہ سے عجیب ضد ہو چکی تھی، اوپر سے تائشہ کا برداشت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے بڑھ چڑھ کر اس کے ساتھ مقابلے پر اتر آنا، ضامن مزید سلگ جاتا۔

ضیغم اور شہریار کے ساتھ ساتھ ہیر اور عینا بھی نا سمجھی سے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے ضامن کو دیکھا جو تمسخر بھری نظریں تائشہ پر ڈالے ہوئے تھا۔

"ہنغہ خوک دی چچ قطب می پوہنتون تہ منلی۔"

(اسی نے جس نے کھمبے کو یونی میں داخلہ دیا۔)

تائشہ نے کہاں ادھار رکھنا سیکھا تھا۔ ترخ کر اسی کے انداز میں جواب دیا۔

اور وہ چاروں ان دونوں کی زبان سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

تائشہ کے جواب پر مصنوعی ستائش چہرے پر طاری کیے، وہ آنکھیں جھپکنے لگا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم دونوں؟"

بالآخر شہریار نے بیچ میں بول کر انکی ایک دوسرے پر گھورتی نظروں کو خاموش کروایا تھا۔

"کچھ خاص نہیں میں تو بس پوچھ رہا تھا کہ چوہیا کھاتی کیا ہے؟"

وہ پہلے طنز کے اثر سے باہر آئی ہی تھی کہ ضامن نے اپنے تحت ایک نیا چٹکلا چھوڑا۔

"ضامن!"

تائشہ نے بولنے کو لب وا کیے ہی تھے کہ ضیغم نے ضامن کو تنبیہ کرتے پکارا تھا۔

"کیا؟"

میں تو بس جنرل نالج کے لیے پوچھ رہا تھا۔"

کندھے اچکاتا، معصوم بنتا، تائشہ کی طرف مزاق اڈاتی مسکراہٹ اچھالی۔  
اور سیٹی پر گانے کی دھن بجاتا بے پرواہی سے تائشہ کے پاس سے گزر گیا۔  
پیچھے ضیغم اور شہریار شرمندہ سے کھڑے تائشہ کو تاسف سے دیکھ رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

وہ کہتے ہیں نا ہاتھ بڑھاؤ تو بازو پکڑ لیا جاتا ہے، ایسا ہی کچھ بیچارے ضیغم کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

ضیغم کا مخلص انداز عینا کو مزید بڑھاوا دیتا تھا کہ وہ اپنے تمام تر مسائل کا حل ضیغم سے ہی نکلوانے لگی تھی۔ کوئی لیکچر سمجھنا ہو یا چھوٹا موٹا کوئٹہ تیار کرنا ہو اسے تائشہ کی بجائے ضیغم ہی اپنا خیر خواہ نظر آتا تھا۔

اور ضیغم ہر روز اسے اپنے سامنے دیکھ کر اب دل کے ہاتھوں ہار چکا تھا، کہیں نہ کہیں خود سے اعتراف بھی کر چکا تھا، لیکن روایتیں اسے اس اعتراف کو خود سے بھی چھپانے کا حکم دیتی تھیں۔

"شاہ صاحب!

آج کل بہت گھوم گھام رہے ہو۔"

داؤد اپنی کمینگی کا مظاہرہ کرتے، ضیغم کے ساتھ موجود عینا کا جائزہ لیتے ہوئے معنی خیزی سے بولا تھا۔

عینا جو ضیغم کے پاس لیکچر سمجھنے آئی تھی، چلتے چلتے وہ دونوں لائبریری کی طرف جارہے تھے کہ داؤد اچانک سے آٹپکا۔

عینا کہاں جانتی تھی لفظوں کے دہرے معنی اور نہ ہی وہ لہجوں کو سمجھ پاتی تھی، تبھی خاموش ضیغم کے ساتھ کھڑی رہی۔

"تجھ سے مطلب؟"

اکھڑے لہجے میں کہہ کر عینا کو چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

داؤد، رونی کے ساتھ شہیار اور ان کے گروپ کی شکایت کرنے گیا تھا، ایچ او ڈی نے دونوں فریق کی بات سنتے اور کچھ طلباء سے معلومات اکٹھا کرتے داؤد اور اس کے گروپ کو ایک بار پھر وارننگ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ وارننگ تو انہیں بھی ملی تھی لیکن ایچ او ڈی بھی جانتے تھے کہ جھگڑے میں اصل ہاتھ کس کا تھا، تبھی معاملے کو یونیورسٹی کے چانسلر تک پہنچنے سے پہلے ہی رفع دفع کروا دیا گیا۔

اور اب جا کر داؤد کی نظر ضیغم پر پڑی تھی، تو اسے پرانے بدلے یاد آئے تھے اور پھر اس کے ساتھ وہی دبو سی لڑکی دیکھ وہ حیران بھی ہوا تھا اور متحسب بھی۔

"مجھے ہی تو مطلب ہے، دوست ہوتے ہیں ہم۔ اب مجھے اتنا تو حق ہے ہی نا کہ تمہاری مصروفیت جان سکوں؟"

وہ جو اسکے سامنے سے گزرنے لگا تھا، داؤد نے ضیغم کے کندھے پر بازو پھیلاتے، عینا کی طرف اشارہ کرتے پھر معنی خیز جملہ کسا تھا۔

"دور رہ کر بات کر۔ انفیکٹ مجھے تجھ سے بات ہی نہیں کرنی، آگے سے ہٹ۔"

اسے جھٹکے سے دور کرتا وہ غصے سے دبی آواز میں غرایا تھا۔



پہلے مہنا اور اب اسکا مجنوں داؤدگلے کی ہڈی بن رہا تھا۔

وہیں عینا ان دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو کو الجھ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"کیا یار، بہن کو ساتھ لیے پھر رہے ہو اور ملوایا ہی نہیں۔"  
پدیترا بدلتا وہ عینا کے قریب ہوا تھا، جو گھبراتے کچھ قدم پیچھے ہوئی تھی۔

"بہن۔۔"

بہن نہیں ہے یہ۔"

وہ ہڑبڑا کر نیچی آواز میں بولا تھا۔

پہلے عینا کم تھی بھائی کہنے کے لیے اب داؤد نے بھی بہن بنا دیا تھا۔

"او۔ بہن نہیں ہے تو کون ہے؟"

ہونٹوں کو گول کیے وہ مصنوعی حیرانی دکھاتا پھر سے عینا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو جان کر کیا کرے گا؟"

،اپنے کام سے کام رکھ۔"

داؤد سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی بھی حد کی بے ہوگی دکھا سکتا تھا، تبھی سخت نظروں سے گھورتا اسکی بد وضعی کو شرافت میں رہنے کی تنبیہ کرتا عینا کو ساتھ لیے چل دیا۔

\*\*\*\*\*

وقت تو ہر قید سے آزاد ہے۔ اور وہ اپنی ہی رفتار میں گزر جاتا ہے۔ ایسے صبح شام میں ڈہلی، دن مہینوں میں اور ایسے ہی موسم میں سردی اپنی سختی کا اثر ماند کیے دہیرے دہیرے بہار میں قدم رکھنے لگی۔

اور یوں ان کا ایک سمیٹر تمام ہو گیا، دوسرے سمیٹر کی کلاسیں بیٹھ چکی تھیں۔ اس دوران بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ایک دن کے ڈہلنے پر کافی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، یہ تو پھر بھی مہینوں کا ذکر تھا۔

عینا رحیم، کافی حد تک اس ماحول میں گھل مل چکی تھی۔ ابھی بھی وہ گھبرا جاتی تھی پر ہیر اور تائشہ کی موجودگی اس کے اعتماد بحال کرنے میں ہر اقدام کر رہی تھیں۔ جب کہ منہا کی بے سرو پیر کی باتوں سے وہ سخت پریشان تھی۔ اس لڑکی کو جیسے اس سے کتے بلی کا بیر ہو۔ اسے

تو یہی لگتا تھا کہ پہلے دنوں میں ہوئی منہ ماری کی وجہ سے وہ ایسی ہے، اب وہ کیا جانے کہ ضیغم کو اس کے پاس دیکھ کر وہ کس قدر سلگ کے رہ جاتی تھی۔

اس دن کے بعد سے داؤد نامی بندے سے اس کا ٹاکر نہیں ہوا تھا۔ اس میں بھی ضیغم کا ہی ہاتھ تھا، جس نے فرصت سے اسے اپنے طریقے سے سمجھایا تھا۔

ایک بات اچھی تھی کہ جب بھی وہ حالات سے پریشان ہوتی پتہ نہیں کیسے پر ضیغم اس کے لیے نئی امید کی کرن اور پریشانی کا اینٹی ٹوڈ بن کر اسکے سامنے ہوتا تھا۔ ضیغم سے وہ کافی حد تک گھل مل گئی تھی اور یہ تائشہ اور ہیر کی غیر موجودگی میں ہی ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی میں تو ضیغم اس سے بات تک ہی نہیں کرتا تھا، ایسے لگتا تھا جیسے وہ اسے جانتا ہی نہ ہو پر عینا کا دھیان اس موڑ پر کبھی آیا ہی نہیں۔

تائشہ اور ضامن کا بلی چوہے کا کھیل ویسا ہی تھا۔ تائشہ کو تنگ کرنے کا، ضامن کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا اور ان دنوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب وہ آپس میں لڑے نہ ہوں۔

ضیغم ظفر شاہ کے دل میں محبت کی پینگ جھولتے، اب قدم جما چکی تھی۔ پر اس سب کی خبر نہ شہریار کو ہو پائی تھی اور نہ ہی ضامن کو۔ اسے صیخہ راز میں رکھنے کا فیصلہ بھی ضیغم نے خود لیا تھا۔ ایک تو یہ کہ انہیں بتا کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ دوسرا عینا کی وجہ سے بھی، وہ تھی ہی اتنی معصوم کے وہ خود کو اس کی طرف مائل ہونے سے روک نہ پایا پر وہ نہیں چاہتا تھا اس کی معصومیت پر کوئی حرف آئے، اور ویسے بھی ابھی اس کا ایم بی اے کا ایک سمسٹر رہتا تھا، جس کے بعد ہی وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ لے پائے گا۔

شہریار کو رانجھا کہنے والا، خود کتنا بڑا رومیوں بن چکا تھا اپنی ہی حالت پر ہنسی آنے لگی تھی اسے...!

پر سب سے بڑا بدلاؤ تو شہریار کی زندگی میں آیا تھا۔ اس پورے عرصے میں اس نے خود کو بدل کر رکھ دیا تھا، بالکل ہیر کی پسند کے مطابق خود کو ڈھال دیا تھا۔ بالوں کے کٹ سے لے کر پاؤں میں پہننے والی چپل تک ہیر کی پسند کی تھی۔ قصہ مختصر کے ہیر کے ہیرو کی جھلک اب شہریار عالم میں نظر آنے لگی تھی۔

اس میں ضیغم نے اس کی بہت مدد کی تھی، ضیغم کو کھیلوں میں اور خاص کر باکسنگ میں بہت دلچسپی تھی۔ ضیغم کا کسرتی جسم، اسکے ڈولے شولے اسکا بات کا ثبوت تھے۔ اور اب شہریار بھی دبلے پتلے جسم سے کافی حد تک کسرتی جسم کا مالک ہو گیا تھا۔ ضیغم ہی اسکا جم ٹرینر تھا۔

وہ جب جب اسکے چیلنج کو مکمل کر کے، اپنا پروپوزل اس کے سامنے رکھتا تھا، ہیر تب تب اسے نیا چیلنج دے دیتی، اسے مزہ آتا تھا شہریار کو اپنی انگلی پہ نچاتے ہوئے۔

اسے ملا ہی وہی تھا، جو اس کی بات کو مان دے اور شہریار نے جتنا اسے مان بخشا تھا وہ خود بخود اسکے دل میں اپنی جگہ بنا چکا تھا پر ابھی تک ہیر کا اسے گرین سگنل دینے کا خاص موڈ نہ تھا۔

\*\*\*\*\*

"اے!

ٹومی کو بھی لے آیا،

آلے (ارے)، ٹومی کتا، تو بھی پڑھنے آیا ہے۔"

شیری، ضامن کے بازو میں موجود چھوٹے سے بھورے رنگ کے کتے کو دیکھ کر طنزیہ بولا تھا۔

اور یہ انداز کتے کو ایک آنکھ نہ بھایا، بھاؤ بھاؤ کرتا، اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ کو گردن ہلا کر جھٹکا تھا۔

"ٹومی کے مالک نے پڑھ لیا ہے، اب ٹومی کی باری ہے۔"

شیری کے طنز پر ضیغم نے بھی ضامن کا مذاق اڑایا، جس پر وہ دونوں کو منہ چڑاتا ٹومی کو لیے ان کے پیچ چھوڑی جگہ پر گھس کر بیٹھ گیا اور اس کی اس حرکت پر وہ دونوں اسے گھورتے جگہ چھوڑ کر مزید دور ہوئے۔

"اب پریکٹس بھی یہ کتا ہمارے ساتھ کرے گا؟"  
شیری کو تو اس کتے سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔

"ٹومی"۔

ضامن نے کتا کہنے پر اسے ٹوکا تھا، جس پر وہ دانت کچکچا کے رہ گیا۔

"ٹومی کل سے کچھ کھا نہیں رہا، ابھی پریکٹس کے بعد اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"  
ٹومی کی پیٹھ سہلاتے وہ مزید بولا۔

"لگتا ہے کسی کی بددعا لگ گئی ہے۔"

کن اکھیوں سے شیری کو دیکھتے وہ چڑانے کے انداز میں بولا کہ اب کی بار ضیغم نے اس کے بازو پر چپت رسید کی جس پر ٹومی نے بھاؤ بھاؤ کرنا شروع کر دیا۔

"ڈا دیا میرے بچے کو..."

Tomy,calmyar

Tomy! Tomy!"

اسکے بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اسے چپ کروانے لگا کہ اس نے بھاؤ بھاؤ کرتے ضامن کی گود سے اتر کر سامنے دوڑ لگا دی اور وہ ٹومی ٹومی کرتا رہ گیا۔

ان کے آخری سمیٹر کے شروع کے دن تھے، لگے ہفتے سے ہی سپورٹ ویک بھی شروع ہو رہا تھا، جس کی وجہ سے کلاس بہت کم ہو رہی تھیں اور زیادہ وقت پریکٹس کو دیا جا رہا تھا۔

تالشہ بھی ابھی کلاس لے کر آئی تھی، اور اب وہ چلتے چلتے ریفریشمنٹ کرتی باسکٹ بال کورٹ میں جا رہی تھی تاکہ اپنی ٹیم کے ساتھ باسکٹ بال کی پریکٹس کر سکے۔ نیلی جینز پر کالی ٹی شرٹ ڈالے گلے میں مفلر کو لپیٹے، سپورٹ گرل دکھتی، کندھوں پر بیگ لٹکائے ایک ہاتھ میں جوس پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے برگر کھاتی مگن اندز میں جا رہی تھی کہ بھاؤ کی آواز پر ٹھٹھک کر رک گئی۔

یونیورسٹی میں کتا آجائے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے اسے وہم خیال کر کے وہ آگے جانے ہی لگی کہ متواتر بھاؤ بھاؤ کی آواز پر اپنے پاس دیکھا تو چھوٹا سا بھورے رنگ کا کتا، بڑے بڑے بھورے بالوں والا اسی کی طرف آ رہا تھا۔ یہ دیکھنا ہی تھا کہ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور ہاتھوں میں موجود چیزوں پر گرفت سخت ہو گئی۔

ابھی ٹومی کچھ ہی فاصلے پہ تھا کہ تالشہ اپنے بچاؤ کے لیے چیخ مار کر وہاں سے سرپٹ دوڑی تھی۔

"بچاؤ!"

چلاتی وہ گراؤنڈ میں ادھر سے ادھر دوڑ لگا رہی تھی اور ٹومی بھی اسکے پیچھے ہی تھا۔

سب رک رک کر اس تماشے کو نا صرف دیکھ رہے تھے بلکہ بجائے اسے بچانے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارے ہنس رہے تھے۔ ان لوگوں میں ضامن اور شیریں بھی شامل تھے، جو سامنے تالشہ کی بھاگ دوڑ سے حظ اٹھا رہے تھے۔



جیسے ہی ٹومی ضامن کی گود سے اتر کر گیا تھا، اور اسے تائشہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر ضامن اسے روکنے ہی والا تھا پر تائشہ کی دوڑ پر بجائے روکنے کے وہ مزید اسے پچکار رہا تھا۔

ضیغم نے کوشش کی تھی، ٹومی کو واپس بلانے کی پر ضامن کے پچکارنے پر وہ دم ہلاتا کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

تائشہ!

ڈرو مت وہ کچھ نہیں کہے گا۔ ایک جگہ سکون سے کھڑی ہو جاؤ۔  
تائشہ چلا چلا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی کہ ضیغم نے تائشہ کو سمجھانا چاہا جس پر وہ مزید بچاؤ بچاؤ کا شور ڈالنے لگی۔

اسی بدحواسی کے دوران اسکے ہاتھ سے جوس کی بوتل چھوٹ کر گری جس پر ٹومی رک کر بوتل کو سونگھنے لگا اور پھر دانت بوتل میں گاڑے پر کوئی خاطر خواہ نتائج نہ ملا تو ایک بار پھر تائشہ کے پیچھے بھاگا، بوتل کے تجربے کے بعد تائشہ نے برگر خود سے ہی زمین پر پھینک دیا اور ضیغم کی طرف دوڑ لگا دی۔

برگر کے ملتے ہی ٹومی پر شوق انداز میں برگر پر ٹوٹ پڑا۔ اپنے ٹومی کو برگر کھاتے دیکھ، ضامن نے پر بھی شوق انداز میں سیٹی بجائی۔ شیریں بھی ہنستا ہوا اس کے کندھے پر تھسکی دینے لگا جیسے ابھی چلتے منظر سے وہ کافی خوش ہوا تھا، اسی چکر میں اس کی نظر ہیر پر پڑی جو کمر پر ہاتھ رکھے، انتہائی غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

اس کے تیور بتا رہے تھے، کہ شیریں کی گئی کچھ دیر پہلے کی حرکات وہ دیکھ چکی تھی۔ شیریں کو لگا کہ اتنے مہینوں کی محنت جیسے پانی میں ملنے جا رہی ہو۔ تھوک نگلتے وہ ہیر کو دیکھنے لگا۔ جو کچھ دیر تک شیریں کو گھورتے وہ ڈری سہمی سی تائشہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی۔

ضیغم نے بھی ان دونوں کو ملا متی نظروں سے گھورا جب کہ ضامن شرارتا آنکھ کا کونا دبا کر اپنے ٹومی کے پاس چلا گیا۔ وہ تو خوش تھا ایک تو اس کے ٹومی نے بھی اپنے مالک کی طرح تائشہ کو ناک و چنے چبوائے تھے اور دوسرا وہ کھانے لگا تھا۔

شیریں وہ اپنے کیے کرائے پر پانی پھرتا دیکھ افسوس سے سر جھٹکتا، شیرینی کے کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے لیے نکل پڑا۔ شاید معافی تلافی سے کام بن جائے۔

"اے چیمپ!

برگر کھانا تھا، میرے بچے کو،...پتوسیا کو بھی کھا جاتے ساتھ ہی۔"

ٹومی کو بازو کے گھیرے میں لیے قہقہہ لگاتے وہ کینٹین کی طرف بڑھ گیا تاکہ ٹومی کو مزید برگر لے کر دیے جائیں آخر کو وہ کل سے بھوکا تھا۔

\*\*\*\*\*



"ہیر، میری بات سنو۔

ہیر...!"

ہیر تائشہ کو لے کر کنٹین ہی جا رہی تھی جہاں پہلے سے عینا موجود تھی کہ شیری دوڑتا اسکے پیچھے آیا تھا۔۔

ہیر اور عینا کو کسی بھی کھیل میں دلچسپی نہیں تھی، جب کہ تائشہ نے اپنی دلچسپی کے مطابق باسکٹ بال کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔

اسی غرض سے وہ ان کو کنٹین میں چھوڑ کر پریکٹس کے لیے جارہی تھی، ہیر کو اس سے کام تھا، تبھی وہ بھی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔

لیکن اسے پورے گراؤنڈ میں چیختے پکارتے دیکھ، ادگرد کھڑے لوگوں کی ذہنی پسمناہی پر افسوس ہوا جو بجائے اس کی مدد کے ہنس کر دہرے ہو رہے تھے۔

ان میں ضامن اور شہریار بھی تھے، جو تالشہ کو یوں بے بسی سے خود کو بچاتے دیکھ قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔

اور شہریار کو یوں مدد کرنے کی بجائے قہقہہ لگا کر تماشا کی صورت کھڑے رہنا اسے بہت کھلا تھا۔

اسکی نظر میں ہیرو صرف گڈ لکنگ ہی نہیں بلکہ ایک سپر ہیرو کی طرح تھا جو غلط ہوتا دیکھ نہ سکے۔ اور وہ ناصر ف غلط ہوتا دیکھ رہا تھذ بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔

وہ جو اپنے لیے اسکے والہانہ پن کو دیکھ کر اور جہاں اسے لگ رہا تھا کہ اب وہ اسکے ہیرو کی تعریف پر پورا اترنے لگا تھا، آج کی حرکت سے وہ صحیح معنوں میں دل برداشتہ ہوئی تھی۔

"کیا ہے؟"

شیری کے بار بار کے پکارنے پر وہ شدید غصے سے مڑ کر چیخنی تھی۔

"وہ.."

سوری."

اٹک کر معافی مانگی۔

اس دوران تائشہ کینٹین کے اندر جا چکی تھی جب کہ وہ دونوں ابھی بھی کینٹین کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"کس لیے؟"

غصے کو ضبط کرتی، سینے پہ ہاتھ باندھے وہ استفسار کرنے لگی۔

"وہ.. ایک چوٹی جو تم نے دیکھا وہ سچ نہیں تھا..."

اس کی بات سچ میں ہی کاٹ کر سخت نظروں سے گھورتی، وہ پھولی ستواں ناک کے ساتھ اسے مزید خوبصورت لگی۔

"تو کیا سچ ہے؟"

ہیر نے بدقت سوال کیا۔

"یار.."

وہ کتا.."

"ٹومی۔"

ابھی شیریں بول ہی رہا تھا کہ ضامن نے پیچھے سے ہانک لگائی اور ایک شرارتی مسکراہٹ دونوں کی طرف اچھڑتا کینٹین کے اندر چلا گیا

"دیکھا اسے۔"

ضامن کی حرکت پر وہ، شیریں کو گھورتے ہوئے بولی جس پر شیریں مزید معافی تلافی پر اتر آیا۔

"سو سوری۔ اس کی طرف سے بھی معافی مانگتا ہوں۔"

ہیرا!

میری بات تو سنو۔"

ابھی وہ بول ہی رہا تھا کہ ہیر پر پٹنٹی بغیر اس کی سنے کنٹین جانے کی بجائے دوبارہ سے گراؤنڈ کی طرف چلی گئی۔ غصے سے وہ اپنا ضبط کھونے لگی تھی، وہ اپنی کھولن کیسے اتارے یہی سمجھ سے باہر تھا۔ اور شیریں اب بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔

\*\*\*\*\*

"ہوگئی پریکٹس؟"

دھپ سے کرسی پر بیٹھی تو اس کی پھولی ہوئی سانسیں دیکھ کر عینا نے استفسار کیا۔

"اس انسان کے ہوتے ہوئے، کچھ ہو سکتا ہے۔"

ضامن اور اس کے کتے کی تصویر آنکھوں میں لہرائی تو سر جھٹکتی کہنے لگی اور عینا کا برگر اپنی طرف کھسکایا۔

"کس کے ہوتے ہوئے؟"

آنکھوں پر ٹکے چشمے کو مزید آگے کرتے وہ سوال کرنے لگی۔

"یار وہی ایک انسان میری جان کا دشمن پتہ نہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے اس کی؟"

"او ضامن بھائی۔"

تائشہ کی دشمنی تو ایک ہی سے تھی، اور عینا کے یوں ضامن بھائی کہنے پر اس نے برگر کو دانتوں سے بے رحم بن کر کاٹا، آنکھوں میں سختی الگ تھی کہ عینا کھسیانی ہنسی ہنستی، خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔

"اب کیا کیا انہوں نے؟"

پچھلے سمیٹر زیادہ وقت ان دونوں گروپ کا ہی ساتھ گزرتا تھا۔ سب ایک دوسرے کو اچھے سے جان گئے تھے، سوائے تائشہ اور ضامن کے، جو دونوں آپس میں چوہے بلی کی طرح جھگڑتے تھے۔

"بھاؤ.... بھاؤ"

ابھی تائشہ اسے ضامن کی حرکت کے بارے میں بتاتی کہ ایک بار پھر اسے کتے کی وہی آواز سنائی دی اور ہاتھ میں موجود لقمہ ٹیبل پر گرا اور وہ ساکت بت بنی سامنے دیکھنے لگی، جب کہ آواز پیچھے سے آرہی تھی۔



"ہائے، کتنا پیارا پی ہے۔"

عینا ضامن کے ہاتھ میں ٹومی دیکھ کر خوشی سے اٹھتی، تائشہ کو مکمل نظر انداز کیے، ضامن کی طرف بڑھ گئی اور تائشہ نے جھٹکے سے گردن کو خم دے کر ضامن اور ٹومی کو دیکھا۔  
ٹومی ایک کرسی پر بیٹھا، برگر تناول کرنے لگا جسے ابھی ہی ویٹر ٹیبل پر رکھ کر گیا تھا اور ضامن بڑے لاڈ سے اسکے بال سہلا رہا تھا۔

"ضامن بھائی!"

یہ آپ کا ہے۔"

ٹومی کی طرف اشارہ کرتے وہ پیار سے ٹومی کو دیکھنے لگی جس نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔

"ہاں نوڈل!"

میرا ہی ہے۔"

اس کے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھنے پر نرمی سے جواب دیا۔

جب کہ اس کے نوڈل کہنے پر ہمیشہ کی طرح اس نے ناک چڑھائی، پر پھر سے ٹومی کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

"میں اٹھالوں اسے؟

یہ کتنا کیوٹ ہے۔"

عینا کو کتے بلے ویسے بھی بہت پسند تھے، اور ٹومی تو تھا ہی چھوٹا سا خوبصورت پی۔ وہ تو خود ایک پی رکھنا چاہتی تھی پر مریم بیگم کو کتے بلی گھر میں رکھنے سے خاص چڑ تھی اور طویل بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ کوئی جانور گھر میں نہیں رکھا جائے گا۔

"ڈونٹ!..."

نہیں، وہ کاٹ لے گا۔"

عینا نے جیسے ہی ہاتھ بڑھا کر ٹومی کو اٹھانا چاہا، تائشہ اپنی جگہ سے اٹھتی پچھلے ٹیبل پر آئی اور اسے اس حرکت سے باز رکھا۔ تائشہ کو دیکھ کر ضامن کی پھر سے شرارتی رگ پھڑکنے لگی۔

"ہاں یہ کاٹتا تو ہے ہی، اور ساتھ ناپسندیدہ لوگوں کو پورے گراؤنڈ میں چکر بھی لگواتا ہے۔"

ضامن کے چڑھاتے انداز پر تائشہ نے نخوت سے لب سکیڑے تھے، اب تو ضامن کے ہاتھ میں ترم کا پتہ تھا، آتے جاتے وہ اسے اس بات پر سننا اپنا فرض سمجھے گا۔

"چلو ڈونٹ۔"

ضامن کے طنز کو نظر انداز کیے عینا کو ہاتھ سے پکڑتے وہ لے جانے لگی، پر عینا ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"نہیں۔ یہ کاٹنا نہیں ہے دیکھو کتنا معصوم ہے، مجھے اسے اٹھا کر دیکھنا ہے۔" وہ ضد سے کہتی پہر سے ٹومی کو بانہوں میں اٹھانے لگی کہ ٹومی نے اسکی یہ کوشش ناکام کی۔

"بھاؤ، بھاؤ۔"

اچانک سے دم ہلاتا وہ کھانے میں دخل پڑنے پر تیز آواز میں بھونکنے لگا کہ عینا ڈر کر دو قدم پیچھے ہوئی۔

"ارے ارے ٹومی!"

، یہ اچھی ہیں ان کے پاس جاؤ گے۔"

اچھی پر خاص زور دیتا، ٹومی کو اٹھا کر وہ لاڈ سے بولا، اور عینا کے ہاتھوں میں دینے لگا پر اس سے پہلے ہی جھٹکا دیتے ٹومی کا رخ تائشہ کی طرف کر دیا جس پر ٹومی نے پھر سے بھاؤ کہا اور ضامن کا اتنا کرنا ہی تھا کہ تائشہ نے چیخنا شروع کر دیا۔ اور ضامن کا قہقہہ پھر سے گونجا تھا۔

"تشو!"

کچھ نہیں ہوا یہ دیکھو!"

تائشہ آنکھیں بند کر کے چیخ رہی تھی، تبھی ضامن نے ہنستے ہوئے ٹومی عینا کو پکڑ لیا۔ وہ جو خود کو بڑی توپ چیز سمجھتی تھی آج ایک کتے سے ڈر رہی تھی!

"ضامن!"

یہ کیا حرکت تھی!"

ضیغم بھی اس کے پیچھے آتا، اسے ڈانٹنے لگا تھا۔

"آپ کو ذرا تعمیز نہیں ہے، لڑکی کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے!"

آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی لیے وہ خود کے ڈر کو سنبھالتی، ضبط سے بولی۔

"لڑکی، کون لڑکی؟"

ارے تم لڑکی ہو؟"

قہقہہ لگا کر اس کے پہناوے اور حلیے کا مذاق اڑاتے وہ بولا تو ایک پل کے لیے اس نے تائشہ کی آنکھوں میں ویرانی، دکھ دیکھا۔ اور اگلے ہی پل وہ آنکھیں جھپکتی وہاں سے چلی گئی۔

"تشو!..."

تائشہ کے جاتے ہی عینا نے اسے پکارا تھا پر وہ کنٹین سے باہر نکل گئی۔ تو وہ کندھے اچکا کر ضیغم کی طرف پلٹی۔

"ضیغم بھائی!"

یہ کتنا کیوٹ ہے نا!"

"ہاں.. ہے تو، پر تم سے کم!"

آنکھوں میں خاص چمک لیے، اور مونچوں کے نیچے موجود عنابی ہونٹ مسکراتے ہوئے نرمی سے بولا تو عینا اس کی بات پر کھلکھلانے لگی۔

نجانے کس ترنگ میں وہ ضامن کی موجودگی میں یہ سب بول گیا تھا۔

"چلو میرے ساتھ۔"

تالشہ آدھے راستے پہنچی، تو اسے اپنے ساتھ عینا نظر نہ آئی، تبھی واپس آکر وہ جھٹکے سے عینا کا بازو کھینچتی لے گئی، بغیر اس چیز کی پرواہ کیے کہ ٹومی بھی اس کے بازوؤں میں موجود تھا۔ جھٹکا لگنے پر ٹومی زمین پر گرا، جسے بروقت ضامن نے اٹھا لیا اور ایک غصے بھری گھوری اس کی پشت پر ڈالی جو عینا کو ساتھ کھینچے لے جا رہی تھی۔

"اسے لگی تو نہیں۔"

تھوڑی دیر پہلے کی گئی عینا سے بات کا اثر زائل کرتے ہوئے بات بدلی۔

وہ تو اچھا ہوا کہ تالشہ آگئی، اور بات آئی گئی ہوئی۔ پر یہ اس کی صرف غلط فہمی ہی تھی۔

"اسے تو نہیں لگی، پر لگتا ہے، تمہارے دماغ پر کچھ ضرور لگا ہے۔"

معنی خیزی سے کہتے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا، جس پر ضیغم نے نظریں چرائیں۔

"کیا مطلب؟"

مضبوط لہجہ اپناتا وہ لاعلمی کا اظہار کر گیا۔

"مطلب یہ کہ کچھ لوگ بڑے کیوٹ لگ رہے ہیں تمہیں!"  
چڑانے کا سا انداز اور جانچتی نظریں، ضیغم کو آہیل مجھے مار کا صحیح معنوں میں مفہوم سمجھ آیا تھا۔

"کچھ بھی بولتا رہے گا، چل پریکٹس بھی کرنی ہے کل میچ ہے۔"  
اسے جھڑکتا وہ بھی باہر کی طرف بڑھ گیا پر ضامن اس کی بات پر مطمئن نہیں ہوا آخر کو اسکی گناہگار نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔

"یار ٹومی!"

دال میں کچھ تو کالا ہے۔ کیا کہتے ہو؟"

اسکے بالوں کو سہلاتے پرسوچ سے انداز میں کہہ کر ٹومی سے رائے چاہی جس پر اسنے بھاؤ بھاؤ کی رٹ پھر سے لگائی۔

"کیا کہا؟.."

پوری کی پوری دال ہی کالی ہے۔"

خود سے ہی اخذ کرتے وہ قہقہہ لگا کر، شیری اور ضیغم کی تلاش میں باہر نکل گیا۔

کل کا میچ ویسے بھی بہت اہم تھا کیونکہ یہ داؤد کی ٹیم کے ساتھ تھا، اور تھا بھی دفاعی میچ، پچھلی بار کی فاتح ٹیم انکی تھی اور انہیں اپنے ٹاٹل کا دفع کرنا تھا۔

\*\*\*\*\*

موسم نے کروٹ بدلی تھی، اس کا تغیر قدرت سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہار کی نوید سنا رہا تھا اور رونقوں کا احساس دے رہا تھا۔ سردی دہیرے دہیرے گرمی کی چادر خود پر لپیٹ رہی تھی پر اب بھی موسم میں تانگی کا سا سماں تھا۔ وہیں وہ بھی رنگ برنگی تتلی کی مانند بیچ پر، دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تختوں کو پکڑے، بیٹھی تھی۔ گویا تمام کا تمام غصہ وہ انہیں پر اتار رہی ہو۔ سورج کی مدقوق سی روشنی جو کبھی بادلوں کی اوٹ سے آکر جھانکتی تو کبھی بادل پورے میدان پر چھڑ جاتے، کبھی کبھی پرتی اس روشنی میں وہ منہ پھولائے بیٹھی اسے ہمیشہ کی طرح دل کے بے حد قریب لگی۔

"میں ایک اچھا ہیرو نہیں بن سکا نا۔"



افسوس سے کہتے اسکے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ جو اب سامنے میدان میں ہوتے کھیل کو دیکھ رہی تھی۔ پر جواب ندارد..!

"آئی ایم سوری ہیر۔"

اتنا کہنا تھا کہ ہیر نے اب کی بار لب کشائی کی۔

"آپ کو یہ سب مذاق لگتا ہے نا۔"

اسکی آنکھوں میں ہلکی ہلکی ہتک آمیز نمی دیکھ کر شہریار تو مانو تڑپ اٹھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"میں جو ہیرو، ہیرو کرتی رہتی ہوں۔"

تلخ بھری ہنسی نے لبوں کا احاطہ کیا، شہریار اس تلخی پر شرمندہ ہوا۔

"مجھے ہیرو صرف نام کا ہیرو نہیں بلکہ کام کا ہیرو بھی چاہیے۔"

وہ جو میرے ساتھ چلے تو لوگ مڑ مڑ کر دیکھیں، اور وہ بھی جو مڑ مڑ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں

نکال لے۔۔۔

مجھے لگا تھا آپ سچ میں میرے ہیرو بنیں گے، پر آپ نے میرے احساسات کا اچھا مذاق اڑایا۔"

آج پہلی بار وہ اتنی سنجیدہ ہوئی تھی، اسے دکھ ہوا تھا، ساتھ ہی شہریار سے کچھ بدگمان بھی، پر شہریار کی تو روح فنا ہو گئی تھی وہ کتنا غلط سمجھ بیٹھی تھی اسے۔ اس میں غلطی اس کی بھی تو نہ تھی۔

"تم بہت غلط سمجھ رہی ہو ہیرا!"

تمہارا مذاق اڑانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا"

"واقع آپ میرے ہیرو نہیں بن سکے۔"  
اسے گہری جانچتی نظروں سے دیکھتی وہ ملامت سے کہتی اُج کر جانے لگی۔

"ہیرا پلیز!"

مجھے ایک موقع اور دے دو، میں سچا ہیرو بن کر دکھاؤں گا۔

میرا یقین کرو۔"

وہ منت کرتے، اسکا رستہ روک کر کہڑا ہو گیا۔

"آپ کو پتہ ہے ہیرو کی خاصیت کیا ہے؟

وہ صرف اپنے پیاروں کی ہی نہیں بلکہ ان کی بھی حفاظت کرتے ہیں جن کو جانتے بھی نہ ہوں۔

اور تائشہ تو میری دوست تھی!"

جتلاتے ہوئے وہ اس کے پاس سے گزر کر جانے لگی کہ شہیار نے اسکی کلائی تھام لی۔  
اب ایسا تھا کہ دونوں کے رخ مختلف سمت میں تھے اور ہیر کی کلائی شہیار عالم کے ہاتھ کی گرفت میں تھی۔

"صرف ایک موقع..

پہلا اور آخری موقع دے دو۔

میں وعدہ کرتا ہوں، ہر وعدہ وفا کروں گا۔"

دہیمے سے کہتے ہوئے وہ اپنا رخ اسکی سمت کر چکا تھا اور کلائی بھی آزاد کر چکا تھا۔

"میں تمہاری زندگی میں تمہارا ہیرو بننا چاہتا ہوں ہیر!"

ہیر کی خاموشی پر وہ اسکی آنکھوں میں جھانکتا اٹل لہجے میں کہنے لگا، اسکے آنکھوں میں جھانکنے پر وہ نظریں چراتی پھر سے میدان میں دیکھنے لگی جہاں کھیل ختم ہو چکا تھا، جیتنے والے جشن منا رہے تھے۔

پر ہیر کی خاموشی برقرار تھی۔

"تم جو بھی سزا تجویز کرو گی، مجھے قبول ہوگی۔"

شہریار کی اس پیش کش پر وہ نظریں اسکے چہرے پر مرکوز کیے اس کی کہی بات کی حقیقت ڈھونڈنے لگی۔

"کوئی بھی؟"

اس نے سوچنے کا موقع دیا تھا۔

"ہاں کوئی بھی۔"

ہیر کے سوال پر شیریں نے کھلے دل سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے کل کا میچ اگر آپ جیت گئے تو میں مان لوں گی کہ آپ واقع ہی ہیرو ہیں۔"  
دوبارہ سے میدان پر نظریں ٹھراتی رسان سے کہنے لگی جس پر شہریار کے اندر خوشی کے لہریں دوڑیں۔

"وہ تو ہم جیت جائیں گے ہمیشہ کی طرح".

شہریار کے جواب پر ہیر نے اسے ٹوکا۔

"نہیں، ابھی ایک ٹوسٹ ہے".

شاطرانہ ہنسی ہنستے وہ کہتے ہوئے خاموش ہوئی اور شہریار کی خوشی اب فکر مندی میں ڈبلنے لگی۔

"کیسا ٹوسٹ".

وہ سوالیہ نظروں سے ہیر کو دیکھنے لگا

"ٹوسٹ یہ ہے کہ کل کے میچ میں آپ لیڈ کرینگے، نہ ضامن بھائی ہونگے اور نہ ہی ضیغم بھائی".

اپنی کہہ کر وہ ایک بار پھر سے خاموش ہوئی۔ اور شہریار کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی جہاں الجھن اور فکر بیک وقت دیکھی جاسکتی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا؟۔

یوں تو ہم میچ ہار جائیں گے، اور کل کا میچ داؤد کی ٹیم کے ساتھ ہے۔

اُس آڈیفینڈنگ میچ ہیر!

(یہ ایک دفاعی میچ ہے ہیر!۔)

وہ اسے سمجھانے گا تھا، ہیر اس کے انداز پر مسکرائی تھی۔

"یہی تو بات ہے، جب آپ ایک ڈیفینڈنگ میچ جیت پائیں گے تبھی مجھے پتہ چلے گا کہ آپ مجھے کتنا ڈیفینڈ کر سکتے ہیں۔"

ہیر کا لہجہ مضبوط اور آنکھوں میں سختی تھی۔

ہیر کا ایسا روپ، اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا یعنی وہ اسی معیار پر ہی فیصلہ کرے گی تو اسے یہی معیار اپنانا ہوگا۔

"اوکے۔

اور اگر میں میچ جیت گیا تو..؟"

میچ جیتنے کے چانسز کم تھے، ضیغم کی غیر موجودگی میں داؤد کی ٹیم کے ساتھ کھیلنا خاصا مشکل تھا پر وہ پھر بھی پر امید تھا۔

"تو، میں مان لوں گی کہ آپ ہیرو ہیں۔"

کندھے اچکا کر کہتی وہ جانے کے لیے قدم اٹھانے لگی کہ شہریار اسکے بے حد قریب بڑھ آیا۔

"اور؟"

اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ استفسار کرنے لگا۔

"اور کیا؟"

ہیرا اسکی سانسوں کی تپش اور آنکھوں میں چمکتی جزبات کی رو کی تاب نہ لاتے ہوئے مسمنائی۔

"اور یہ کہ تم مجھے اپنا ہیرو مان لو گی؟"

ہیرا نے نظریں چرائیں، شہریار نے اپنا پر زور دیتے ہوئے اب بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں، وہ گھبرائی گھبرائی سی بدحواس ہوتی مزید دل میں گھر کر رہی تھی۔

"ہاں۔"

بمشکل کہتی وہ اس سے چند قدم دور ہوئی۔

"پر یہ میچ جیتنے کے بعد۔"

کچھ قدموں کی دوری بنا کر وہ جتلاتے ہوئے کہتی دھڑکتے دل کے ساتھ منظر سے غائب ہوئی، کہیں وہ پھر سے اتنا قریب نہ ہو جائے کہ اس کی دھڑکن تک سنائی دے، ویسے بھی شہریار سے یہ بعید بھی نہ تھا...!

اور وہ اس کی پھرتی پر ہنستا پیچھے سے،

"ان شاء اللہ"

کی آواز لگانے لگا۔

اگر اللہ نے چاہا وہ اس کا ہیرو ضرور بنے گا، جب ارادے پختہ اور نیت نیک ہو تو اللہ بھی اسی کے حق میں کن کہہ دیتا ہے۔

\*\*\*\*\*

"اب بول بھی لے کب سے پارک کے چکر کھڑا رہا ہے۔"



یونی میں بات ہو نہیں پائی تھی، پریکٹس کے دوران بھی وہ خود کو تیار کرتا رہا کہ کیسے ان سے کہے گا۔ اور پھر انہیں شام کو ایرجینسی کا کہہ کر قریبی پارک بلا لیا۔

ابھی بھی وہ دونوں اس کے الفاظوں کے منتظر تھے، جب کہ وہ سنجیدہ چہرہ لیے ادھر سے ادھر پارک کی لمبائی ناپنے میں مگھو تھا۔

"یار شیریں!.."

کیا بات ہے، بول نا" ضیغم کے بعد ضامن نے بھی اس سے پوچھا، جس پر وہ رکا اور ٹہر کر بولنا شروع کیا۔

"مجھے تم دونوں سے بات کرنی ہے۔"

وہی سنجیدہ تیور..!

"ہم غالباً اسی لیے یہاں موجود ہیں۔ اصل بات بول۔"

ضیغم نے تپ کر کہا۔

"ہیر نے کہا ہے کہ کل کا میچ لازمی جیتنا ہے۔"  
وہ تحمل سے بتانے لگا۔

"وہ تو ہم نے جیتنا ہی ہے۔"  
ضامن پر یقین تھا۔

"ہم نے نہیں صرف میں نے!"  
بوٹ کی نوک سے گھاس کو کھرچتے چہرہ جھکائے وہ ضامن کی بات کے جواب میں آہستہ سے بولا  
جس پر ضیغم کو شک گزرا۔

"مطلب؟"  
ضیغم کے استفسار پر شہریار نے دونوں دوستوں کو دیکھا اور آنکھوں میں التجا جب کہ چہرے پر دنیا  
جان کی معصومیت سموئے گویا ہوا۔

"یار،

میں جانتا ہوں یہ مشکل ہے تم دونوں کے لیے بھی، ہم نے بہت محنت سے داؤد کے مقابلے میں یہ مقام بنایا ہے۔

ضیغم، تیری محنت ہم سب سے زیادہ ہے۔ میں مانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شاید نہیں یقیناً میں تم دونوں کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ تم دونوں کے علاوہ یہ میچ ٹیم کو کوئی نہیں جتوا سکتا لیکن میں یہ رسک لینا چاہتا ہوں۔

ہیر کے لیے....!"

دونوں طرف سکوت تھا ضیغم اور ضامن اس کے کہ لفظوں کو سمجھنے لگے، یعنی وہ رسک لینا چاہتا تھا اس کی تین سال کی محنت پر، کتنی مشکل سے تین سال سے وہ اس جگہ پر فائز تھا، اور شہیار اس جگہ کو داؤ پر لگانا چاہتا تھا پر وہ پھر بھی خاموش تھا۔

ایک طرف انا تھی اور دوسری طرف دوستی!

"بات ختم،

پہلے میچ میں ہی صفایا ہو گیا۔

اس لڑکی کے لیے ہمیں یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ دیکھ شیری تو لمٹ کر اس کر رہا ہے۔ وہ تجھے اشاروں پر نچا رہی ہے اور تو ناچ رہا ہے۔

دا عجیب بند خُبنہ شاگردہ دہ!

(عجیب زن مریدی ہے یہ!)

ضامن کے غصے اور جھنجھلاہٹ کا گراف بڑھتا جا رہا تھا جسے تحمل کا لبادہ ضیغم نے اڑایا۔

"ضامن تعمیز سے۔"

شیری، اس نے ایسا کیوں کہا کہ ہم نہ ہوں اس میچ میں؟  
ضیغم کے پوچھنے پر شیری نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

"وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ کیا میں اپنے بل بوتے پر ایک میچ کا دفاع کر سکتا ہوں۔  
آئی ایم سوری یار۔ میں جانتا ہوں جو میں مانگ رہا ہوں وہ مشکل ہے تم دونوں کے لیے پر..."  
ہیر کی بابت بتاتے وہ یک دم سے ان کے سنجیدہ چہرے دیکھ کر رنجیدہ ہوا، ضیغم کا ٹاٹل سے  
لگاؤ وہ جانتا تھا، مانا کہ وہ فائل میچ نہیں تھا پر داؤد کے خلاف میچ وہ فائل سمجھ کر ہی کھیلتے  
تھے۔ جیسے داؤد میچ جیتنے کے لیے ایری چوٹی کا زور لگاتا تھا، ویسے ہی یہ بھی پورے من سے  
کھیلتے تھے۔

"وہ جو چاہے گی، تو کرے گا؟"

ضامن نے اسے غیرت دلانا چاہی جس پر شیری نے صرف ایک لفظ ہی کہا۔

"ہاں۔"

اور ضیغم کا قہقہہ برجستہ تھا، کیونکہ اب وہ خود بھی اس کشتی کا مسافر تھا، وہ خود بھی ایسے کئی رسک اپنے پیار کی خاطر لے سکتا تھا۔

"ضیغم یار یہ پاگل ہو گیا،

اسکا علاج کروا۔ تو ہنس رہا ہے۔"

ضیغم کو ہنستا دیکھ کر وہ دہائی دینے پر اتر آیا، شیریں نے اب بھی منہ لٹکایا ہوا تھا۔

"ایک بات بتا،

اگر وہ کہہ دے کہ دوستوں کو بھی چھوڑ دو،

تو چھوڑ دے گا؟"

ضامن کا انداز بالکل سنجیدہ تھا، ضیغم کی ہنسی پر بھی پاؤں آیا۔

اور شیریں نے تڑپ کر سر اٹھائے اسے دیکھا۔

"وہ ایسا کیوں کہے گی۔"

دل تو ڈوب رہا تھا، یہ سوال ہی جان لیوا تھا گوکہ اس پر عمل کرنا۔

"نہیں تو میرے سوال کا جواب دے۔

وہ جو کہتی ہے تو اندہوں کی طرح کرتا جاتا ہے۔ ابھی سے زن مریدی کے سارے ریکارڈ توڑ رہا ہے،

وہ کہے گی تو یہ بھی کرے گا؟"

اس کے سینے پر انگلی سے بجاتا وہ استفسار کر رہا تھا۔

ضامن اپنی بات پر بضد تھا، ضیغم بھی اسکی ضد سمجھ کر اسے چپ کروانے لگا۔ پر وہ شیریں کو احساس کروانا چاہ رہا تھا۔

"یار ایسا نہیں ہوگا۔"

شیریں بھی پکے من سے بولا تھا۔

"بالفرض ہو گیا تو؟"

ضامن اب بھی ضد پر اڑا تھا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو ہم دونوں مل کر شیری کا سر پھاڑ دیں گے۔"  
شیری سے پہلے ضیغم نے جواب دے کر قصہ ہی تمام کیا، تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اب چل رانجھے!  
تجھے پریکٹس کروائیں۔ اور کل ہمارا شیر جیت کر آئے گا۔"  
ضیغم دونوں بازو شیری اور ضامن کے گرد پھیلائے چلنے لگا، یہ اس بات کا عندیہ تھا کہ وہ شیری کی بات مان چکا ہے۔

"تھینک یو یار۔"

آئی لو یو۔"

ضیغم کے گلے لگتے شیری کافی جزباتی ہو گیا۔

"بکواس نہ کر۔"

اسے خود سے علیحدہ کرتے، ضیغم نے اسکی پیٹھ پر دھموکا جڑا۔

"اور رانجھے!

اگر تو ہار گیا تب بھی ہم مل کر تیرا سر پھاڑیں گے۔"  
اسکے جذباتی پن کو نظر انداز کرتے ضامن نے بھی اسے الٹی میٹم دیا۔  
جس پر شیریں پھر سے منہ بسور کر رہ گیا۔

وہ بھی جانتا تھا کل کا مقابلہ ان دونوں کے بغیر بہت مشکل ہونے والا تھا۔  
پر وہ کہتے ہیں نا

ہمت مرداں

تو مدد خدا

\*\*\*\*\*

آج کی صبح ٹھنڈی اور خشکی لیے ہوئے تھی، کل رات میں ہوئی بوندا باندی نے پورے دن پر  
خوشگواریت کا احساس ڈال دیا تھا۔



میدان کے اطراف ہجوم کی شکل میں طلباء و طالبات اکھٹا تھے، ایک طرف کرسیوں پر پروفیسر، ایچ او ڈی اور وائس چانسلر بھی براجمان تھے۔

کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ پر آج مانو سب بدل گیا ہو، پہلے جو تین پوتھائی یونیورسٹی کے افراد ایگل فر (Eagle Fur) کے ساتھ ہوتے تھے آج صرف ایک تہائی رہ گئے تھے۔ آخر کو اکثریت جیتنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے، داؤد کی ٹیم کا پلڑا بھاری تھا، آخر آج تو ایگل فر کے دو اہم کھلاڑی میدان میں نہیں اترے تھے، ضیغم اور ضامن۔

تماشاؤں کے ساتھ ساتھ ٹیم کے دوسرے کھلاڑی بھی شاکی ہوئے۔ پریشر ایگل فر پر موجود تھا جس کے باعث بہت بار کھلاڑیوں سے غلطیاں ہو رہی تھیں۔ شہیار اپنی طبعیت کے برخلاف آج لیڈ کر رہا تھا اور پوری جان مار کر میدان میں اتر رہا تھا۔

ہیر، عینا بھی ایک طرف ضیغم اور ضامن کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ضامن مسلسل چکر پہ چکر لگائے ہیر کی اس احمقانہ حرکت پر کوئی نہ کوئی جملہ کس رہا تھا جس کا جواب وہ محض گھور کر دے رہی تھی۔

اور عینا مسلسل فٹ بال کو نظروں کے گھیرے میں لیے، ادھر سے ادھر آنکھوں کو حرکت دے رہی تھی۔

جب کہ ضیغم بے چینی سے پہلو بدل کے رہ جاتا جب بال ٹائیگرز کے شکنجے میں ہوتی۔

"شیری ڈیفینڈ کر۔"

ٹانگر کنگ (Tiger king) کا کھلاڑی بال گول کی طرف لے جا رہا تھا، شہیار ساتھ ساتھ اس سے بال لینے کی کوشش میں محو تھا۔ پاؤں کو حرکت دیتے اس نے بال داؤد کی طرف بڑبائی، تبھی ضیغم نے آواز لگا کر اسے سمجھانا چاہا پر اس سے پہلے کہ شیری بال پر اپنے پاؤں کی گرفت ڈالتا، بال داؤد کے پاس تھی دو تین بار بال کو پاؤں سے ہلکا سا چھو کر آگے کو احتیاط سے گھسیٹنے لگا، یہاں تک کہ بال اور کیپر میں بہت کم فاصلہ رہ گیا اور پھر پوری زور سے کک مار دی، بال سیدھی کیپر کے ٹانگوں سے ہوتے ہوئے یکدم سے جگہ بناتی جالی پر اپنے گول کی چھاپ چھوڑ گئی۔ وہیں کیپر اپنی غلطی پر پشیمان سا گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔ شہیار نے غصیلی نگاہ کیپر پر ڈال کر دوبارہ سے پوزیشن سنبھال لی۔

"کوئی بات نہیں، شیر ٹف ٹائم دینا ہے۔"

ضیغم شہریار کا حوصلہ بحال کرتا، پھر سے باریک بینی سے کھیل دیکھنے لگا، ٹائیکرز آج پر امید تھے کہ جیت ان کی ہوگی اور یہی ہمت اور یقین کی وجہ سے وہ کھیل بھی اچھا پیش کر رہے تھے۔

"ٹائیکرز کی

1-0

سے برتری"۔

اس آواز پر ٹائیکر کے حامیوں نے الگ شور ڈالا۔ جس پر پھر سے ضامن نے ہیر سے کچھ کہا کہ وہ پیر پختی وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ چلی گئی۔

اب کھیل کچھ یوں تھا کہ بال شہریار کے پاؤں کے نیچے تھی، ارد گرد ٹائیکرز کے کھلاڑی تھے، اور اس سے کچھ فاصلے پر ایگل کے دو کھلاڑی موجود تھے، پھر اچانک سے اس نے بال ہوا میں اچھالی، کھلاڑی ساتھی نے ہیڈ مار کر بال دوسرے کھلاڑی ساتھی کی جانب بڑھادی اتنے تک شیریں نے ڈی کے اندر کی جگہ سنبھال لی تھی، اشارے سے بال اپنی طرف مانگی، بال جیسے ہی اس کے قریب کھسک کر آئی، زوردار کک سے بال کو جالی کی طرف اچھال دیا، پر اس طرح کہ کیپر کو چکمہ دے گیا، بال عین اس کے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے جالی میں گئی اور وہ نیچے بال کو پکڑنے کے لیے ہاتھ لیے کھڑا رہا۔

"ویل ڈن مائے بوائے".

"میرے چیتے".

ضامن اور ضیغم پہلے گول کی خوشی میں پرہوش ہوئے۔

"یہ پہلا گول ایگلز کی جانب سے تھا۔  
کھیل

1-1

سے برابر ہوا تھا۔

پہلے راؤنڈ کا وقت ختم ہوا۔"

شیری ایک نظر ضیغم اور ضامن سے دور کھڑی ہیر پر ڈال کر انکی طرف متوجہ ہوا جو اسے آگے کی تکنیک سمجھا رہے تھے، ساری سوچوں کو جھٹکتے وہ ان کی سننے لگا۔ آخر کو یہ میچ جیتنا شدید اہم تھا۔

"اس کی مجھے سمجھ نہیں آرہی".

شیری کے دوبارہ میدان میں جاتے ہوئے، ضیغم کو پرسکون دیکھا تو عینا نے چشمہ درست کرتے ضیغم سے کہا، جس پر وہ اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھنے لگا، اس سب میں وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ قرار جاں بھی اسکے ساتھ موجود ہے۔

"کیا سمجھ نہیں آ رہا۔"

کھیل دوبارہ سے شروع ہونے میں وقت تھا۔ تبھی پورا کا پورا اسکی جانب بڑھتے پوچھنے لگا۔

"یہی، بال کبھی ادھر جارہی ہے کبھی ادھر،

شیری بھائی جیت گئے ہیں؟"

عینا کے سوال پر ضیغم کا قہقہہ برجستہ تھا جس پر عینا نے اسے خشمگین نگاہوں سے گھورا۔

"تم فٹ بال نہیں دیکھتی؟"

ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں۔"

میری تو آنکھوں میں درد ہو گیا۔"

مسلسل ادھر سے ادھر بال کو جاتے دیکھنے پر نظریں گھمانے سے اسے اپنی آنکھیں دکھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اور ضیغم اس نازک سی گریبا کی نزاکت پر عیش عیش کر اٹھا۔

"دیکھا کرو،

مجھے پسند ہے۔"

بھرپور نگاہ اس پر ڈال کر بڑے مان سے ایک جملہ کہا، اور پھر سے سامنے دیکھنے لگا جہاں کھیل اب شروع ہو چکا تھا۔

"آہم اہم،"

اس سے پہلے کہ عینا ضیغم سے کچھ اور پوچھتی یا کہتی، ضامن جو کچھ دیر پہلے انکے پیچھے آکھڑا ہوا تھا گلا کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا جس پر ضیغم نے آنکھیں گھمائیں۔ یقیناً وہ سب سن چکا ہوگا۔

"ویسے یہ تو بتایا نہیں اسے، کہ تمہیں فٹ بال پسند ہے یا وہ۔"

بظاہر میچ دیکھتے ہلکی سی سرگوشی کی جسے صرف ضیغم ہی سن پایا۔  
ضامن کے اتنے درست اندازے پر وہ کچھ دیر تو چپ رہا اور پھر بولا۔

"تجھ سے مطلب؟"

اسے گھورتے دوبارہ سے میدان کی طرف نظریں گھمائیں جہاں بال ایگلز کے کھلاڑی کے پاؤں  
میں تھی اور کک مار کر بال جیسے ہی دوسرے کھلاڑی کی جانب دی تو بر وقت بال کو اپنی قید  
میں نہ لینے سے فائل ہو چکا تھا۔

"یعنی دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔"

یا پھر..."

دانستہ بات مکمل نہ کی

"یا پھر؟"

ضامن کی آدھوری بات کو نا سمجھی سے دہراتے پوچھا۔

"یا پھر۔۔"

پوری کی پوری دال ہی کالی ہے۔"

اس سے پہلے کہ ضیغم کوئی جواب دیتا، ایگلز کا ایک کھلاڑی گول کرچکا تھا۔

دونوں اس بحث کو بھلائے اس کامیابی پر جشن منانے لگے۔

ایگلز کو اب

2-1

سے برتری حاصل تھی۔

"بس تھوڑی دیر اور انگیج (Engage) رکھ،

ٹائم ختم ہونے ہی والا ہے۔"

ضامن نے بلند آواز میں شیریں سے کہا جس پر وہ صحیح کا اشارہ کرتا پھر سے کھیل میں شامل ہو گیا۔

کھیل ختم ہونے میں ایک منٹ باقی تھا، سب کی نظریں بال پر تھیں۔ جو کہ شہیار کے پاؤں کے گرد کبھی ادھر تو کبھی ادھر ہو رہی تھی۔ بال کو گھسیٹتا وہ گول کرنے کے لیے لے جانے لگا کہ



یک دم ٹانگر کے کھلاڑی نے پاؤں اٹکا کر بال اس مے شکنجے سے دور کی، اور اپنے کھلاڑی کی جانب اچھال دی۔ جسے بر وقت ساتھی کھلاڑی نے پاؤں مار کر گول کی جانب دھکیلا اور پلک جھپکتے بال جالی کو چھو گئی۔ اور وہیں وقت کے ختم ہونے کی آواز بھی گونجنے لگی۔  
شہریار شکستہ قدموں کے ساتھ پیچھے کو چلا۔

ایک ایک پلنٹی رکھی گئی تھی۔ کیونکہ میچ

2-2

سے برابر ہو چکا تھا۔

ضیغم اور ضامن مسلسل اسے ہوش سے کام لینے کا کہہ رہے تھے، جس کے دماغ میں نجانے کون کون سے وسوسے جنم لے رہے تھے۔

اگر وہ یہ میچ ہار جائے گا تو ہیر تو انکار کرے گی ہی کرے گی، ضیغم اور ضامن کی تین سالوں کی محنت آج اس کی وجہ سے مٹی میں مل جائے گی۔ صرف ایک ضد کو پورا کرنے کے چکر میں وہ ضیغم کی باندھی داؤد کے خلاف ضد کو ہرا دیگا!

"سن رہا ہے نا؟

پلنٹی کے لیے تو جائے گا۔"

ضیغم نے حتیٰ کہا جس پر شہریار چہرے پہ آیا پسینہ ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"میں نہیں کر سکتا،

پلنٹی پہ تو جاتا تھا ہمیشہ، یار۔"

انداز شکستہ تھا، جیسے وہ ہار مان چکا ہو۔

"تو ٹھیک ہے، نہ جاؤ۔

پر تو نے اگر کسی اور کو بھیجا تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا، سب پریشہ میں آئے ہوئے ہیں۔ اور ویسے بھی یہ فائل میچ نہیں ہے کہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھیں گے یہ تم جانتے ہو کہ تمہارے لیے یہ میچ کتنا اہم ہے۔

جانتے ہونا۔"

ضیغم نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تو وہ سر جھکائے ہی اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"شیری تو میچ ہار بھی جاتا ہے، تو ہمیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ہم پھر سے فائنل جیت لیں گے۔ ان شاء اللہ

پر ہیر کے بارے میں سوچ ایک دفعہ۔"

ضامن نے شہریار کو دل برداشتہ اور شکستہ دیکھ کر ہمت بندھائی جس نے واقع کام کیا۔ شہریار جس چیز سے ڈر رہا تھا ضامن نے وہ بوجھ نامحسوس انداز میں اسکے دل سے سرکا دیا تھا۔

"Go and Kill the waves"

"شیر!"

شوخی لہجے میں ضامن نے آج کل کا مشہور جملہ چھوڑا تو بے ساختہ شہریار کے چہرے پر مسکان آگئی، اور دونوں کے گلے لگتے وہ نئے جذبے کے ساتھ میدان میں گیا۔

ٹائیگرز کی طرف سے ناصر پلنٹی شوٹ کے لیے آیا۔

پوری ٹیم دفاع کے لیے آگے کھڑی تھی، ناصر نے ترچھے اطوار سے بال کو کک کی کہ وہ سیدھے گول میں جانے لگی پر کیپر نے یہ کاروائی سہل نہ ہونے دی اور بال کو اپنے دونوں ہاتھوں میں قید کر لیا۔

اس طرح اب تمام نظریں ایگلز پہ تھیں آیا کہ وہ گول کر پائیں گے کہ نہیں سب سانس روکے شہریار کے پاؤں کے نیچے موجود بال کو دیکھ رہے تھے کہ شہریار نے بال پر سے پاؤں ہٹایا ایک نظر ضیغم اور ضامن کی جانب دیکھا جو چہرے پر مسکراہٹ لیے اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ نظروں کا ارتکاز بدلتے، ہیر پر نظر دوڑائی تو وہ بھی بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی، اس پر نظر ڈال کر دوبارہ سے بال کو ڈیفینڈ کرنے والے کھلاڑیوں کی پوزیشن کو دیکھا اور پھر بال کو کک کی مدد سے ہوا میں اچھالا، اور بال دائیں طرف سے سب کے سروں سے ہوتی ہوئی جالی کے اندر چلی گئی اور سب آگے کھڑے بال کی پھرتی کو دیکھتے رہے، کہ کب وہ ان کے اوپر سے گئی، اور گول ہو گیا۔

فضا میں ہوٹنگ، تالیوں کی گونج ہونے لگی، یہ جیت واقع ہی ناقابل یقین تھی اور سب سے زیادہ شہریار کے لیے...!

"ہم جیت گئے؟"

ایگلز کے کھلاڑیوں نے شہریار پر دباوا بول دیا تھا، کوئی گلے لگ رہا تھا تو کوئی اس کے کندھوں کو تھپک رہا تھا۔

ضیغم اور ضامن بھی خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ تبھی عینا نے دونوں سے پوچھا۔

وہیں ہیر شہریار کی جیت پر وہاں سے چلی گئی تھی۔

"ہاں نوڈلز ہم جیت گئے ہیں۔"

خوشی سے کہتے ضامن پھر سے شہریار کو ہاتھ ہلا کر اپنی طرف بلانے لگا۔  
اور اس کے نوڈلز کہنے پر وہ ناک منہ چڑھاتے، اور پھر شہریار کو ہنستے ہوئے آتے دیکھ کر  
مسکرا نے لگی۔

ضیغم نے عادت کے برخلاف شہریار کی جیت کی خوشی میں سیٹی بجائی جس پر باقی تماشائی بھی  
سیٹیاں بجانے لگے۔

منہا جو ضیغم کے نہ کھیلنے پر داؤد کی ٹیم کو سپورٹ کر رہی تھی، اب اس کی ہار پر اسے صلواتیں  
سناتی اپنی چمچیوں مطلب سہلیوں کے ساتھ واک آؤٹ کر گئی۔

"شیر!"

کمال کر دیا۔"

ضامن گلے لگتا، مسرت سے گویا ہوا کہ شہریار طمانیت سے مسکرایا۔

میچ جیت کر اس نے ضامن اور ضیغم کو جو خوشی دی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔

"کانگریز بولیشنز بھائی".

عینا کے مبارکباد دینے پر وہ اسکی طرف متوجہ ہوا.

"او تھینک یو، چشمش".

ہنستے ہوئے اسکی عینک ٹیڑھی کی تو، وہ ٹیڑھی عینک کے ساتھ منہ پھلائے، کافی مضائقہ خیز لگی کہ تینوں کی ہنسی چھوٹ گئی. اور وہ اپنا مذاق بنتا دیکھ کر وہاں سے پیر پٹختی چلی گئی.

یہ بھی تبدیلی ہی تھی کہ ان کے ساتھ رہتے وہ اب مذاق پر چڑتی ضرور تھی پر آنسو بہانا کافی کم کر دیا تھا.

"چل پھر رانجھے، تیری ہیر کو مناتے ہیں".

اصل جشن کی تیاری تو اب شروع ہونی تھی، میچ کی جیت تو امتحان میں جیتنے کی ایک شرط تھی جو پوری ہو چکی تھی. ضیغم کے کہنے پر شہریار نے ضامن کی جانب دیکھا جس نے کندھے اچکا دیے، تو شہریار ضامن کے گرد بازو پھیلاتا وہاں سے جانے لگا.

"میں کہہ رہا ہوں، آخری دفعہ سوچ لے۔

میچ تو تو جیت گیا، تجھے کوئی بھی مل جائے گی۔ ہیر نے تجھے سچ میچ کا رانجھا بنا دینا ہے۔"  
 ازراہ ہمدردی وہ ساتھ ساتھ چلتا اسے ارادہ بدلنے کا کتنا کہہ چکا تھا۔ پر شہریار کو نہ پہلے فکر تھی  
 نہ اب!

\*\*\*\*\*

شہریار عالم شرط جیت چکا تھا۔ ہیر کی حالت ابتر تھی، نجانے اب وہ کب آن ٹپکے اور جواب  
 مانگے۔ وہ ہاں کہے گی بھی تو کیسے؟  
 اس وقت تو بول دیا تھا، اور آخری وقت تک اسے لگا تھا کہ وہ ہار جائے گا۔ پر وہ جذبات کے ساتھ  
 ساتھ عزم کا بھی پکا تھا۔ وہ جیت چکا تھا، میچ بھی اور اسکا دل بھی۔ وہ اس بات سے انجان نہیں  
 تھی، آخر دل اسکے وجود کا حصہ تھا، دل کی بے وفائی کا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا۔

ابھی یہی سوچتی وہ میدان کے دوسری طرف نکل آئی، کھیل ختم ہوا تو پیسہ بھی ہضم ہو چکا  
 تھا، تماشائی بھی منتشر ہو چکے تھے۔ کوئی کرکٹ کے میچ دیکھنے چلا گیا تو کوئی لڑکیوں کے مابین  
 ہونے والے مقابلے دیکھنے۔

وہ بھی بے دہیانی میں ایک خالی جگہ پر آپہنچی کہ اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، پلٹی تو اسکے پیچھے ہی شہریار عالم، سرخ چہرے کے ساتھ ہاتھوں پر بھی مٹی کے نشان، پسینہ سرخ ہوئی جلد پر بہہ رہا تھا۔

وہ ہیر کی آنکھوں میں جھانکتا اپنی آنکھوں میں موجود جیت کی چمک دکھانے لگا، جس کی چبھن سے ہیر آنکھیں پھیر گئی۔  
یعنی وہ وقت آگیا تھا۔

آج تو اسکے ساتھ نہ عینا تھی اور نہ ہی تائشہ۔ آج راہ فرار بھی نہ تھا اور دل وہ تو سب سے بڑا غدار تھا۔ اچھل اچھل کر ہاں کہنے کے پرتول رہا تھا لیکن دماغ کے لگائے ہوئے زبان پر قفل تھے۔

"تم نے کہا تھا کہ آج کا میچ جیتوں۔ وہ بھی ضیغم اور ضامن کے بغیر۔"

آواز میں سرور تھا، خوشی تھی۔

"لو جیت گیا۔"

اب!"



ہیر اس پر نظر نہیں ٹکا رہی تھی، کیونکہ دل اور آنکھیں دونوں نے اس کی موجودگی میں بے فائی کرنی تھی۔ تبھی دماغ کی سنتے جھجھک سے آنکھوں کا زاویہ بدلا۔

"اب؟"

ممناتے وہ شہریار کی ادھوری داستان کو دہراتے، انجان بنی!

"اب اپنا وعدہ وفا کرو۔"

اس کے ممناتے پر مونچھوں تلے لب مسکائے، ضیغم اور ضامن قدرے فاصلے پر تھے۔ شہریار کو تو سن پار ہے تھے پر ہیر کی ممناتے نے صرف شہریار کی سماعتوں تک کا راستہ طے کیا۔

"کیسا وعدہ؟"

انجان پن سے کہتی پل بھر کو اس کی لودیتی آنکھوں میں جھانکا جہاں اس سوال پر آنکھیں اور لب بیک وقت مسکائے کہ وہ نظریں جھکا گئی۔

"میرے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا وعدہ،

سکھ دکھ میں ساتھ نبھانے کا وعدہ،

دل میں تو ہو، گھر میں آکر بسنے کا وعدہ،

اور۔۔"

وہ لفظوں سے گویا اس پر سحر چھونک رہا تھا کہ اس کے بات آدھوری چھوڑنے پر وہ پوچھ بیٹھی۔

"اور؟"

اسکے سوال پر پھر سے مسکان نے پورے چہرے کو منور کیا اور بولا

"اور۔۔"

اپنا ہیرو مان لینے کا وعدہ۔"

تو ہیر کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑی اور پھر تیز رفتاری میں دھڑکنے لگا گویا پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

"ہیر۔۔۔!"

وہی جڑوں کے خمار میں ڈوبی پکار جس پر لرزتی پلکوں کو اٹھاتی، دوپٹے کو انگلیوں پر لپیٹتی پھر سے مسمنائی۔

"ہوں"۔

"اس رانجھے کی ہیر بنو گی"۔

گھٹنے کے بل جھکتے ہاتھ کی ہتھیلی پھیلائے وہ سوال کر رہا تھا۔ اس انداز پر گھبراہٹ کا شکار ہوتی  
آس پاس دیکھنے لگی۔

شہریار کے اس عمل پر ضیغم اور ضامن بھی اس کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ پر ہیر کی خاموشی  
برقرار تھی۔

"ہیر!"

پلیز!"

ضیغم نے التجا کی، شاید پہلے وہ ایسا نہ کرتا، لیکن اب خود اس راہ کا مسافر تھا۔ دوسروں کے راہ  
سے کانٹے اٹھائے گا تو خود کی راہ بھی سہل ہو جائے گی۔

"ہیر جی!"

مان جاو نا"۔

ہیر کی مسلسل خاموشی پر امید بھری نگاہوں سے ضامن نے دیکھا جس پر وہ پھر سے جھکے  
کندہوں کے ساتھ بیٹھے، ہاتھ پھیلائے شہریار کو دیکھنے لگی۔

کیا سے کیا ہو گیا تھا یہ شخص صرف اس کے لیے، اس کی پسند کے لیے اس شخص نے اپنا آپ  
بدل دیا۔ ان پانچ، چھ مہینوں میں وہ پہلے والے شہریار عالم سے بالکل الگ ایک نیا اور بہتر شہریار  
عالم بن گیا تھا۔ ایسے انسان کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت تھا۔ اور اس کا باغی دل اسے یہ غلطی کرنے  
بھی نہیں دینا چاہتا تھا تبھی اسے جھنجھوڑ کر ہاں کے لیے اکسانے لگا۔  
لیکن دماغ نے اپنی چال چلی اور زبان کا استعمال کیا۔

"میرے چھ بھائیوں اور میری امی سے آکر کہیے گا کہ رانجھے کے لیے ہیر چاہیے، اگر وہ مان  
جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

شرمیلی، لرزتی آواز میں وہ مشکل بولتی، دوپٹے کی کناری دانتوں میں دبائے وہاں سے بھاگ  
نکلی۔ پیچھے ضعیف اور ضامن کی بتیسی کھل اٹھی وہیں شہریار جھکے سر کے ساتھ ہاتھ کی ہتھیلی گرا  
کر شکستہ بیٹھ گیا، جیسے سب ہار گیا ہو۔

"اولے شیریں!"

کچھ پل گزرنے کے بعد بھی جب شہیار کی طرف سے کوئی خوشی نظر نہ آئی تو ضامن نے اسے جھنجھوڑا جس پر وہ خالی خالی نظر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

"وہ مان گئی ہے۔"

تو ایسے کیوں منہ لٹکائے ہوئے؟"

اسے تو مہنگڑے ڈالنے چاہئے تھے، جو منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

"اسکے چھ بھائی ہیں۔"

ہونٹوں کو باہر لٹکائے، وہ بے بس سا بولا کہ بات کو سمجھتے ضعیف کا قہقہہ گونجا اور ضامن نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"تو تو نے کونسا کشتی لڑنے جانی ہے۔"

ضعیف نے چھیڑا جس پر ضامن نے اپنا حصہ ڈالنا ضرور سمجھا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی اور دیکھ لیتے ہیں۔ اب پوری زندگی کھیلتا رہیں چھ بھائیوں کے ساتھ کشتی۔"

چڑتے ہوئے کہتے، بالوں کو مٹھی میں قید کیا۔

"کیا بک رہا ہے!"

ضامن کو جھڑکتے وہ شیر کی طرف پلٹا۔

"تو آنٹی انکل سے بات کر اور رشتہ لے جا سمیل..."

آگے وہ سب سنبھال لیں گے۔"

ضیغم کے پر خلوص مشورے پر شہریار کی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں جہاں ضامن نے پھر سے پہلو بدلا۔

"مطلب تم لوگوں نے ماننا نہیں ہے۔

اس چوہیا کی دوست کو ہی میری بھابھی بنانا ہے۔"

چوہیا کہتے دانتوں کو پیستا وہ چڑ کے بولا تو شہریار نے ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلائی۔

"سوچ لے،

ابھی ابھی وقت ہے۔"

ضامن نے پھر سے خبردار کیا۔

"اب تو کچھ سوچا بھی نہیں جاتا۔"

لوفرانہ آنداز میں آنکھ دباتے وہ ضیغم کو ساتھ لیے چل دیا، اور پیچھے ضامن اسکے ہمیشہ سے یوں ہی مسکراتے رہنے کی دعا دل سے کرتا انکے پیچھے ہوا۔

"عشق نے نکما کر دیا غالب

بندے ہم بھی کام کے تھے۔"

شعر کستے، وہ شہریار کو مزید چڑھانے لگا۔

پر یہ وقت گواہ تھا کہ اس عشق نے اسے نکھارا تھا، یہ عشق اس کے لیے مثبت ثابت ہوا تھا۔ جو کچھ شہریار عالم عرف شیریں سے پوری دنیا نہ کروا سکی، کچھ مہینوں میں ہی ایک لڑکی نے کایا پلٹ دی۔

اور وقت مسکرایا یہ عشق اور کتنوں پر لٹ کر برسے والا تھا کہ وہ ہوگا جو آج تک نہ کسی نے دیکھا اور نہ سنا، اور وقت تب بھی گواہی دے گا۔

کیونکہ وہ گواہ ہے ہر لمحے کا!

\*\*\*\*\*

"شیری!

آئی انکل مان جائیں گے نا۔"

ضامن کے سوال پر، ضیغم کے ہاتھ میں موجود کٹنگ بورڈ پر نفاست سے چلتی چھری پل بھر کو تھمی اور پھر سے اسی رفتار میں چلنے لگی۔

جس سے سوال کیا گیا تھا وہ تو ہر چیز سے بے نیاز کاونٹر پر بیٹھا پاؤں جھلا رہا تھا۔

"ہاں ماننا تو پڑے گا نا، آخر کو اکلوتی اولاد ہوں۔"

"اکلوتی اولاد ہے تبھی، انہیں اس رشتے کے لیے منانا مشکل بھی ہو سکتا ہے۔"

سلاد کو پلیٹ پر سجاتے، ضیغم نے بھی جواب دیا۔

"تو بھی کیا، نیا ضامن بن رہا ہے۔ اچھا اچھا بول!"

شیری بدمزہ ہوا۔



"صحیح تو کہہ رہا ہے یہ!"  
ضامن بھی ضیغم کے دفاع میں کوندا۔

"اچھا نہ بولنا، تم دونوں۔"

دھپ سے کاؤنٹر سے اترتا، سچی ہوئی سلاد کے پلیٹ اٹھا کر ڈائینگ پر لے گیا۔ جبکہ ضامن نے بھی کندھے اچکائے اور دم پہ رکھی بریانی پر سے ڈھکن اٹھایا کہ سوندھی سی خوشبو کچن میں پھیل گئی۔

"ہمارے اچھا بولنے سے کیا ہو جائیں گا؟"  
ضیغم نے گہری سانس اندر کھینچتے، یاسیت سے کہا، اصل خطرہ تو اسے اپنی طرف سے تھا، وہ تو شہریار سے بھی زیادہ ڈگمگائے راستے پر تھا نجانے اسکی منزل ہوگی بھی کہ نہیں..؟

"اچھا بولنے سے قسمت بدل سکتی ہے میرے دوست۔"  
شیری کے آس سے کہنے پر اس کے لب مسکرائے اور ہرکنوں نے ان شاللہ کہا۔

"ضئی، دیھ تیار ہے؟"

تینوں مل کر رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے، آج شیریں کی جیت کی خوشی میں ان کا ارادہ باہر وقت گزارنے کا تھا، پر رات کو ضیغم کی گھر سے غیر موجودگی کا مطلب تھا، بابا سائیں کی طرف سے سختیوں میں مزید اضافہ ہونا۔ تبھی تینوں نے مل کر ضیغم کے گھر پر ہی ڈنر کا اہتمام کیا۔

مل کر اس طرح کہ شیریں تو کلنگ کے ک سے بھی نابلد تھا۔ ضامن بس چیزیں پکڑانے اور پلیٹیں دھونے تک کا کام کر دیتا تھا جبکہ باقی کے سارے کام ضیغم ہی کرتا تھا۔ یہ واحد شوق تھا جس کی خبر شکیل کا کا نے بابا سائیں تک نہیں پہنچائی تھی۔ اس معاملے میں اسے نے چھوٹے سائیں کا راز اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔ اور کھانا پکانا بھی ضیغم نے کا کا سے ہی سیکھا تھا وہ بھی کافی مدتوں سماجتوں کے بعد ورنہ ان کے بقول تو پچولے پچو کے کا کام زنانیاں کرتی ہیں مرد نہیں!۔

"ویسے شیریں، یہ پاگل پن کرنے کی تجھے کیا سوچھی؟"۔  
کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگ چکا تھا، آج شکیل کا کا کو چھٹی دے کر، کھانا بھی انہیں کمرے تک پہنچا دیا تھا۔

اب وہ تینوں بیٹھے، ضیغم کے ہاتھ کی بنی مزیدار سندھی بریانی سے لطف اٹھاتے، ساتھ میں سلسلہ کلام بھی شروع کر چکے تھے۔

"پاگل پن کیسا؟"

چاول چباتے وہ بولا

"یہی، محبت!"

محبت پر زور دیتے وہ ہنسا، تو شیریں نے اسے گھورا۔

"تجھے کیا پتہ، محبت کا دوست۔"

یہ پاگل پن کیا نہیں جاتا، بس یہ تو ہو جاتی ہے، کبھی بھی کہیں بھی اور کسی سے بھی۔"  
خلاء میں دیکھتا، خیال کے پردے پر ہیر سے پہلی ملاقات کا منظر چھایا۔

وہ ایک ترنگ میں بولتا جا رہا تھا کہ ضامن نے لوکا۔

"اور کتنی بار ہوتا ہے؟"

ضامن نے ہنستے ہوئے استفسار کیا جس پر شیریں کا منہ بنا۔

"ہسنہ!"

وہ محبت ہی کیا جو کئی بار ہو۔ محبت تو ایک بار ہوتی ہے، ایک ہی شخص سے جو آپ کا سب کچھ بن جائے۔ اور وہ محبت دنیا کا حسین ترین جذبہ ہوتی ہے۔ جو کئی بار ہوتی ہے وہ محبت نہیں بے غیرتی ہے۔"

شیری اپنی بات کہہ کر کھانے میں لگن ہوا تو، اس کے آخری لفظ پر ضامن اور ضیغم کا قہقہہ پھوٹا۔

"محبت کچھ بھی نہیں ہوتی، یہ صرف ایک خالی ڈھول کی طرح ہوتی ہے میرے بھائی! جس کا بجنا محض دور سے اچھا لگتا ہے۔"

ابھی تجھے یہ محبت بڑی حسین لگ رہی ہے نا، بعد میں یہی چڑیل لگے گی۔"

ضامن کے فلسفے پر نفی میں سر ہلاتا ضیغم پہلی بار ان کی گفتگوں میں شامل ہونے لگا تھا، پر ہر بار کی طرح اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی مار دی۔

"تو ایسا کیسے کہہ سکتا ہے، محبت کی ہے کیا تو نے؟"

ضیغم نے تو مسخرے کے لیے یہ بات کر دی، پر وہ ضامن ہی کیا جو بال کی کھال نہ ادھیڑے۔

"میں نے تو نہیں کی، پر تو نے تو کی ہے نا۔"

ضامن کا آخری جملہ ٹھوس لہجے میں تھا، اور اسی یقین سے پر لہجے پر شیری کے منہ میں جاتا چمچ رکا اور وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب۔"

گرڑھڑاتا، تیزی سے چمچ، پلیٹ میں چلانے لگا کہ اس کی گرڑھڑاہٹ پر ضامن مسکراتا، نظریں اسی پر ٹکائے، قدرے اس کی طرف جھک کر، کچھ یاد دلانے لگا۔

"مطلب یہ کہ.."

تم سے زیادہ کیوٹ نہیں!

اور ہاں وہ کیا تھا

ہاں! ہاں!

دیکھا کرو، پسند ہے مجھے۔"

بھنویں اچکائے آخر میں تاغید چاہی تو ضعیف ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا یعنی بلی تھیلے سے باہر آ کے رہے گی۔

"کیا چل رہا ہے تم دونوں کے درمیان؟"

وہ دونوں تو شیریں کو بھلا بیٹھے تھے، جس پر اس نے اس الجھی سی گفتگو میں خود کو شامل کیا۔

"ہمارے درمیان نہیں پر، ان صاحب اور نوڈل کے درمیان ضرور کچھ ہے۔"

یہ بم شیریں کے کان کے پاس گرا کر ضامن دوبارہ سے کھانے پر ٹوٹ پڑا کہ ابھی کچھ دیر پہلے کوئی بحث چھڑی ہی نہ ہو۔

"ہیر کی دوست، وہ چشمش، مطلب کہ وہی نوڈل، کیا نام ہے اسکا۔۔۔"

ساکت سا ضیغم کو دیکھتا وہ حیرت سے گویا ہوا، پر اسے نام یاد نہیں آ رہا تھا اور ایک بار پھر سے بیچ میں بول کر ضیغم نے کلہاڑی اٹھا کر اپنے پاؤں پر ماری۔

"عینا۔"

ضیغم کے نام بتانے پر ضامن کی ہنسی نکلی۔ جسے وہ پانی کا گلاس منہ سے لگا کر روکنے لگا۔ اور ضیغم وہ اپنی بے اختیاری پر آنکھیں میچ گیا۔

"Un Believable!"

کرسی سے ٹیک لگا کر شیری ساتھ بیٹھے ضیغم کو دیکھتا گویا ہوا۔

"But its true!"

ضیغم نے ہار مانتے، آنکھیں نیچے کیے جرم کا اعتراف کر ہی لیا۔  
جو کہ ایک خوبصورت جرم تھا، اور جس کا انعام بھی خوبصورت ہونا چاہئے تھا۔

"اب ہو گیا یقین؟"

ضامن کے سوال پر شیری جو ابھی تک حیرانی کی کیفیت میں مبتلا تھا نفی میں سر ہلانے لگا، جبکہ ضیغم وہ تو ایک بھاری بوجھ سر سے سرکا کر اب پرسکون سا کھانے کا شغل فرما رہا تھا۔

"یار.."

مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا یہ سخت دل بندہ بھی محبت و حبت کر سکتا ہے۔"  
شیری کے ہونق پن سے کہنے پر ضیغم نے ہنسی دبائی، اور خیال میں عینا کی معصوم ادائیں گھومی، جنہوں نے سخت دل میں قطرہ قطرہ بوچھاڑ کر کے سوراخ کر دیے تھے، کہ بہت جلد ہی محبت کی کونپل پھوٹ پڑی۔

"ویسے میں سوچ رہا ہوں، اب کوچی کوچی آئی مین، مہنا میڈم کا کیا ہوگا۔  
 نوڈل تو لے اڑی اپنے سائیں کو!"  
 شیریں مصنوعی افسوس سے بولا۔

لونگ منہ میں آنے کی وجہ سے یا شاید مہنا کے ذکر پر ضیغم کا منہ کا زاویہ بدلا۔

"اپنی بکواس بند رکھ اور کھانا کھا۔ ایک اور بات، آئندہ میں تیرے منہ سے نوڈل نہ سنوں، اور چشمش  
 تو بالکل نہیں!"

"تو پھر تو کیا چاہ رہا ہے،

بھابھی بولیں اسے؟

نن ورخ، نتول بی میرمن بی پیروان بی شو بی دی

(آج کل تو سب ہی زن مرید بنے ہوئے ہیں)۔"

ضیغم کے ٹوکنے پر ضامن چڑ کر کہتا، دانت پیسنے لگا۔

اس کے آخری جملے کی خیر کسی کو سمجھ نہ آئی۔



"دیکھ ضئی!

ہم بھا بھی تب ہی بولیں گے، جب وہ بھا بھی بنے گی۔  
اور اس کے آثار تو ہمیں دور دور تک نظر نہیں آرہے۔"

شہریار نے بھی حالت حاضرہ کے مشاہدے کے مطابق بات تو درست کی تھی، پر ضیغم کا تو مانو  
دل ڈوب گیا۔

ضیغم نے کھینچ کر چچ اس کی طرف اچھالی جسے بروقت کچ کر لیا گیا۔

"شکل اچھی نہ ہو، تو زبان سے اچھا پھوٹ لیا کر۔"

وہ تپا تھا

"ہسنہ!

ابھی کوئی کہہ رہا تھا، اچھا بولنے سے کیا ہوتا ہے۔"

شہریار ہنکار بھرتے، ضیغم کی کچھ دیر پہلے کی بات کی نقل اتارنے لگا، جس پر اس نے سر  
جھٹکا۔

"تم دونوں یہ جو عشق کر رہے ہو نا، ایک نمبر کے نکمے بنو گے۔  
لکھوا لو مجھ سے۔"

پلیٹ میز پر سے اٹھاتا کچن کی طرف بڑھ گیا، کیونکہ ضیغم اور شہریار تو اپنے مسئلوں میں گھرے  
ایک دوسرے کو مشورے دے رہے تھے۔

"ارے بہائی!

آنکھ کھٹے ہیں کیا۔"

شہریار نے شرارت سے جملہ کسا تو ضامن بھی بگڑ کر وہیں سے انہیں صلواتیں سنانے لگا۔

"ہاں بہت کھٹے ہیں، کھائے گا۔"

ضیغم اور شہریار اسکے چڑ جانے پر قہقہہ لگاتے اسے مزید کوفت کا شکار کر رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

"شیری، آج یونی نہیں جانا؟"

وہ گھر کے حلیے میں ناشتے کی میز پر آیا تو زلیخا بیگم پوچھ بیٹھیں۔

"مام جانا ہے، پر آج لیٹ جاؤنگا۔"

"چلو.. اچھا ہے،"

وہ اتنا کہہ کر ناشتے کی طرف متوجہ ہوئیں جب کہ شہریار خود کو تیار کر رہا تھا، کہ خودکش بم گرانے کے لیے کن الفاظ کا سہارا لے۔

سب ہی اپنے اپنے کاموں میں لگن تھے، کوئی بھی شہریار کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہریار نے الفاظ کہہ ہی دیے۔

"مجھے شادی کرنی ہے۔"

پلیٹ میں چلتے چچ، کپ میں گرتی چائے، ڈسٹنگ کرتے ہاتھ سب ساکت ہو گئے اور نظریں شہریار عالم کی طرف اٹھ گئیں۔

ملازم بھی منہ اور آنکھیں کھولے اپنے چھوٹے صاحب کو دیکھ رہے تھے جو تقریباً روز ہی انہیں حیران کرتا تھا۔

"کیا کہا؟"

عالم صاحب سکتے سے باہر آتے، کچھ سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

شہریار کا دل سہما ضرور تھا، پر اسے یقین تھا وہ منالے گا۔ بس تھوڑی ہمت اور دکھانی ہوگی۔

"وہ ڈیڈ!"

مجھے شادی کرنی ہے۔"

نظریں جھکاتے دہیمے پر مضبوط لہجے میں کہتا وہ ٹوسٹ اٹھانے لگا۔

"او!"

تو یہ ساری تیاریاں، یہ جم جوائن کرنا اور یہ داڑھی مونچھ تم نے اس لیے رکھی تھیں تاکہ ہم جلد ہی تمہاری شادی کروائیں۔"

عالم صاحب اپنا سخت لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولے، جب کہ زلیخا بیگم چائے کا کپ ایک طرف کیے، سخت نظروں سے شہریار کے جھکے سر کو گھورنے لگیں۔

"لڑکی کون ہے؟"

شہریار کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اب کی بار زلیخا بیگم نے سوال کیا۔ جس پر شہریار کے ساتھ ساتھ عالم صاحب بھی قدرے حیرت سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگے۔

"مام!"

وہ یونی میں، میرا مطلب ہے کہ وہ جونئیر ہے مجھ سے۔"  
گڑبڑاتے اس نے جواب دیا۔

"اور کب سے چل رہا ہے یہ سب؟"  
عالم صاحب کے استفسار پر شہریار کی بجائے زلیخا بیگم بولیں۔

"اسی دن سے جس دن یہ صاحب بہادر جلدی اٹھے تھے۔ ایم آئی رائیٹ شیری؟"  
وہی سخت آواز، آج تو شیری کے ستارے گردش میں تھے۔  
خود بیل کو دعوت جو دی تھی کہ آ مار مجھے...!

"یس مام۔"

مام! وہ بہت اچھی ہے ایون آپ..."

"انف!- شہریار".

ابھی وہ ہیر کے گن گاتا اس سے پہلے ہی زلیخا بیگم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

پر شہریار کے لیے حیرانی کا باعث ان کا پورا نام لینا تھا۔ آج تک وہ شیری ہی کہتی آئی تھیں۔

"مام!"

وہ صدمے سے بولا۔

"تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے کہ شادی کا فیصلہ خود سے کر سکو"۔

غضب ناک تاثرات چہرے پہ سجائے، آنکھوں میں سختی لیے وہ شہریار کو مزید سہما رہی تھیں۔

"مام!-"

میرا ایم بی اے کا لاسٹ سیمیٹر ہے اور کتنا بڑا ہوں؟

منت بھرے انداز میں کہنے پر عالم صاحب کے منہ سے ہنسی کا پھوارا نکلا جسے بروقت وہ دبا گئے کیونکہ بیگم صاحبہ کی سخت نظریں انکی طرف اٹھ چکی تھیں۔

"شیری یہ کیا طریقہ ہے، اگر لاسٹ ٹرم ہے تمہارا تو اب تمہاری شادی کروادیں۔ چلو کروادیں پر لڑکی تو ہماری مرضی کی ہونا۔"

"ڈیڈ!"

تو لڑکی آپ ہی کی مرضی کی ہے نابالکل پنجاب کا عکس، کھسے میں قید پاؤں، کھنکھاتی پائیل ل، جب چلتی ہے تو چھن چھن کی آواز آتی ہے۔ پوری کمر پر لہرائے، سیدھے ریشمی کالے بال۔ سوٹ کے ساتھ کا یہ بڑا دوپٹہ پھیلائے، آنکھوں میں بھر بھر کر کا جل ڈالے، اور ناک، ناک تو...."

شہریار نے ہیر کی خصوصیات بتاتے ہوئے، حدوں کو چھوتی مبالغہ آرائی سے ابھی اور بھی کام لینا تھا کہ عالم صاحب نے اسے ٹوک دیا۔ جس پر وہ جھینپ مٹانے کو پھر سے بولا۔

"ارے ڈیڈ..."

ابھی تو آپ نے اس کا نام نہیں سنا۔ نام سن کر آپ انکار کر ہی نہیں کر پائیں گے۔"

"ہمیں نہیں سننا کوئی نام وام۔"

مسز کریم نے بات کی تھی اپنی بیٹی کی، اور میں تمہاری شادی اسی کے ساتھ کرواؤں گی۔"  
 دو ٹوک لہجے میں کہتی وہ شہریار اور عالم صاحب دونوں کو ششدر کر گئیں، عالم صاحب کے دماغ  
 میں ہیر اور مسز کریم کی بیٹی کا موازنہ چل رہا تھا جس میں ہیر کا پلڑا بہت بھاری تھا، کچھ وجہ  
 یہ بھی تھی کہ شہریار نے صحیح دم پر پاؤں رکھا تھا۔ عالم صاحب کی کمزوری پنجاب تھی، اور ہیر تو  
 حقیقت میں بھی پنجاب کی مٹیارن تھی۔

"زلیخا!"

ایک بار نام سننے میں کیا ہے۔ ہاں بتاؤ کیا نام ہے۔"

"ہیر۔"

ہیر نام ہے لڑکی کا!"

نام بتا کر وہ بہت حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اب شہریار کے حصے کی جنگ اس  
 کے ڈیڈ لڑیں گے۔

اور نام سن کر جہاں عالم صاحب کی آنکھیں خوشگوار حیرت سے پھیلیں، وہیں زلیخا بیگم نے سر  
 پیٹا۔



"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے۔"

انہوں نے تصدیق چاہی۔

"سو فیصد سچ ہے ڈیڈ۔"

عالم صاحب نے اب کی بار اپنی بیوی کی طرف رضامندی سے دیکھا جس پر وہ نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"نو عالم!"

اور وہاں سے واک آؤٹ کر گئیں۔

"تم یونی جاؤ۔ باقی مجھ پر چھوڑ دو۔"

لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر نام یہ نہ ہوا تو۔۔۔۔۔"

عالم صاحب اٹھتے ہوئے، اس کی طرف جھک کر آنکھوں سے تنبیہ کرتے ہوئے جس پر شہریار نے سر ہلایا۔

"ضیغم!"

اللہ تیری محبت، تجھے نصیب کرے۔"  
ضیغم کو یہ میسج کرتے وہ طمانیت سے مسکرایا۔

\*\*\*\*\*

اس دن کی ہوئی حرکت پر وہ شرمندہ بھی تھی۔ اور ہتک کا احساس الگ تھا کہ کل آہی نہیں  
سکی، ویسے بھی کل اس کا میچ نہیں تھا۔  
جب کہ آج میچ تو تھا، پر ہیر آج نہیں آئی تھی۔

وجہ بھی وہ جانتی تھی، کل ہی فون پر ہیر نے شہیار کے ساتھ ہوئی ساری باتیں بتا کر آخر میں  
خود کے اقرار کا بھی بتایا جس پر پہلے تو اس نے خوب واویلا مچایا اور وجہ بھی ایک ہی تھی،  
ضامن نواز، پر عینا کے اسرار پر آخر میں ہیر کو مبارک باد دے کر فون بند کر گئی۔

اس کا دماغ وہیں کہیں گراؤنڈ میں اٹکا ہوا تھا جب ہر دوسرا بندہ اس پر ہنس رہا تھا۔ اور تالشہ  
وسیم اس بات کا بدلہ نہ لے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بس اسے موقع کی تلاش تھی۔

"اب طبعیت کیسی ہے؟"  
عینا بھی اس کے ساتھ بیٹھنے لگی۔

"ہمم.. ٹھیک ہوں۔"  
بچھے دل کے ساتھ کہتی وہ باسکٹ کوٹ پر نظریں دوڑانے لگی۔  
میچ شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔

"میچ کھیل لو گی نا؟  
عینا کے فکر مند ہونے پر تائشہ مجبوراً مسکراتی ہاں میں سر ہلا گئی۔

"چلو شکر!۔"

آج میچ لازمی جیتنا ورنہ ضامن بھائی پھر سے..."

"عینا پلیز!  
ہم کبھی بھی کسی اور کے لیے نہیں کھیلتے۔"

ہماری اپنی لگن ہوتی ہے جو ہمیں جیتنے دیتی ہے، کسی اور کے ڈر سے ہمیں خود کو مجبور نہیں کرنا چاہئے کچھ بھی کرنے کو!"

سختی سے عینا کی بات کاٹتے وہ بولی، تیز بولنے سے اسکا سانس پھولنے لگا، ایک تو وہ ضبط کر رہی تھی، جس طرح سب اس پر ہنسے تھے اور آج پھر سے کچھ سرگوشیاں سننے کو ملی تھیں۔ وہ تو مضبوط بننا چاہتی تھی، پر کچھ چیزیں کبھی کبھی ہماری کمزوری پکڑوا دیتی ہیں۔

"آئی ایم سوری۔"

میں نے تو بس ایسے ہی کہا تھا۔"

"اُس اوکے میری ڈونٹ۔"

اپنی سختی کا احساس ہوا، تو عینا کے گال کو کھینچتی وہ پھر سے پرانی تشو بن گئی۔

"آہ!"

تم بہت گندی ہو۔"

اسکے چٹکی بھرنے پر، عینا کی نینوں کے کٹورے پانی سے بھیک گئے۔

"اور تم بہت بیٹھی ہو۔"

پھر سے گال پر چٹکی بھرتے، وہ اپنا بیگ اٹھا کر ٹیم کی طرف دوڑی جب کہ عینا نے نشانے پر پانی کی بوتل پھینکی، پر ہمیشہ کی طرح نشانہ خطا ہو گیا۔

\*\*\*\*\*

"آج تائشہ اور ہیر نہیں آئیں؟"

وہ اکیلی کنٹین میں بیٹھی تھی کہ ضیغم اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"ہیر نے چھٹی کی ہے۔"

تسو تو آئی ہے۔"

اسے جواب دیتی وہ پھر سے سوڑی بک پڑھنے لگی۔

"تو وہ کہاں ہے؟"

اور تم یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔"

کنٹین کافی حد تک خالی تھی، کونے کی دو میزوں پر کچھ لڑکے بیٹھے تھے، سب اپنے آپ میں لگن تھے پر ضیغم کو اس کا یوں اکیلے بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔

"تشو، اپنی ٹیم کی کیپٹن سے کچھ بات کرنے گئی ہے۔ آجائے گی تھوڑی دیر میں۔" جھنجھلا کر کہتی وہ چشمہ درست کرتی، ماتھے پر بل ڈالے پھر سے کتاب بینی میں مصروف ہو گئی۔

"تو تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔"

اسکے ماتھے پر پڑے بلوں کی پرواہ کیے بغیر وہ روانی میں بولا۔

"اچار بنا رہی ہوں، کھائیں گے؟"

دانتوں کو پیستے غصے سے کتاب بند کرتی وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی جو مصنوعی ڈرنے کی اداکاری کرتا، کچھ پیچھے ہوا۔

"اف، اتنا غصہ!۔"

"آپ فی الحال کے لیے بات نہ کریں مجھ سے، چپ ہو جائیں۔"

انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتی وہ پھر سے کتاب کھولتی پڑھنے لگی۔  
وہ ضیغم کو ہی ایسے ڈراوے دے سکتی تھی، آخر کو اس نے چھوٹ جو دے رکھی تھی

"کیوں بھئی، کیوں بات نہ کروں؟"

اس کے ہاتھ سے کتاب چھینتا وہ خود کتاب پڑھنے لگا، وہ کوئی فیری ٹیل کی کہانی تھی۔  
عینا کو یوں جھنجھلاتے دیکھ، دل گگدگانے لگا تھا، تبھی عادت کے برخلاف اسے مزید تنگ کرنے لگا۔



"تم یہ سب پڑھتی ہو۔"  
وہ آنکھیں بڑی کیے، کتاب کے ورق دیکھ رہا تھا۔

"میری سٹوری بک واپس کریں۔"  
عینا کتاب چھیننے کی کوشش کرنے لگی، جس پر ضیغم نے کتاب مزید اس سے دور کی اور  
ورق گردانی کرنے لگا۔

"او مائی گاڈ!۔"

تم یہ پڑھتی ہو۔"

قہقہہ لگاتا، ہر صفحے پر ہنستا، وہ عینا کو یقیناً ناراض کرچکا تھا۔  
تبھی وہ ہاتھ باندھے خشمگین نگاہوں میں ہر بار کی طرح نمی لائے غصے سے دیکھ رہی تھی۔

"اوکے۔۔

یہ لو اپنی سٹوری بک۔

اتنی بڑی ہوئی ہو، ابھی تک یہ باربیز کی سٹوریز پڑھتی ہو؟"  
کتاب اسے پکڑتا وہ بولا تو عینا زبردست گھوری سے نوازتی وہ کتاب اپنے بیگ میں ڈال چکی تھی۔  
کیا بھروسہ، وہ پھر سے چھین لیتا۔

"کیوں، آپ کو پرابلم ہے؟"

لفظ چباتی وہ آگ کا گولا لگی، جس پر ضیغم نے ہنسی دبائی۔

"ابھی تو نہیں، ہاں بعد میں ہو سکتی ہے۔"

معنی خیزی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا، جس پر عینا کی آنکھوں میں نا سمجھی کا تاثر پھیلا۔



"ہوتا رہے مسئلہ، میں تو یہی پڑھوں گی۔"  
ضد سے کہتی وہ ضیغم کو متجسس کر گئی۔

"یہ پڑھتی کیوں ہو؟"

"مجھے اچھی لگتی ہیں۔"  
اشتیاق سے کہا۔

"اور کیوں اچھی لگتی ہیں۔"  
ضیغم نے اسی کے انداز میں پوچھا۔

"ہمم۔ کیونکہ اس میں فیریئز، باربیز بہت پیاری ہوتی ہیں، سویٹ نیچر والی۔"  
سوچ کر بتاتی وہ ضیغم کو اپنی ایک اور ادا میں جکڑ گئی۔

"بس؟"

اس لیے اچھی لگتی ہیں؟"

"نہیں!۔"

اور بھی بہت سی وجہ ہیں، جیسا کہ یہاں اینڈ میں سب اچھا ہو جاتا ہے۔ اور کچھ میں تو فیریز کے پاس سپر پاور ہوتی ہیں تو وہ جب چاہیں، جہاں چاہیں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔"

"اچھا۔"

پر حقیقت میں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا نا۔"

ضیغم کے سمجھانے پر وہ اسے دیکھتی بولنے لگی۔

"یہی تو بات ہے!"

حقیقت میں تو سب ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تنگ کرتے ہیں کوئی کسی کی ہیلپ نہیں کرتا۔ تبھی میں یہ سٹوریز پڑھتی ہوں یہاں سب ایک دوسرے کی ہیلپ کرتے ہیں اور ایول نیچر ( Evil nature) والوں سے بچاتے ہیں۔"

عینا کی باتیں، تو ایک چھوٹے بچے کو سکھلائی باتوں جیسی تھیں۔ پر اسکا لہجہ اور لفظوں میں چھپا درد ضیغم کو بہت کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھا۔

"ہمم!"

تو اسے پڑھ کر تم حقیقت میں اسے اپلائے کیوں نہیں کرتی؟  
کچھ توقف کے بعد بولا، تو عینا نا سمجھی سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیسے؟"

"بہت ایزی ہے، ان فیریز کی طرح ہی غلط بولنے والوں کو چپ کروا کے۔"  
ضیغم نے ایسے کہا جیسے بہت آسان بات ہو، اور عینا اسکے جواب پر مسکراتی اسے اصل حقیقت  
دکھانے لگی۔

"فیریز کے پاس پاورز ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس کوئی میچک سٹک نہیں ہے کہ انہیں چپ  
کروائیں۔"

آخر میں اس کا لہجہ ناامیدی لیے ہوئے تھا۔

"اللہ نے ہمیں اتنی پاورز تو دی ہیں، دل اور دماغ دیے ہیں جو صحیح غلط جانتے ہیں اور جب ہمیں پتہ ہے کوئی غلط کہہ رہا ہے، کوئی کسی کو تنگ کر رہا ہے تو اسے روکیں، زبان سے روکیں۔"

"اور سامنے والا اگر ہاتھ اٹھالے تو؟"  
 ضیغم کی بات کچھ حد تک ٹھیک تھی، پر عینا بھی غلط نہیں تھی۔

"تو کیا تمہارے پاس ہاتھ نہیں ہیں؟"  
 ضیغم کے جواب پر وہ کشمکش کا شکار ہو گئی، وہ کیسے کسی پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔

"پر...؟"

"دیکھو، لازمی نہیں ہے کہ سب آپ کو تنگ کرنے والے ہاتھ بھی اٹھائیں اور آپ کو فزیکلی تکلیف پہنچائیں۔ اور سب تکلیف پہنچانے والے جان بوجھ کر بھی ایسا نہیں کرتے، انہیں تو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کے الفاظ کسی کو مینٹلی کتنا ڈسٹرب کر رہے ہوتے ہیں، اور ان لوگوں

کی باتوں کو نظر انداز کر دینے میں ہی بھلائی ہے اگر دماغ سے چپکا کر رکھیں گے تو ڈسٹرب ہی رہیں گے۔"

ضیغم بہت تحمل سے اس کی بچگانے دماغ میں پختگی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور وہ جو جان بوجھ کر کسی کو تنگ کرتے ہیں۔"

ضیغم کا انداز بہت خالص، ہمدرد سا تھا، سمجھاتے تو سب تھے اسے، ایسے ہی لفظوں میں پر ضیغم اسکے لفظ چاہے عام سے تھے۔ پر انداز، وہ منفرد تھا۔

"جو جان بوجھ کر کرے، اسے لینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ اسے بتا دو کہ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔"

بہادر بنو، بہادر!"

آخر میں اس کی ناک پر انگلی سے مخصوص انداز میں ہلکی سی ضرب لگائی تو وہ ناک سکیر کر پیچھے ہوئی۔

"میں اپنی بات تو نہیں کر رہی تھی۔"

کچھ گھبرائی سی، وہ اپنا دفاع کرنے لگی، اور ایسا کرتے ہوئے وہ ضعیف کو چوٹی موٹی سی چشمش ہی لگی۔

"او ہاں!

تم تو اپنی بات نہیں کر رہی تھی۔

تم تو پہلے سے ہی بہادر ہو۔"

سجیدہ لب و لہجے میں کہتا۔

وہ آنکھوں میں شرارت لیے، ہونٹوں پر مسکراہٹ دبا گیا۔

"ہاں نا۔"

گردن اکڑا کر کہتی، وہ ضعیف کی نظروں میں بہادر بننے لگی۔

یہ اس نے کیوں کیا وہ خود بھی نہیں جانتی تھی، وہ جو ہمیشہ سے خود ترسی کا شکار رہتی تھی، اپنی

ہی برائیاں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ آج ضعیف کے سامنے کمزور نہیں دکھانا چاہتی تھی، اس کی

نظروں میں خاص دکھنا چاہتی تھی۔ کیوں؟

اس بات سے عینا سراسر انجان تھی، وہ تو خود سے بھی انجان تھی۔ ایسے جزبات سے تو اجنبیت

ہونی ہی تھی۔

"تم یہاں بیٹھے ہو، ہم نے پورا ڈیپارٹمنٹ چھان مارا۔"  
شیری بھاگتا دوڑتا اس کے سر پر آ پہنچا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

ضیغم نے، لمبی لمبی سانسیں لیتے شیری اور ضامن کو دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا، پر اگر تو نہیں پہنچا تو میچ نہیں ہوگا"

"او شٹ!"

میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

سر پر ہاتھ مارتے، یاد آنے پر کہ آج بھی ان کا میچ تھا، اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔

"ہاں اب تو بھولنا ہی تھا۔"

شہیار نے دانت پیس کر عینا کی طرف نظریں گھوماتے کہا تو ضیغم نے گھورا۔

آخر کو وہ دونوں اسکی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

"نوڈلز!"

تم بھی آ جاؤ۔ آج اپنے ضیغم بھائی کو بھی کھیلنے ہوئے دیکھ لینا۔"  
بھائی پر زور دیتے وہ ضیغم کے تیور بگاڑ گیا۔ پھر یاد آنے پر بولا۔

"اور تمہاری دوست کہاں ہے؟"

اس چوہیا کو بھی لے آنا، تاکہ وہ بھی دیکھ لے میچ جیتنے کیسے ہیں۔  
یا پھر اس دن ٹومی کے ساتھ ہوئی ریس سے ہی ڈر گئی کہ یونی آنا ہی چھوڑ دیا۔"  
تمسخرے پن سے کہتے، وہ عینا کے چہرے پر غصے کے تاثرات لانے میں کامیاب ہو گیا۔

"ضامن بھائی!"

رکیں۔"

وہ جانے لگا، تو عینا نے ڈرامائی وقفہ لیتے اسے روکا۔

وہ رک کر مھنویں اچکائے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔



"پہلی بات، میرا نام عینا ہے، نوڈلز نہیں۔"

اور دوسری بات میری دوست کا نام تائشہ ہے، پٹوہیا نہیں۔"

سینے پر ہاتھ باندھے گردن اکڑا کر ضامن سے ٹکر لیتی کھڑی تھی، ضیغم کے ساتھ ساتھ شیری نے بھی آنکھوں میں ستائش لیے اسے دیکھا۔

"اور آخری بات، میں میچ جیت چکی ہوں، تو مجھے ضرورت نہیں ہے کسی اور کی جیت دیکھنے کی، شاید کسی اور کو ضرورت محسوس ہو دیکھنے کی کہ جیتتے کیسے ہیں۔ کیونکہ جو بے زبان جانور کے بل بوتے پر لڑتے ہیں وہ خود سے جیت جائیں ناممکن سا لگتا ہے۔"

ضامن کو اپنے پیچھے سے تائشہ کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ بھی قدم اٹھاتی، عینا کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

عینا کی باتوں کا تو اسے اثر نہیں ہوا، پر تائشہ کے گردن اکڑا کر کہنے پر وہ اشتعال سے بھرا، اس کی جانب بڑھا۔

تبھی دبی دبی ہنسی کی آوازیں، کینٹین میں ابھریں۔ ارد گرد نظریں گھمائیں تو شیری اور ضیغم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے لڑکے پر شوق سے بیٹھے انکے پیچ چھڑنے والی جنگ کے منتظر تھے۔

اس ہتک پر کہنے کو بہت کچھ تھا، پر فی الحال راوی کو چین ہی چین لکھنے دیا۔ فقط آنکھیں دکھاتا، وہ کینٹین سے باہر نکل گیا۔

جب کہ شیریں کے ساتھ ساتھ ضیغم نے بھی، عینا کی ہمت کو سراہا اور مسکراتے ہوئے ضامن کے پیچھے چل دیے۔ ابھی تو ضامن کا غصہ بھی کم کرنا تھا۔

"یہ سورج مغرب سے نکلا تھا کیا؟  
آج تو میں حیران ہو گئی میری ڈونٹ نے بولتی بند کروا دی کھمبے کی۔"  
پیار سے گلے لگاتے بولی، تو عینا اپنی تعریف پر جھینپ گئی۔

"ویسے میں تو سمجھا سمجھا کر تھک گئی، میری تو نہیں سنی۔ یہ نیا پتھر کون آیا ہے۔"

"ضیغم بھائی نے سمجھایا۔"

ضیغم کی کہی باتوں کا اثر تھا۔

ضیغم کو جتلانے کے لیے ہی اس نے پہلا قدم اٹھایا تھا اور کامیاب بھی ہوئی تھی۔

"ارے واہ!!"

ویسے آج کل تم اور ضیغم بھائی ایک دوسرے کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں گھوم رہے۔  
تائشہ نے سرسری سا کہہ کر جگہ سنبھالی تو عینا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، سب اپنے کاموں  
کی طرف متوجہ تھے، وہ بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"نہیں تو۔"

ایسا تو نہیں ہے۔ تم کیوں ایسا کہہ رہی ہو؟"  
اٹک اٹک کر کہتی وہ تائشہ کو متوجہ کر گئی، کچھ پل اس کی نظروں میں دیکھنے کے بعد کندھے  
اچکا کر کہا۔

"میں نے تو بس ایسے ہی کہا، تم کیوں گھبرا رہی ہو۔"

بھنویں اٹھائے اس سے استفسار کیا تو عینا نے پھر سے چشمہ درست کرتے آنکھیں گھمائیں۔

"نہیں تو، میں تو۔۔۔۔"

ابھی وہ کچھ کہتی، تائشہ سے ملنے اس کی ساتھی کھلاڑی آ گئی۔ اور اس پر عینا نے سکھ کا سانس  
لیا۔

وہ گھبرا کیوں گئی تھی؟ شاید تائشہ کی کہی بات ایسی تھی، کہ وہ اس کا مطلب غلط سمجھ بیٹھی تھی۔

پر وہ یہ نہیں جانتی تھی، کہ اپنی گھبراہٹ کے باعث ہی اس نے تائشہ کو شک میں مبتلا کیا تھا۔ جس کا اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

\*\*\*\*\*

"تم نے میرا ایک کام کرنا ہے۔"

"کیسا کام؟"

وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھتی سوال کرنے لگی۔

"تمہیں فائل میچ ہرانا ہوگا۔"

"آپ ہوش میں ہیں، میں ایسا کیوں کروں گی۔ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے کیے ٹیم سے نکلوانا چاہتے ہیں؟"

وہ چخ کر بولتی جانے لگی کہ سامنے والے کی بات پر ٹھٹھک کر کی۔

"ٹیم سے تو آؤٹ تم ہو ہی جاؤ گی، اگر جو میں کہہ رہا ہوں وہ نہ کیا تو...!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے تم کیسے بھی کر کے فائل میچ ہروا دو، تو انعام میں تم ٹیم کی وائس کیپٹن بن سکتی ہو۔"

پیش کش پر وہ پھسلنے لگی تھی۔

"کیسے؟"

لاچ اچھا تھا، پر ر سکی تھا۔

اس کے سوال پر تفصیل سے سمجھایا گیا، تو پہلے جہاں بیزاری تھی، اب اس پلان اور اس کے نتیجے کا سن کر وہ کھل اٹھی تھی۔

"اسکے ساتھ ساتھ اور کچھ بھی چاہیے ہو تو بتانا۔"  
آفر دیتے وہ اکڑو کھڑا تھا، جب کہ چہرے پر زیریلی مسکراہٹ تھی۔

"ڈیل ڈن۔"  
اسے اوکے کا اشارہ کرتی وہ بھی مسکراتی ہوئی چلی گئی، اور وہ کھڑا اپنی اصل جیت کا انتظار کرنے لگا۔

\*\*\*\*\*

پانچ دن لگاتار، سپورٹ ایکٹوئیز کی نظر ہو گئے تھے، اور آج تقریباً تمام بڑے کھیلوں کا فائنل میچ تھا۔

فٹ بال میں ایگل فر، ہر بار کی طرح فائنل کی ٹیم تھی۔

اور باسکٹ بال کی ایگل فر بھی کڑی محنت کے بعد، فائل کی ٹیم بن چکی تھی، جن کا فائل منہا کی ٹیم کے ساتھ تھا۔

مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ دونوں اطراف سے اب تک بہت اچھا کھیل پیش کیا گیا تھا۔ سب کی نظریں ایگل فر پر تھی، دیکھتے ہی دیکھتے میچ ایگل فر کے حق میں ہو چکا تھا۔  
تالشہ ہمیشہ کی طرح آج بھی بہت اچھا کھیل رہی تھی، لیکن پھر اچانک سے اس کے ہاتھوں مخالف کھلاڑی کو دھکا لگا اور وہ کوٹ میں اوندھے منہ گر گئی۔  
ریفری کی جانب سے تالشہ کو کارڈ دکھا کر گیم سے باہر کر دیا گیا۔

اب میچ کا پاساپلٹ چکا تھا، منہا نے موقع پاتے ہی کھیل کی جیت کو اپنی ٹیم کے حق میں موڑا، اور تالشہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کیے، کمینیاں گھٹنوں پر لگائے، عمیق نظروں سے میچ کی جیت پلٹتی دیکھ رہی تھی، ساتھ ساتھ اپنی غلطی بھی ڈھونڈنے کی کوشش میں محو تھی کہ ایسی بے وقوفی آخر اس سے ہوئی کیسے؟۔

جب کہ کیپٹن کی غصیلی نظریں اسی پر بار بار اٹھ رہی تھیں۔ وہ خود حیران تھی کہ ایسی حماقت وہ کیسے کر سکتی ہے۔

اسی دوران میچ کا آخری فیصلہ بھی ہو گیا، اور ایگل فر کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اور اب سینیئر کیپٹن تالشہ کے سامنے موجود تھی۔

"تالشہ بہت برا کیا تم نے!"

ہم جیت رہے تھے اور پھر بھی ایسی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپی، میں نے خود سے نہیں کیا۔

آپ سمجھنے کی کوشش کریں، مجھے لگتا ہے کسی نے مجھے دھکا دیا ہے تو ان کی کھلاڑی کو بھی دھکا لگ گیا۔"

تالشہ نے عذر پیش کیا۔

شرمنگی کی بات الگ تھی کہ فائل میں وہ ایسی حرکت کرتے ہوئے گیم سے باہر ہوئی۔

"سٹاپ اٹ تالشہ!"



سب نے دیکھا ہے تم نے دہکا دے کر اسے گرایا ہے۔ اگر کچھ دیر اور صبر کر لیتی تو ہم جیت جاتے۔

میں تو تمہیں وائس کیپٹن بنانے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن اس بے وقوفی کے بعد، اب تمہاری جگہ ٹیم میں بنتی ہے کہ نہیں اگلے سال کے لیے یہ بھی دیکھنا پڑے گا۔

کیپٹن تو کہہ کر چلی گئی پر تائشہ کے کانوں میں وہ الفاظ سائیں سائیں کر رہے تھے۔

وہ پڑبائی میں اور کھیل میں بیک وقت اچھی تھی۔ اور آج اسے ہی ٹیم سے نکالنے کی بات کی جا رہی تھی۔ خود کو رونے سے باز رکھتی وہ لب کترتی، وہاں سے بھاگ گئی۔

سرگوشیاں اور ہنسی کی آوازیں اسے اپنا تعاقب کرتے ہوئے سنائی دیں۔ ہتک کا احساس مزید حاوی ہونے لگا تھا۔

"کیا ہوا بار گئی میچ؟"

وہ مسلسل آنسو پیتی، کڑے ضبط کے ساتھ بیٹھی تھی کہ پیچھے سے ضامن کی آواز آئی۔

لفظوں میں افسوس، جب کہ لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

اسے مکمل نظر انداز کیے وہ بیٹھی رہی، نہ پلٹی نہ کچھ کہا۔ فی الحال اس کا کوئی موڈ نہیں تھا جنگ چھیڑنے کا۔

"او ہوا۔"

بہت برا ہوا۔

ویسے ہارنا ہی تھا، تو ایسی اچھی حرکتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

چہ۔۔

تم میں تو کھیلنے کے گرہی نہیں ہیں۔"

طعنوں کے تیر مارتا وہ اس کے مقابل آگیا۔ لفظ پھر سے ناصحانہ تھے، لیکن یہ لہجہ زخم پر نمک کی دلی کی مانند تھا

جھکے سر کے ساتھ، پیلی ٹی شرٹ میں کندھوں سے اوپر تک آتے باب کٹ بال، ہمیشہ کی طرح خود سے لاپرواہ انداز میں، وہ افسردہ بیٹھی، اس کے دل کو قرار دے رہی تھی۔

پل بھر کو سرخ آنکھیں ضامن پر گاڑیں اور پھر سے نظریں پھیر کر گھاس کو پاؤں سے کرچنے لگی۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہیں ٹیم سے نکال دیا جائے گا۔

اب ایسے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہے۔"

اس کی خاموشی جیسے ضامن کو مزید بولنے پر اکسا رہی تھی۔

اس کے سامنے اپنے دراز قد کے ساتھ کھڑا وہ تائشہ کو ہر بار سے زیادہ زہر لگ رہا تھا۔

"غصہ آرہا ہے؟

مجھے بھی آیا تھا جب اس دن سب کے سامنے تم نے میری بے عزتی کی تھی۔"

اسے یوں خود گھورتا پا کر بولا۔

آخر میں بولتے بولتے، اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

"ایک جانور کے دم پر میں نے وہ کیا تھا نا۔

آج خود کے دم پر یہ کیا ہے، کیسا لگ رہا ہے اب ہار کر ہاں؟"

ضامن کے اعتراف پر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ نے کیا ہے یہ سب؟"

گلے سے پھنسی سی آواز نکلی۔

اس کے ایسی بے یقینی پر گرے آنکھوں میں چمک ابھری، اور چہرہ کھ گیا۔

"ویل!"

تمہاری انفارمیشن کے لیے بتاتا چلوں، پلان میرا تھا۔ اور یہ کروایا میں نے کسی اور سے تھا!"  
اس کی معلومات میں اضافہ کرتے اب اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر غور کرنے لگا۔  
جب کہ ہونٹوں پر بکھرتی شرارت بھری مسکراہٹ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"آپ اس حد تک گر سکتے ہیں!"

ملامت اور بے یقینی کی مورت بنی وہ اسے تک رہی تھی۔

"چار فٹ کی چوہیا!"

تمہیں تو پتہ ہے کہ

Everthing is fair in love & war

اور یہ تو ورلڈ وار تھری ہے۔

میں کچھ بھی کر سکتا ہوں، اس لیے مجھ سے الجھنے سے پہلے، یہ سوچ لینا کہ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا جب تائشہ نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

"آپ کہیں کے صدر ہیں کیا، جو یوں دہمکیاں دیں گے تو میں ڈر جاؤں گی۔ آپ نے بہت برا کیا ہے۔ اور میری ایک بات سنتے جائیں ضامن نواز خان، تائشہ و سیم خان ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے اسکا بدلہ بہت جلد چکاوٹگی وہ بھی سود سمیت۔"

آنکھوں میں آنکھیں گاڑے وہ بھی برابر کا چیلنج دے رہی تھی، پل بھر کو گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اس چھٹانک بھر لڑکی کے عزم کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

"اور ایک بات تم بھی یاد رکھو، تائشہ و سیم خان لڑکی ہو تم۔ اس لیے ضامن نواز خان سے ٹکراؤ گی تو ریزہ ریزہ ہو جاؤ گی۔"

وہ بھی آنکھوں میں سخت تاثر لیے اسی کے انداز میں کہہ کر مضبوط قدموں کے ساتھ پلٹ گیا۔

"میں ایک لڑکی ضرور ہوں، پر کمزور نہیں ہوں۔"

مضبوط اور اٹل لہجے میں کہتی، اس کی پشت پر قہر برساتی نظر ڈال کر خود بھی پلٹ گئی۔

"راخئی چچی موزک وگورو"

(دیکھتے ہیں چوہیا) ..

گردن موڑے مسکراتی نظروں سے اسکی پشت کو تکتا، سرگوشی نما آواز میں کہہ کر خود بھی آگے بڑھ گیا۔

وہ کہتے ہیں نا کل کس نے دیکھی ہے، کیا پتہ یہی ایک دوسرے کی جان کے دشمن، کل ایک دوسرے کے لیے جان دینے لگیں۔ کون جانے؟

\*\*\*\*\*

"آپ کا کام ہو گیا ہے، اب میرا کام کب کریں گے۔"  
وہ اپنی ہی ٹیم کو ہروا کر اب ضامن کے سامنے کھڑی تھی۔

"تمہارا کام بھی سمجھو ہو گیا۔"

پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا جیب سے والٹ نکالنے لگا۔



ضامن نے ہی فائل ہارنے کے لیے گیم کھیلا تھا۔ اور ہارنا بھی ایسا کہ تائشہ اس کی وجہ بنے۔

ضامن کے کہنے پر ہی اس لڑکی نے بہت کوشش کی کہ تائشہ کی وجہ سے ہار ہو پر ایسا نہ ہو پایا تو آخر نامحسوس انداز میں تائشہ کو دہکا دیا کہ تائشہ کی وجہ سے بیلنس کھونے پر مخالف کھلاڑی گر گئی۔

"ویسے کام بہت اچھا کیا ہے، اس خوشی میں یہ بھی رکھو۔" تو صیفی انداز میں کہتے، پیسوں کے چند نوٹ پکڑائے جسے بغیر کسی حیل و حجت کے سامنے والی نے تھام لیا۔

"تھینکس۔"

وائس کیپیٹن بن جاؤں گی نا؟"

نوٹ گنتی وہ اپنی پوزیشن کے بارے میں فکر مند تھی۔

"ہاں!"

بالکل بن جاؤ گی۔

بس ایک چیز یاد رکھنا کہ اس بات کی بھنک کسی کو نہ لگے۔ میرا تو خیر کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن تمہارا جتنا نقصان ہوگا، اس کا تمہیں اچھے سے اندازہ ہے۔"

آنکھوں میں سرد تاثر لیے، بڑی چالاکي سے معاملہ اس کے سپرد کیا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں، ضامن بھائی۔"

حلیہ کو تالشہ سے شروع سے ہی مسئلہ تھا، پڑھائی میں بھی ان دونوں کے نمبروں میں بہت کم تفریق تھی، پر پوزیشن تالشہ ہی لے گئی تھی۔

اور باسکٹ بال میں بھی وہ اپنی جگہ مضبوط کر چکی تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں نا خود اس جگہ پر پہنچ نہ پائیں تو جلتے، کڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو نیچا دکھانے کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ ایسی ہی حلیہ تھی اور ضامن کو بھی ان کی اس سرد جنگ کا اندازہ تھا۔ تبھی شاطرانہ چال چلتے، اس کا استعمال کیا۔

اور وہ بھی بہت آسانی سے اس کے لیے کام کرنے لگی۔ کیونکہ فائدہ اس کا بھی تھا۔

اور آج تو ضامن جیت کی خوشی میں سرشار تھا۔ خوشی دہری جو تھی۔

آج وہ لوگ بھی فائل جیتے تھے، پر تالشہ کے خلاف جیت میں اسکی دلچسپی کئی گنا زیادہ تھی۔



\*\*\*\*\*

"بتاؤ، کب جانا ہے رشتہ لے کر؟"

کل سے باقاعدہ کلاس شروع ہونی تھیں۔ اور آج وہ سست ساٹی وی کے آگے بیٹھا چینل بدل رہا تھا کہ عالم صاحب کی آواز سنائی دی۔

"کیا؟"

بے خیالی میں سنے گئے الفاظ کی تصدیق چاہی تو عالم صاحب نے پھر سے جملہ دہرایا۔

"ارے!"

بتاؤ کب جانا ہے رشتہ لے کر۔"

"مام مان گئیں؟"

کچن کی طرف نظریں اٹھاتا صوفے پر سمٹ کر بیٹھتا پوچھنے لگا۔

"منا لیا ہے، وہ الگ بات ہے کہ بہت مشکل سے مانی ہے۔"  
ان کے کہنے پر شہریار آگے بڑھ کر بغل گیر ہوا۔

"آئی لو یو ڈیڈ!"

مجھے پتہ تھا آپ منالیں گے۔  
خوشی سے ان کے ساتھ لیٹا۔

"منا تو میں نے لیا ہے پر اگر جیسا تم نے کہا ویسا نہ ہوا تو..."

"ارے ڈیڈ آپ فکر ہی نہ کریں۔

میں ابھی یہ خبر ضیغم اور ضامن کو دے آیا۔"

ان سے الگ ہوتا، یقین دلاتے ہوئے۔ دوستوں کو بتانے کا کہتا صوفے سے چھلانگ مار کر  
کمرے کی طرف دوڑا۔

"پر یہ تو بتاتے جاو کب رشتہ لے جانا ہے؟"

انہوں نے بے چینی سے ہانک لگائی۔

"صبر ڈیڈ، صبر۔"

آپ کو تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی ہے۔"  
شرارتا آنکھ دبا کر کہتا عالم صاحب کو غصے میں مبتلا کر گیا۔

"ارکو، میں بتاتا ہوں کس کو جلدی ہے۔"

وہ بھی اس کے پیچھے دوڑے تھے۔

اور زلیخا بیگم دونوں باپ بیٹوں کی کئی میٹھی محبت کی برقراری کی دعا کرتی اپنے کام میں پھر سے لگن ہو گئیں۔

عالم صاحب نے بہت منت سماجت اور کچھ رعب دکھا کر زلیخا بیگم کو منا ہی لیا۔ اور وہ بھی بیٹے اور شوہر کی محبت میں ہار مان ہی گئیں۔

\*\*\*\*\*

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟"

مبارک ہو پھر تو شیریں۔"

ضامن اور ضیغم کو یہ خبر فون پر دینے کی بجائے، انہیں ضیغم کے گھر ہی بلا لیا تھا اور اب جب یہ خوشی کی خبر انہیں سنائی تو دونوں اس کی قسمت پر خوش ہوتے مبارک باد دینے لگے۔

"یار تیرے پلان پر کام کیا، ڈیڈ کو وہ کہانی ڈالی ہے کہ انہیں ماننی ہی پڑی اور ڈیڈ مان گئے تو مطلب مام نے بھی مان ہی جانا تھا۔ اور بہلا ہو ہیر کے نام کا جس نے کہانی میں مزید جان ڈال دی۔"

تشکر بھرے لہجے میں کہتا وہ پھر سے ضیغم سے لیٹ گیا۔

"اور اگر انکل کو پتہ چل گیا کہ تو نے جھوٹ بولا ہے، تو؟"

"کوئی جھوٹ نہیں بولا، ہاں سچ میں تھوڑا بہت فلمی ٹچ ڈالا ہے پر کوئی نہیں اتنا چلتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے ہیر انہیں پسند آجائے گی۔"

بے فکری سے ضامن کو جواب دیا۔

"تو نے پکا سوچ کر فیصلہ کیا ہے نا، یہ نہ ہو بعد میں یہ بھی چوہیا کی طرح پوری جنگجو نکل آئے۔"

ضامن کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی تھی۔

"ضامن بچ جا مجھ سے، ایک دفعہ کہہ دیا نا کہ ہیر تو بس ہیر ہی!  
تیری فالٹو کی بکواس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"  
بیزاری سے کہتا مزید پھیل کر لیٹ گیا۔

"اولے ضیغم!"

تو کیا سوچ رہا ہے؟"  
ضیغم کسی سوچ میں بہت دیر سے کھویا ہوا تھا، اسے بھی شامل گفتگو کیا۔

"ہوں۔۔"

نہیں کچھ خاص نہیں۔"

"پھر بھی۔۔"

کہیں یہ تو نہیں سوچ رہا انکل شاہ سائیں مانیں گے کہ نہیں؟"

"ہاں وہ بھی سوچنے والی بات ہے۔ پر میں عینا کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"  
 ضنیغم کا یہ کہنا تھا کہ دونوں فٹ سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور مکمل دلچسپی کے ساتھ یک  
 زبان ہو کر کہا۔

"او۔۔"

تو عینا کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ ویسے کیا سوچا جا رہا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں سوچ رہا میں، جو تم لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔"  
 باری باری دونوں کو چپت رسید کرتا بولا۔

"تو کیسا سوچ رہا ہے وہی بتا دے۔"

بازو سہلاتے ضامن بولا۔

"یار مجھے عینا میں کچھ پرابلم لگتی ہے۔"  
 کھویا کھویا سے کہہ گیا۔

"اتنی کیوٹ تو ہے، تمہیں کیا پرابلم لگتی ہے۔"  
شیری نے ضیغم کو حیرانی سے دیکھا، انہیں تو اس کی ذہنی حالت پر شک گزرا۔

"میں وہ بات نہیں کر رہا یا۔۔  
تمہیں نہیں لگتا وہ ڈری ڈری سی لگتی ہے، گھبرائی ہوئی سہمی سی۔۔۔"  
ابھی اس کی بات جاری تھی کہ ضامن نے پیچ میں ہی اچک لی۔

"استغفر اللہ!  
اگر تم یہ پہلے کہتے تو میں مان بھی لیتا کہ ڈری ہوئی اور سہمی سی لگتی ہے، اب کچھ دنوں سے  
اس کے منہ میں بھی اچھی خاصی زبان آگئی یہ چوہیا نے اپنا اثر ڈال دیا ہے۔"  
کانوں کو ہاتھ لگاتا ضامن بدک کر بولا۔

"بے وقوف انسان!  
وہ باقی لڑکیوں کی طرح نہیں ہے، بس اپنے سرکل میں ہی رہتی ہے۔ اور اس دن جو بھی کہا  
بالکل ٹھیک کہا، اس سے ایسا کرنے کو میں نے ہی کہا تھا۔

پر یہ سب وہ صرف تم لوگوں کے ساتھ ہی کہتی ہے، دوسروں کے سامنے تو جیسے گنگی بن جاتی ہے۔ اور کانفیڈنس وہ تو ہے ہی نہیں۔"

ضیغم پہلے دن سے ہی اس کی حالت سمجھ گیا تھا، پر اب وہ زیادہ فکر مند ہو چکا تھا۔ دونوں طرف سے پھنسا ہوا تھا۔ نہ ہی عینا اس ذہن کی مالک تھی کہ ضیغم کے جذبات سمجھ سکے، اور نہ ہی وہ اس حالت میں تھا کہ بابا سائیں سے بات کر سکے۔

"تو تجھے پہلے نہیں پتہ تھا کہ وہ باقیوں جیسی نہیں ہے، معصوم ہے وہ!" شہریار کے جواب پر وہ مدہم سا مسکرایا۔

"باقیوں سے ہٹ کر ہے، معصوم ہے، تبھی تو یہاں جگہ بنالی ہے۔" دل کی جگہ پر ہاتھ جماتا سرشار سا اعتراف کر گیا۔

"پھر مسئلہ کیا ہے؟"

دونوں الجھے۔



"مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک بچوں والی سٹوری بکس پڑھتی ہے، میری فیلنگز کہاں سمجھ پائے گی وہ۔"

بالوں کو ہاتھ کی مٹھی میں جکڑتا وہ بے بسی سے گویا ہوا، شیری اور ضامن کا چھت پھاڑ قہقہہ کمرے کے درودیوار میں گونجا۔

"تو اصل مسئلہ یہ ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے، پوری زندگی یہی بچہ پالتے رہنا۔ بچوں کی ضرورت ہی نہیں ہے تجھے۔" ضامن کے مشورے پر، شیری نے جہاں اسے داد دی۔ وہیں ضیغم ہاتھ میں کشن لیے دونوں پر حملہ آور ہو چکا تھا۔

"ارے چھوڑ ہمیں،

چھوڑ نا۔۔۔

اب اس میں ہمارا قصور ہے کہ وہ بچوں والی کہانیاں پڑتی ہے۔ چھوڑ دے۔" ضامن اپنی گردن سے ضیغم کی گرفت چھوڑواتا، اسے مزید غصہ دلانے لگا۔

"یار ضیغم! ایک حل ہے اس کا۔"

شیری کے ڈرامائی انداز میں کہنے پر اس کی گرفت ضامن کی گردن پر ڈھیلی پڑی۔

"وہ بچوں والی کہانیاں پڑھتی ہے نا تو شادی کے بعد تم پڑھ کر سنا دینا اسے۔"

قہقہہ لگاتے، وہ اور صامن دونوں اسکے چنگل سے بچ کر بھاگے اور وہ بھی انکے پیچھے بھاگا یہ جانے بغیر کہ اب سے کچھ دیر پہلے کی ساری گفتگو کسی اور کی سماعتوں کا بھی حصہ بن چکی تھی۔

\*\*\*\*\*

"کیا کہہ رہے ہو؟"

یہ تو ہے ہی صدا کی بے شرم، اس نے تو کہا ہی کہا تم بھی منہ اٹھا کے آگئے اسکی حملیت کو۔"

وہ کٹیے لہجے میں بولتی، قہر برساتی نظروں سے ہیر کو دیکھنے لگی جو چھ بھائیوں کے بچوں بچ ماں کی طرف سے ہوئی عزت کو وصول کر رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے اماں!

ہماری ایک ہی ایک بہن ہے۔ ہم اسے دنیا کی ساری خوشیاں دینا چاہتے ہیں۔ اور اگر وہ کہہ رہی ہے کہ لڑکا اچھا ہے تو ایک بار دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

یہ دوسرے نمبر کا بھائی تھا، فیضی بھائی، جو اسے ساتھ لپٹائے، ماں کو منانے کے جتن کر رہا تھا۔

"کوئی سو بے غیرت مرے ہوں گے، جو تم جیسے بھائی پیدا ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ اس سے پوچھو کہ یونیورسٹی اسے پڑھنے بھیجا تھا لڑکے پسند کرنے۔"

چہرے پر غصہ اور آنکھوں میں جلال لیے وہ اپنے سامنے بیٹھے چھ بیٹوں اور ایک بیٹی کو دیکھنے لگی۔ ان کے مطابق سات کی سات اولادیں ان کے شوہر مرحوم پر چلی گئی تھیں۔

"بھائی دیکھ لیں، اماں اب زیادتی کر رہی ہیں۔ آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں آماں!

میں نے بھائی کو بتایا تھا، میں خود پسند کرنے نہیں گئی تھی۔"

بدک کر کہتی آخر میں مظلوم بنی ٹسوے بہانے لگی، کہ چھ کے چھ بھائیوں کے دل کانپ گئے فوراً بڑھ کر اسے اپنے حصار میں لیا۔

"اپنی یہ گز بھر کی زبان سنبھال کے رکھا کر میرے سامنے، ان بھائیوں کے سر پر چوڑی ہو رہی ہے۔ لگے گھر جا کر ہماری ناک کٹوانی ہے۔

ابھی سے کہہ رہی ہوں، اسے سیدھا کر دیں گے سسرال والے۔ آخر کو، کس کی بکری، کون ڈالے گھاس۔

تیر کی طرح سیدھی ہوگی، لکھوا لو مجھ سے۔"

اسے لتاؤتے وہ وثوق سے کہہ رہی تھیں۔

"اماں بس بھی کر دے اب!

اس نے بتایا تھا مجھے جب پہلی بار لڑکے نے بات کی تھی۔ اور اگر وہ کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کرتا تو ہم اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ ہمیں اپنی بہن پر پورا بھروسہ ہے۔"

سیفی بھائی نے اسے خود سے لگائے، اٹل لہجے میں کہا کہ اماں عجیب ہنسی ہنسیں۔

"ہاں!

مجھے بھی اس کی نالائقی پر پورا بھروسہ ہے کچھ نہ کچھ تو غلط اس نے بھی کیا ہوگا۔"

ماں تھی، آخر کو اولاد کی خصلت سے واقف تھیں۔

"بھائی!"

ہیر نے احتجاج بلند کیا۔

"وہ کیا غلط کرے گی اماں!

اکلوتی جان کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ پھر کہتی ہو ابا خواب میں آکر کنکر مارتے ہیں۔ انکی بیٹی کو تڑپاؤ گی تو خواب میں آکر کنکر ہی ماریں گے نا۔"

یہ سب سے چھوٹا تھا، عادل بھائی، جسے اپنی بہن بہت عزیز تھی۔  
خیر عزیز تو سب کو تھی، آخر کو سب سے چھوٹی اور اکلوتی بہن تھی۔

"اچھا جی!"

جو یہ میرے سینے پر سانپ بن کر بیٹھی ہے اس کا کیا؟ کوئی کام دہندا آتا نہیں ہے۔ بس  
مولے ٹی وی کے آگے بٹھا کر ریوٹ پکڑا دو۔

اور آگے سے اس کی فرمائشوں کی لسٹ سنو، فلاں جیسا سوٹ بنوا دو، فلاں جیسا دوپٹہ بنوا دو۔"  
ہاتھ نچا کر ہیر کی نقل اتار کر کہا۔ تو بھائیوں کے ساتھ ساتھ بھائیوں نے بھی ہنسی کا گلا  
گھونٹا جب کہ ہیر نے یہ زحمت بھی نہ کی اور چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔

"بے حیا، بے شرم، اسکو بہیانے آئے گا کوئی؟ نہ سلیقہ ہے نہ تہذیب پتہ نہیں کس اندھے کو پسند آئی ہے۔"

جوتی اٹھا کر ہیر کی طرف داغی پر اس سے پہلے ہی بھائی نے جھپٹ کر بہن کا تحفظ کیا۔

"سیدہ سیدہ بول دو نا اماں، جل رہی ہو مجھ سے کہ میرا اتنا اچھا رشتہ کیسے آگیا۔

میں نا کہتی تھی ہیرو آئے گا، میرے بالکل ہیرو جیسا ہے۔ ابھی تو تم نے اسے دیکھا نہیں ہے دیکھ لو گی تو جل جل کر سیاہ ہو جاؤ گی۔"

اترا کر کہتی وہ اماں کو مزید انگاروں پر لٹا گئی۔ اس سے پہلے کے دوسری جوتی بھی اس کا تعاقب کرتی، بھاگ کر کمرے میں پناہ لے لی۔

"اسی دن کے لیے کہتی تھی، نہ دو چھوٹ دیکھا منہ پھاڑ کے بکواس کر گئی ہے نا ماں کا لحاظ نہ بھائیوں کا نہ بھابھیوں کا۔"

ماتھا پیٹتی کہنے لگی تو بڑی بھابھی آگے بڑھ کر انکے پاس آ بیٹھیں۔

"اماں جان! آپ بھی تو اس کے رشتے کے لیے فکر مند تھیں نا اب جب اچھا رشتہ آ رہا ہے تو دیکھنے میں حرج کیا ہے؟"

"اماں! ہم بھائی کس لیے ہیں، اگر رشتہ اچھا نہ ہوا تو ہم ہرگز اقرار نہیں کریں گے۔ ہماری ہیر جتنی بھی جھلی ہو پر اس نے یہ اختیار ہمیں ہی دیا ہے۔ وہ جانتی ہے ہم جو کریں گے اس کے بھلے کے لیے ہی کریں گے۔"

بڑے بھائی نے بھی اگے بڑھ کر ماں کو دلا سے دیا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ویسے اچھی ایکٹینگ کر لیتی ہو اماں، ہیر کو اپنی آنکھوں سے دور نہیں کرنا چاہتی تو کہہ دو ہم اسے گھر بیٹھا کر رکھ لیتے ہیں۔"

ان کا چھوٹا بیٹا بظاہر تو مزاحیہ لہجے میں کہتا انکے پاس آیا پر انداز میں غم کی آمیزش صاف چھلک رہی تھی۔

"کیا کروں میری ایک ہی تو بیٹی ہے۔"

اصل دہڑکا تو یہی لگا تھا، چھ بیٹیاں گھر لے کر آئی تھیں۔ پر ایک کو بہیانہ تھا اور اس کے لیے دل بڑا ہی نہیں ہو پارہا تھا۔

سب کے چہروں پر افسرگی نے ڈیرا جما لیا، ہیر کے بغیر یہ دیواریں تو برقرار رہیں گی پر یہ گھر، اس میں شوخ و چنچل جملوں کی برسات ہوگی کہ نہیں کون جانے۔ ہیر ہی سے تو اس گھر کی رونق تھی۔

"ارے آپ لوگ اداس کیوں ہو گئے ہیں؟

ایک آغیٹا ہے میرے پاس کیوں نا اسے آپ لوگ گھر داماد بنا لو!"

دروازے سے جھانکتی وہ آنکھوں کے کٹوروں میں پانی لیے، چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائے انہیں ہنسانے کے جتن کرنے لگی۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوئی کہ سب کے ساتھ ساتھ اماں کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"بے شرم، شریفوں والی کوئی بات ہے بھی کہ نہیں تجھ میں!"

مصنوعی سنجیگی طاری کرتیں، وہ پھر سے اسے لعن طعن کرنے لگی۔ اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ سچی دیکھ کر وہ بھی مسکراتی، مزید عزت افزائی سے نچختی اندر کی اور بھاگی۔

آج ہی شہیار نے خبر دی تھی کہ وہ بہت جلد اپنا وعدہ وفا کرنے آ رہا ہے، ہیر نے پہلے سے ہی اپنے بھائیوں کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ اس دن سے جب پہلی بار شہیار نے اسکے دل کے تار



چھیڑے تھے۔ کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں نا جن کے لیے انکے بھائی، ماں اور بہنوں سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ دل کی ہر چھوٹی بڑی بات ان سے کہتی ہیں۔ ایسی ہی ہیر تھی۔ اپنے بھائیوں کا قلب، اور سکون!

چار سال پہلے ہیر کے ابا اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ہیر کا ساہبان بچھڑا، پر بھائیوں نے اسے محبت سے ایسے سمیٹا کہ اب ان کے لیے ہیر سے جدائی بہت مشکل ثابت ہونی تھی۔ پر یہ تو فرض تھا، جسے ادا کرنا تھا۔

\*\*\*\*

"ماشاء اللہ!

آپ کی بچی تو بہت پیاری ہے۔"  
عالم صاحب نے توصیفی انداز میں کہا۔

شہریار کے کہنے پر وہ دو دن بعد ہی ہیر کے گھر موجود تھے۔ زلیخا بیگم بھی دل مار کر بیٹے اور شوہر کی پسند پر خود کو راضی کر کے آگئی تھیں۔

درمیانے طبقے کے سادہ سے لوگ تھے۔ ہیر چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک بوڑھی ماں تھی جو دکھنے میں ہی کافی کڑیل اور سخت لگتی تھیں۔ اس بات سے زلیخا بیگم کو اندازہ ہوا کہ لڑکی کی تربیت اچھی کی گئی ہوگی۔ پر انہیں کیا معلوم کہ کچھ لڑکیوں کے کانوں میں ماں کے لعن طعن کرنے پر بھی جوں نہیں رینگتی اور یہاں تو ماشاء اللہ چھ چھ بہائی موجود تھے اس کے آگے ڈھال بننے کے لیے۔

"السلام علیکم!"

ہیر دہیمی آواز میں سلام کرتی اپنی اماں کے برابر آ بھی۔ بھابھیاں چائے اور باقی کے لوازمات سرو کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ رسماً تو یہ کام ہیر کو کرنا چاہیے تھا پر اس معاملے میں وہ ایک ہیروئن کے روپ سے نکل کر ایک عام چھوہڑ لڑکی بن جاتی تھی۔ تبھی اس نازک موقع پر یہ زہم داری بھابھیوں نے سنبھالنی ضروری سمجھی۔

"بیٹا، آپ کیا پڑھ رہی ہیں؟"

زلیخا بیگم نے شائستگی سے سوال کرنا شروع کیے، عالم صاحب تو خیر ہیر کی ظاہری خوبصورتی اور مشرقی حسن پر ہی بیٹے کی پسند کو دل ہی دل میں داد دے رہے تھے۔ اور ان کے چہرے کی مسرت، اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ ہیر انہیں بہت پسند آئی تھی۔

"جی!

میں بی بی اے کر رہی ہوں۔"

وہی دہیما لہجہ اپنائے جواب دیا تو اماں نے بھی دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو کوسا، انہیں یقین تھا کہ اس سین کے لیے بھی اس نے کتنی ہی فلمیں دیکھی ہوں گی۔

"ماشاء اللہ۔"

ہماری بیٹی تو بزنس وومن بنے گی کیوں بیٹا؟" عالم صاحب تو جوش سے بولے ہی، زلیخا بیگم بھی اس پیاری سی لڑکی کو دیکھتی نرمی سے مسکرائیں۔

"نہیں، انکل میں آگے پڑھنا نہیں چاہتی۔"

عالم صاحب کے سوال پر ہیر نے ساری لجاجت پرے رکھتے ہوئے جھٹ سے جواب دیا، مبادہ کہ وہ ایم بی اے کروانے کی بات ہی نہ کر دیں۔

ہیر کے جواب پر جہاں اماں کا رنگ پھیکا پڑا وہیں، بھائیوں کے چہروں پر ہنسی کے تاثرات نمایاں ہونے سے پہلے ہی وہ چچپا گئے۔ جبکہ زلیخا بیگم ہونق بنی سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو کچھ دیر پہلے انہیں کیا لگی تھی اور اب کیا؟ اور عالم صاحب، بیگم کے تاثرات دیکھ کے کھسیانی ہنستے اور بات کو مذاق کا رنگ دے گئے۔

"نہیں بھائی صاحب! اس کا کہنے کا مطلب تھا کہ یہ بزنس وغیرہ نہیں کرے گی۔ لڑکیاں گھر سنبھالتی ہی اچھی لگتی ہیں، کیوں ہیر بیٹا!"

اماں نے بچ میں مصلحت کی راہ ہموار کی۔ اور ہیر نے بھی اپنی غلطی پر کھسیاتے، ہاں میں زور و شور سے سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں بہن جی! یہ تو ہیر بچے کی چوائس ہے۔"

فراغ دلی سے کہتے وہ اس بات کو زلیخا بیگم پر ظاہر کر گئے تھت کہ بہو تو وہ یہی اپنے گھر لے جائیں گے۔ اور زلیخا بیگم وہ ان کی ہٹ دہرمی پر خود کو پرسکون رکھنے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھیں۔

"اور بیٹا آپ کی ہابیز کیا کیا ہیں؟"

زلیخا بیگم کا ایک نیا سوال ابھرا جس پر اماں کے چہرے پر رنگ اڑا، آخر کو جانتی تھیں بیٹی کا جواب کیا ہوگا۔

"جی آنٹی، ٹی وی دیکھنا۔"

اپنے جواب پر سامنے بیٹھی خوبصورت عورت کی آنکھوں میں نا سمجھی اور بے یقینی بھانپ کر مزید بولی۔

"ایکچوٹی آنٹی مجھے نا فلمز اور ڈرامے بہت ہی پسند ہیں تو فارغ وقت میں، میری ہابی ٹی وی دیکھنا ہی ہوتا ہے۔"

تفصیلاً بیان کرتے وہ داد کی طلبگار تھی جبکہ زلیخا بیگم کی پھٹی آنکھوں کو دیکھ کر عالم صاحب نے اپنا قہقہہ دبایا۔

"ارے واہ!

کون کون سی فلمز دیکھتی ہے ہماری بیٹی؟"

وہ بھی فلموں اور ڈراموں کے دلدادہ تھے۔ اور یہ تو ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

"ساری۔

مطلب جو کیبل پر لگ جائے۔"

ساگی سے جواب دیتی، دھیما سا مسکرائی تھی۔

اور زلیخا بیگم ان کے تاثرات اماں کا گلا خشک کرنے کو کافی تھے۔  
پر یہاں اچھی خاصی سمجھدار ہیر کو اس کی بے وقوفی کا بتائے کون؟

"کوئی ایک پسندیدہ فلم بھی تو ہوگی نا بیٹا آپکی؟"

اب یہ موضوع چھڑ چکا تھا، اور گھنٹہ ڈیڑھ تو ان پر بات کرتے ہی صرف ہو جانا تھا۔

"چوڑیاں۔ سب سے فیورٹ ہے۔"

پہلے جھجھک کر اماں کو دیکھا اور پھر عالم صاحب کو ہمہ تن گوش پایا، تو اعتماد سے گویا ہوئی۔ جیسے کسی پسندیدہ کتاب کا بتایا جا رہا ہو۔  
زلیخا بیگم نے اس کے جواب پر پہلو بدلا۔

"ارے واہ!

میری بھی پسندیدہ فلم چوڑیاں ہی ہے۔ اور صائمہ تو ایک وقت میں میرا کرش... میرا مطلب ہے کہ پسندیدہ ہیروئن تھیں۔"

جزبات کی رو میں بہتے منہ سے غلط نکلا، اس کے بعد بیگم کی گھوری پر بات کو سنبھال گئے۔

"وحید مراد، شان، معمر رانا، ان سب کی فلمیں بہت شاندار ہوتی ہیں۔"

بات کرتے کرتے اب ہیروئن سے موضوع ہیرو کی تعریف پر آکا تھا۔

بھائی بھابھیاں، زلیخا بیگم اور اماں سب بس آنکھیں پھیلائے کبھی ہیر کو سنتے تو کبھی عالم صاحب کو۔

اور وہ دونوں اپنے ارد گرد موجود سب نفوس کو بھلائے اہم بحث کا حصہ بنے ہوئے تھے۔

"واہ بچے مجھے سن کر بہت اچھا لگا ورنہ آج کل کی نسل تو ہمارے ماضی کو بھول ہی بیٹھی ہے۔"

عالم صاحب کے توصیفی کلمات پہ زلیخا بیگم نے آنکھیں گھمائیں، جیسے ان کے ماضی کا رشتہ بھی فلم کی دنیا سے جڑا ہو۔

"جی بالکل انکل!

آج کل تو بس ڈرامے ہی اچھے آرہے ہیں۔ فلمیں تو دیکھنے لائق ہی نہیں ہیں۔ فلم تو پرانے زمانے کی تھیں۔ اور ان کی ہیروئن اتنی خوبصورت پنجابی بولتی تھیں کہ واللہ۔"

ہیر اور عالم صاحب کی گفتگو سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں رشتے کی بات ہونے والی تھی۔ اماں کا دل کر رہا تھا اس کی چرب زبانی پہ خود کو کچھ کر لیں یا پھر اسی کا قصہ تمام کر دیں۔ جب کہ بھائیوں کی آنکھوں اور کانوں پر پردے پڑے تھے۔ انہماک سے دونوں کے مابین گفتگو سن رہے تھے۔

"بچے آپ نے تو میرے دل کی بات کر دی۔"

بہن جی ہمیں تو آپ کی بیٹی بہت پسند آئی ہے۔ اس پیاری بچی کے آنے کے بعد ہمارے سنان گھر میں رونق ہو جائے گی۔ بس آپ جلدی سے ہمیں ہاں کر دیں۔ کیوں زلیخا؟"



عالم صاحب، ہیر کو جواب دینے کے بعد اماں سے مخاطب ہوئے اور آخر میں رسماً زلیخا بیگم کو بھی گفتگو میں شامل کیا۔

زلیخا بیگم کو تو اپنا آنا غیر آہم لگا، کیونکہ سارے معاملات عالم صاحب طے کر ہی چکے تھے۔

"جی بالکل۔

ویسے بھی ہیر آگے پڑھنا تو چاہتی نہیں ہے، تو آپ جلد سے جلد ہمیں ہیر کا ہاتھ ہمارے بیٹے کے لیے دے دیں۔"

ایک گھوری عالم صاحب پر ڈال کر شائستہ لہجے میں لطیف سا طنز بھی کر دیا۔ اور ان کے بر ملا رشتہ مانگنے پر ہیر شرما کر ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئی جس پر ستائشی نظر ڈال کر عالم صاحب گویا۔

"بالکل مشرقی بیٹی ہے ہماری،

کیوں؟"

اور ان کے ایسا کہنے پر زلیخا بیگم نے بھی زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر بات کی تائید کی جب کہ وہ تو ہیر کے جوابات سن کر اپنے گھر کا مستقبل سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

"بھائی صاحب!

ہیر ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ اللہ نے چھ بیٹوں کے بعد رحمت سے نوازا ہے، تبھی بڑے لاڈپیار میں پلی ہے۔ تھوڑا مزاج میں کچا پن ہے اور لااوبالی سی بھی ہے پر دل کی بہت اچھی ہے۔" اپنے بیٹوں پر نظر ڈال کر انہوں نے لمبی تمہید باندھی۔

"جی کوئی بات نہیں، لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے خوش مزاج۔" زلیخا بیگم نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں کہا۔

"جی بس۔ بیٹی ذات ہے اور وہ بھی ایک ہی تو ہم باہم مشورہ کر کے آپ کو پیغام دے دیں گے۔"

اب اصل مدعا پر آئی جس پر دونوں میاں بیوی راضی ہوتے دکھے۔

"جی بالکل!

آپ سوچ لیں، بلکہ ہمارے بیٹے کہ بارے میں جو معلومات چاہیے وہ لیں۔ آخر کو یہ آپ لوگوں کا حق ہے۔ پر ہمیں جواب ہاں میں ہی چاہیے۔"

عالم صاحب نے قطعیت سے کہا جس پر ڈرائنگ روم کی درز سے جھانکتی آنکھوں میں شرمیلا پن پھر سے نمودار ہوا۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی۔

\*\*\*\*\*

"ڈیڈ!"

اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ کیا بنا؟"  
مسلسل لاونج میں چکر کاٹتے وہ انکے آنے کا انتظار کر رہا تھا، اور جیسے ہی انہیں گھر کے اندر آتے دیکھا۔ آگے بڑھ کر بے چینی سے سوال کیا۔

"آؤ بتاتا ہوں!"

عالم صاحب بے حد سنجیدہ دکھے تھے۔ شہریار کے دل میں پل بھر میں بے قراری آن بسی۔

اسے ساتھ لیے وہ بیٹھ کر ازحد سنجیدہ چہرے کے ساتھ بات جاری کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔ جب کہ زلیخا بیگم تو دونوں باپ بیٹوں کو نظر انداز کیے پہلے ہی آ بیٹھی تھیں۔ آخر کو

فیصلہ دونوں لے چکے تھے، اور انہیں تو آٹے میں نمک کے برابر بھی اہمیت نہ دی تھی۔ تو بس انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

"ڈیڈ!"

کیا ہوا ہے؟

کیا کہا انہوں نے؟

زلیخا بیگم نے شہریار کی بے چینی اور عالم صاحب کی اداکاری کو کوفت سے دیکھا۔ یہ تو طے تھا کہ بہو اور سسر مل کر گھر کو فلمی سٹوڈیو میں تبدیل کر دیں گے!

"ہم نے ہیر کا ہاتھ تمہارے لیے مانگا تو انہوں نے کہا،"

عالم صاحب نے ڈرامائی وقفہ لیا۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

شہریار کے جسم کا ہر عضو سماعت بنا ان کے آگے کے فقرے کا منتظر تھا جب کہ دل دعا کا سہارا لے رہا تھا کہ خبر اچھی ہو۔

"یہی کہ ہم سوچ کر جواب دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ تو پرسکون سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے جبکہ شہریار کا سکون غارت ہو گیا۔

"کیا مطلب؟"

کوئی جواب نہیں دیا؟ ہاں یا نہ کچھ تو کہا ہوگا، ایسے کیسے سوچ کر جواب دیں گے۔ آپ صبح سے بتائیں کیا جواب دیا۔"

شہریار کا اتاولا پن عالم صاحب کو بہت مزہ دے رہا تھا وہیں زلیخا بیگم کو شدید بیزاری کا سامنا تھا۔

"ریلیکس شیری!"

ایسے کاموں میں فیصلے سوچ سمجھ کر ہی ہوتے ہیں۔ فوراً سے کوئی بھی ہاں یا نہ نہیں کہتا۔  
ان کے رسان سے سمجھانے پر وہ سمجھتا، کچھ حد تک سکون سے بیٹھا پر دل کا کیا کرتا جسے کسی کل چین نہیں آ رہا تھا

"پھر بھی بتایا تو ہوگا، کب تک جواب دیں گے۔"

بے چینی سے ہاتھ میں پہنی گہری میں وقت دیکھتا وہ ذلیخہ بیگم سے گویا ہوا۔  
وقت تو ایسے دیکھا جا رہا تھا کہ ابھی کچھ گھنٹوں میں زلٹ آجانا ہو۔

"یہ انکی مرضی وہ ایک ہفتے بعد جواب دیں یا ایک مہینے بعد۔"  
کند ہے اچکا کر کہتیں وہ انگلیوں میں موجود انگوٹھیاں اتارنے لگیں۔

"ہفتے یا مہینے؟"

اتنا ٹائم کیوں لینا ہے؟

رشتہ پسند کرنا ہے کہ رشتہ گھر پر بنانا ہے۔"

اتنے لمبے عرصے کے انتظار کا سنتے ہی بدک کر اٹھا اور دونوں ماں باپ سے استفسار کرنے لگا۔  
زلیخا بیگم نے ناگواری سے اس کا یہ انداز دیکھا۔

"او بیٹا جی!"

رشتہ بنانا ہی ہے۔ تبھی سوچ سمجھ کر وقت لے کر ہی کچھ فیصلہ کیا جائے گا نا۔"  
عالم صاحب نے اسے اپنے ساتھ بیٹھاتے تحمل سے معاملے کی نزاکت کا ادراک کروایا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ شیریں، آخر اس لڑکی میں ایسا ہے بھی کیا کہ تم مرے جارہے ہو۔"  
 ساڈھی کا پلو درست کرتی وہ بیٹے کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے سوال کرنے لگیں۔ شہیار نے  
 ان کے اس تفتیشی روپ اور لفظوں پر آنکھوں میں حیرانی لیے انہیں دیکھا۔

"کیوں مام۔ آپکو ہیر پسند نہیں آئی؟"

"کیا بات کرتی ہو زلیخا اتنی پیاری بچی ہے، اور تمہیں پسند نہیں آئی"  
 عالم صاحب شامل گفتگو ہوئے۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے پسند نہیں آئی۔ بہت پیاری ہے ماشاء اللہ!  
 پر میں شیریں سے جاننا چاہتی ہوں آخر اس نے کس بیس پر ہیر جیسی لڑکی کو چنا ہے۔ کیونکہ  
 جہاں تک میں جانتی ہوں شہیار کی پرائیٹی ہیر جیسی لڑکی نہیں ہو سکتی۔"  
 عالم صاحب کو جواب دینے کے بعد وہ براہ راست شیریں کو دیکھ کر اپنی بات کہہ رہی تھیں۔

"کیا مطلب ہیر جیسی لڑکی مام؟"  
 شہیار کی سوئی انہیں تین لفظوں پر اٹک گئی تھی۔

"دیکھو شیریں۔ ہیر بہت چنچل اور غیر زمرہ دار لگی مجھے۔ اسے تو پڑھائی تک کا شوق نہیں ہے۔ اور تو اور وہ پنجابی فلمیں دیکھتی ہے۔ جب کہ تم تو جب سے پیدا ہوئے تم نے ایک فلم بھی ایسی نہیں دیکھی ہوگی۔ تم دونوں بہت مختلف ہو۔"

ان کے انداز میں ہیر کے لیے حیرانی تھی، اس کی زبان کے جوہر جس طرح وہ فلموں پر تبصرے کر رہی تھی۔ اور جتنا علم اسے فلموں پر تھا زلیخا بیگم کو تو اس کے بی بی اے میں ہونے پر بھی شک گزرا۔

زلیخا بیگم کے آخری جملے پر شہریار نے کان کجھائے، اب وہ کیا بتاتا ان چھ ماں میں وہ کئی پنجابی فلمیں دیکھ چکا تھا۔

"اور اس کی فیورٹ فلم پوڑیاں ہے۔"

بولتے بولتے وہ پسندیدہ فلم کے نام پر جھرجھری لے گئیں۔ آخر کو ایک وقت میں صائمہ انہیں اپنی رقیب لگتی تھی۔

"رٹیلی.. کیا اتفاق ہے پاپا اور میری بھی فیورٹ فلم پوڑیاں ہی ہے۔"



ان کے جملے پر روانی میں اس کے منہ سے یہ لفظ تو ادا ہو گئے پر عالم صاحب اور ذلیخہ بیگم آنکھیں پھاڑے اپنے سپوت کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا؟"

زلیخا بیگم کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

پھر سے کان کھاتا ایک نظر باپ کے چہرے کو دیکھا جہاں فخر سے مسکراہٹ اکڑی ہوئی تھی اور پھر ہاں میں سر ہلا دیا کہ زلیخا بیگم بے یقینی سے بیٹے کو دیکھتے ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گئیں۔

"اب کیا بنے گا اس گھر کا۔"

انہیں بس اسی چیز کی فکر کھائے جارہی تھی۔

\*\*\*\*\*

"ہم آپ کے نمک حلال ہیں۔ ہم جھوٹ کیوں بولینگے؟ ہم نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔

جی۔ یہ سب چھوٹے ضیغم سائیں اپنے دوستوں سے کہہ رہے تھے۔

جی، جی۔"

فون کان سے لگائے، وہ ہمیشہ کی طرح حویلی میں اطلاع پہنچا رہے تھے۔

"اس بات کا ذکر تم کسی اور سے نہیں کرو گے، شکیل!"

فون کے اسپیکر سے رعب میں لپٹی کچھ کچھ خوف سے اٹکتی آواز میں کہا گیا۔ جس پر شکیل کا کا نے فرمانبرداری سے سر ہلایا۔

"آپ فکر ہی نا کریں۔"

پر آپ سائیں کو سمجھائیں۔"

آگے سے انہیں تسلی دی گئی تھی اور ساتھ میں کچھ بدلیت بھی دی جا رہی تھیں۔ جسے سمجھتے وہ ہاں کی تکرار جا رہی رکھے ہوئے تھے۔

اس دن ضیغم کے گھر پر شہریار اور ضامن کے بیچ ہونے والی گفتگو اور ضیغم کے زبان سے اقرار سن کر شکیل کا کا کو اپنے چھوٹے سائیں پر ترس آیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنی محبت کو نہیں پاسکیں گے۔ پر اگر ابھی سے محبت پر لگام ڈال دی جائے تو شاید محبت مزید پنپنے کی بجائے شروعات میں دم گھٹنے کے باعث مر جائے، تو انہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔

\*\*\*\*\*

"کیا کر رہی ہو؟"

ہاتھ میں فائل پکڑے، وہ سائے میں بیٹھی عینا کے، سامنے بیٹھ گیا۔

وہ جو رجسٹر پر جھکی مسلسل کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ ضیغم کی آواز پر سر اٹھا کر اسے دیکھا اور صفحے کو مزید اسکل کی جانب کیا۔

"یہ....!"

آواز اور انداز جھنجھلائے ہوئے تھے۔ کب سے وہ ایک سوال حل کرنے کی کوشش میں لگی تھی پر وہ اس سے ہو ہی نہیں پار رہا تھا۔

"دکھاؤ!"

ابھی تھکا ہارا، وہ دو دن بعد ہونے والی پریزینٹیشن کا مواد اکٹھا کر کے آیا تھا۔ دو دن کے وقفے کے بعد ضامن کی بھی پریزینٹیشن تھی اور اس سے لگے دو دن کے بعد شہریار کی۔ سب کی ہی لائبریری کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔

"ارے اسے ایسے تو نہیں کرنا تھا۔"

مائیکرو ایکناکس کا تھوڑا مشکل سوال تھا جس پر کافی سٹوڈنٹ اٹکتے تھے اور اس وقت عینا بھی اسی سوال پر اٹکی ہوئی تھی۔

"میں ہر طرح سے کرچکی ہوں پتہ نہیں کیسے ہوگا۔"

بالوں کو جھٹکتی، بیزاری سے بولی کہ ضیغم کے لب مسکائے۔ ایسی بے پرواہ اداؤں سے ہی تو اس کے دل کو قید کر رکھا تھا۔

"ایسے کرنا تھا۔"

کچھ دیر تک رجسٹر پر سوال کرنے کے بعد اسکی جانب گھمایا تو عینا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"چلو شکر!"

ایک ٹینشن تو ختم ہوئی۔"

شکر کا سانس بھرتی، وہ رجسٹر بند کر کے بیگ میں رکھنے لگی اور ساتھ میں ہی فائل باہر نکالی۔

"اچھا اور کتنی ٹینشنز ہیں تمہاری زندگی میں؟"

ماتھے پر بکھرے بالوں کو سمیٹتے نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہ آسائمنٹ..."

اور سب سے بڑی پریشانی پرپرینٹیشن دینا ہے۔"

چہرے پر سو فکرے لیے پھر سے مصروف ہو گئی۔

"پڑھائیاں سوکھیاں نہیں۔"

(پڑھائی آسان نہیں)

اس کی پریشان صورت کو آنکھوں میں بساتے، لطیف انداز میں پنجابی میں جملہ کسا جس کی عینا کو تو کھک سمجھ نہ آئی۔

"کیا؟"  
وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"ارے تم تو لاہور سے ہونا۔"  
اسے لگا تھا کہ وہ پنجابی سمجھتی ہے۔

"لاہور سے تھی۔"  
لاہور کے ذکر پر ناگواری کے بل اس کے چھوٹے سے ماتھے پر آئے تھے جسے صاف ضیغم کی نظروں  
نے دیکھا تھا۔

"تو تمہیں پنجابی نہیں آتی۔"  
انداز خاصا چڑانے والا تھا۔

"ہاں تو! میں لاہور میں پیدا تو نہیں ہوئی تھی۔"  
چشمہ آنکھوں پر درست کرتی لفظ لاہور چبا کر بولی۔

"یہ بتائیں آپ نے کہا کیا؟"  
بھوری آنکھوں میں دیکھ کر استفسار کیا۔

"چہرہ کچھ نہیں کہا!

دکھاؤ کیا آسائمنٹ ملی ہے۔ اور پریزنٹیشن کس ٹاپک پر ہے؟"  
ہنستے ہوئے، اس سے فائل لے کر اپنی طرف کھسکاتا، وہ انہماک سے پڑھنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے  
دلچسپ تاثرات چہرے پر آئے، عینا کی نظریں مسلسل ضیغ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جہاں  
صرف نرمی کا راج تھا۔ ضیغ نے سر اٹھایا، اسے خود پر ساکت نظریں ڈالے دیکھا تو اس کی  
آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرانے لگا۔

"کہاں گم ہو؟"

"ک۔ کہیں نہیں۔"

وہ نجانے اس کے چہرے پر کیا تلاش کر رہی تھی۔ ماتھے کو ہاتھ کی ہتھیلی سے مسلتی، چشمہ  
درست کرتی اٹک اٹک کر بات مکمل کرنے لگی۔

اور دل کے ہمک ہمک کر ایک نئی دہن پر تھرکنے پر دہڑکنوں کے شور سے گھبراتی ادھر ادھر دیکھ کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

"یہ مینیجمنٹ کی آسائمنٹ تو بہت آسانی سے بن جائے گی، بلکہ لائبریری میں ایک بک ہے وہاں سے تمہارے ٹاپک کا سارا میٹریل تقریباً مل جائے گا۔"  
 رسان سے اسے سمجھاتا پھر سے فائل پڑھنے لگا، اب وہ پریزنٹیشن کے ٹاپک کو پڑھ رہا تھا۔

"یو آر لکی، سر ندیم کبھی بھی مائیکرو اکنامکس میں پریزنٹیشن کے لے آسان ٹاپکس نہیں دیتے۔ یہ تو بہت آسان ہے۔"

"ہاں تو میں نے کب کہا یہ مشکل ہیں۔"

فائل تقریباً کھینچنے کے انداز میں اس سے لیتی صفحات کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ جب کہ اس کے تیور اس کے جھوٹ بولنے کی صاف چغلی کھا رہے تھے۔



ضیغم نے دلچسپی سے اس کا یہ روپ دیکھا وہ کچھ دنوں سے کافی الگ طرح سے پیش آرہی تھی۔ کبھی خود ہی گھبرا جاتی تھی کبھی موضوع ہی بدل دیتی تھی۔ اور یہ تبدیلی تو واضح تھی کہ اب وہ خود کو برا بھلا نہیں کہتی تھی۔

"ویسے کب ہے پریزنٹیشن؟"

بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ سرسری سا پوچھنے لگا، ارادہ اسکی مدد کرنے کا تھا۔ جانتا تھا، وہ اکیلی نہیں کر پائے گی۔ پچھلی تمام پریزنٹیشن کی تیاری تائشہ یا پھر ضیغم نے مل کر کروائی تھی۔ پھر بھی نتیجہ خاص اچھا نہیں تھا۔ پر اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب کلاس کے سامنے بولنے سے اس کی ٹانگیں نہیں کانپتی تھیں۔ کچھ حد تک اعتماد بحال ہوا تھا۔ اور ایسے تبدیلی کے آنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔

"ایک ہفتے بعد۔"

مصروف سی صفحوں کو الٹ پلٹ کر کے غور سے کم گھور کر زیادہ دیکھ رہی تھی۔ ایسے دیکھنے سے شاید پریزنٹیشن خود بن کر سامنے آجائے گی، ضیغم کو تو خیر یہی لگا۔

"کوئی ہیلپ چاہیے ہو تو بتانا"

، ہیر اور تائشہ کو اسکی طرف آتے دیکھ کر وہ یہ کہتا اٹھ گیا تھا۔

"ہممم"۔

سر ہلاتی وہ گردن اوپر کیے اس لمبے کسرتی جسم کے حامل جوان کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے اب اسے عجیب جھجھک محسوس ہوتی تھی۔ بے گانگی والی نہیں، بلکہ ایک الگ احساس جنم لے رہا تھا جسے پہچاننے سے وہ قاصر تھی۔

وہ تو کہہ کر پلٹ گیا جبکہ وہ ابھی بھی اس کی پوڑی پشت کو تک رہی تھی یہاں تک کہ وہ گراؤنڈ سے ہوتا ہوا کوریڈور میں چلا گیا۔

"او ہیلو!"

مسلسل اسے سامنے خلاوں میں گھورتے دیکھ کر ہیر نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔ اور تائشہ وہ عینا کی نظروں کے تعاقب میں ضیغم کو دیکھ چکی تھی۔ چاہے لڑکیوں جیسے طور طریقے اور ڈھنگ سے ناواقف صحیح، پر عینا کی بھٹک بھٹک کر جاتی نظریں اور ضیغم کی چہرے پر کھلنے والی مسکراہٹ وہ پڑھ پارہی تھی۔

"تم دونوں میں کچھ چل رہا ہے؟"

بغیر لگی لپٹی رکھے کتابوں کو درمیان میں رکھتے، اس نے سوال داغا جس پر الجھی الجھی نظروں سے دونوں نے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

پہلے وہ خود سے الجھی ہوئی تھی، اب تائشہ کی بغیر سر، پیر کی باتیں۔  
یہ کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ، آنکھوں کو انگلی کی مدد سے دباتے اس نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کیا ضیغم بھائی اور تم میں کچھ چل رہا ہے۔"  
تائشہ کو ہمیشہ سے صاف اور کھری بات کرنے کی عادت تھی، سو اس نے تو کہہ دیا۔

"تسوا! تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟"

عینا تو گنگ ہوئی ہی تھی، پر ہیر کو بھی جھکا لگا تھا۔

"میں نے صرف پوچھا ہے، تم نے نوٹ نہیں کیا کیسے وہ اس کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو انہیں عینا کے علاوہ کسی اور لڑکی کے ساتھ بات کرتے تک نہیں دیکھا۔"  
تائشہ نے پریکٹیکل بات کی منطق پیش کی جسے عینا نے فوراً رد کیا۔

"وئی آر جسٹ فرینڈز".

قطعیت سے کہنے کی کوشش کی تھی، پر آواز میں لڑکھڑاہٹ ضرور تھی، جیسے چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔

"گرلز اینڈ بوائز کین نیور بھی فرینڈز".

تائشہ بے حد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"ہو سکتا ہے تم نہیں جانتی ہو، پر میں سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ضیغم بھائی لائکس یو!"

تشو کے لفظوں کے ساتھ ساتھ آواز اور لہجے میں بھی یقین تھا جب کہ عینا نے نچلا ہونٹ کچلتے ہوئے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ ذکر چھیڑ کر اس کے انجان جزبات کو ہوا دے رہی تھی۔ وہ اس راہ کی مسافر تھی ہی نہیں، وہ تو منزل سے ہی نا آشنا تھی۔ پر کبھی کبھی حسین حادثے ہو بھی جاتے ہیں، کہ پتہ ہی نہیں چلتا کب راہ بدل جاتی ہے، اور منزل تک تبدیل ہو جاتی ہے۔

"عینا، مجھے بھی تائشہ کی بات سچ لگتی ہے۔ ہمیں تو بتاؤ کیا ایسا کچھ ہے؟"

ہیر نے نرمی سے سوال کیا۔

جواب میں عینا نے محض سر نہ میں ہلایا۔ دل الگ خواہش لے کر سامنے آیا تھا کہ تائشہ جو کہہ رہی ہو وہ حرف حرف سچ ہو۔ پر دماغ نے اس خیال کی ہی نفی کی تھی، آخر کو یہ ناممکنات میں سے تھا اور جس کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو ایسی خواہش کو دبا دینا ہی بہتر ہے۔

عینا کے انکار پر ہیر نے سوالیہ نظروں سے تائشہ کی جانب دیکھا۔ تائشہ نے کندھے اچکا دیئے۔

"اگر یہ کہہ رہی ہے تو پھر نہیں ہوگا کچھ، پر مجھے اب بھی لگتا ہے کہ ضیغم بھائی لائکس ہر۔" تائشہ نے منطقی انداز اپنائے بات ہی ختم کر دی۔ پر بات اسی موڈ پر ختم کی کہ وہ اپنی بات پر اب بھی قائم ہے۔

اور عینا اس کا چہرے کا رنگ، ہونٹوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ پلکوں کا لرزنا، سب اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

اس کا چہرہ اس کے اندر کی کیفیت صاف دکھا رہا تھا۔ تائشہ اور ہیر نے اس کے بعد تو کوئی بات اس متعلق نہ چھیڑی پر وہ عینا کے دل کا حال جان گئی تھیں۔  
ایک انجان تھی تو وہ صرف عینا تھی!

\*\*\*\*\*

"ارے میری پیاری ماں، آپ ابھی سے میری شادی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔"  
ضامن نے چڑ کر پر تعمیز کا دائرہ ہاتھ میں تھامے نرمی سے بات مکمل کی۔

"تو اور کس کے پیچھے پڑوں، تم بس مجھے اتنا بتاؤ کہ تمہارا لاسٹ سمسٹر کب ختم ہو رہا ہے"  
ضامن کی امی قطعیت سے کہتیں، بے حد سنجیدہ دکھ ہی تھیں۔

اور ضامن کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ کیا ضرورت تھی، بھڑوں کے چتھتے میں ہاتھ  
ڈالنے کی۔ شہریار کی پسند اور پھر اس کے رشتے کے بارے میں مزے لے لے کر وہ اپنی امی  
اور ابو کو سنا رہا تھا کہ صلہ بیگم نے بھی اس کی شادی کروانے کی تان پکڑ لی۔

"تین مہینے بعد فلیمنلز ہیں۔"

کیوں؟

ان کے سوال پر جواب دیتا، مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بس ٹھیک ہے، تمہارے پیپرز کے بعد ہی تمہاری شادی کر دیں گے۔ اب شیری اور تمہاری ایک ہی عمر ہے۔ تو تم دونوں کی شادیاں بھی تو ساتھ ہونی چاہیے نا۔"  
 پیار سے اسکے بالوں میں ہاتھ پھیرتی وہ اپنا جواب سنا گئیں۔

"آپ تو ہاتھ پر سرسوں جمارہی ہیں۔ اتنی جلدی شادی کے لیے ایک عدد لڑکی بھی ضروری ہوتی ہے بیگم صاحبہ۔"

مجبوراً ضامن کے ابو کو گفتگو میں حصہ لینا ہی پڑا۔ اور ان کے بولتے ہی ضامن نے سکھ کا سانس لیا۔

"ہاں!"

تو شادی کسی لڑکی سے ہی کرواؤنگی نا اپنے بیٹے کی۔  
 اور وہ بھی ضامن کی پسند کی ہوگی۔"

"میری پسند کی؟"

دونوں کو ابھی نظروں سے دیکھتا پوچھ بیٹھا۔

"ہاں یاسر کے لیے اپنی پسند کی لائی تھی، تو بھی وہ پرائیوں جیسی نکل۔ اور یاسر اپنی بیوی کو ساتھ لیے باہر چلا گیا۔

پر تم اپنی پسند کی لانا، جانا ہے تو جاؤ پر پسند تو تمہاری ہو تاکہ مجھے کوئی ملال نہ ہو۔"

یاسر کے ذکر پر تینوں کے چہروں پر اداسی چاہ گئی جبکہ صلہ بیگم کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

"امی!

میں آپ کی پسند سے ہی شادی کرونگا۔

اور اگر اپنی پسند کی بہو آپ کے لیے لایا بھی تو آپ لوگوں کو چنوڑ کر کہیں نہیں جاوے گا۔ کیونکہ اس پورے گھر کا اب اکلوتا وارث تو میں ہی ہوں نا۔"

انہیں خود میں بھیختا، سر کی مانگ پر لب رکھے وہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو گیا۔

"خبردار جو ایسا سوچا تو، اس میں یاسر کا برابر کا حصہ ہے۔"



اس سے الگ ہوتیں، مصنوع خفگی سے کہنے لگیں جس پر ضامن نے بھی احتجاج بلند کیا۔

"یار ابو یہ تو نانصافی ہے امی ہمیشہ یاسر بھائی کو پیار کرتی ہیں۔ چاہے وہ کچھ بھی کر لیں ان کا پیار ختم نہیں ہوتا۔"

"وہ میرا بڑا بیٹا ہے۔"

ان کے لہجے میں حسرت اور آواز میں ممتا کی تڑپ تھی۔

پانچ سال ہو گئے تھے انہیں پاکستان سے گئے ہوئے، پہلے تو فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اب تو کچھ عرصے سے رابطہ ہی نہیں ہو پارہا تھا۔

"اور میں آپ کا چھوٹا اور لاڈلا بیٹا۔"

ضامن نے یاد دلانا ضروری سمجھا۔

"ضامن تم تو میرے لاڈلے ہو، ادھر آؤ میرے پاس۔"

نواز صاحب ضامن کو بانہیں پھیلا کر اپنی طرف بلانے لگے، ضامن بھی صلہ بیگم کو چڑاتا اپنے ابو کی بانہوں میں سمٹ گیا۔

"قانوناً ساری جائیداد پر میرا ہی حق ہے۔"  
انہیں باور کروانا، ان کی چڑ کو مزید ہوا دے گیا۔

"میں بھی دیکھتی ہوں، کیسے تمہیں ملتی ہے ساری جائیداد۔"  
غصے بھری نظر مسکراتے شوہر پر ڈال کر حتمی بات کرتی جانے لگیں۔

"ہاں ہاں دیکھتے ہیں۔"  
ضامن نے بھی پیچھے سے ہانک لگائی جس پر کشن سیدبا اسکے رخ مبارک پر آن پڑا۔

"کیوں تنگ کرتے ہو ماں کو۔"

محبت سے اسکے بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں سنوارتے وہ بولے۔ تو ضامن نے انکے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"میں تنگ نہیں کرتا، میں تو یہ سب اس لیے کہتا ہوں تاکہ بھائی کو یاد کرتے وہ بات بات پر اداس نہ ہوں۔ دیکھا نہیں بھائی کو اب بھی کتنا پیار دیتی ہیں۔ اور دیکھ لیجئے گا ان کا بس چلے تو میرے حصے کی جائیداد بھی بھائی کے نام کروادیں۔"

ضامن کے جواب پر وہ محبت سے اس کا چہرہ تکیے لگے۔ اب تو ضامن ہی ان کے پاس موجود تھا انکے دکھ سکھ کا ساتھی، ان کا ایک ہی کنڈہ جو دونوں کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔ یاسر نے تو ایک بار بھی بڑھاپے کی دہلیز پار کرتے ماں باپ کو مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"ویسے تمہاری امی تو شیری کی شادی ہونے سے پہلے ہی تمہاری شادی کروا کر چھوڑینگے۔ لیکن کوئی کام دہندا کرو گے تو لڑکی کا ہاتھ ملے گا نا۔"

"ہاتھ کسے چاہیے، امی تو پوری کی پوری لڑکی لائیں گی میرے لیے۔"

ضامن نے آنکھ دبا کر شرارت سے کہا۔

"شریر۔"

اسکے کان پکڑے وہ بھی اس جملے پر ہنس دیے۔

"شیری، ضیغم اور میں مل کر کچھ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ بس یہ دگری مل جائے۔"

شرارت ایک جگہ رکھے اب وہ سنجیگی سے اپنے مستقبل کے پلان کے بارے میں نواز صاحب سے بات کر رہا تھا اور وہ بھی دلچسپی سے اسے سن رہے تھے۔

نواز صاحب اور صلہ بیگم کے دو ہی بیٹے تھے۔ یاسر نواز اور ضامن نواز۔

یاسر بچپن سے ہی صلہ بیگم کے نزدیک تھا۔ صلہ بیگم نے اپنی پسند کی لڑکی سے اس کی شادی کروائی تھی کہ وہ ان ہی کی طرح گھر کو جوڑ کر رکھے گی۔ پر ہر فیصلہ درست تو نہیں ہوتا۔ کچھ عرصے بعد ہی یاسر اپنی بیوی کو لے کر باہر شفٹ ہو گئے۔ پیچھے صلہ بیگم اس کی جدائی میں آدھی ہو کر رہ گئیں۔ ضامن نے اس عرصے میں انہیں بہت توجہ دی پر اب بھی یاسر کی محبت اسی شان سے ممتا کے دل میں برقرار تھی۔ بس ایک بات نے صلہ بیگم کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا کہ وہ ضامن پر اپنی پسند نہیں تھوپیں گیں۔ کیونکہ ان کے مطابق، انہی کے فیصلے میں کھوٹ تھی جو ان کا چھوٹا سا گھریوں ٹکڑوں میں بکھر گیا۔

\*\*\*\*

"کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟"

ضیغم ابھی پریزنٹیشن مکمل کر کے آیا تھا۔ اور اب وہ تینوں گراؤنڈ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے تھے کہ تالشہ، ہیر اور عینا چھاؤں میں بیٹھی دکھیں تو شہریار کے کہنے پر انہی کے پاس چلے آئے۔

"جی پلیز۔"

پھیلائی ہوئی کتابوں کو سمیٹتی، عینا اور ہیر نے ان کے لیے جگہ بنائی جب کہ تالشہ نے ایسے نظر انداز کیا جیسے ان کی آمد سے یکسر بے خبر ہو۔

"ہیر جی، آج پہلی بار آپ کو پڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، یہ تو کمال ہی ہو گیا۔"  
ضامن کے سوال پر ہیر سٹپٹائی۔

شہریار اور ہیر جو مسلسل ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں جھکا رہے تھے اور پھر بہانے بہانے سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اب ہیر نے نظروں کا زاویہ بدل کر ضامن کی طرف دیکھا۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ سرندیم کی کرم نوازیاں ہیں جو مجھے پریزنٹیشن کے لیے اتنا مشکل ٹاپک اٹھا کر دے دیا ہے۔"

کتاب اپنے سامنے پٹج کر بند کرتی بولی۔

"وہی میں سوچوں سورج مغرب سے کیسے نکل آیا۔"

ضامن چڑاتا ہوا ہیر کے آگے سے کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا۔

ہیر نے ضامن کو سوائے گھورنے کے اور کوئی جواب نہیں دیا۔

ان دونوں کی چلتی تکرار کے دوران، شہریار ضیغم کو کچھ پوچھنے کا اشارہ کر رہا تھا، جسے سمجھتا وہ ہیر کو مخاطب کر گیا۔

"ہیر!"

انکل آنٹی تمہارے گھر آئے تھے کچھ دن پہلے، تو پھر کیا ڈیساڈ کیا تمہاری فیملی نے؟" ضیغم کے سوال پر ہیر نے نظریں اٹھا کر شہریار کو دیکھا جو اسے ہی بڑی آس سے تک رہا تھا۔

"ابھی تک تو کچھ فاعل نہیں کیا اماں نے۔ پر۔۔"

"پر...؟"

شہریار نے بے صبری سے جواب چاہا۔

"پر بھائی چاہتے ہیں کہ وہ پہلے خود ان سے ملیں گے۔"  
نظریں جھکاتے وہ کہنے لگی تو شہریار کی زبان پھسلی۔

"کیوں؟"

"مجھے کیا پتہ کیوں، انہوں نے کہا کہ کچھ دنوں میں وہ آپ سے ملیں گے۔"  
ہیر نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے زور دے کر کہا کہ شیریں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"لیکن شادی تم دونوں کو کرنی ہے، تو بھائی اس سے مل کر کیا کریں گے۔"  
یہ ضامن تھا جو ان رسم و رواج سے نابلد تھا۔

"کیونکہ فیصلہ تو اس کے بھائیوں نے ہی لینا ہے۔ اور وہ شیریں بھائی سے مل کر انہیں جان کر  
پرکھ کر ہی کوئی فیصلہ لیں گے۔"

آخر کب تک وہ خاموش رہتی، کوئی بحث و تکرار ہو اور تائشہ و سیم خان خاموش رہ جائے یہ مشکل  
ہی تھا۔

"تمہیں بڑی تفصیل پتہ ہے اس سب کی، لگتا تو نہیں ہے کہ تم کچھ جانتی ہوگی۔"  
انداز میں طنز کی آمزیش صاف چھلک رہی تھی۔

اس کے حلیے پر چوٹ کرنا تو ضامن نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا تبھی نظروں سے اس کے پہناوے کی طرف اشارہ کیا۔

اور تائشہ خود کو کوسنے لگی کہ کیا ضرورت تھی اس انسان کو جواب دینے کی۔ پر ابکی بار وہ خاموش رہی کیونکہ ابھی کچھ کرنے اور کہنے کے لیے موقع ہاتھ نہیں آیا تھا۔  
جب کہ اسکی خاموشی پر بجائے چپ ہونے کے ضامن کو مزید موقع ملا۔

"ویسے بھائی جیسی تو تم ہو، شاید تبھی پتہ ہوگا ہے نا۔"  
صاف لفظوں میں اس کے وجود کی تضحیک کرتا۔ اس کے لڑکوں کی مشابہت میں پہنے گئے لباس پر نظریں ڈالتا اسے اندر تک سلگا گیا۔

"جن کے بھائی نہیں ہوتے، انہیں ایسے ہی بھائی جیسا بننا پڑتا ہے۔"



بمشکل اپنی ہتک پر برداشت کا دامن تھامتی، لب بھینچے کہہ کر وہ بغیر کسی کی سنے وہاں سے چلی گئی۔

"ضامن بھائی آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"  
ہیر نے کچھ سخت، ملامتی انداز میں ضامن سے کہا کہ وہ کچھ پل کے لیے شرمندہ ہو گیا۔

"ضامن! تمہیں وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔"  
شیری اور ضیغم نے باری باری اسے احساس دلایا کہ وہ غلط کہہ گیا ہے۔  
پر وہ اکیلا ہی تھا جو تالشہ سے ناواقف تھا، شاید اس لیے کیونکہ تالشہ کبھی اتنی ضروری رہی ہی نہیں کہ اس کے متعلق کوئی بھی بات وہ سن سکے۔ جب کہ باقی سب تالشہ کے بارے میں جانتے تھے کہ اس سب کے پیچھے وجہ کیا ہے، بہت بار سمجھانا بھی چاہا پر تالشہ و سیم خان کو شاید لفظوں کی زبان سمجھ ہی نہیں آتی۔

"میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔"  
خود کی شرمندگی چھپاتا وہ دھیمے لہجے میں دفاع کرنے لگا کہ ضیغم نے اس کی تصحیح کرنے کی بجائے موضوع ہی بدل دیا۔

"عینا تمہاری پریزنٹیشن کی تیاری کہاں تک پہنچی۔"

"ابھی تک سٹارٹ ہی نہیں کی۔"

انگلیاں چٹختی وہ چہرہ سی بنی نظریں جھکا کر بولی کہ حلق سے دہیمی سی آواز برآمد ہوئی۔

"ارے کیوں؟"

اس دن تو کہہ رہی تھی میں خود کر لوں گی، تو آج ضیغم کا حیران ہونا بنتا تھا۔

"آج کروں گی۔"

وٹوق سے کہتی کتاب پر جھک گئی۔

وہ نہ اسے دیکھ پارہی تھی اور نہ ہی جواب دے پارہی تھی، اسی لیے کتاب کو راہ فرار بناتی اسی کے ورق پلٹنے لگی۔

جبکہ ہیر، شہریار سے کچھ کہہ رہی تھی اور عینا مسلسل خود کو کتاب میں مصروف دکھا رہی تھی کہ ضیغم نے

ناچار ضامن سے ہی اسکی پریزنٹیشن کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

"یار فلیش میں فائل ڈال دی ہے۔ بالکل کمپیٹ ہے بس اب فائل دیکھنی ہے۔"  
جیب سے فلیش نکال کر دکھاتا وہ اسے بتانے لگا کہ اسی اثنا میں تائشہ بھی لوٹ آئی۔

"عینا وہ بک پاس کرنا۔"

بغیر کسی کی جانب دیکھے وہ روئی ہوئی آنکھوں کو پلکوں کے نیچے چھپاتے، اپنا بیگ اور عینا سے کتاب لیتی جن قدموں سے آئی تھی ویسی ہی واپس چلی گئی۔  
یہاں فی الحال کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا، پر کب تک؟

\*\*\*\*\*

خنکی میں سورج کی حرارت بھی کوئی خاصا اثر نہیں دکھا رہی تھی۔ سردی کی ٹھنڈک ویسے ہی برقرار تھی بس اتنا ضرور ہوا تھا کہ بستر سے نکل کر سب کام کاج میں لگے ہوئے تھے۔ وہیں ایک سولہ سال کا لڑکا اپنی پانچ سالہ بہن کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ قمقموں کے طوفاں اور چیخوں کی آوازیں گھر کے مکینوں کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ دونوں سردی کی فکر کیے بغیر دوڑے چلے جا رہے تھے۔

"بھائی اسے لے جائیں، بھائی پلیز".

لان میں لگے جھولے کے اوپر چڑ کر وہ اپنے سامنے کھڑے سفید بالوں والے کتے اور اس کے ساتھ ہنستے اپنے بھائی کو دیکھ کر منت کرنے لگی۔

"ہاہا.. تم تو کہہ رہی تھی کہ ڈرتی نہیں ہو۔ آو شاباش ہاتھ لگاؤ آکر اسے، پھر میں مان جاؤں گا میری چھوٹی سی بہن تائشہ و سیم خان کسی سے نہیں ڈرتی".

کتے کے گلے میں پڑی رسی کو جھٹکا دیا کہ وہ اچھل کر اس کی جانب بڑھا وہیں اس بچی کی چیخ برآمد ہوئی۔

"سلمیان!"

کیا حرکت ہے یہ؟ بہن گر جاتی تو!"

پیچھے سے اس کی ماں نے آکر گرتی ہوئی بچی کو تھاما اور اس لڑکے کو بھی ڈانٹا جو سر کھجانے لگا۔

"اما، میرے ساتھ ہوں تو میں نہیں ڈرتی".

ماں کی آغوش پا کر وہ پھر سے اسے چیلنج کرتی مزید ماں میں سمٹ گئی کہ اس کے بھائی نے محبت سے اس کا یہ روپ دیکھا۔

اپنے کندھوں سے نیچے آتے لمبے بال جو کہ اس کی عمر کے حساب سے کافی لمبے تھے انہیں جھٹکا دیتی اترا کر گردن اکڑا کر اپنی امی کے ساتھ اندر کی طرف چل دی۔

فیروزی رنگ کا فراک پہنے جس پر جا بجا مختلف رنگوں سے تتلیاں بنی ہوئی تھیں، پتلی سی کلائی میں پہنیں چھوٹی چھوٹی پتھریاں، دودھیا رنگت، اس پر سیب کی طرح لال گال، وہ ایک حسین پھٹانی بچی کا روپ دھارے ہوئے تھے۔

آئیے میں دکھتا دہندلا سا عکس اب صاف منظر میں بدل گیا تھا وہی لڑکی اب کندھوں سے اوپر تک آتے چھوٹے باب کٹ بالوں میں، فیروزی رنگ کا کرتا پہنے، کرتے کے بازوؤں کو کہنیوں تک موڑے گلے میں مفلر کو لپیٹے... کچھ کچھ لڑکی اور کچھ لڑکوں کی مشابہت اختیار کیے اس لڑکی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

ان دس سالوں میں وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ صحیح تو کہا تھا جن کے بھائی نہ ہوں انہیں خود ایسا بننا پڑتا ہے۔

پر اسکا تو بھائی تھا، ہاں وہ تھا۔

جو اس کے لیے لڑ سکتا تھا۔ جو ہر پل ہر لمحہ اسکا ساتھ دیتا تھا، پر وہ تو لوٹا ہی نہیں۔

اسے تو پڑھنے بھیجا تھا کہ پھر واپس لوٹ کر ہی نہ آیا۔ یہاں تک کہ اس کے بابا بھی دنیا سے روٹھ کر آنکھیں موند گئے پر وہ پلٹ کر نہ آیا۔

یہاں تک کہ باپ کی وفات کے بعد ان کی جائیداد میں سے آدھا حصہ سکے رشتے داروں نے ہڑپ کر لیا پر بھائی واپس نہ آیا۔ اور بڑی بہن کی شادی تک ہوگئی پر وہ واپس نہیں آیا۔ ہاں وہ تو نہ آیا پر تالشہ، تشو ضرور بن گئی۔

ان لمبے بالوں سے جسے محبت تھی اپنے ہاتھوں سے ان کو کاٹ دیا، ایک آنسو بھی بہائے بغیر۔ وہ جو اپنی پتلی کلائی میں بھر بھر چوڑیاں ڈال کر رکھتی تھی ساری چوڑیاں اٹھا کر پھینک دیں۔ اور پھر وہ ایک مضبوط لڑکی بننے کے چکر میں لڑکی سے منسلک ہر خواہش ہر حسرت کو روندتی چلی گئی۔ اور اب شاید ہی لڑکیوں جیسے جذبات و ارمان اس کے اندر پنپتے ہوں گے۔ وہ بظاہر بدلی تھی، اندر تو لڑکی ہی تھی نا۔ کسی کے کہے جملوں سے اسے بھی تکلیف پہنچتی ہوگی، اس کا دل بھی روتا ہوگا۔ اس کے بھی احساسات ہوں گے پر یہ سب وہ خود تک محیط رکھتی تھی یہاں تک کہ سگی ماں سے بھی اپنا ہر دکھ چھپائے رکھتی تھی۔ پر ماں تو ماں ہوتی ہے نا وہ اولاد کے اندر اور باہر کے موسم سے خوب آشنا ہوتی ہے۔

آئیے میں نظر آتے اپنے عکس پر نظر دوڑا کر وہ پٹی تھی کہ ذہن میں ایک خیال نمودار ہوا۔  
اور اسے سوچتے ہی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی۔

اب اسے بس کل کا انتظار تھا جب وہ اپنے ساتھ کی گئی ہر ناانصافی کا بدلہ لے گی۔ ضامن نواز  
نے اسے کئی عرصے سے بھولی تائشہ و سیم یاد دلائی تھی۔ تو وہ بھی ضامن نواز کو اس کی نانی یاد  
دلانا چاہتی تھی۔

چہرے پر جھلسا دینے والی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں زیریلی چمک، جس طرح وہ ٹیم سے باہر  
ہوئی تھی اور لوگوں کی ہنسی کی آوازیں اب بھی اس کی سماعتوں کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ اسی  
طرح ضامن کے لیے بھی کل کا دن یادگار ہونے والا تھا۔

\*\*\*\*\*

"ڈونٹ!"

بڑی ہو؟"

سرسری سا انداز اپنائے وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔

"ہوں"۔

مصروف سی جواب دے کر کتاب پر نظریں مرکوز رکھی۔

"اچھا رکھو نا اسے (کتاب کو بند کرتی عین اسکے سامنے بیٹھ گئی) وہ سر فیصل ڈھونڈ رہے تھے"۔

"مجھے"۔

وہ اٹھ کر جانے لگی کہ تالشہ نے اسکا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔

"ارے نہیں یار وہ کھمبا ہے نا اسے ڈھونڈ رہے تھے سر فیصل"۔

"کھمبا؟

ضامن بھائی کا کہہ رہی ہو؟

ہاں تو مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ چھوڑو، میری پریزنٹیشن رہتی ہے"۔

کتاب واپس چھینیتی وہ پھر سے کوشش کرنے لگی کہ پریزنٹیشن میں بولنا کیا ہے۔



"یار ڈونٹ!"

سرنے مجھے اس کھمبے کو بلانے کے لیے کہا پر تمہیں تو پتہ ہے ان کا اور میرا چھتیس کا آکڑا ہے۔ اب اگر میں گئی تو وہ میری سنیں سنیں گا۔ اس لیے تم جا کر..."

"میں...؟"

چشمہ دست کرتی وہ گھور کر پوچھنے لگی۔

"ہاں نا تم۔ پلیز۔"

تائشہ اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

"اچھا پھر میری پریزنٹیشن کمپلیٹ کر کے دو۔"

شرط رکھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بہت تیز نہیں ہو گئی۔"

تائشہ منہ پھلا کر کتاب کو اپنی طرف کھینچتی بولی۔

اپنی تعریف پر قہقہہ لگاتی۔ وہ تو چلی گئی پیچھے تائشہ کے لبوں پر ہنسی کا بسیرا آن ٹہرا۔

\*\*\*\*\*

"ضئی، اسے ایڈ کرنا ضروری ہے کیونکہ ساری بات ہی اس سے ریلیٹڈ کرنی آگے۔"

"صحیح ہے پھر، لیکن تھوڑی وضاحت کر دینا، ایسے سمجھ نہیں آئے گی۔"

ضیغم اور ضامن بیٹھے لیپ ٹاپ پر چلتی سلائیڈز پر تبصرہ کر رہے تھے کہ عینا ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں۔"

ضیغم کو جواب دیتے، ساتھ میں ہی عینا سے اس کی آنے کی وجہ بھی اشارتاً پوچھی۔

"ضامن بھائی! آپ کو سر فیصل ڈھونڈ رہے تھے۔"

اور یہ سنتے، ضامن لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر ضیغم سے خیال کرنے کا کہتا چلا گیا۔

سر فیصل کافی سخت ٹیچر تصور کیے جاتے تھے اور اسٹوڈنٹس کی چجوٹی سے چجوٹی غلطی پر بھی نمبر کاٹنے میں ماہر تھے۔ تبھی ضامن انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔  
 ضامن کے جاتے ہی عینا بھی ضیغم سے بغیر کچھ کہے جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ تالشہ جو کب سے یہیں نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

"ڈونٹ!"

مجھ سے تو یہ نہیں ہو پارہی، میں اپنی والی میں ہی بری طرح پھنسی ہوں۔"  
 جھنجھلاہٹ اور بیزاریت چہرے پر پھیلائے، وہ کتاب عینا کے ہاتھ میں تھماتی۔ ضیغم کی جانب گھومی۔

"ضیغم بھائی!"

آپ فری ہیں تو پلیز اسکی مدد کر دیں۔"  
 یہ کہتے ہی اسکے ہاتھ سے پین چھوٹ کر زمین پر گرا۔

"ہاں میں فری ہوں۔ عینا کوئی پرابلم ہے؟ دکھاؤ۔"

تائشہ نے جھک کر پین کے ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ کے ساتھ لگی فلیش ڈرائیو بھی اس صفائی سے اٹھائی کہ ضیغم اور عینا دونوں کی نظروں میں نہ آسکی۔  
اور ان کے درمیان سے نا محسوس انداز سے نکل کر اپنی جگہ کی طرف چل دی۔

\*\*\*\*\*

فلیش ڈرائیو کو لیپ ٹاپ میں ڈالتے اس کی نظریں مسلسل سامنے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جس طرف ضامن گیا تھا۔

پہلے اسے متعلقہ فائل ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ گیا، اور فائل کے ملتے ہی، چند امپورٹنٹ سلائیڈز کو ڈیلیٹ کر کے اس میں ضامن کی انسٹا سے اٹھائی ورک آؤٹ اور ٹومی کے ساتھ لی گئی تصاویر کو پیسٹ کر دیا۔

یہ سب کرتے ہوئے اسے بمشکل دو منٹ ہی لگے۔ اور فائل کو سیو کرنے ہی لگی کہ سامنے سے ضامن آتا ہوا دکھائی دیا۔

تائشہ کے چہرے کی ہوائیاں اڑ چکی تھیں۔ اگر وہ اپنی فلیش اسکے پاس دیکھ لیتا، تو ایک نیا تماشہ کھڑا ہو جاتا ایسی بے وقوفی کی وہ فی الوقت متحمل نہیں تھی۔

\*\*\*\*\*

"کچھ ہوا ہے کیا؟"

اسے مسلسل غیر دماغی سے کتاب کے پنے پلٹتے اور کچھ سوچتے ہوئے دیکھ کر ضیغم نے سوال کیا۔ جس پر وہ سٹپٹا کر پل بھر کو اس کے چہرے کو دیکھتی نہ میں سر ہلا گئی۔

"ایسا ہو نہیں سکتا۔ کچھ تو ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہی۔ شاید تم بھول گئی ہو کہ ہم بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ تو تم مجھ سے شئیر کر سکتی ہو۔"

ضیغم کی پیشکش پر وہ تذبذب کا شکار ہوتی۔ تائشہ کی کہی گئی باتیں ابھی بتانے ہی والی تھی کہ ضامن اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

"تم تو کہہ رہی تھی کہ سر فیصل بلا رہے ہیں مجھے۔"

"وہ مجھے تو..."

ضامن کے ترش انداز میں استفسار پر وہ بدحواس سی اٹھ کھڑی ہوئی، ابھی اس کا آدبا جملہ حلق میں ہی تھا کہ پہولی سانسوں کے ساتھ تائشہ بھاگ کر عینا سے جا ٹکرائی۔

ٹکرانے کی صورت میں عینا کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر نیچے گری اور تائشہ بھی لڑکھڑا کر نیچے کو جھکی۔ پھر اپنا بیلنس برقرار رکھتی کھڑی ہو گئی۔ اس سب کے دوران وہ نہایت چالاکي کا مظاہرہ کرتی فلیش کو لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھ چکی تھی۔

"لڑکیوں والی کچھ تہذیب و تعمیز لے لو گی تو کچھ نہیں بگڑے گا تمہارا"۔

درشت لہجے میں ناگواری سے اس کا یوں گرنا پڑنا دیکھتا بولا کہ تائشہ کو اس کے لفظ پھر تکلیف دینے لگے۔ پر یہ سوچ آتے ہی کہ آج وہ بھی ایسی ہی تکلیف سے گزرے گا۔ مسکراتی وہ جلدی میں عینا کو گھسیٹ کر لے گئی۔

"چلو میرے ساتھ کام ہے"۔

ضامن کی بات کو سرے سے نظر انداز کیے عینا کو لے کر چلی گئی۔ ضامن کچھ حیران تو ہوا تھا آخر چوہیا اتنی خاموشی سے چلی کیسے گئی، لیکن اپنے مسئلے بہت تھے اس لیے خود بھی نظر انداز کر گیا۔

ان کے جاتے ہی ان دونوں کے لیکچر کا ٹائم بھی ہو چکا تھا۔ جس میں ضامن نے اپنے پروجیکٹ پر پریزنٹیشن دینی تھی۔

"شٹ یار ابھی تو کچھ سلائیڈز دکھانی رہتی تھیں۔"

بند پڑے لیپ ٹاپ اور گھاس پر گرمی فلیش کو اٹھاتے وہ افسوس سے بولا۔

"کوئی بات نہیں، اللہ مالک ہے چل ٹائم ہو گیا ہے۔ اب لیٹ تو نہیں پہنچ سکتے۔"

ضیغم اس کے کندھے کے گرد ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

اور ان کے جاتے ہی، تائشہ کے لب بے ساختہ مسکرائے آگے ابھی کچھ دیر بعد رونا ہونے والے واقع کو بغیر دیکھے وہ جانتی تھی کہ آج ضامن کا پوری کلاس کے سامنے مذاق بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

"ضامن نواز لڑکی ہوں، تبھی کہا تھا بچ کہ رہو۔ پر ایک چیز کا ملال رہے گا۔ یہ سب میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاؤں گی۔"

ضامن کی پشت پر نظریں ٹکائے وہ خیال میں ضامن سے مخاطب ہوئی۔ آخری جملے میں افسوس کے تاثرات کی بجائے، لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ کھلی تھی۔ اور عینا اسے یوں سوچوں میں گم اور مسکراتا دیکھ کر جان گئی کہ یقیناً کوئی کمینگی کو چھوتی شرارت کر چکی ہے یا کرنے والی ہے۔

"اب کیا کیا ہے تم نے؟"

عینا نے غور سے اپنے سوال کے جواب میں اس کے چہرے پر سسٹاہٹ کے تاثرات دیکھے تھے۔ تائشہ نے بھی جھوٹ کا سہارا لینے کی بجائے، عینا کے شک کو یقین دلایا۔

"بس کچھ دیر انتظار کر لو۔ میری ڈونٹ!"

آنکھ دبا کر ایک زوردار قہقہہ لگاتی وہ عینا کو ڈرا گئی۔

تائشہ ہمیشہ سے ہی بے خوف رہی تھی۔ بڑے سے بڑی حرکت کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر کوئی پچھتاوا اور غم کے تاثرات ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان جزبات سے اسکا واسطہ نہ پڑا ہو، پر وہ ان جزبات کو چہرے پر چسپاں نہیں کرتی تھی کہ سب اس کے اندر کی حالت کو پڑھ لیں اور محسوس کر لیں۔ جبکہ عینا تائشہ سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے احساسات، اس کے چہرے پر صاف لکھے نظر آتے تھے جن سے وہ خود بھی ناواقف

تھی۔ ڈر، خوف، پچھتاوا یہ سب اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے وہ کشمکش کا شکار ہوتی، اسے خود پر اعتماد اور یقین تھا ہی نہیں۔ پر تائشہ کو خود پر بہروسہ تھا، خود پر



اعتماد تھا اور جب خود پر اعتماد ہو تو دوسروں کو اپنے احساسات کی تشہیر کر کے دکھانے کی تک ہی نہیں بنتی۔

\*\*\*\*\*

"Here is Zamin Nawaz Khan, The project which I..."

پراجیکٹر کی نیلی روشنی سامنے لگے وائٹ بورڈ پر جا کر عکس بنا رہی تھی جہاں ضامن کے لیپ ٹاپ پر موجود پہلی سلائیڈ دیکھی جاسکتی تھی۔ ضامن نے اپنا تعارف کروانے کے بعد جیسے ہی سلائیڈ بدلنے کے لیے لیپ ٹاپ پر انگلی رکھی اس کی نظر پہلی ہی تعارفی سلائیڈ پر لکھے گئے اپنے نام پر پڑی۔

جہاں ضامن نواز خان کی جگہ ٹومی نواز خان لکھا گیا تھا۔ بے یقینی سے وائٹ بورڈ کی جانب دیکھا وہاں بھی وہی نام بولڈ حروف میں موجود تھا۔ کلاس کی خاموش فضا میں ہلکی ہلکی ہسنی کی آوازیں سرگوشیانہ آوازوں میں پھیلنے لگیں۔

"Silence!

Carry on Zamin".

اپنے انلی بارعب اور سنجیدہ لہجے میں کلاس کو خاموش رہنے کی تنبیہ کرتے ضامن کو آگے بڑھنے کا عندیہ دیا جس پر ضامن نے سر کو خم دیتے، اگلی سلائیڈ بدلی جہاں بڑے اور بولڈ حروف میں پروجیکٹ کا ٹاپک لکھا گیا تھا۔

"Sorry sir!

As the topic is very keen to understand the..."

کچھ سیکنڈ کے بعد، اگلی سلائیڈ بدلتے، اس کی نظریں سامنے بیٹھے سر اور باقی سب کی جانب تھیں جہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات تو وہ صاف نہیں دیکھ پارہا تھا۔ پر آہستہ آہستہ ہنسی کا نہ رکنے والا شور سرگوشی سے بڑھتا ہوا، شدید زور پکڑ چکا تھا۔

ضامن نے پلٹ کر بورڈ کی جانب دیکھا تو اس کی بنائی گئی سلائیڈز تو غائب تھیں۔ اور اسکی جگہ، اسی کی ورک آؤٹ کرتے وقت لی گئی ایک تصویر تھی۔ اور کیپشن میں

Boys Are Strong

اور ساتھ میں کچھ چڑانے والے ایموجیز پیسٹ تھے۔

(یہ تصویر ضامن نے خالصتاً تائشہ کو دکھانے کے لیے لگائی تھی، اور تبھی تائشہ نے کیپشن اور تصویر انسٹا سے کاپی کر کے یہاں لگا دی۔ یہ اچھا موقع تھا ضامن کی strength دکھانے کا)۔

"سر یہ.."

سر یہ میری فائل نہیں ہے۔"

بوکھلا کر سلائیڈز بدلتا وہ بولا کہ قہقہوں کا زور بڑھتا ہی چلا گیا کہیں وہ اپنے ٹومی کے ساتھ موجود تھا تو کہیں شرٹ لیس، ایسا لگ رہا تھا کہ پریزنٹیشن نہ ہوئی کسی ماڈل کا فوٹو شوٹ ہو۔

"سٹاپ اٹ ضامن!"

یہ کونسا طریقہ ہے پرینک کا؟

آپ کو اندازہ ہے یہ پرینک آپ کے لیے کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔"

درشتگی سے اسکی بات کاٹتے وہ دباڑے کہ پوری کلاس یکباگی دانتوں میں انگلیاں دبا کر بیٹھ گئی۔ وہیں ضامن بھی آنکھیں میچیں ان کی باتیں سننے لگا۔

"آئی ایم سوری سر!"

لیکن یہ کسی اور نے میرے ساتھ پرینک کیا ہے۔ ابھی تو یہ فائل ٹھیک تھی سر، اچانک سے اسے کیا ہو گیا۔"

منت کرتے وہ فلیش کو چیک کرنے لگا۔ پر اس میں کوئی خرابی نہ نکلی۔

"اگر ابھی صحیح تھی تو یہ سب کیا ہے۔  
گیٹ آؤٹ آف مائی کلاس۔"

"سر.. میں نے نہیں کیا کسی نے میرے ساتھ...."  
"آئی سیڈ گیٹ آؤٹ!"

وہ چلائے کہ ضامن بے بسی سے انکا چہرہ دیکھ کر اپنی چیزیں اٹھاتا کلاس سے باہر نکل آیا۔

ابھی پندرہ منٹ پہلے تو سب ٹھیک تھا، پھر اچانک سے ایسا کیا ہو گیا کہ اس کی تصویریں اس میں پیسٹ ہو گئیں۔ اسے پورا یقین تھا کہ یہ کسی کی شرارت تھی، پر کس کی؟  
شہریار تو صبح سے لاپتہ تھا۔ شاید وہ ہیر کے ساتھ تھا۔ ہاں ضیغم، ضیغم اسکے ساتھ موجود تھا۔ تو کیا ضیغم نے؟

وہ مسلسل چکر لگاتا، بالوں میں انگلیاں چلاتا سوچنے لگا کہ آخر یہ حرکت کون کر سکتا تھا؟

ضیغم کے بارے میں سوچتے ہی، اسے جھٹکا لگا۔ آخر وہ کیوں کرے گا ایسا، یہ گرمی ہوئی حرکت ضیغم مزاق میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ضیغم نہیں تو پھر کون؟

پاؤں کی مدد سے زمیں پر ٹھوکر مار کر وہ وہیں دھپ سے بیٹھ گیا۔ اضطراب کا شکار وہ ضیغم کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سر احسن نے اسے کلاس سے باہر نکالا تھا، اور یہ بھی طے تھا کہ سیشنل میں اسے کوئی نمبر نہیں ملیں گے اور اب تو اسے مڈز اور فائنل کے نمبروں کا بھی شک گزر رہا تھا۔ سر احسان سے ہر طرح کے برے نتیجے کی امید کی جاسکتی تھی۔ اور یہ بھی طے تھا کہ G.P پر بہت برا اثر پڑے گا۔

مٹھی میں پکڑی فلش کو زور سے لیپ ٹاپ کے اوپر پٹختے وہ غصے اور جھنجھلاہٹ کی تصویر بنا تائشہ کے دل کو سکون بخش رہا تھا۔

وہ اس وقت سے گراؤنڈ میں بیٹھی، لیکچر ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل تو کر رہا تھا کہ کلاس کے باہر جا کر سنے کہ کیا چل رہا ہے۔ پر اس طرح کسی کو بھی شک گزر سکتا ہے۔ تبھی دل کی خواہش کو دباتے وہ بے صبری سے ضامن کا لٹکے منہ کے ساتھ باہر آنے کا انتظار کرنے لگی اور اسے زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا کہ وہ اسے بے چین، غصے میں کھولا ہوا اور چڑچڑا سا سامنے آتا ہوا دکھائی دیا۔

مسکراہٹ تھی کہ اس کے ہونٹوں سے الگ ہی نہ ہو رہی تھی۔ اسکے ہر ہر انداز پر وہ اپنے دل میں سکون خون کی طرح گردش کرتا محسوس کر رہی تھی۔

"ضیغم!"

اگر یہ حرکت تو نے کی ہے تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مذاق مذاق ہوتا ہے پر یہ حرکت مذاق کے زمرے میں نہیں آتی۔"

بالوں کو مٹھی میں قید کیے، وہ آنکھیں بند کیے خیال کے پردے پر ضیغم سے مخاطب ہوا۔ ابھی تک جہاں اسکا دماغ جا رہا تھا، وہ صرف ضیغم کو ہی شک کے دائرے میں لایا تھا کیونکہ آخری وقت میں اس کی پراجیکٹ کی فائل ضیغم کے پاس ہی تھی۔

"پاگلوں کی طرح مسکرا کیوں رہی ہو؟"

ہیر شہریار سے لمبی ڈسکشن کے بعد، عینا اور تائشہ کو ڈھونڈنے نکلی۔ اور وہ اسے اسی جگہ ملی جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

تائشہ سامنے دیکھتی خود بخود مسکرائے جا رہی تھی اور عینا وہ نجانبہ نے رجسٹر کے صفحے پر کون سی قلم کاری کر رہی تھی کہ سر بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔

"میں تو نہیں پر کوئی بہت جلد پاگل ہونے والا ہے۔"

دونوں ہاتھوں سے بالوں کو مٹھی میں قید کیے ضامن پر ایک مسکراتی نظر ڈال کر وہ ہیر سے بولی۔

"کون؟"

متجسس ہوتی وہ عینا کو پرے کرتی اسکے سامنے آ بیٹھی۔

"اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے یا یہ کرنے والی ہے۔ اور ہماری خیر نہیں ہے۔" تائشہ کی طرف پنسل سے اشارہ کرتی وہ چڑ کر بولی کہ تائشہ نے اسکے گال پر چٹکی بھری۔

"آہ۔"

عینا کے منہ سے سسکی نکلی اور بائیں ہاتھ سے گال سہلانے لگی۔

"کیا حرکت کی ہے تم نے؟"

اب تو اسکے انداز سے ہیر کو بھی کسی خطرے کی بو آ رہی تھی۔

"ارے میری پیاری دوست کچھ دیر اور صبر کر لو!"

ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ گراؤنڈ میں چلانے کی آواز آنے لگی۔ ہیر اور عینا نے مڑ کر دیکھا تو ضامن ضیغم کا گریبان پکڑے چلا رہا تھا۔

"لو ختم ہوا انتظار!"

سامنے کی طرف اشارہ کرتی دلچسپی سے سامنے ہوتے تماشے کو دیکھنے لگی۔

"تو اتنا گر جائے گا میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ آخر کو یہ کیا حرکت تھی؟ تجھے ذرا شرم نہیں آئی میرا تماشہ بناتے ہوئے؟" ضیغم کے اسکے قریب آتے ہی وہ بھپے شیر کی مانند اس پر چڑھ دوڑا۔ ضیغم کو گریبان سے پکڑے وہ اس پر چلا رہا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تیرا؟"

اس کے ہاتھوں کو جھٹکتے، وہ بھی اسی تیز آواز میں چلایا۔

"تو نے نہیں کیا تو تیرے فرشتوں نے کیا ہے تیرے علاوہ اور کون کر سکتا ہے بول!"



ضیغم کے نہ ماننے پر وہ مزید آگ بگولا ہوتا اس کی طرف جھپٹا جب شیری نے بیچ میں آکر اسے دھکا دیا کہ وہ پیچھے کی طرف چند قدم گرا۔

"کیا حرکت ہے یہ؟"

دونوں کو مشتعل دیکھ کر باری باری دونوں سے استفسار کیا۔  
لہو رنگ ہوتی گرے آنکھوں میں غصہ لیے وہ تنفر سے شیری کے جواب پر غرایا۔

"اس کمینے سے پوچھ کیا کیا ہے اس نے۔"

"بلکہ اس نہ کر ضامن، میں نے کہا نا میں نے کچھ نہیں کیا۔"

ضیغم بھی جلالی روپ میں غرایا۔

ارد گرد سٹوڈنٹس کا جھمگٹا بن چکا تھا۔ سب حیرت سے، کچھ دکھ سے اور کچھ خوشی سے تینوں دوستوں کو آپس میں الجھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"دوست ہے یار، اگر کچھ ہوا بھی تو...."

شیری نے مصلحتی راہ اپناتے ضامن کو پرسکون کرنے کی کوشش کی کہ ضامن نے اسکے ہاتھ اپنے کندھوں سے جھٹکے۔

"دوست۔"

پھیلکی ہنسی ہنسا، آنکھوں کے گوشے نم نم سے معلوم ہوئے، سورج کی پڑتی کرنوں سے آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے آنکھوں میں پانی موجود ہو۔ دکھ لوگوں کی ہنسی کا تھا، کلاس سے نکالے جانے کا، نمبروں کا یا پھر دوست کی غداری کا ابھی اس کا فیصلہ مشکل تھا۔

"ایسا ہوتا ہے دوست؟"

اس سے اچھے تو دشمن ہیں جو پیٹ پیچھے وار نہیں کرتے۔"

اس کے لفظوں سے زیادہ لہجے میں نفرت اور ہتک دھرائی تھی۔ ضیغم نے حیرت سے اسے یوں پہلی بار سنجیدہ اور متنفر دیکھا تھا وہ بھی اپنے لیے جب کہ شیری شروع سے معاملے سے ہی انجان تھا۔

"ہوا کیا ہے؟"

کچھ تو بتا۔"

ضامن تھک کر بے بس سا، وہیں بیٹھ گیا جبکہ ضیغم ابھی بھی بے یقینی سے ضامن کے جھکے سر کو دیکھ رہا تھا۔ اور شیریں معاملے کو سمجھنے کی کوشش میں سوال کر گیا۔

"یہ میرا پراجیکٹ تباہ کر دیا اس نے۔"

آواز کافی اونچی تھی پر ٹوٹی ہوئی جیسے ضبط کر رہا ہو۔ پر یہ ضبط مشکل امتحان ٹہرا ہو۔

فلش ڈرائیو جو لیپ ٹاپ کے ساتھ ہی گھاس پر گری پڑی تھی اسے اٹھا کر شیریں کے سامنے کرتے وہ بول کر خاموش ہو گیا۔

پھر جب خود کی نظر فلش کے کھلے کور پر پڑی، تو وہ ٹھٹکا۔

فلش کا کور گرنے کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ اور کچھ دیر پہلے، جب پریزنٹیشن کے لیے اس نے گھاس سے فلش اٹھائی تھی تب بھی کور ایسے ہی کھلا ہوا تھا۔ اسے لگا کہ کتاب کے گرنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہوگا تبھی کوئی دھیان نہیں دیا۔

پر اب اسے سر فیصل کے لیے عینا کا بلانا اور پھر تائشہ کا جلدی سے عینا کو لے کر جانا جب وہ اس سے سر فیصل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کڑی سے کڑی جڑتی جا رہی تھی، معاملہ صاف

تھا، اس کے پیچھے تالشہ ہی تھی۔ تالشہ نے ہی کیا تھا یہ سب، اس کا ثبوت اور وجہ دونوں اسکے پاس تھیں۔

فلش کو مٹھی میں دباتے وہ لب بھیج گیا، ایک شرمندہ نظر ضیغم پر ڈال کر نگاہیں پھیر لیں۔

شہریار کے گھورنے پر تماشہ دیکھنے آیا ہجوم چھٹ چکا تھا۔ آخر کو ان دوستوں کا آپسی معاملہ تھا، کسی کے لیے تفریح کا مقام تھوڑی تھا۔

اور اب وہ تینوں خاموش تھے۔ ضیغم اور شہریار دونوں کو ضامن کی طرف سے ایسے عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جلد ہی ٹیمپرز لوز کر جاتا تھا، کچھ حد تک جلد باز تھا، لیکن دوستوں کے معاملے میں ایسا تو نہ تھا۔

وہ اس کے رویے کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ جب کہ ضامن کی نظریں گراؤنڈ میں تالشہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور وہ سامنے ہی مسکراتی ہوئی اسے ہی دیکھتی نظر آئی۔

جھٹکے سے اٹھتا وہ اس کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتا جانے لگا۔ اس کے ایسا کرنے پر ضیغم اور شیری بھی اس کے پیچھے دوڑے۔

جب کہ تالشہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ اور تنے ہوئے چہرے کے نقوش تالشہ کو سہما رہے تھے۔  
لیکن وہ بظاہر مضبوط بنی بیٹھی رہی۔

"یہ بچ حرکت تمہاری ہے۔"

ماتھے پر بلوں کا اضافہ کرتا وہ دہاڑ کر بولا کہ تالشہ کے ساتھ ساتھ ہیر اور عینا بھی بدک کر اٹھیں۔

"ہاں! میں نے کیا ہے۔"  
سہمی تو تھی۔ پر اپنا کارنامہ بھی تو بتانا تھا۔ سینے پہ ہاتھ باندھے وہ اقرار کر گئی۔

"کیوں؟"

اس کے اطمینان سے انکار پر ضامن کا دل کیا ابھی کے ابھی گلا دبا کر مار دے پر ہاتھ کی مٹھی بنائے سختی سے دباتے استفسار کیا۔  
وجہ تو جانتا تھا، بس اس سے پوچھنے پر بضد تھا۔

"اپنی ہار کا بدلا لیا ہے۔"

گردن اکڑا کر اس کی، آگ کے شعلے بھڑکاتی آنکھوں میں دیکھ کر جواب دیا کہ اس کے اس انداز پر ضامن کا ہاتھ اپنی انگلیوں کی چھاپ اس کے شفاف چہرے پر چھوڑتا نیچے گرا۔

"چٹاخ..."

تالشہ اس کے اس زور سے مارے گئے تھپڑ پر اپنا توازن کھوتی ہوئی پیچھے پھولوں کی کیاری میں منہ کے بل جا گری۔ اور منہ میں مٹی کے ساتھ ساتھ خون کا ذائقہ بھی گھلنے لگا تھا۔ تھپڑ کی شدت اتنی تھی کہ اس کی آواز پر جہاں باقی چاروں کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے، وہیں اس تشدد کا نشانہ بننے والی کے ہونٹ کا کنارہ پھٹ چکا تھا، اور خون رس کر منہ میں گھلنے لگا۔ کان الگ سائیں سائیں کر رہے تھے، جیسے تھپڑ کی گونج اب بھی کانوں میں برابر آرہی ہو۔

وہ تو شکر تھا، کہ اسٹوڈنٹس بہت دور درختوں کے سائے میں بیٹھے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ اور ان کی جانب کوئی متوجہ نہیں تھا۔ ورنہ یہ حرکت ضامن اور تالشہ دونوں کو بہت مہنگی پڑتی۔

تالشہ کے کیاری میں گرنے پر اس کا گھٹنوں سے اوپر آتا سفید کرتا، کیچڑ اور پانی کے چھینٹوں سے گندا اور کہیں کہیں سے گیلا ہو چکا تھا۔ اسکے گرتے ہی ہیر نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی، پر مڑی نہیں۔

اپنی غیر ہوتی حالت کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی، نظریں جب اپنے حلیے پر پڑیں تو وہ سسک اٹھی، آنکھیں شرمندگی میں پانی سے بھر چکی تھیں۔

ضیغم اور شہیار نے نظریں چرائیں، جب کہ ضامن ویسے ہی سخت تیور سجائے اسکی پشت کو گھور رہا تھا۔

اس سب کے دوران عینا منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے تالشہ کو لگے تمپڑ اور اس کے گرنے پر ضامن کی بے حسی کو دیکھ رہی تھی۔

"چل ضامن یہاں سے..."

اس سے پہلے کہ کوئی اور یہاں آجاتا، اور انہیں ایسے لڑتے دیکھ لیتا تو بات چانسز تک پہنچ سکتی تھی۔ تبھی شیریں اسے بازو سے کھینچتا اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

"چھوڑ..."

ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہتا اپنے بازو کو جھٹکا دیا اور دو قدم تائشہ کی طرف بڑھائے۔  
ہیر نے اپنی چادر تائشہ کے گرد پھیلا دی تھی کہ اس نے چادر کی مدد سے اپنے آپ کو مکمل  
ڈھانپ لیا تھا۔ پر ابھی بھی وہ مڑی نہ تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں بھر چکے تھے، اور وہ ان آنسو  
کو آنکھ سے لڑھکنے سے باز رکھتی چادر کے کونوں کو مسٹھی میں دبائے ہوئے تھی۔

"کس چیز کا بدلا لینا تھا؟

بولو، لے لیا بدلا۔ ہاں؟"

اس کے بازو کو گرفت میں لے کر اپنی طرف موڑا تھا کہ اس کے پلٹنے پر سینے پر چادر پھیلائے  
اور اسے نظریں جھکائے دیکھ کر گرفت نرم ہوتی چلی گئی۔  
پانی سے بھری آنکھیں، اس کی استفسار کرتی آنکھوں میں گاڑ کر، اپنے بازو کو جھٹکا دے کر، اس  
کی نرم گرفت سے ہٹاتی چیخ کر بولی۔

"ہاں لے لیا بدلا!"

بہت اچھے سے لے لیا۔ تم جیسے بچ انسان سے لے لیا بدلا، بات بہ بات میرے حلیے پر، مجھ پر طنز  
کا بدلہ، تمہارا مجھے پورے گراؤنڈ میں چکر لگوانے کا بدلا، کتے کو میرے پیچھے لگانے کا بدلا۔



اور مجھے دھوکے سے ٹیم سے باہر نکالنے کا بدلہ سب کا بدلہ لیا ہے میں نے۔  
ہاں لے لیا ہے میں نے بدلہ۔"

وہ ہزینانی انداز میں اسے دھکا دے کر چیخ رہی تھی۔ اپنے ساتھ ہوئی ہر زیادتی گنوار ہی تھی۔  
آنسو لڑی کی مانند آنکھ سے بہہ چلے تھے۔ جنہیں بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی وہ  
لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

اور ضامن وہ دو قدم پیچھے ہو کر اس کا ٹوٹا لہجہ، روتی صورت اور چادر کے اوپر سے نکلتے گرد لگے  
سفید کالر کو دیکھ کر اس کی کیفیت کا اندازہ تو لگا چکا تھا۔  
اس کے جواب کو نظر انداز کیے وہ چند قدم مزید پیچھے ہوا اور پلٹ کر بھاگ نکلا۔

تائشہ کے الفاظ اسکے کانوں میں اب بھی گونج رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ گاڑی نکال کر  
یونیورسٹی سے باہر چلا گیا۔

پیچھے تائشہ زمین پر بیٹھ گئی، چادر کو زور سے مسٹھی میں قید کیے۔ وہ دھاڑے مار کر رونے لگی۔ شہریار  
اور ضیغم تو ضامن کے ہاتھ اٹھانے پر ہی ششدر تھے۔ اور پھر تائشہ کی زبانی سن کر وہ مزید  
نظریں جھکا گئے۔

"تسوا!"

اسے روتے دیکھ کر عینا بھی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ جب کہ ہیرا ان دونوں کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

"تائشہ چلو!"

تمہیں گھر چھوڑ دوں!"

کچھ وقت کے بعد ضیغم بولا تو تائشہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"نہیں، میں چلی جاؤں گی!"

رونے کی وجہ سے آواز بھاری ہو چکی تھی۔ اپنی آنکھیں صاف کرتی وہ اٹھنے کی کوشش کرتی، اپنا بیگ سنبھالنے لگی۔

"تائشہ ایسے پوائنٹ سے کیسے جاؤگی، ہم چھوڑ دیتے ہیں!"

شہیار نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے سبھاو سے کہا کہ اسے ماننی ہی پڑی۔

\*\*\*\*\*

تیز رفتار گاڑی چلاتا وہ اس لمحے اور ان الفاظوں کو ذہن میں بچنے سے روکنا چاہتا تھا۔ جو بار بار اس کے جنگ چھیڑ رہے تھے۔

نہ وہ آوازیں آنا بند ہوئیں اور نہ ہی وہ عکس آنکھوں پر سے ہٹ رہا تھا، وہ گیلی نم آنکھیں، چادر میں لپیٹی کمزور سی لڑکی، جسے آج وہ لڑکی لگ بھی رہی تھی۔ اس کا عکس اپنی آنکھوں کو میچ کر بھی مدہم نہ کر پایا تھا۔

پورش پر گاڑی کو روکتا وہ کچھ پل، اسٹیپنگ تھامے اس پر سر گرائے، اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور سرزنش کرتے دل و دماغ کو قابو کرنے کے جتن میں لگا تھا۔

اور پھر جھٹکے سے گاڑی سے باہر نکلتا، لمبے لمبے ڈگ بہتا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ پیچھے صلہ بیگم اس کی پشت دیکھتی رہ گئیں، آج تو آکر نہ اس نے سلام کیا تھا اور نہ ہی یاسر کے بارے میں کوئی بات کی تھی۔ ایسا تو بہت کم ہوتا تھا، اور تبھی ہوتا تھا جب وہ پریشان ہوتا۔

کمرے میں آکر دروازہ لاک کرتے وہ اضطراری حالت میں ٹہلتا خود کے اندر جلتی آگ، اور ضمیر کی ملامت کرتی بازگشت کو سلانے کی ناکام کوشش میں تھا۔

اور پھر وہ اندر جلتی آگ کو باہر کی آگ سے بچانے کے لیے، سگریٹ کا پیکٹ اٹھائے۔ سگریٹ پہونکنے لگا یہاں تک کہ ہوا کو سگریٹ کی بونے آلودہ کر دیا تھا۔

منہ سے دھواں اڑاتا تو دھواں انہیں روئی روئی آنکھوں میں تبدیل ہو جاتا جو اسے ملامت، دکھ، رنج سے دیکھ رہی ہوتیں۔

آنکھیں میچ کر اس عکس سے رہائی چاہتا تو کانوں میں جملے بجنے لگتے۔

صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کرتے وہ احتساب کے کھڑے میں کھڑا تھا۔ اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جو بھی تھا اسے ایک لڑکی پر ہاتھ نہیں اٹھانا نہیں چاہیے تھا۔

اسے شاید لڑکیوں سے کیسے برتا جاتا ہے اس کی تعمیز ہی نہیں تھی۔ بہن تو تھی ہی نہیں، ایک ماں ہی تھی جس سے وہ دل و جان سے محبت کرتا تھا۔ باقی زندگی میں کبھی لڑکی ذات سے اس کا پالا نہیں پڑا تھا۔ اگر پڑا بھی تھا تو ایک حد مقرر تھی۔ پر وہ لڑکی اپنی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔

ایک لڑکی تھی تو اسے لڑکیوں کی طرح اپنے کردار اور نسوانیت کی حفاظت کرنی چاہیے تھی ناکہ اپنی حدوں کو بھول کر ہر میدان میں پہلے آکر کھڑا ہونا چاہیے تھا۔

حدوں کو تو وہ بھی پھلانگ گیا تھا، وہ تو لڑکا تھا۔ ایک شریف گھر کا لڑکا، اس کی حدود میں کہیں بھی صنف نازک پر ہاتھ اٹھانا نہ تھا۔

دروازے پر مسلسل ہوتی کہٹ کہٹ سے وہ خیال کے بہنور سے باہر آیا۔ تیزی سے اٹھتا، کھڑکی کے پٹ کھول کر کثافت بھری ہوا کو باہر نکلنے کا موقع دیا۔ اور سگریٹ کا گہرا کش بھرتے، اسے کھڑکی سے باہر پھینکا۔ ڈیسر سے پرفیوم اٹھا کر کمرے میں چھڑکا۔ اور منہ سے آتی سگریٹ کی بو کو نظر انداز کرتے دروازہ کھول دیا۔

"کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔ کہاں تھے؟"

کمرے کے اندر داخل ہوئے تو پرفیوم کی خوشبو میں گھلی سگریٹ کی بو بھی شامل تھی۔ ایک نظر بیٹے کو دیکھ کر استفسار کیا۔

"وہ، میں ریسٹ کر رہا تھا۔"

آنکھوں کو انگلی کی مدد سے مسلتا بولا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ان کی نظریں بیڈ پر سلیقے سے نیچھی چادر پر پڑیں جہاں ایک بھی سلوٹ نہیں تھی، کمرے میں ہلکی ہلکی سگریٹ کی بو، اور اضطرابی چہرہ، اسکے جھوٹ کہنے کے واضح ثبوت تھے۔

"کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"

صلہ بیگم کے بتانے پر ہی وہ اس کی طرف آئے تھے۔

یاسر کے بعد وہ ضامن کے لیے بہت حساس ہو گئی تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ ضامن کبھی بھی ان سے کھل کر اپنی پریشانی نہیں کہے گا۔ تبھی نواز صاحب کو بھیجا تھا۔

خود دروازے کی اوٹ سے اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر کچن میں اس کا پسندیدہ سمود ہی بنانے کے لیے چلی گئیں۔

"نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے"

ہاتھ کی ہتھیلی کو مسلتے، سر جھکا کر وہ بولا تو اس کی آواز بھی ظاہری حالت کی طرح پریشان ہی معلوم ہوئی۔

"وہ بس پریپرینٹیشن کی وجہ سے تھک گیا تھا۔"

ماتھے پر پڑے بالوں کو پیچھے کی طرف بھٹاتا وہ انہیں کسی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیسی رہی پریپرینٹیشن؟"

پریپرینٹیشن کے ذکر پر کلاس میں ہوئی سبکی، ضیغ کے ساتھ کی گئی لڑائی اور پھر تالش کے ساتھ۔۔۔۔۔

سب منظر آنکھوں کے سامنے پھر سے ابھرنے لگے۔ ایسا بھی کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہو گیا تھا کہ وہ جان سے پیارے دوست کے ساتھ جھگڑ پڑا تھا۔ اپنی تربیت کے برخلاف لڑکی پر ہاتھ اٹھا چکا تھا۔

ایک ہی دن میں اس سے کئی غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں۔ جو غصے میں تو اسے صحیح لگ رہی تھیں۔ پر اب صرف اور صرف شرمندگی کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

"لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔"

اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو جانچتے، اپنے تجربے کے لحاظ سے انہوں نے کچھ کچھ صحیح سرا پکڑا تھا۔

ان کے سوال پر چونک کر انہیں دیکھتا، کندھے اچکا گیا۔

"کیا گرڑ بڑ ہوئی ہے؟"

وہ جانتے تھے، نہیں بتائے گا۔ اگر بتانا ہوتا تو یوں چھپ کر کمرے میں نہ بیٹھتا پھر بھی وہ پوچھ بیٹھے۔

"ایک نہیں بہت ساری گرڑ بڑ کر چکا ہوں۔"

دونوں ہاتھوں میں سر کو گراتے پشیمان سا بیٹھ گیا۔

"تو اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

صوفے سے اٹھتے وہ بیڈ پر اس کے ساتھ جا بیٹھے، اور جھکے سر کو اوپر اٹھایا۔

ایک نظر انہیں دیکھ کر وہ سامنے آدھ کھلی کھڑکی کو دیکھنے لگا۔ کمرے سے اب سگریٹ کی بو کافی حد تک جا چکی تھی۔ پرفیوم کی مہک اب بھی باقی تھی۔

"آپ اگر میری کی گئی غلطی سن لیں تو شاید مجھے معاف نہ کریں۔"

ان کے پاس سے اٹھتا، پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے وہ دہیمے لہجے میں بولا۔



جانتا تھا اپنے باپ کو، خان کا خون تھا، عورت ذات کی عزت کرنا انکے گھروندے پر لازم و ملزوم تھی، پر وہ تو اس تربیت پر سوالیہ نشان لگا آیا تھا۔

"غلطی، غلطی ہی رہے گی جب تک تم اسے سدہارو گے نہیں۔"  
انہوں نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیے اپنا فلسفہ جھاڑا۔ جس پر ضامن نے آنکھیں گھمائیں۔

"بابا آپ نہیں جانتے ناکہ وہ غلطی کیا ہے۔ وہ سدہر نہیں سکتی۔"  
تھک کر کہتا وہ کھڑکی کے کواڑ بند کرنے لگا۔

"غلطی کی ہے یا گناہ؟"

اسے اپنے عقب سے بنا تاثر کی سرد آواز سنائی دی۔ وہ ضرور ضامن کے بارے میں کچھ غلط اخذ کیے بیٹھے تھے۔ ٹھنڈی سانس خارج کرتا وہ پلٹ کر ان کی طرف بڑھا۔

"بابا۔ آپ کا ضامن ایسا کوئی گناہ نہیں کر سکتا، جس سے آپ کا سر جھکے۔"

ایک نہیں بلکہ دو تین غلطیاں ہوئی ہیں، پر میرا ضمیر اب انہیں چھوٹی غلطی تسلیم نہیں کر رہا۔"

ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے وہ ٹہر ٹہر کر انہیں سمجھانے لگا۔

"تم تو تسلیم کرتے ہو نا کہ تم سے غلطی ہوئی ہے؟"

ان کے سوال پر ضامن سے سر ہاں میں ہلایا۔ اتنی دیر سے وہ اسی کشمکش میں تو تھا۔

"تو بس اب دو اور قدم بڑھانے ہیں۔"

ایک اس غلطی پر معافی مانگو۔ اور دوسرا آئندہ اس غلطی کو نہ دہرانے کا خود سے عہد کرو۔"

عام سے لہجے میں کہتے وہ ضامن کی اندر جلتی ندامت کی آگ پر برف کی ڈلی رکھنے لگے۔

"تھینک یو بابا۔"

ان کے ہاتھوں کو چوم کر ماتھے سے لگاتا وہ عقیدت سے بولا کہ نواز صاحب مسکرا دیے۔

"ایک بات یاد رکھنا ضامن، کبھی ہماری عزت پر حرف نہ آنے دینا۔ یا سر کے بعد تم ہی ہمارا

سہارہ ہو۔"

وہ اسے آرام کرنے کا مشورہ دیتے جانے لگے کہ جاتے جاتے پلٹے اور بڑی آس سے یہ جملہ کہا۔

"بابا آپ کا ضامن کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔"

ان کی آس کو یقین پکڑاتا وہ بولا تو نواز صاحب مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

غلطی تو وہ مان چکا تھا۔ اب معافی مانگنی تھی۔ ضیغ سے بھی اور شاید اس سے بھی۔ اب وہ انا جس کے چکر میں اتنا سب کچھ ہو گیا، وہ کہیں سو چکی تھی۔ اور اب دل و دماغ مل کر اپنی ہر ناانصافی کی معافی مانگنے پر اکسا رہے تھے۔

جیب سے فون نکال کر اسے انگھوٹے اور انگلی کی مدد سے گھوماتے وہ الفاظ ترتیب دے رہا تھا کہ کیسے اور کس سے پہلے معافی مانگی جائے۔

فال نکلا کہ ضیغ سے معافی مانگی جائے کیونکہ اس سے معافی مانگنا ضروری بھی تھا اور آسان بھی۔ جب کہ تائشہ سے معافی مانگنا ضروری تو تھا، پر آسان نہ تھا۔

دو تین دفعہ کال جا رہی تھی تو آگے سے فون اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اور پتو تھی بار کال جانے کی صورت میں فوراً کاٹ دی گئی۔ یعنی ناراضی یہاں بھی شدید حد تک تھی۔ آخر کو بے اعتباری دکھائی تھی۔

ایک دو دفعہ شہیار کو کال کر کے بھی دیکھا تو اس نے بھی یہی عمل دہرایا۔ تھک ہار کر موبائل جیب میں ڈالتا۔ جیسے تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ارادہ ضعیف کے گھر جا کر اس سے اپنے رویے کی معافی مانگنے کا تھا۔

\*\*\*\*\*

شہیار اور ہیرا سے ساتھ گھر چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اتنی غیر دماغ حالت میں تھی کہ انہیں گھر میں آنے کا بھی نہ کہہ سکی۔

گھر کی بیل بجاتی، وہ چادر کو ارد گرد پھیلائے، دروازے کو گھورتی کھڑی تھی کہ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔

"نہائشہ!"

بکھرے ہوئے بال، سوچی ہوئی لال ہوتی آنکھیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے گرد لپیٹی چادر۔ یہ سب دیکھ کر وہ اسے بازو سے جھنجھوڑتی پکاری تو ایک نظر انہیں دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں جانے لگی۔

"یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تائشہ؟"  
اس کے پیچھے ہی بولتے ہوئے وہ کمرے میں آگئیں۔

"یہ مٹی کہاں سے لگی؟"  
اس کی ساری شرٹ سامنے سے مٹی سے اٹی ہوئی تھی۔ کیچڑ اور پانی سوکھ گیا تھا بس داغ رہ گئے تھے، کپڑے پر بھی اور چہرے پر بھی۔

"کچھ نہیں امی، بس گر گئی تھی!"  
ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہتی وہ الماری سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلی گئی۔

لیکن انہیں یقین نہ آیا تبھی اس کے باہر نکلنے تک وہ کمرے میں ہی رہیں۔

"تالشہ سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

تم روئی ہو کیا؟

کسی نے دہکا دیا ہے؟"

اس کے باہر نکلتے ہی، وہ اس سے سوال کرنے لگیں۔ ان کے ہر سوال پر اس کا پھر سے رونے کو دل کرتا۔ پر کمال ضبط کی تصویر بنی وہ نہ میں سر ہلاتی آئینہ کے سامنے کھڑی گیلے بالوں کو تولیہ سے صاف کرنے لگی۔

اپنے عکس کو دیکھ کر اس کا دل کر رہا تھا چیخیں چلائے، آئینے کو چکنا چور کر دے، اپنے دکھتے عکس کو نوچ ڈالے، پر وہ بے حس بنی اپنا عکس دیکھنے لگی۔

"یہ لو پانی پیو۔"

اسے یوں ہی مسلسل آئینے کو گھورتے دیکھ کر وہ اس کے لیے پانی لے آئیں۔ دو گھونٹ بھر کر اس نے گلاس واپس تھما دیا۔

"امی میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے سونا ہے۔"

اپنی بات کہتی وہ بیڈ پر جا لیٹی اور آنکھوں پر بازو رکھ دیا۔

ناچار انہیں بھی کمرہ بند کر کے جانا پڑا۔

ان کے جاتے ہی، آنکھوں پر رکھے بازو کو ہٹا کر، چھت پر چلتے پنکھے کے پنکھ کو گھورنے لگی۔

کیا اس کا قصور اتنا بڑا تھا کہ اسے یوں تھپڑ مار کر ذلیل کیا جاتا، ہر زیادتی پہلے ضامن کی طرف سے کی گئی تھی تو کیا وہ لڑکی بن کر برداشت کرتی۔ آخر کو اس نے بدلہ ہی تو لیا تھا۔ اس نے بھی تو گیم سے باہر کروایا۔ اگر تائشہ نے چال چل کر اسے کلاس سے باہر نکلوا دیا تو اتنا شدید رد عمل!

یہ سب سوچتے، اسکی آنکھوں سے خاموش آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے، جنہیں صاف کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بس اوپر لٹکے پنکھے کو گھورتی رہی یہاں تک کہ آنکھوں پر نیند کا خمار بوجھ بن کر پڑا اور وہ آنکھیں موند کر ہر فکر سے کچھ وقت تک رہائی لے کر سو گئی۔

\*\*\*\*\*

"کاکا، اسے کہیں چلا جائے یہاں سے۔"

قطعیت سے کہتا وہ اپنے کمرے کا دروازہ زور سے پٹخ کر اندر بند ہو گیا۔

ضامن اس سے ملنے گھر آیا تھا۔ شکیل کا کا کے دروازہ کھولنے پر ضیغم نے لاونج سے اسے کھڑا دیکھ کر فرمان جاری کیا۔ اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"کا کا۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔"

ملتی نگاہوں سے دیکھتا وہ التجا کرنے لگا تو انہوں نے اسے اندر آنے کا کہا۔  
ضامن مشکور نظروں سے انہیں دیکھ کر وہ ضیغم کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔

"ضئی!"

بڑے مان سے اسے پکارا تھا۔ پر جواب ندارد۔

"ضئی میں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کچھ فاصلے پر کھڑے شکیل کا کا کو دیکھا جو ہاتھ باندھے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے یوں دیکھنے پر سمجھتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ضامن نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

"میری غلطی بہت بڑی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ اور تجھی معافی مانگنے آیا ہوں۔"



ضامن کے کہنے پر ضیغم کے کان کھڑے ہوئے تو کیا اتنی جلدی وہ اپنی غلطی کو پہچان بھی گیا۔

ضیغم کی طرف سے مسلسل خاموشی پا کر اب قدرے اونچی آواز میں وہ بولا۔

"مجھے تجھ پر الزام نہیں لگانا چاہیے تھا۔ اور نہ ہی تجھ پر ہاتھ اٹھانا چاہیے تھا۔ پر کیا کروں یار، غصہ آگیا تھا مجھے۔ پلیز مجھے معاف کر دے۔"

دروازے پر ایک ہاتھ جمائے وہ کھڑا بول رہا تھا۔ جبکہ اس کے ان جملوں پر ضیغم کا خون کھولا تھا اور وہ جھٹ سے دروازہ کھول کے سامنے آیا۔

"تجھے صرف اس غلطی کا اندازہ ہے، ہاں؟"

کڑے تیور لیے وہ پوچھ رہا تھا۔

"مجھے تجھ جیسے مخلص دوست کے ساتھ بے اعتباری بھی نہیں دکھانی چاہیے تھی۔"

کچھ دیر سوچتا، وہ بولا تو ضیغم نے غصے سے سر جھٹکا۔ اور اس کے کندھے پر بھی ہاتھ مارتا اسے پیچھے کی اور دھکا دیا۔

"تو چیز کیا ہے؟ کوئی عقل ہے بھی کہ نہیں تجھ میں۔ تو اتنی بڑی حرکت کر کے آیا ہے۔ ایک لڑکی پر ہاتھ اٹھا کر آ رہا ہے۔ اور یہاں تو مجھ سے معافیاں مانگ رہا ہے۔"

وہ تاسف سے ضامن کو دیکھتا، اسے وہیں چھوڑ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

"ضئی!"

میں مانتا ہوں، اپنی اس غلطی کو بھی مانتا ہوں۔ اور ناصرف مانتا ہوں شرمندہ بھی ہوں کہ میری غلطی تھی مجھے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔

پر تو نے دیکھا نہیں اس نے کیا گری ہوئی حرکت کی۔"

غلطی ماننے کے بعد، ضامن نے اپنے دفاع کے لیے بھی توجہ پیش کی۔

"سیرئسلی، اس نے گری ہوئی حرکت کی؟ اور جو تم نے اسے فائل میں باہر نکالنے کی حرکت کی تھی۔ وہ تو بہت شاندار حرکت تھی؟"

ضیغم کے جتلا نے پر وہ سر کجھاتا شرمندہ سا دکھا۔

"ان فیکٹ، اس کے بدلے میں یہ حرکت بالکل جائز تھی۔ تو پھر تیرا ہاتھ اٹھانے کا کیا مقصد تھا؟"

وہ اب اسکے مقابل آن کھڑا ہوا اور اس کے جھکے سر کو دیکھتا استفسار کر رہا تھا۔ اس کی غیرت گوارا نہیں کر رہی تھی کہ اس کے ہی دوست نے ایک مظلوم لڑکی جو بہت کچھ پہلے ہی برداشت کر رہی تھی، اس پر ہاتھ اٹھا کر اپنی مردانگی کی تشہیر کی تھی۔

"یار!"

اس کا رویہ، اس کا لہجہ کہیں سے بھی تمہیں لڑکیوں والا لگتا ہے۔ ہر وقت تو جنگ کے میدان میں لڑنے کو تیار ہوتی ہے۔ اور تم اسے لڑکی، لڑکی کہے جا رہے ہو۔ کتنی بد لحاظی سے اور منہ پھاڑ کر اقرار کر رہی تھی کہ بدلا لیا ہے، اس نے مجھ سے، تو غصے کی حالت میں اٹھ گیا میرا ہاتھ بھی۔"

اس کے سامنے سے گزرتا، وہ تیز آواز میں کچھ جھنجھلاتا اپنی بات کہہ کر لاؤنج میں رکھے ایک صوفے پر بیٹھا، اور سر ہاتھوں میں گرا گیا۔

"یہ سراسر اس کا مسئلہ ہے وہ لڑکی دکھے کہ لڑکا۔"

ضیغم نے لفظوں پر زور ڈال کر کہا تھا جس پر ضامن کا آنکھوں کو مسلتا ہاتھ رکا۔ اور پھر تھوڑا آگے کو جھک کر اپنی بات پر زور دیا۔

"تو ٹھیک ہے، پھر میں نے بھی کچھ غلط نہیں کیا۔ جب اسے لڑکا بن کر برابری کرنی ہے ہم لڑکوں کی تو اس میں ناانصافی کہیں بھی نہیں آتی۔ لڑکے آپس میں گھتم گھتا بھی ہوتے ہیں تمہیڑ بھی پڑتے ہیں۔ پھر تو کوئی جواز ہی نہیں بنتا، میرے شرمندہ ہونے کا۔ ہاں نا؟"

کندہ ہے اچکاتا وہ اپنے آپ کو ہر الزام سے بری کر گیا۔

"تجھ سے کس نے کہا کہ وہ یہ سب صرف برابری کے لیے کرتی ہے۔"

"اس کا حلیہ اسکی حرکتیں سب بتاتا ہے۔"

ضامن کے جواب پر ضیغم نے گھورا۔

"منہا، شہلا، زرش، ثانیہ، رحیلہ اور بھی ایسی کئی لڑکیوں کے حلیے دیکھے ہیں تو نے ہتائشہ کا حلیہ ان لڑکیوں کے حلیے سے کئی حد تک بہتر ہے۔"

ضیغم کی دلیل پر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

ایسا ہی تو تھا، ہاں وہ کرتا اور پاجامہ ہی تو پہنتی تھی۔ جبکہ باقی لڑکیاں، تو چست لباس پہنیں نسوانیت کا مکمل اشتہار لگ رہی ہوتی تھیں۔ اس کا سادہ سا انداز دونوں طرف جیب لگا کرتا، اور پاجامہ پہنے گلے میں مفلر اور کندھوں سے تھوڑا اوپر تک چھوٹے سے بال جنہیں کھلا چھوڑا ہوتا تھا۔ وہ باقی لڑکیوں سے ہٹ کر ہی تھی۔

"لیکن باقی لڑکیاں ایسے برابری کے مقابلے پر بھی نہیں اترتیں یار! غلطی سراسر میری بھی نہیں ہے ضیغم"۔ سوچوں کو جھٹکتے، ایک اور وجہ پیش کی۔

"تم کیا چاہتے ہو کہ اسکے ساتھ کچھ بھی کرتے جاؤ اور وہ خاموشی سے کمزور لڑکی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تمہاری ہر حرکت کو برداشت کرے؟

اور اس کا ایسا رویہ بنتا ہے کیونکہ باقی لڑکیاں امیر باپوں کی اولادیں ہیں۔ پرتائشہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہے جسے اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کا خود مداوا کرنا پڑتا ہے۔ نہ ہی اس کے بابا اس دنیا میں ہیں کہ وہ اسکا سہارا بنیں۔ اور نہ ہی بھائی"۔

ضیغم اسے بتاتا جا رہا تھا اور وہ ڈوبتے دل کے ساتھ سنتا جا رہا تھا۔

"جن کے بھائی نہیں ہوتے، انہیں ایسا ہی بننا پڑتا ہے۔"  
ضیغم کے خاموش ہونے کے بعد ضامن کے کانوں میں کچھ دن پہلے کا جملہ گونجنے لگا۔

"اس کا تلخ رویہ، اپنی محرومیوں کے باعث ہے ضامن۔ وہ خوشی سے یہ سب نہیں کرتی۔"  
ضیغم بھی اس کے چہرے پر ندامت دیکھ کر اب نرمی دے گویا ہوا۔  
ہاں میں سر ہلاتا وہ مزید چہرہ جھکا گیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کیے وہ کچھ کہنے چاہ رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا تھا۔"

افسوس سے کہا۔

"جب جانتے نہیں تھے تو اتنے بڑے بول بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔"  
ضیغم کی ہر بات آج اسے سچی لگ رہی تھی۔

"ہاں۔"

ویسے ہی جھکے سر کے ساتھ کہا۔ تو ضیغم کو بھی اس سے ہمدردی ہونے لگی، وہ اسے شرمندہ کرنا چاہتا تھا لیکن اب یوں ندامت میں گرا دیکھ کر اسے اچھا بھی نہیں لگ رہا تھا۔

"اچھا یہ بتالچ میں کیا کھائے گا۔"

ساری شرمندگی اور اداسی کا اثر ماحول سے زائل کرنے کے لیے کھانے کا پوچھتا وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں جانے لگا۔

آخر کو اسکا گہرا دوست تھا، اپنے ساتھ کیے گئے غصے کو تو وہ اس لمحے ہی معاف کر چکا تھا۔ آخر کو یہ رشتہ تھا ہی ایسا جہاں معافی اور شکریہ کی گنجائش بچتی ہی نہیں۔

"نہیں میں گھر جاؤنگا۔"

نظریں چراتا، وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب یوں منہ بنا کر ڈرامے نہ کر۔ آج تجھ سے ہی بنواؤں گا۔"

آجا شاباش!"

اسے ہاتھ پکڑ کر ساتھ کچن میں لاتے وہ بولا تو ضامن بھی پھیکا سا مسکرا دیا۔

"ایسی شکل بنانے سے اچھا ہے اپنی غلطی سدہار لے۔"

ایک نظر اس پر ڈال کر فریج سے سبزیاں نکالنے لگا کہ ضامن نے اچھنبے سے اسے دیکھا اور پھر سر جھٹکتا مسکرا دیا۔

"سیدھے سے کہہ دے اس چوہیا سے معافی مانگ لو۔"

مزاح کا رنگ دیتے وہ بولا تو ضیغم بھی ہنسی چھپاتے اس کے چوہیا کہنے پر، مصنوعی خفگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کبھی سدہرنا نہ۔"

ضیغم نے خفگی سے کہا کہ ضامن کا ہلکا سا قہقہہ برآمد ہوا۔

"پر آئیڈیا اچھا ہے۔"

ضیغم کے آنکھ دبا کر کہنے پر وہ دل مسوس کے رہ گیا۔ نجانے وہ اسے معاف کرے گی کہ نہیں۔ یا اس تمپڑ کا اب وہ کیسے بدلا لے گی۔ ان سب سوچوں کو جھٹکتے وہ ضیغم کے ساتھ مل کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔



"شہریار کو بھی بلا لیتے۔"

پتیلی میں چمچہ چلاتے وہ سرسری سا بولا۔

"وہ نہیں آئے گا۔"

کننگ بورڈ پر ٹائمر کاٹتے ضیغم نے عام سے لہجے میں کہا۔

"وہ بھی مجھ سے ناراض ہے؟ اب اسے بھی مناؤں۔"

منہ بسور کر کہا کہ ضیغم بے ساختہ ہنسا۔

"ویٹ آ منٹ۔ تم نے مجھے کب منایا ہے؟"

"تم مان نہیں گئے۔"

"تم نے منایا ہے؟"

کمر پر ہاتھ رکھے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ جس پر ضامن نے کندھے اچکائے کہ جیسے بھی مانے،  
مان تو گئے۔

"ویسے آج اس کی ہیر کے چھ بھائیوں کے ساتھ میٹنگ ہے۔"  
 سر جھٹک کر شہریار کے بارے میں بتاتے پھر سے کنگ بورڈ پر رکھے ٹائمر کاٹنے لگا۔  
 ضیغم اور ضامن دونوں کے چھت پھاڑ قہقہے کمرے میں موجود کاکا کے کانوں میں پڑے۔

"کیسا رشتہ ہے دوستی کا پل میں تولہ پل میں ماشہ، کچھ دیر پہلے شکل دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ اب  
 ساتھ کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔"  
 شکیل کا کا دل میں مسکراتے، سر جھٹک کر ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے جاہ نماز اٹھانے  
 لگے۔

\*\*\*\*\*

"السلام علیکم۔"

چھ کے چھ افراد ریسٹورینٹ میں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔  
 ہیر اسے اپنے بھائیوں کی تصویر دکھا چکی تھی اگر نہ بھی دکھاتی تو چھ لڑکوں کو یوں ایک ساتھ سر  
 جوڑے دیکھ کر وہ پہچان ہی جاتا۔

شہریار نے قریب پہنچ کر تھوک نکلنے سے سلام کیا تو سب کی نظریں اپنے پر پڑتی دیکھ وہ گر بڑایا۔  
نیوی بلیو ڈریس پینٹ اور کوٹ کے ساتھ سفید شرٹ پہنے اور نیوی بلیو رنگ کی ہی ٹائی گلے میں  
لٹکائے کافی حد تک جاذب نظر لگ رہا تھا۔

سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے سیف نے (جو کہ کافی بھاری بھر کم وجود کا مالک  
تھا) از حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ اسے بیٹھنے کا کہا۔  
چھ بھائیوں کے تعارف کے بعد، شہریار نے سوکھے گلے کو تر کرنے کی غرض سے سامنے پڑے  
میز پر پانی کے گلاس کو منہ سے لگایا۔

"کیا کرتے ہو؟"

سیف نے ہی رعب دار آواز میں استفسار کیا۔  
گلا کھنکھار کر شیریں بولا۔

"جی ایم بی اے کے لاسٹ سمسٹر میں ہوں۔"

اس کے جواب پر عادل (چھوٹا بھائی) نفی میں سر ہلاتا طنزیہ لہجے میں بولا۔

"مجھے لگا کہو گے آپ کی بہن سے پیار کرتا ہوں۔"  
 شیریں نے لب بھینچ کر گھبراہٹ روکنے کی کوشش کی۔  
 یعنی جواب غلط ہو گیا تھا۔

"وہ بھی کرتا ہوں۔"

اس کے جلدی سے بات سنبھالنے پر عادل کے ساتھ ساتھ باقی پانچوں کی بھی ہنسی نکلی۔  
 ان کے ہنسنے پر جھینپ کر ہنستا وہ گلے میں لٹکی ٹائی کو ڈھیلا کرنے لگا۔

"ایم بی اے کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

اب سنجیگی سے ہیر کے بھائی وقفے وقفے سے سوال کر رہے تھے۔ جن کے جواب شہیار ایمانداری  
 سے سوچ سمجھ کر دے رہا تھا۔

آج اس موقع پر ضامن اور ضیغم کی شدید کمی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بھی ان کو اپنے ساتھ لانا  
 چاہتا تھا۔ پر آج کی گئی ضامن کی حرکت پر دل برداشتہ ہوتا وہ صرف ضیغم کو بتا کر آیا تھا۔

"شہریار، ہماری بہن ہمیں بہت عزیز ہے۔ وہ اگر کوئی غلطی بھی کرتی ہے تو ہم اسے بڑا دل کر کے معاف کر دیتے ہیں۔ اور ہم تم سے بھی یہی توقع کریں گے کہ ہماری بہن کو تمہاری سنگت میں کوئی مشکل یا تکلیف پیش نہ آئے۔"

سیف نے قطعیت سے کہا جس پر باقی پانچوں نے تائید میں سر ہلایا۔

"جی بھائی میں پوری کوشش کروں گا۔"

سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے وہ عاجزی اور فرمانبرداری سے بولا۔

"کوشش نہیں کرنی، یہ تم پر لازم ہے کہ ہماری بہن پر کوئی آنچ نہ آئے۔"

مزاحیہ طبیعت کا مالک عادل، کافی سخت اور گنبدھیر لہجے میں گویا ہوا۔ شہریار نے اس کے لہجے پر تھوک نگلا اور زور و شور سے ہاں میں سر ہلایا۔

"جی بالکل۔"

"اب کچھ کھا لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

ویٹر!"

سب سوالوں کے جواب اور ہر اندیشے کے دور ہو جانے کے بعد منجھلے بھائی نے کھانے کا ذکر چھیڑا۔ ان کی موجودگی میں شیری کے گلے سے تو نوالہ نہیں گزرنا تھا پر باقی پانچوں کے کہنے پر وہ خاموش سا دہیمی سی زبردستی کی مسکراہٹ سجائے بیٹھا رہا۔

\*\*\*\*\*

"او، مس عینک!"

تائشہ اور ہیر دونوں نے ہی بنا بتائے چھٹی کر لی تھی، اور وہ بیچاری انجانے میں ہی ماری گئی۔ ایک لیکچر لے کر اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا، تبھی کلاس سے باہر آکر وہ ڈرائیور کو بلوانے کے لیے فون کرنے ہی لگی تھی، جب اسے اپنے عقب سے مہنا کی آواز سنائی دی۔

"جی!"

بچائے کال ملانے کے موبائل واپس رکھا۔

"ضیغم کہاں ہے؟"

آنکھیں چھوٹی کیے گھورتی، وہ استفسار کر رہی تھی۔

"پتہ نہیں۔"

معصومیت سے لاتعلقی کا اظہار کرتی منہا کو سلگا گئی۔

"کم از کم میرے سامنے یہ ڈرامے مت کرو۔ اچھے سے جانتی ہوں تم جیسی لڑکیوں کو صرف معصومیت کا ڈھونگ رچانا آتا ہے۔"

تنفر بھرے انداز میں کہہ کر، وہ اس کی الجھن بھری آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کیا کہا ہے؟"

اس بیچاری کے توپلے کچھ پڑا ہی نہیں تھا، تبھی انجان بنی استفسار کر رہی تھی۔

"او پلیز! اپنی یہ دبو سی لک صرف ضیغم کو ہی دکھایا کرو۔ میں تمہاری اس معصومیت کے جال میں آنے والی نہیں۔"

قطعیت سے کہتی وہ جانے کو پلٹی ہی تھی جب اپنے پیچھے ضیغم کو کھڑے پایا۔

اس کے چہرے پر موجود سختی بتا رہی تھی کہ منہا کا کہا ہر لفظ وہ سن چکا تھا، گلا تر کرتی وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ضیغم نے سخت پردھیمی آواز میں اسے ٹوکا۔

"آئندہ عینا سے اس لہجے اور ان لفظوں میں بات مت کرنا۔"

تنبیہ کرتا انداز، منہا کو بہت کچھ جتلا گیا تھا۔

پہلے ہی دن عینا سے محسوس ہوئی رقابت ایسے ہی نہ تھی، عینا کا اس کے ساتھ ہنس کر گھومنا، وہ بھی ایسے ہی نہ تھا۔

منہا کے تمام خدشے درست تھے، ایک نظر ضیغم پر اور دوسری عینا پر ڈال کر وہ ضیغم کے سامنے سے گزر گئی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

منہا کے جاتے ہی، عینا کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس کے سوال پر ڈبڈبائی نظریں اٹھاتی بغیر جواب دیئے پلٹی۔

"عینا!"

کیا ہوا ہے؟

اسے جو منہ موڑ کر جاتے دیکھ وہ فوراً اسکے سامنے آیا تھا۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں کل کے واقع کو لے کر ناراضگی دیکھ کر وہ ماتھا مسلنے لگا۔



"آئی ایم سوری۔"

کل جو بھی ہوا بہت غلط تھا۔ پر اس میں میری کیا غلطی ہے؟"  
وہ سمجھانے لگا تھا۔ پر عینا کے سوال پر پل بھر کو ساکت ہوا۔

"آپ بھی ضامن بھائی کی طرح مجھے تھپڑ مار دیں گے، مجھے بات نہیں کرنی۔"  
وہ گھبراتا، اپنا چہرہ جھکا گئی۔

"میں؟ میں کیوں تمہیں تھپڑ ماروں گا؟"

عینا ادھر دیکھو، میں کیوں ایسا کرونگا۔ یار عینا!

ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

وہ بے بس سا اسے یقین دلانے لگا، جو لبوں کو باہر نکالے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

کل کی حرکت پر وہ بہت ڈر گئی تھی، اگر ضامن ہاتھ اٹھا سکتا تھا، تو پھر اس کے دوست ضیغم سے تو کچھ بعید نہیں تھا۔

"اچھا اب یہ آنکھیں تو صاف کرو، پھر میں مینڈک کہوں گا تو تم غصہ کرو گی۔"

دل تو چاہ رہا تھا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جنہیں چشمے کی قید میں رکھا گیا، ان کو اپنی انگلی کی پوروں سے صاف کرے، پھر اپنی خواہشات پر بند باندھتا بولا۔  
عینا نے جواباً گھورا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

\*\*\*\*\*

اسے دو دن ہو گئے تھے نہ ہی وہ یونی جا رہی تھی اور نہ ہی کمرے سے باہر امی نے کئی بار اسے باہر آنے کو بھی کہا پر وہ طبیعت خرابی کا کہتی بستر ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔  
آج بھی وہ چادر گردن تک تانے، کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں گاڑے سوچ میں گم تھی کہ باہر سے آتی مسلسل آوازوں پر خیال کی روش سے باہر آئی۔  
کوئی ہمسائی ہوگی، یہ سوچتے سر جھٹک کر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔  
ابھی آنکھیں بند کیے ایک منٹ بھی نہ گزرا ہو گا، دھڑام کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تھا۔ وہ جو سونے کی تیاری میں تھی، بھک سے ساری نیند ہوا ہوئی، اور دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ تو سامنے ہی عینا اور ہیر چہرے پر خفگی سجائے کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں فائل، کتابیں اور کندھے پر لٹکتے بیگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یونی سے سیدھا یہاں آئی ہیں۔

"ذرا شرم نہ آئی تمہیں کہ دوستوں کا حال چال ہی پوچھ لو۔"  
 اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر دونوں سے ملتی ہیر خفگی کے تاثرات سجائے بولتی اسکے ساتھ ہی آکر  
 بیٹھ گئی۔ عینا نے بھی اس کے مخالف جگہ سنبھال لی۔

"یار، طبعیت خراب تھی۔"

وہی دو دن سے بنایا ہوا بہانہ انہیں بھی گھڑ ڈالا۔ پر حقیقت سے کب تک نظریں چرائی جائیں۔  
 جب کہ وہ دونوں تو حقیقت سے واقف تھیں۔

"ہائے اور با!

دکھاو۔"

اس کے ماتھے پر ہاتھ کی پشت رکھتے، بخار کی شدت محسوس کرنے لگی، پر بخار کے نام پر ٹھنڈا  
 ٹھار جسم تھا۔

"کیا ہوا ہے۔؟

صحیح سلامت تو پڑی ہو۔ بخار بھی نہیں ہے۔"

ہیر کے جھڑکنے پر وہ بھی ہنس دی۔ ان کے آجانے سے اندر کی طبعیت کافی حد تک بحال ہو چکی تھی۔

"ڈونٹ!"

تم کچھ نہیں کہو گی۔"

ہیر جب سے آئی تھی بولی جا رہی تھی۔ پر عینا وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔ ہاں ہیر کی باتوں پر ہلکا سا ہنس دیتی تھی۔

یوں اپنے ذکر پر وہ جھینپ کر تائشہ کو معصومیت سے دیکھتی بہت خوبصورت لگی۔ وہ پہلی بار اسکے گھر آئی تھی، شاید جھجھک تھی جو وہ کچھ کہہ نہیں رہی تھی۔

"کیا کہوں؟"

نچلے ہونٹ کے ایک کونے کو دانت میں دبائے وہ پریشانی سے بولی۔  
تائشہ نے اسکے انداز میں ہنس کر سر نفی میں ہلایا۔

"یہی پوچھ لو کہ کیسی ہو۔ ویسے تو ہٹی کٹی ہی لگ رہی ہے۔"

ہیر نے اس کی مشکل آسان کر دی جس پر عینا کے ساتھ ساتھ تائشہ کا بھی قہقہہ پھوٹ پڑا۔

"اچھا کل سے تم یونی آرہی ہو۔"

اس کے ہونٹ کے کنارے پہ پڑا نیلا پھیکا سا نشان کافی حد تک مندل ہو گیا تھا۔ اسی نشان پر نظریں رکھے وہ تحکمانہ لہجے میں بولی تھی۔

"میرا دل نہیں ہے۔"

وہ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی کم اور لیٹی زیادہ تھی، چادر کو مزید آگے کو کھسکاتی بولی۔

"کیوں؟"

یہ سوال عینا کی طرف سے ہوا تھا۔ اور اس کے جواب میں تائشہ نے صرف عینا کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالی تھیں۔ وہ آنکھیں پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ پر ان میں ہلکورے مارتا درد صاف چھلک رہا تھا کہ ان پڑھ بھی محسوس کر ہی لے۔

"تشو!"

اس دن وہ سب جو بھی ہوا۔ اسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ضامن بہائی کا اتنا سخت رد عمل واقع ہی بہت غلط تھا پر۔۔۔"

ہیر نے ایک لمحے کے لیے اس کی جھکی نظروں کو دیکھ کر بات جاری رکھی۔

"پر تمہیں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

ہیر نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

یہ کہہ کر وہ تالشہ کی طرف سے احتجاج سننے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی لیکن اس طرف مکمل خاموشی تھی۔ ویسے ہی نظریں جھکائے وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔

"تشو۔ تم سن رہی ہو؟"

"ہاں۔"

ہیر کے سوال پر ایک لفظی جواب دے کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

"تو پھر جواب کیوں نہیں دے رہی۔"

"کیا جواب دوں؟"

مجھے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا؟

اور وہ جو انہوں نے ٹیم سے نکلوانے کے لیے گیم کھیلی تھی۔ تم نہیں جانتی ہیر اس وقت مجھ پر کیا گزری تھی، کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ کیا میں نے ہاتھ اٹھایا؟ وہ سر جھٹکے سے اٹھاتی تیز آواز میں استفسار کر رہی تھی۔ ہیر خاموش سی اسے دیکھے گئی۔

"لیکن تم بھی صحیح کہہ رہی ہو۔

ہاں، غلطی میری ہی تھی۔ مجھے پہلے دن سے ہی اس شخص کے منہ نہیں لگنا چاہیے تھا جس میں تعمیز رتی برابر بھی فکس نہ ہو۔ جس کے اندر بار سہ جانے کا حوصلہ ہی نہ ہو، ایسے شخص سے دشمنی رکھنا بھی بے وقوفی ہے۔

پر میں بھی انسان ہوں اور غلطیاں بھی انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔"

پرسکون لہجے میں ویسے ہی بیٹھے، اس نے جواب دیا تو عینا کے ساتھ ساتھ ہیر نے بھی ہاں میں سر ہلایا۔

ان دو دنوں میں مسلسل وہ اس عرصے میں ہوئے ہر اس لمحے کو یاد کر رہی تھی۔ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آخر میں نتیجہ یہی نکلا تھا کہ اگر بانس نہ ہوتا بانسری ہی نہ بچتی۔ یعنی کہ نہ ہی پہلے دن وہ ضامن سے کچھ کہتی اور نہ ہی بات پھیلتی پھیلتی اس موڑ پر آٹھرتی۔

"آئی ایم سوری۔

اس دن تم مجھے بچانے کے لیے آئی تھی۔ اور یہ سب میری وجہ سے...."

عینا اس کی بات کے جواب میں، یونی میں پہلے دن کو یاد کرتی، دکھ سے بولی کہ تائشہ نے تڑپ کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"کچھ نہیں ہوا تمہاری وجہ سے ڈونٹ۔ اور جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ ویسے نہیں تو ایسے صحیح۔ اس لیے اپنے چھوٹے سے دماغ کو زحمت نہ دو"

بات کرتے آخر میں اس کی چھوٹی سی ناک کو دبا کر دائیں بائیں گھمایا کہ عینا نے ماتھے پر شکن ڈالے اس کی یہ حرکت ملاحظہ کی۔

"تم لوگوں کا ایموشنل سین ختم ہو جائے تو میری بھی سن لو۔"

"ہاں تو بولو۔ پہلے جیسے ہمارے کہنے پر ہی بولتی ہو نا۔"

ہیر اور تائشہ کی لفظی جنگ سے عینا کافی حد تک پریشان ہوتی تھی۔ آج بھی ان دونوں کو یوں بحث کرتے دکھ سے دیکھا۔



"کل یونی لازمی آنا۔ کیونکہ کل تمہاری پریزنٹیشن بھی ہے۔ اور ہاں آسائمنٹ سبٹ کروانے کی بھی لاسٹ ڈیٹ ہے۔"

"او شٹ۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔"  
 ماتھے پر ہاتھ مارتی وہ پریشان ہو گئی۔

"اب میں کیسے سبٹ کرواؤں آسائمنٹ، میرے پاس تو میٹریل ہی کمپلیٹ نہیں ہے۔"  
 افسوس سے کہتی وہ ہونٹوں کو باہر کی طرف نکالے ان دونوں کو دیکھے گئی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔"

شان بے نیازی سے کہتی عینا کے پاس رکھی فائل اور بیگ سے فلیش نکال کر اسکے ہاتھ پر رکھی۔

"یہ کیا ہے؟"

فائل کو کنگھالتی، اس کے صفحے پر اپنا نام پڑھ کر حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چیختی۔

"یہ کس نے بنائی؟"

"تم آم کھاؤ نا گٹھلیاں کیوں گن رہی ہو۔"

اس کے سوال پر گڑبڑاتی وہ جھڑک کر بولی۔ تو تائشہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

"یہ تم نہیں بنا سکتی، اور نہ ہی عینا بنا سکتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ کس کی اٹھا کر لے آئی ہو۔"

اس کے مشکوک انداز پر عینا نے سوکھے لبوں پر زبان پھیری جب کہ ہیر تو تپ کر اس پر چڑ دوڑی۔

"ایک تو تمہارا بھلا کریں اوپر سے ہم پر ہی شک کر رہی ہو۔ دو واپس نہیں یقین تو۔"

فائل اسکے ہاتھ سے تقریباً کھینچتے ہوئے وہ بولی تو تائشہ نے جلدی سے فائل اپنے تکیے کے نیچے رکھ لی۔

"ویسے تمہارے ہاں دوستوں کو ٹھنڈا پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے کیا۔"

ہیر نے اسے شرمندہ کرنے کی غرض سے بے شرمی سے پوچھا کہ وہ بھی سر پر ہاتھ مارتی اٹھ کر جانے لگی۔

تبھی اس کی امی ہاتھ میں ٹرے پکڑے، دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔

"کیوں نہیں بیٹا، رواج ہے نا، یہ لو آرام سے کھاؤ اور پیو۔"

اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے مسکراتے ہوئے وہ بولیں۔

ہیر کھسیانہ ہنستی، شرمندہ ہو چکی تھی۔

ان کے جاتے ہی تائشہ نے بڑے اہتمام سے عینا اور ہیر کے لیے پلیٹ تیار کی۔ اور انہیں پکڑائی، پھر خود بھی اپنی پلیٹ تیار کرنے لگی۔

"دو دنوں سے میں بھی ڈھنگ سے کھا نہیں سکی۔"

اب تائشہ کو بھی بھوک کا احساس ہونے لگا تھا۔

ہیر بغور تائشہ کا سگھڑپا دیکھ رہی تھی۔ کتنی نفاست کے ساتھ پلیٹ میں کٹلٹس رکھتی وہ کچھ اپ کو صفائی کے ساتھ ڈالتی پلیٹ تیار کر رہی تھی۔

"عینا تمہاری آج پر ریٹینشن تھی نا کیسی رہی۔"  
جوس کا سپ لیتی تائشہ نے عینا سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔"

عینا نے چمک کر کہا۔

"اس دن تو بہت پریشان تھی تم، اور اب اتنی اچھی کیسے ہو گئی۔"  
تائشہ کو حیرت ہوئی۔

"ہاں۔ ضیغم بھائی نے بہت مدد کی ہے نا اسکی۔"

بھائی پر زور دیتی ہیر نے بھی حصہ لیا۔

"اوو۔۔"

تو یہ بات ہے۔"

تائشہ نے عینا کو چھیڑا جس پر وہ نفی میں سر ہلاتی خاموشی سے کھانے لگی۔ جب کہ گالوں پر  
گلاب کھلنے لگا تھا، اور آنکھیں جھپک جھپک کر غیر ہوتی حالت کو بمشکل سنبھال رہی تھی۔

"میری جس سے شادی ہونے والی ہے۔ اس نے بھی جھوٹے منہ نہ پوچھا کہ کوئی مدد چاہیے کہ نہیں۔

اور یہاں کسی نے نہ صرف بنا کر دی بلکہ پوری تیار بھی کروائی۔ لیکن ابھی بھی وہی آرجسٹ فریڈز"

ہیر کے چڑ کر کہنے پر تائشہ نے ہنس کر دونوں ہاتھوں سے تالی ماری۔

"مانو یا نہ مانو۔ میں نے جو کہا تھا وہ سو فیصد صحیح کہا تھا۔"

ہنستے ہوئے تائشہ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ڈوب مرو تم دونوں۔"

پلیٹ کو پٹخ کر رکھتی وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

اور اب دونوں اسے مناکم اور مزید چڑا زیادہ رہی تھیں

\*\*\*\*\*

ہیر اور عینا کے جانے کے بعد وہ خود کو کافی حد تک تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ امی کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاتی رہی۔ وقفے وقفے سے اپنی دوستوں کے متعلق بھی انہیں بتاتی رہی۔

دو دن سے مسرت بیگم، تائشہ کی حالت سے کافی پریشان تھیں، نہ وہ یونی جا رہی تھی اور نہ ہی کچھ بتا رہی تھی۔ پر آج وہ بہت حد تک پرانی جیسی ہو گئی تھی۔

ابھہ وہ اسے دیکھ کر بھی سوچ رہی تھیں کہ دروازہ بجا۔ ہاتھ صاف کرتیں وہ دروازہ کھولنے کے لیے باہر گئیں تو پیچھے سے تائشہ نے دہلے ہوئے برتنوں کو سلیقے سے سیٹ کیا اور خود بھی باہر آگئی۔ جہاں اس کی آپا امی کے ساتھ بیٹھی معذرت کر رہی تھی۔

"امی آپ کا فون آیا تو عالیان کی طبعیت بہت خراب تھی۔ آج ہی کچھ بہتر ہوا ہے تو ملنے آگئی۔ کیسی طبعیت ہے اب تشو کی۔"

"میں ٹھیک ہوں آپ، آپ بتائیں عالیان کو کیوں نہیں لائیں ساتھ۔"

ان کے گلے میں بانہیں ڈالے، لاڈ سے بولی کہ وہ فکر مندی سے ہاتھ کی پشت سے اس کا بخار چیک کرنے لگی۔

"وہ اپنی دادی کے پاس ہے... تم ادھر آکر بیٹھو... شکر ہے بخار تو نہیں ہے... تشو، تمہیں امی کا خیال رکھنا چاہیے.... الٹا تم خود بیمار پڑ جاتی ہو۔"

اسے اپنے پاس بٹھاتے وہ ہمیشہ کی طرح سیکھا رہی تھی۔  
انہیں باتیں کرتے دیکھ کر امی اٹھ کر جانے لگیں۔

"ارے آپ کہاں جا رہی ہیں۔"

"تم لوگ بیٹھو میں چائے بنا لاؤں۔"  
وہ کہہ کر پھر سے جانے لگیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو گرمی میں کچن میں جانے کی۔ میں کس لیے ہوں میں بنا دیتی ہوں۔"

انہیں زبردستی بٹھاتی تائشہ بولی۔

"ہاں آپ بیٹھیں مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"  
ان دونوں کو سر جوڑے دیکھ کر وہ کندھے اچکاتے کچن میں چولہے پر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

\*\*\*\*\*

"شیری! میری بات سن لے۔"  
وہ ضیغم کے ساتھ آکر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ شیری جو پہلے سے بیٹھا تھا چہرے پر کرخت تاثرات لائے، اٹھ کر جانے لگا۔

"بول۔"

بیگ کو کندھے پر لٹکائے، لمٹھ مار انداز میں کہا کہ ضیغم نے بمشکل ہنسی دبائی۔

ضامن پچھلے دو دن سے عجیب حالت میں مبتلا تھا، ضیغم تو باآسانی مان چکا تھا لیکن جب عینا نے اس سے خدشہ ظاہر کیا تھا، تو اسکا سارا غصہ ضامن پر ہی نکالا تھا۔

دو دن سے وہ شہریار کو منانے کی کوشش میں تھا پر وہ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔



پر اس سب میں ایک بات اچھی ہوئی تھی کہ لگے ہی دن اکیلے میں وہ سر احسان سے مل چکا تھا۔ اور ان سے معذرت کے ساتھ اس بات کا بھی یقین دلایا تھا کہ اس نے کسی قسم کا مذاق نہیں کیا بلکہ یہ اسکے ساتھ کسی کی طرف سے کیا گیا مذاق تھا۔ وہ بھی بات کو کچھ حد تک سمجھے تھے اور اسے کچھ مارجن دینے کا کہا تھا۔

"تو ایسے کیوں بیہو کر رہا ہے۔"  
 ضامن کے بے بسی سے کہنے پر دونوں نے بیک وقت لب بھیچے کہ کہیں انکی مسکراہٹ سارے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دے۔

"جیسے تجھے تو پتہ نہیں۔"  
 ضیغم نے شہیار کی اس اداکاری پر دل ہی دل میں داد دی۔

"تو اس وجہ سے تو اب مجھ سے بات بھی نہیں کریگا۔"  
 حیرت کی زیادتی سے آنکھیں پھیلائے وہ بولا۔

"کروں گا نا بات پر میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط".

ضیغم کو ایک نظر دیکھ کر شہیار اپنی بات جاری کی.

"شرط یہ ہے کہ تو تالشہ سے اپنی غلطی کی معافی مانگے گا۔ نہ صرف تھپڑ کی بلکہ جو گری ہوئی حرکت تو نے اسے ٹیم سے نکال کر کی اس کی بھی معافی مانگے گا".

"کیا؟"

ضامن حیرت کا مجسمہ بنا اسے تکے گیا.

"کیوں کچھ غلط کہا ہے میں نے؟"

ایک بات یاد رکھ ضامن، میں ہرگز ایک ایسے شخص کے ساتھ دوستی نہیں رکھوں گا جو کسی مظلوم پر ظلم کرے".

شیری نے صاف لال جھنڈی دکھا دی.

"اچھا میں معافی مانگوں گا۔ پر اگر اس نے معاف نہ کیا تو؟"

یہی سوال اسے تنگ کر رہا تھا۔ مداوے کی طور پر ہیر نے جب کل ذکر کیا تھا کہ اس کی پرپرینٹیشن ہے تو اس نے نہ صرف اس کی پرپرینٹیشن بلکہ آسائمنٹ بھی اپنے ہاتھوں سے بنا کر دی تھی۔ کیونکہ اگر وہ پرپرینٹیشن اور آسائمنٹ نہ دے پائی تو ضامن کی گردن پر ایک اور الزام آجائے گا۔

"وہ کردے گی معاف۔"

ضیغم نے اسکی پیٹھ تھپک کر کہا۔ ناچار ضامن کو بھی اب یہ کرنا تھا۔ کوئی جواز تو تھا نہیں انکار کا، ہاں ایک جھجھک یا ہلکی سی انا باقی تھا۔ وہ اس پر قابو پانا جانتا تھا۔

\*\*\*\*\*

ہلکے لیمن رنگ کے کرتے کے ساتھ سفید ٹراورز پہنے، چھوٹے بالوں کو کھلا چھوڑے وہ تیار تھی۔ ایک تبدیلی اختیار ضرور کی تھی اس نے، شیفون کا سفید دوپٹہ ایک کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ جس سے وہ مکمل لڑکی لگ رہی تھی۔ پہلے جو سکارف کو مفلر کی صورت میں گلے پر لپیٹا ہوتا تھا۔ آج شاید امی کا دوپٹہ کندھے پر پھیلا کر ڈالا گیا تھا۔

وہ کسی کے لیے خود کو نہیں بدل رہی تھی، پر یہ ضرورت تھی۔ دوپٹے اس کی ضرورت تھی، اس دن جب کپڑوں کے بھینگنے پر اس کے پاس دوپٹے کی نام پر سکاف بھی نہیں تھا جس سے وہ خود کو ڈھانپ سکتی، تبھی ہیر کی چادر نے اس کی عزت رکھی تھی۔ تالشہ نے طے کیا تھا، مضبوطی اور خود کا سہارا بننا اپنی جگہ لیکن ان بنیادی چیزوں سے انکار کر کے وہ اپنی نسوانیت پر مزید حرف نہیں آنے دے گی۔

"ماشاء اللہ۔"

امی محبت سے اسے دیکھتی، ماتھا چوم کر دوبارہ سے اس کا یہ روپ دیکھ رہی تھیں۔ ایک دوپٹے کی زیادتی نے اسے مکمل بدل دیا تھا۔ اس کے ساگی بھرے حسن کو چار چاند لگ چکے تھے۔

"امی اب میں چلتی ہوں۔"

ان کے ہاتھ کی پشت پر لب رکھتے وہ جانے کو مڑی تھی۔

"اچھا خیر سے جاو۔"

واپسی پر مجھے تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے۔"

انہوں نے مہر کر کہا۔

"ضروری ہے تو ابھی بتادیں۔"

دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھتے وہ بولی۔ دیر تو اسے ہو رہی تھی۔ لیکن ضروری بات سننا بھی ضروری تھا۔

"نہیں نہیں، ابھی تم جاو۔ واپسی پر آرام سے بات کریگے۔"  
ان کے نرمی سے کہنے پر وہ خدا حافظ کہتی گھر سے باہر نکل گئی۔

دل میں سو سو سے غات لگائے بیٹھے تھے۔ ضامن کے غصے کی اسے خبر نہیں تھی کہ اب بھی وہ اسی طرح شدید ہوگا کہ نہیں۔

جب انسان اپنا احتساب کرتا ہے تو پھر خود کی گئی غلطیاں بھی سامنے آتی ہیں جن سے منہ موڑنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اور ایسا ہی کچھ تائشہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اسے بھی اب اپنی غلطی دکھ رہی تھی۔ اور وہ کسی حد تک شرمندہ بھی تھی۔ کیا ہوتا وہ صبر سے کام لے لیتی۔ اور ایسی حرکت نہ کرتی کہ ایک لڑکے سے تھپڑ کھا کر منہ چھپا کر بیٹھنا پڑتا۔

\*\*\*\*\*

"یہ تم ہو تائشہ؟"

آج تو اسے سب مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو اسے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن اب سب کا اشتیاق سے اسے دیکھ کر جانا اور اسے یہ کہنا کہ بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ یہ سننا اسکے لیے نیا تھا۔ خوبصورت تھی وہ لیکن آج تک خوبصورتی کبھی اس کی ترجیحات میں سے نہ تھی۔ آج سب کا رک رک کر اسے دیکھ کر آنکھوں میں ستائش لے آنا، اس کی مسرت کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اس بدلاؤ سے وہ کچھ دن پہلے کی ہر بات بھول چکی تھی۔

"ہیر تم تو ایسا نہ کہو۔"

جھینپ کر اسے جواب دیتی وہ گھاس پر پاؤں پھسار کے بیٹھ گئی۔

"یار.. مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے، یہ تم ہو۔"

اپنے چہرے کو ہاتھ کے پیالے پر رکھتی، اشتیاق سے گویا ہوئی۔

ہیر آج دو لیکچر چھوڑ کر یونی آئی تھی۔ پریزنٹیشن کے وقت بھی صرف عینا، تائشہ کے ساتھ تھی۔ وہ اب اسے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کر رہی تھی۔ عینا اور ایسی کئی لڑکیاں دو گھنٹے سے حیران ہی ہو رہی تھیں۔

"اف۔ اب اتنا بھی اوور ریکٹ نہ کرو۔ صرف ایک دوپٹہ ہی تو لیا ہے۔" تائشہ کو بھی اب یہ کچھ زیادہ ہی لگا تھا، خفیف سے لہجے میں کہا۔

"مجھے تو لگ رہا ہے تم پوری کی پوری بدل گئی ہو۔" عینا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور عینا کی بات کی تائید ہیر نے بھی کی۔ جس پر تائشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"یار پریزنٹیشن دے کر تو میرا گلا سوکھ چکا ہے۔ کنٹین چلیں۔"

"لو جی میں تو آئی ہی گھر سے ہوں۔ لیکن چلو تم کہتی ہو تو چلے چلتے ہیں۔" کنٹین کی بات ہو اور ہیر انکار کر دے۔ ذرا مشکل ہی تھا۔ اور اس کا یوں احسان جتلا کر چلنے والا انداز، تائشہ نے تاسف سے سر جھٹکا۔

\*\*\*\*\*

"یہ تشوہ ہے؟"

کنٹین میں وہ تینوں ہی بیٹھے تھے۔ ضامن کے مان جانے پر کہ وہ معافی مانگے گا۔ شہیار نے اس سے بات چیت تو شروع کر دی تھی پر بات پہ بات طعنے مارنے سے باز نہیں آیا تھا۔ ابھی بھی وہ اسی متعلق بات کر رہے تھے کہ شہیار جو کنٹین کے دروازے کی طرف رخ کیے بیٹھا تھا حیران ہوتا آنکھیں انٹرنس پر جمائے پوچھنے لگا یا بتانے لگا یہ فیصلہ مشکل تھا۔

"کون؟"

ضیغم اور ضامن یک زبان بول کر پلٹے تو انکی حالت بھی شہیار سے مختلف نہ تھی۔ تالشہ ہیر کی طرح ہی دوپٹے کو پھیلا کر شانوں پر ڈالے، کرتے اور ٹراوزر میں ملبوس کافی مختلف لگ رہی تھی۔ اور چھوٹے بالوں میں ایسا روپ اسے کافی عجیب بھی بنا رہا تھا۔ پر ضامن کا دل اسے اچھے والا عجیب کہہ رہا تھا۔



وہیں قسمت بھی منہ پہ ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی کہ ضامن کے دل کو اور کتنی ہی عجیب چیزیں اچھی لگنے والی تھیں۔

"یہ اسے کیا ہو گیا؟"

ضیغم کے منہ سے پھسلا تھا۔ ایک چیز کی زیادتی یا کمی کبھی کبھی بہت بڑا بدلاؤ لے آتی ہے۔ ایسا ہی حال تائشہ کا بھی تھا۔

شہریار نے ضیغم کے سوال پر اثبات میں سر ہلایا جب کہ ضامن نے اس سوال پر نظریں چرائیں۔ آخر کو اس تبدیلی کی وجہ وہ اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا۔ بے شک یہ تبدیلی بہت بھلی تھی پر جس انداز اور اطوار کے ذریعے آئی تھی وہ تکلیف دہ تھا۔

"چل بیٹا، تیار ہو جا معافی مانگنے کے لیے۔"

تائشہ ہیر اور عینا، شروع کی ایک میز کے گرد لگی تین کرسیوں پر بیٹھ چکی تھیں۔ تو شہریار نے بھی نظریں سامنے سے ہٹا کر ضامن کے چہرے پر مرکوز کیں۔

کچہ دیر جھکے سر کے ساتھ بیٹھا وہ ہمت جمع کر رہا تھا۔ لبوں کو بھیچنے، ہاتھ کی مٹھی بنا کر میز کی سطح پر رکھی ہوئی تھی۔ گردن کی رگیں تن چکی تھیں۔ جو بظاہر دیکھنے والوں کو لگ رہا تھا کہ وہ شاید غصہ پینے کی کوشش کر رہا ہے۔

جھٹکے سے کرسی سے اٹھتا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے سر پہ کھڑا تھا۔

"یہ مروائے گا پتہ نہیں کیا کرنے گیا ہے۔"

ہر بڑا ہٹ میں اٹھتے وہ بھی اس کے پیچھے ہی تھے۔

کنٹین میں رش کافی حد تک کم تھا، کچھ سٹوڈنٹس ہی تھے جو کونوں میں بیٹھے ہوئے اپنے کاموں میں لگن تھے۔

"مجھے کچہ بات کرنی ہے۔"

اپنی پیٹھ کے پیچھے کسی کے آکر کھڑے ہونے پر تالش نے گردن گھما کر دیکھا تو ضامن سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ تالش کے دیکھتے ہی ضامن نے ٹہرے ہوئے لہجے میں بات کی۔

اس کی موجودگی ہی تائشہ کے لیے کافی تکلیف دہ تھی۔ وہ کیسے یہاں موجود ہو سکتا تھا۔ تمھڑ مار کر وہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی کا بدلا تو لے چکا تھا۔ اب کیا رہ گیا تھا۔ یا پھر اب سب کے سامنے وہ یہ بدلا لینا چاہتا تھا۔ خوف کے سائے، تائشہ کے دل میں ابھرنے لگے تھے۔

"مجھے نہیں کرنی بات۔"

بے اعتنائی برتتے، اسے دیکھنے سے اجتناب کیا اور گردن واپس گھما کر عینا اور ہیر کی جانب دیکھنے لگی۔

"میری ایک دفعہ بات سن لو...."

"میں نے کہہ دیا نا کہ نہیں سننی بات، آپ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ دوسری بار بھی تمھڑ مارنا چاہتے ہیں۔ آخر چاہتے کیا ہیں؟"

ضامن کی بات درمیان سے ہی اچک کر وہ تیکھے لہجے اور دہیمے انداز میں بولتی بولتی، آخر میں تیز آواز میں چُخ کر بولی۔

اپنی چیزیں سمیٹتی وہ عینا اور ہیر کی بھی پرواہ کیے بغیر ضامن کے سامنے سے کتراتی کنٹین سے باہر چلی گئی۔

ضامن اسکے ہاتھ میں اپنی فائل پر نظریں جمائے اس کی پشت دیکھتا رہا جب تک کہ وہ باہر نہیں چلی گئی۔

"نکل آ مراقبے سے۔"

اسے دروازے کی طرف نظریں جمائے دیکھ کر ضیغم نے کندھا ہلا کر کہا تو وہ بھی نادام سا چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ سے کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔"  
ہیر غصے سے ناک کے نتھنے پھلا کر آنکھوں کو سکیرے گھور کر شہریار کو دیکھتی، پیر پٹخ کر عینا کو ساتھ لیے چلی گئی۔

شہریار نے اس کے انداز پر ماتھا مسلا۔

"کچھ نہ کرنا ڈھنگ سے۔"

ہیر کا غصہ الٹا ضامن پر اتارتے وہ بولا تو ضامن کو پتنگے ہی لگ گئے۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

چخ کر کہا، لیکن سب کی نظریں اپنے پر پڑتی دیکھ کر وہ آہستہ آواز میں بات جاری رکھنے لگا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ معافی مانگنے تو گیا تھا۔ آگے سے اس نے سنی ہی نہیں۔"

"ہاں تم جو کہتے رہو گے، بات کرنی ہے، بات کرنی ہے۔ تو وہ کہے گی کہ ہاں ضامن میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ آگے کر لو بات۔ معافی مانگنے کا بولا تھا، بات کرنے کو نہیں کہا تھا۔"

شہریار اس کی نقل اتارتا تپ کے بولا۔ اس سب کے دوران ضعیف خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

"تو اور کیا کہتا؟"

ایک منٹ یہ تو اتنا لال پیلا کیوں ہو رہا۔ او۔۔

تو اب سمجھا، یہ معافی کا آئیڈیا کہاں سے آتا آتا آیا ہے۔"

چڑ کر اس سے سوال کیا اور پھر خود ہی اسکا جواب دے ڈالا کہ شہریار نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"تو ایک کام کر،"

ضیغم سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

"کیا؟"

اس کے اچانک سے بولنے پر ضامن اور شہریار اکھٹے متوجہ ہوئے۔

"دیکھ تو نے آسائنٹ بنا کر دی اور پریزنٹیشن بھی بنا کر دی۔ ویری گڈ بہت اچھا کیا۔ لیکن اگر اسکے ساتھ ساتھ تم ایک اور کام کر دیتے ہو تو آئی ایم نائی پرسنٹ شیور کہ وہ نہ صرف تمہاری سنے گی بلکہ معاف بھی کر دے گی۔"

ٹھر ٹھر کر دونوں کے چہروں پر نظریں جمائے وہ اپنی بات مکمل کر کے اب دونوں طرف سے جواب کا منتظر تھا۔

"بول پھر کیا کام کرنا ہے؟"

یہ ضرور کرے گا۔"

شہریار نے اتنے یقین سے کہا کہ ضامن بھی مہنوئیں اکڑائے، اسے دیکھنے لگا۔

"یار یہ بہت رُسکی کام ہے، اگر کسی ٹپھر کو خبر ہوگئی یا کسی اور کو بھی کہ یہ میں نے کیا ہے۔ مجھے پہلی فرصت میں فارغ کریں گے۔"

ضیغم کا آئیڈیا سن کے جہاں شہیار نے ہاں کا سگنل دیا تھا وہیں ضامن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

"یہ پہلے سوچنا چاہیے تھا نا جب وہ حرکت کی تھی۔"

شہیار نے آج اسے طعنوں پر چھلنی چھلنی کر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"تو تجھ سے کس نے کہا، کہ تو اپنا نام لے۔ ایک دفعہ ٹرائے تو کر۔"

ضیغم کے نئے مشورہ پر بیچاگی سے دونوں کو دیکھا۔

"اللہ کا نام لے کر کر دے۔"

شہیار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے کہا۔

"تیری محبت کی خاطر میں بلی کا بکرا بن رہا ہوں۔"

ضامن نے جلے دل سے جتلاتے ہوئے کہا۔ بات بھی صحیح تھی، شہریار کے اسرار پر ہی وہ معافی مانگ رہا تھا۔ اور اب یہ نیا مداوا بھی!

"ہاں، تمھیں میں نے مارا تھا نا؟"  
آنکھیں سکیرے گھورتے ہوئے کہا کہ ضامن نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"پوری زندگی اب یہی طعنے دیتے رہنا۔"  
کرسی پرے کھسکاتے، وہ ان دونوں پر ایک نظر ڈال کر باہر بکل گیا۔ ارادہ ضعیف کے بتائے گئے پلان پر عمل کرنے کا تھا۔

\*\*\*\*\*

"یار تم مجھ سے منہ پھلا کر کیوں بیٹھی ہو۔ ضامن گیا تو تھا تائشہ سے بات کرنے۔"  
شہریار ہیر کا راستہ روکے اسے کب سے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پر وہ تھی کہ ماننے کو ہی نہیں آرہی تھی۔



"تو مانگی معافی؟ نہیں نا۔"

ہیر نے بگڑ کر کہا۔

"وہ بیچارہ معافی مانگنے تو لگا تھا۔ تائشہ ہی اٹھ کر چلی گئی۔"

وہ دونوں طرف سے بچ میں پس رہا تھا۔ یہاں ہیر اس کی نہیں سن رہی تھی، اور وہاں ضامن نے ابھی تک کچھ نہیں کیا تھا۔

"وہ بیچارہ..."

واہ وہ بیچارہ ہو گیا اور میری دوست اس کا کیا۔ وہ جائے بھاڑ میں؟  
ہاتھ نچا نچا کر غصے سے اسے دیکھتی گویا ہوئی کہ شہریار نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"دیکھو، کیا ہم کچھ دیر کے لیے ان دونوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے۔"  
شہریار نے بچ کی راہ تلاش کی۔ صحیح بھی تھا، وہ اس لڑائی میں خود کا رشتہ کیوں خراب کریں۔

"نہیں۔"

اور آپ بھی فیصلہ کر لیں آپ میرا ساتھ دیں گے یا اپنے دوست کا۔"

ہیر نے سخت لہجے میں پوچھ کر اسے دیکھا جو بے بسی سے کمر پر ہاتھ رکھے اسے سن رہا تھا۔

"ہیر تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟

دیکھو تم چاہتی تھی کہ ضامن نے جو جو تالشہ کے ساتھ کیا وہ اس سے معافی مانگے تو میں یقین دلاتا ہوں وہ معافی مانگے گا۔ اب پلیز یہ بے جا کی ضد چھوڑو۔"

شہریار کی بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"تو ٹھیک ہے جب وہ معافی مانگ لے تو میں بھی بھائی کو ہاں کرنے کو کہہ دوں گی۔"

ہیر نے بھی اپنی شرط دہرائی۔

اس کے بھائیوں کو شہریار پسند آیا تھا۔ اور اب وہ باقاعدہ رشتہ طے کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ پر ہیر نے انہیں جواب پہنچانے سے روک رکھا تھا۔ اس چھ مہینے کے عرصے میں تالشہ اور عینا اس کے لیے بہنوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ اور ضامن کی حرکت کے بعد اس نے صاف لفظوں میں شہریار سے کہہ دیا تھا کہ ضامن سے کہو کہ وہ تالشہ سے معافی مانگے۔ ہیر کے ہی کہنے پر ضامن نے تالشہ کے لیے آسائمنٹ اور پریزنٹیشن تیار کی تھی۔ ضامن خود بھی شرمندہ تھا

تبھی بغیر چوں چراں کے یہ کام کر دیا۔ اور اب وہ چاہتی تھی کہ ضامن تائشہ سے معافی مانگے تاکہ اسے بھی احساس ہو کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

"ہیر، تم ہمارا رشتہ جو ابھی بنا بھی نہیں ہے اس میں دوسروں کو بیچ میں لا رہی ہو۔"  
وہ جھنجھلا کر بولا۔

"ہاں لا رہی ہوں اور لاتی رہونگی۔ کیونکہ وہ دوسرے کوئی اور نہیں میری دوستیں ہیں۔"  
گردن کو جنبش دیے وہ ضد سے کہتی چلی گئی۔  
پیچھے وہ اپنا دکھتا سر ہاتھوں میں جکڑ کے رہ گیا۔

\*\*\*\*\*

تپتی دوپہر میں سورج اپنے جوہن پر تھا۔ اسلام آباد کا موسم بہت بے ایمان رہتا تھا۔ پر کچھ دنوں سے گرمی کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یونی کی سبز گھاس بھی کہیں کہیں سے سوکھ چکی تھی۔

تقریباً سب اسٹوڈنٹس ہی سایہ دار جھاڑی یا پھر راہداری کی اوٹ میں ٹانگیں پھسارے بیٹھے تھے۔

ان میں عینا بھی آنکھوں پر گول چشمے کو لٹکائے سامنے سایہ دار درخت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اکیلی ہی اس طرف بیٹھی تھی۔ تالشہ اور ہیر دونوں اچانک سے کہیں غائب ہو گئی تھیں۔

"او ہوں۔"

مصنوعی گلا کہنہار نے کی آواز نکالتے ضیغم اسکے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آواز پر چونک کر ساتھ کھڑے ضیغم کو دیکھا تو پھر سے وہی عجیب سا احساس حصار میں لیے ہوئے تھے۔ ہر طرح کے احساس سے نظریں چراتے جگہ چھوڑ کر ضیغم کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

"تھینک یو۔"

کچھ سوچ رہی تھی؟

پاؤں لٹکا کر راہداری کے ایک سرے پر بیٹھتا وہ بولا۔

"ہمم۔"

پھر سے سامنے دیکھتی وہ پاؤں جھلا رہی تھی۔ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو فرش پر لٹکائے ہوئے تھی۔

"اچھا۔ تو کیا سوچ رہی تھی۔"

ہاتھ سینے پر باندھے وہ تھوڑا اس کی اور جھک کر بولا کہ عینا بے ساختہ تھوڑا سا پیچھے کو کھسکی۔ اس اچانک افتاد پر وہ سانس روکے بیٹھی رہی جب تک وہ چہرہ پیچھے کو نہ لے گیا۔

"ک۔۔ کچھ خاص نہیں۔"

بے کلی میں اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑسنے لگی تو کبھی چشمے کو بار بار ہاتھ کی ہتھیلی جما کر ٹکانے لگی۔

"سوچ تو سوچ ہوتی ہے، عام یا خاص کا اندازہ تو سن کر ہوگا۔"  
وہی نرم لہجہ جسے سننے کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

"مجھے ایک کنفیوژن ہے۔"

وہ اپنی ہر مشکل تائشہ یا ہیر سے کہنے لگی تھی اور کبھی کبھی ضیغ بھی اسکی پریشانیاں حل کر دیتا تھا۔ لیکن یہ پریشانی نہ ہی تائشہ حل کر سکتی تھی نہ ہیر کیونکہ دونوں ہی اس موضوع پر ہتے سے اکھڑ جاتی تھیں۔

"تو بتاؤ کیا کنفیوژن ہے۔"

شرٹ کے بازو کہنیوں تک فولڈ کرتا وہ مصروف سا بولا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے پہلے انسان غلطی کرتا ہے اور پھر معافی مانگنے لگ جاتا۔ وہ غلطی کرے ہی نہ۔"

اپنی الجھن اس کے سامنے رکھتی وہ بڑی معصومیت سے مشورہ بھی دے گئی۔  
ضیغم اس کے سوال پر مسکرایا، وہ ضامن کے بارے میں ہی بات کر رہی تھی۔

"جب انسان غصے میں ہوتا ہے تو اس کی سوچنے، سمجھنے کی ساری حسیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور بس وہ غصے میں غلطی کر دیتا ہے۔ لیکن جب غصہ اترتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کر دی ہے۔ اور اسے معافی مانگنی چاہیے۔ ضامن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔"

تھم سے اسے سمجھاتے وہ آخر میں اسے جتلا چکا تھا کہ وہ جانتا ہے یہ ضامن کی وجہ سے ہی آیا گیا سوال ہے۔

وہ جو بڑے غور سے ضیغم کی باتیں سن رہی تھی۔ اور اس سے اتفاق بھی رکھتی تھی۔ آخری جملے پر مہنویں سکڑیں۔

"ضامن بھائی کی توبات نہیں کر رہی، میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔"  
گردن موڑ کر پھر سامنے دیکھنے لگی۔

"او! اچھا"

ضیغم نے زور دے کر کہا۔

"آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے۔"

وہ نخل سی ہوئی۔ پھر معصومیت سے سوال کر ڈالا۔  
آنکھیں بڑی کیے کچھ حیرت کچھ پریشانی سے دانت سے لب کچلتے وہ اسے دیکھ کر معصوم سا  
سوال کرتے ہوئے اتنی دلچسپ لگی کہ ضیغم کا قہقہہ مچوٹا۔

"مجھے تمہارے بارے میں سب پتہ چل جاتا ہے۔"

گہری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیے ہنسی روکتا وہ الگ دہن میں کہہ اٹھا۔  
عینا کو ایک لمحے کو لگا کہ ضیغم کی آنکھوں نے اس سے کچھ کہا ہے۔ اس کا یوں دیکھنا دل کو  
دھڑکانے لگا تبھی ڈر کر اس نے نظریں پھیر دیں۔ وہ اس کی غلط فہمی بھی تو ہو سکتا ہے۔

"وہ تو مجھے صرف ایک چھوٹی بچی سمجھتے ہیں۔ تبھی تو میری بات سن کر جواب دیتے ہیں۔ تائشہ بھی نہ کچھ بھی بولتی رہتی ہے۔"

سر جھٹکتے سوچوں کو بھی جھٹکتی وہ ضیغم سے ہمیشہ کی طرح ڈھیروں چھوٹے موٹے سوال کرنے لگی۔ اور ضیغم بغیر ماتھے پر کوئی شکن لائے اس کے جواب دینے لگا۔ اسے اچھا لگتا تھا عینا کے ساتھ بیٹھنا، اس سے باتیں کرنا۔ اور خاص کر جب وہ اکیلی ہو اور وہ اس سے اپنی ڈھیروں باتیں کرے۔ اس کا عینا کو توجہ دینا، اس کے ساتھ رہنا۔ کئی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ کچھ بہت بڑی قیاس آرائیاں کیے بیٹھے تھے۔ اور جس کے بارے میں کر رہے تھے وہ بیچاری خود ابھی تک کشمکش کا شکار تھی۔

\*\*\*\*\*

"تائشہ کیا تم اگلے سال بھی ٹیم کا حصہ بنو گی۔"

تائشہ نے آنکھیں پھیلا کر اپنے سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا جس نے پہلے اسے ٹیم سے نکالا تھا، اب یوں اچانک آکر کہنا۔ کچھ تو عجیب تھا۔

"ہاں۔۔"



نہیں میرا مطلب ہے کیوں؟

ہاں یا نہ میں جواب دینے سے پہلے وجہ جاننا زیادہ اہم تھا۔

"ضامن بتا رہے تھے کہ اس دن تمہیں کسی نے دہکا دیا تھا۔ اس وجہ سے تم سامنے والی سے جا ٹکرائی، اور اس طرح گیم سے باہر ہو گئی۔"

اس نے جواب دیا۔

"میں بھی غالباً تب ان سے یہی کہہ رہی تھی۔"

چھبتی نظروں سے دیکھتے وہ خود سے مخاطب تھی۔

"انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ مجھے دہکا کس نے اور کیوں دیا؟"

پھر جانچتی نظروں سے دیکھتی وہ پوچھنے لگی۔

"ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ غلطی سے کسی کا دہکا لگا تھا۔ دراصل انہوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت وہ بھی میچ دیکھ رہے تھے اور انہوں نے کسی اور کو دہکا لگاتے دیکھا تھا۔ پر وہ کون تھی یہ نہیں پتہ۔"

"کتنا اچھے سے شیشے میں اتارا ہے اسے۔"  
تائشہ نے نخوت سے ہونٹ سکیڑے اور کڑ کر سوچا۔

"تو ابھی بھی تمہارے پاس آفر ہے۔ تم جوائن کر سکتی ہو بلکہ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں وائس کیپٹن بنا دوں، بہت اچھا کھیلتی ہو تم۔"  
ضامن کے آکر بڑی دلچسپی کے ساتھ اس سے بات کرنے پر اور اس کی گیم کے متعلق کچھ تعریفیں کر کے وہ تائشہ کو کھلوانے کی اہمیت، کہ وہ بہت اچھا کھیلتی، ٹیم کو مزید بہت فائدہ ہوگا وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی کہا کہ اس کو ٹیم سے نہیں نکالنے چاہیے تھا۔ یہ تو جھٹ سے مان گئی۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ ضامن نے اس کا میچ دیکھا اور بہت غور سے دیکھا تھا۔  
"شیور۔"

تائشہ نے جواباً نرمی سے ہاں کہی۔ آخر کو بنا قصور کے نکالی گئی تھی اور اب جب موقع چل کر آیا تھا تو وہ انکار کیوں کرتی؟ چاہے کیسے بھی آیا ہو۔

پر وہ ابھی بھی حیران تھی کہ ضامن نے یہ اچھائی کیوں دکھائی؟ اس کے پیچھے پھر کوئی چال ہے۔ یا...؟

اور اگلی سوچ کافی ناممکن تھی۔ پر کبھی ایسی ناممکن چیزیں بہت جلدی سامنے آ بھی جاتی ہیں۔

\*\*\*\*\*

کتاب کے ورق پھنکے کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے، اور سامنے بیٹھی تائشہ کسی اور جہاں میں کھوئی ہوئی تھی۔

ضامن کا اس کے حق میں بولنا، اسے ٹیم میں جگہ دلوانا۔ واقع ہی حیران کن تھا۔ اور جب اس نے ہیر سے اس متعلق بات کی، تو اس نے جو خبر دی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔ آخر انسان اتنی جلدی اپنا آپ کیسے بدل سکتا ہے۔ پہلے تو اس کا بس نہ چلتا تھا، اسے پوری دنیا کے سامنے ذلیل کرے اور اب اس کے لیے پریزنٹیشن، آسائمنٹ بنا کر دینا اور تو اور اس کے لیے ٹیم کی کیپٹن سے بات بھی کرنا۔

ہیر کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ہر غلطی کا مداوا کر رہا ہے۔ اور معافی مانگنا چاہتا ہے۔ پر تائشہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ضامن اور اپنی غلطی کی معافی مانگے!

پر یہ اتنا ناممکن بھی نہیں تھا، جب وہ خود کو پڑے تھپڑ کو فراموش کر کے خاموشی اختیار کر سکتی تھی جو اسکا شیوا نہ رہا تھا۔ تو ضامن کیوں نہیں۔  
اندر ایک جنگ چھڑی تھی، کبھی یقین آ رہا تھا تو کبھی یہ چال معلوم ہو رہی تھی۔

"آجائیں"

دروازے پر ہوئی دستک پر تمام سوچوں کو جھٹک کر، امی کو اندر آنے کا کہا۔

"سونے تو نہیں لگی تھی؟"  
کتاب کو سائیڈ پر رکھتی وہ انہیں دیکھنے لگی۔ اور ان کے سوال پر نہ میں سر ہلایا۔

"آپ بتائیں کچھ کام تھا؟"  
محبت سے انکے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"ہاں۔ ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

اس کے ہاتھوں میں موجود اپنے ہاتھوں سے دباؤ بڑھا کر شفقت سے کہا۔

"تو کہیں نا".

"تائشہ تم جانتی ہو اب صرف ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ اور میرے سر پر صرف ایک فرض ہی باقی ہے۔ جسے میں جلد از جلد چکانا چاہتی ہوں۔"

مہر مہر کر وہ کہہ رہی تھیں۔ تائشہ الجھ گئی۔

"کیسا فرض امی؟"

تائشہ کے سوال پر وہ اس کا چہرہ محبت سے اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولیں۔

"تمہاری شادی کا فرض۔"

"امی"

وہ بے یقینی سے انہیں پکار کر رہ گئی۔

"تمہاری آپا کل آئی تھی۔ وہ اپنے سسرال سے ایک رشتہ لے کر آئی ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ اچھا کماتا ہے۔ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ تمہاری بہن کو بھی بہت پسند ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ جلد از جلد رشتہ مانگنے آنا چاہتے ہیں۔"

وہ کہے جارہی تھیں۔ اور اس کے کانوں میں یہ الفاظ سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی شادی، یہ خیال ہی فی الحال فضول تھا کجا کہ اس پر عمل کرنا۔

"مجھے یہی کہنا تھا کہ کچھ دنوں تک انہیں بلا لیتی ہوں۔ تمہارے فرض سے سبکدوش ہو کر آرام سے مر سکوں گی۔"

وہ اسکے سر پر ہاتھ پھیرتیں یاسدیت سے بولیں۔

"امی!"

وہ تڑپ کر ان کے سینے سے جا لگی۔

"امی مجھے شادی نہیں کرنی، پلیز آپ آپا کو منع کر دیں مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤنگی۔"

وہ آنسو بہاتے انکے ساتھ لگی کہے جارہی تھی۔

"ہٹ پگلی، دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ نہیں کرنی شادی۔

بھلا کیوں نہیں کرنی شادی؟"

اسے خود سے دور کرتی وہ ڈانٹنے کے انداز میں سوال کرنے لگیں۔

اور وہ سوس سوس کرتی، آنسو بہائے جارہی تھی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میری ابھی پڑھائی رہتی ہے۔ میں ایسے کیسے شادی کر سکتی ہوں۔"

آنسو صاف کرتی وہ انہیں قائل کرنے لگی۔

"تو میں کون سا تمہیں کل بیاہ رہی ہوں۔ ایک دو سال تو لگ ہی جائینگے۔ تب تک کر لینا اپنی پڑھائی پوری۔"

وہ تو سارا پلان پہلے سے ہی بنائے بیٹھی تھیں۔

"میں ایک دو سال تک بھی نہیں کرنا چاہتی۔"

سنجیگی سے کہتی وہ ان سے رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

"تو کب کرنی ہے؟"

انکے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

"ایم بی اے سے پہلے ہرگز نہیں۔"

ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی، وہ پھر سے کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

"ایسا کرنا۔ تم میرے مرنے کے بعد کر لینا شادی۔"

وہ اندوہ گیں لہجے میں کہتیں، اٹھ کر چلی گئیں۔

پیچھے وہ سر ہاتھوں میں گرائے نئی فکروں میں گرفتار ہو گئی۔

\*\*\*\*\*

ایک دن چھوڑ کر وہ آج یونی آئی تھی۔ کل کا پورا دن کمرے میں قید رہی تھی۔ کھانا کھانے صرف

باہر نکلتی اور پھر سے کمرے میں بند ہو جاتی۔ امی نے بھی رات کے بعد سے اس سے کوئی

بات نہیں کی تھی۔ آج بھی وہ بغیر ناشتہ کیے یونی آگئی تھی یہ بھی خاموش احتجاج کا حصہ تھا۔



"تائشہ"۔

ضامن نے اسے پہلی بار نام سے پکارا تھا۔ تھوڑا عجیب تھا، پر اب تو ایسے عجیب اتفاق ہونے باقی تھے۔

وہ کل پورا دن اسکا انتظار کرتا رہا تھا۔ پر تائشہ یونی آئی ہی نہیں آج اسکے آتے ہی وہ آپہنچا تھا۔

"وہ میں۔۔"

ایک چوٹی مجھے تم سے۔۔"

آج اسے معلوم ہوا تھا کہ غلطی کرنا آسان ہے، پر انا مار کر معافی مانگنا بہت مشکل۔

تائشہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔ یعنی وہ سچ میں معافی مانگنے آیا تھا۔ ہیر جو کہہ رہی تھی وہ سچ تھا۔ نقشہ کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ جھلک دکھلا کر مدہم ہوئی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ ذہنی اذیت میں مبتلا تھی، لیکن آج جیسے دماغ میں جلتے شعلوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑنے لگے تھے۔

ضامن کا قصہ اب ایک نیا پینڈورا باکس کھول چکا تھا۔

"آپ نے جو پریزنٹیشن مجھے بنا کر دی اور میری ٹیم میں انٹری کروائی۔ وہی بہت ہے۔"  
وہ رسان سے بولی، لہجہ حد درجہ اجنبی رکھا تھا۔

اب دشمنی کا قصہ وہ اپنے ہاتھوں سے تمام کر چکی تھی اور دوستی جیسے تعلق کا امکان ہی نہیں تھا تو ایسا لہجہ فطری تھا۔

"اس لیے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔"  
اجنبی نرمی سے مزید کہا۔

اب جب وہ اتنا سب کچھ کر چکا تھا۔ تو لفظوں سے معافی منگوانا اسے صحیح نہیں لگا۔ وہ غلطی مان چکا تھا اور مداوا بھی کر چکا تھا۔ یہی بہت تھا۔ وہ خود بھی تو اس قصے کو یہیں دفن کر دینا چاہتی تھی، تو خواہ مخواہ کا بات بگاڑنا اسے اچھا نہ لگا۔

ضامن اس کی بات سن کر جہاں خوش ہوا تھا وہاں حیران بھی تھا کہ یہ لڑکی کافی سلجھے انداز میں اور سلجھی ہوئی باتیں بھی کر سکتی تھی۔ اپنی سوچ پر ہلکے سے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

"لیکن میں سچ میں شرمندہ ہوں۔ بس تمہیں نیچا دکھانے کے چکروں میں لگا رہا۔ اور آخر میں اپنی ساری تربیت بھول کر وہ حرکت کر بیٹھا۔ میں وہ نہیں کرنا چاہتا تھا، بس غصے میں.... میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔"

مُہر مُہر کر لفظ ادا کرتا وہ نظریں جھکا کر بولا۔ اور تائشہ کے دل میں جو غبار اور کدورت باقی بھی تھی وہ بھی چھٹ گئی۔

اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا کسی دوسرے کے دل سے اپنے لیے بدگمانیاں نکالنا، بس ایک انا مٹا کر صفائی ہی تو دینی ہوتی ہے۔ پر بہت کم لوگ ہی یہ انا مار پاتے ہیں۔

"اُس اوکے۔"

وہ دہیمے سے بولی تھی۔

"ایک اور بات بھی کرنی تھی۔"

وہ جانے کو پلٹی ہی تھی کہ ضامن کے کہنے پر رک گئی۔

"اب کیا کہنے والا ہے یہ۔"

تائشہ نے سوچا۔ لیکن کہا صرف۔  
"جی!"

"وہ تم ہیر کو بتا دینا کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔"  
ضامن نے کہا۔

تائشہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی آخر کو اس بات کا مطلب کیا ہے۔ اور پھر سمجھ آنے پر وہ آنکھیں  
پھیلائے اسے دیکھنے لگی۔

"معافی مانگنے کو آپ سے ہیر نے کہا تھا؟"  
تائشہ نے جھٹ سے سوال کیا۔

"ایکپوٹلی میں بھی معافی مانگنے ہی والا تھا۔ لیکن ہیر نے بھی شہریار سے کہا کہ میں تم سے  
معافی مانگوں گا تبھی وہ شہریار سے شادی کرے گی۔"  
ضامن نے ساری بات اسے کہہ دی۔

"کیا؟"

وہ پاگل ہے۔"

حیرت کی زیادتی سے وہ بولی وہ ضامن نے کندھے اچکائے۔

"تمہاری دوست ہے۔"

ہنستے ہوئے وہ بولا تو تالشہ اس کے طنز پر اپنا اجنبی رویہ دکھاتی بنا کچھ کسے پلٹ گئی۔  
ضامن کو اسکا یہ نیا اجنبی انداز شدید کھلاتھا، پھر وہ بھی بے اعتنائی دکھاتا کندھے اچکا گیا۔

\*\*\*\*\*

"ہیر رکو۔"

وہ کلاس میں جارہی تھی جب ضامن کی اس پر نظر پڑی اور اسے رکنے کا کہا۔  
وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہاری دوست سے مانگ لی ہے، معافی!"

اب میرے دوست کو مزید تنگ کرنے سے گریز کرو ہیر جی۔"

وہ دوستانہ لہجے میں مسکراتا ہوا بولا۔

ہیر بھی مسکرا دی۔

"ابھی سے پریکٹس کروا رہی ہوں نا۔"  
گردن اکڑا کر کہتی وہ ہنسی تھی۔

"ظلم نہ کرو اس معصوم پر۔ بلکہ شکر کیا کرو۔"  
ضامن مسکراتے ہوئے اسے ہمیشہ کی طرح چھیڑ رہا تھا۔  
ہیر نے نفی میں سر ہلایا اس انسان کو کوئی خاص ہی ہیر ہے۔

"اسے چھوڑیں آپ یہ بتائیں کہ یہ معافی پکی والی ہی ہے نا۔"  
انگلی اس کے سامنے کیے، سنجیگی کے ساتھ پوچھنے لگی۔

"اور کوئی کچی معافی بھی ہوتی ہے کیا۔"  
آنکھیں سکیر کر اس نے سوال کیا۔

"ہو بھی سکتی ہے۔ پر ایک بات یاد رکھیے گا۔ اگر آپ نے میری دوست کو پھر کچھ کہا نا تو..."  
 کندھے اچکا کر وہ تنبیہ کرنے لگی۔  
 ضامن نے ہاتھ جوڑ کر اسکی بات کاٹی۔

"یہ دیکھو میرے جڑے ہوئے ہاتھ۔ میری توبہ اگر تمہاری دوست کو کچھ کہا تو۔ لیکن میرے  
 بیچارے دوست پر ظلم کرنا بند کر دو ہیر جی۔"  
 وہ چڑ کر کہتا آخر میں ہنستا ہوا اسے بھی چڑا گیا۔  
 اور ہیر منہ بنا کر پیر پختی وہاں سے چلی گئی۔

"اللہ میرے دوست پر رحم کرنا۔"

ہاتھ اوپر کو اٹھائے وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا۔ اور پھر ہنستا ہوا چل دیا۔  
 آج سارے بوجھ اتر گئے تھے۔ اور وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

ہیر اور شہریار کی بات پکی ہو چکی تھی۔ ایک مہینے بعد ان دونوں کا نکاح طے پایا تھا۔  
ہیر کی اماں منگنی کی رسم کے حق میں نہ تھیں۔ اور گھر میں یہی طے پایا تھا کہ ان دونوں کی  
شادی شہریار کے پیپرز کے بعد رکھی جائے گی۔ پر شہریار کی ضد تھی کہ منگنی نہیں تو نکاح ہی  
کر دیں۔

شہریار کی بات مان لی گئی تھی۔ اب تو اس کے پیر زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ ضامن کا وہ  
کتنی دفع شکریہ ادا کر چکا تھا کہ ضامن نے ہاتھ جوڑ کر اس سے بس کر جانے کو کہہ دیا  
تھا۔ شکریہ کرنا بنتا بھی تھا، اگر ضامن نہ مانتا تو ہیر کے تیور دیکھ کر لگ رہا تھا وہ ہرگز ہاں، نہیں  
کے گی۔

اب دونوں گھروں میں نکاح کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ ہیر نے تو ڈیزائیر وئیر کی مانگ کی  
تھی۔ اور وہ شہریار ہی کیا جو ہیر کی خواہش پوری نہ کرے۔  
ضامن اور ضعیفم اسے ابھی سے زن مرید کے طعنے دینے لگے تھے۔ اور اسے نہ پہلے ان کی فکر  
تھی اور نہ اب، ہیر کی ہر خواہش وہ پوری کرنا اپنے اوپر فرض سمجھتا تھا۔ اور ہیر اپنے تمام تر  
ارمان اپنے نکاح پر پورا کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری سمجھ رہی تھی۔



\*\*\*\*\*

ہفتے بھر سے یونی کی کافی ٹف روٹین چل رہی تھی۔ شہریار تو اپنے نکاح کی خوشی میں یونی میں ٹکتا ہی نہیں تھا۔ اور اگر یونی میں آتا بھی تو ہیر کی موجودگی میں وہ زیادہ تر اسی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور اس کے حصے کا کام بھی ضیغم اور ضامن مل کر کر دیتے تھے۔

آج بھی رات دیر تک نوٹس بنا کر وہ دو گھنٹے پہلے ہی سویا تھا۔ اور اب مسلسل فون کی بجتی رنگ سے اس کی نیند میں سلوٹ پڑی تھی۔ بند آنکھوں سے ہی اندھیرے میں موبائل تلاش کرنے لگا۔ کال پک کرتا وہ لیمپ آن کرچکا تھا۔

"السلام علیکم!"

اماں سائیں۔"

سپیکر سے آتی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھتا بولا۔

"وعلیکم السلام میرے بچے!"

کیسے ہو؟"

شفقت بھری آواز سپیکر سے آئی۔

"اللہ کا شکر بالکل ٹھیک۔ آپ سنائیں۔ بابا سائیں کیسے ہیں؟ سنبل جان کیسی ہے؟" آنکھیں مسلتا وہ اب پاؤں لٹکائے بیڈ پر بیٹھا تھا۔

"سب بالکل ٹھیک ہیں۔ تم بتاؤ کہاں غائب ہو جو کافی عرصے تمہارا فون ہی نہیں آیا، یہاں تک کہ ہمارے فون کا بھی جواب نہیں دیتے۔" ان کی شفقت بھری آواز اب طنز کی آمیزش لیے ہوئے تھی۔ پر وہ ابھی بھی نیند کے خمار میں تھا تبھی سمجھ نہ سکا۔

"اماں سائیں یہیں تھا۔ آخری سمسٹر ہے تو زیادہ وقت یونی میں ہی ہوتا ہوں۔" فون کان سے لگائے وہ دروازہ کھول کر باہر دیکھا جہاں کا کا کچن میں موجود شاید اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہے تھے۔

"ضیغم سائیں، کیا چل رہا ہے وہاں؟" اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیے وہ تیکھے لہجے میں بولیں۔

"کیا چل رہا ہے اماں؟"  
کنپٹی سہلاتا وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"شکیل بتا رہا تھا کہ کسی لڑکی کا معاملہ ہے۔"  
وہ تفتیشی انداز میں بولتیں اس کی نیند کا خمار اتار گئی تھیں۔

"کیا!"  
کاکا نے آپ سے کہا؟"  
وہ حیران تھا آخر کو کاکا کو کیسے معلوم ہوا۔

"تم یہ بتاؤ کیا کر رہے ہو وہاں۔"  
سخت آواز میں پوچھے گئے سوال پر ضیغم نے سر کو جھکایا۔

"اماں سائیں کچھ نہیں کر رہا وہاں۔ آپ بتائیں کاکا نے آپ سے کیا کہا ہے۔"

وہ بڑے قدم اٹھاتا کچن میں موجود کاکا کہ سر پر آپہنچا اور انہیں گھورتے ہوئے اماں سائیں سے پوچھنے لگا۔

شکیل کاکا نے بات سنتے ہی خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"ضیغم! ہمیں سچ سچ بتاؤ وہاں کیا چل رہا ہے۔ تمہیں پتہ ہے اگر سائیں جی کو تمہاری اس حرکت کا پتہ چلے گا تو وہ کتنا غصہ ہوں گے۔" وہ اسے خبردار کر رہی تھیں۔

"اماں سائیں میں منالوں گا انہیں۔ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔" وہ کاکا کو سخت نظریں دکھاتا کچن سے باہر نکلتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولتا، شکیل کاکا کی کہی بات کی تصدیق کر گیا۔

"نہ ضیغم سائیں، یہ تمہاری شہر جا کر پڑھنے کی بات نہیں ہے۔ یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے۔ اور سائیں جی برادری سے باہر ہرگز تمہاری شادی نہیں کریں گے۔" انہوں نے لمحوں میں اس کی امید توڑ دی۔

"اماں سائیں۔ آپ میرا ساتھ دینگی تو میں منا لوں گا۔"

وہ زور دیتا بولا۔

"دیکھو میرے بچے، ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاو۔ اور چھوڑ دو اسے، مجھ سے تو کسی قسم کی امید مت رکھنا۔"

وہ سختی سے حقیقت دکھاتیں، فون کاٹ چکی تھیں۔

اور صیغہ فون کان سے ہٹائے اسے گھورنے لگا۔  
اور اب کا کا کی خیر نہیں تھی۔ پہلے ہی عینا کے بچنے اور نا سمجھی کی وجہ سے وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا، اوپر سے گھر میں اماں سائیں کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ کا کا نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اماں سائیں کو اس بارے میں خبر دی تھی۔ اگر بابا سائیں کے کانوں تک بات پہنچ جاتی تو نیا طوفان اس کے سر آکھڑا ہوتا۔

\*\*\*\*\*

"السلام علیکم!"

ہیر بات کر رہی ہوں۔"

ان کے نکاح کو صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ہیر کا پسند کیا گیا نکاح کا جوڑا بھی دو دن تک مل جانا تھا۔ تمام تیاریاں تقریباً ہو ہی چکی تھیں۔ بس چھوٹی موٹی چیزوں کے لیے بازار کے چکر اب بھی لگ رہے تھے۔

"زبے نصیب!

جانتا ہوں۔ آپ کا نمبر سیو ہے۔"

مسکراتے ہوئے، محبت کے خمار میں ڈوبی آواز سے کہا کہ ہیر نے شرما کر آنکھیں میچیں۔

"وہ مجھے ناآپ سے بات کرنی تھی۔"

ہیر نے بڑے چاہ سے کہا۔

"کیسے۔ آپ کی ہی تو سننی ہے ساری عمر۔"

وہی دل فریب، بیٹھا سا لہجہ جو ہیر کا دل دہڑکا دیتا تھا۔ جب سے نکاح کی تاریخ طے ہوئی تھی وہ ایسے ہی جملے کہہ کر اسے لاجواب کر دیتا تھا۔

"وہ آپ مجھے نکاح پر کیا دے رہے ہیں؟"  
ہیر کے جملے پر بالوں میں برش کرتے ہاتھ رکے تھے۔

"کیوں۔ کچھ دینا ہے کیا؟"  
وہ لاعلم تھا تبھی پوچھا۔

"آپ کو نہیں پتہ کیا۔"  
ہیر کی صدمے بھری آواز اسپیکر میں گونجی۔

"نہیں مجھے پتہ ہے۔ پر وہ تو شادی پر دیتے ہیں نامنہ دکھائی وغیرہ..."  
نکاح پر بھی دیتے ہیں کیا؟۔

اپنے مطابق اسے جو پتہ تھا، بتاتے ہوئے آخر میں الجھ کر سوال کیا۔

"آپ کتنے....!"

خیر چھوڑیں۔"

وہ غصے سے کچھ کہنے ہی لگی تھی پر رک کر کچھ سوچتے ہوئے پرسکون آواز میں بولی۔

"آپ مجھے..

ہمم.. ڈامنڈ کی رنگ دے دیجئے گا نکاح پر۔"

"ڈامنڈ؟

جیولری تو تمہیں دی ہے نا۔"

اس کی مانگ اور وہ بھی ڈامنڈ رنگ۔ شریار کچھ سوچ کر بولا۔

"ہاں تو وہ سسرال کی طرف سے ہے نا۔ اور آپ کی طرف سے بھی تو مجھے گفٹ ملنا چاہیے کہ نہیں۔"

وہ اسے سمجھانے لگی۔ البتہ شریار مزید الجھ گیا۔

"یار میں کہاں سے ڈامنڈ کی رنگ لاؤنگا؟ میں تو خود ابھی ابو کے پیسے پر پل رہا ہوں۔"

بے بسی سے کہتا وہ اسکے جواب کا منتظر تھا۔



"ہائے اور ہا!"

ایک ڈائمنڈ رنگ کا ہی تو کہا ہے۔ سارے ہیرو اپنی دلسنوں کو نکاح کے بعد اپنے ہاتھوں سے ڈائمنڈ کی مہنگی مہنگی رنگ پہناتے ہیں۔ اور ایک آپ ہیں کہ...  
ابھی سے ہی کنجوسی دکھا رہے ہیں۔"

دانت پیس کر وہ غصے کا شدید اظہار کر رہی تھی۔

"کنجوسی نہیں دکھا رہا۔ ہیر میں تو بس..."

"مجھے کچھ نہیں سننا، آپ مجھے گفٹ میں رنگ دیں گے یا نہیں یہ بتائیں۔"  
اس کی بات کاٹتی وہ قطعیت سے سوال کر گئی۔

"ایک تو میری اماں نے منگنی نہیں رکھنے دی، چلو منگنی کی آنکھوٹی سمجھ کر ہی دے دینا۔"  
اس کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ دکھ سے بولتی، آخر میں منت پر اتر آئی تھی۔  
اس کے انداز پر شہریار کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی یہی ادائیں، جو دراصل میں  
ڈرامے بازیاں تھیں۔ اس پر ہی تو مرٹنے لگا تھا۔ اور اب بھی وہ مان چکا تھا۔

"اوکے ڈن۔

اور کچھ۔"

شہریار نے محبت سے کہا۔

"نہیں ابھی بس اتنا ہی اگر اور کچھ ہوا تو بتاؤنگی۔"

اس کی آواز میں خوشی صاف چھلک رہی تھی۔ یہ کہہ کر وہ تو فون کاٹ گئی۔ اور شہریار وہ بیچارہ فون کی چمکتی سکرین کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

"نہ پیار نہ محبت بس اپنی سنا کر فون بند کر دیا، کیا بنے گا تیرا شہریار؟"  
سوچوں کو جھٹکتے وہ ہیر کی ایک نئی فرمائش پوری کرنے کے لیے نکل پڑا۔

\*\*\*\*\*

دن تیز تیز گزرے جارہے تھے یہاں تک کہ گرمی کی سختی ہلکی ہلکی نرمی میں بدل رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوتی بارش کی بوچھاڑ سے گرمی کی جگہ خوشگوار موسم نے لے لی تھی۔

آج بھی بادلوں کا ریلا آہستہ آہستہ سے سرکتا ہوا مغرب سے اٹھ کر مشرق کی جانب جا رہا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ لیکن لگ ایسا رہا تھا جیسے شام ڈہل چکی ہو۔ اسٹوڈنٹس بھی دہیرے دہیرے گھروں کو روانہ ہو رہے تھے۔ صرف وہ رہ گئے تھے جن کی کلاس ابھی ہونا باقی تھی۔  
تائشہ اور عینا کی کلاس بھی ختم ہو چکی تھی۔ ہیر کا دو دن بعد نکاح تھا۔ وہ اور شہریار دونوں ہی آج یونی نہیں آئے تھے۔

"سنو لڑکی۔"

تائشہ اور عینا پارکنگ کی طرف جا رہی تھیں۔ تبھی منہا نے پیچھے سے پکارا تھا۔

"میں۔"

عینا نے اپنی طرف انگلی کیے وہ پوچھ رہی تھی۔

"تم ہی سے ہوں۔ ایڈمن آفس میں بلایا ہے تمہیں۔ کوئی ڈاکو منٹس کا کام ہے۔"  
اکھڑے لہجے میں کہہ کر وہ چلی گئی۔

عینا اور منہا کا جب بھی ٹاکرا ہوتا تھا وہ اسی طرح نخوت اور بیزاریت کا اظہار کرتی تھی۔ پر کیوں یہ عینا کی سمجھ سے باہر تھا۔ سر جھٹک کر وہ تائشہ کی طرف پلٹی۔

"چلو گی میرے ساتھ".

اب تو اکیلی بھی چلی جاتی تھی، لیکن اس موسم میں ساتھی چاہیے ہی تھا سہارے کے لیے۔

"یار تم چلی جاؤ میں بہت تھک گئی ہوں۔ پارکنگ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں".

تالشہ نے سستی سے کہا تو عینا بھی سمجھتی سر ہلا کر واپس ایڈمن آفس کی طرف چل دی۔

\*\*\*\*\*

آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ عینا کو لینے بھی آچکے تھے۔ آج لیٹ کلاس سے فارغ ہونے کی وجہ سے تالشہ نے عینا کے ساتھ ہی جانا تھا وہ کب سے اسکا انتظار کر رہی تھی۔ پر وہ آکے نہیں دے رہی تھی۔

بیگ اٹھا کر وہ خود بھی سست قدموں کے ساتھ ایڈمن آفس کی طرف چل دی۔

راستے میں بھی وہ اسے ڈھونڈتی رہی پر وہ کہیں نہیں تھی۔

اور جب ایڈمن آفس پہنچی تو وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

بدحواس سی ادھر ادھر بھی دیکھا وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔

"ضی.. ضیغم بھائی.. وہ.. وہ عینا نہیں مل رہی".  
 ہر راستے پر دیکھ کر اس کی نظر ضیغم اور ضامن پر پڑی تو بھاگ کر ان کے پاس پہنچی.

"مل نہیں رہی... کہاں گئی؟".

ضیغم کے ماتھے پر سلوٹیں پڑیں. ضامن بھی تائشہ کی بدحواسی پر کچھ پریشان ہوا۔

"وہ منہا آپی۔۔ منہا آپی نے آکر کہا کہ اسے ایڈمن آفس میں بلایا ہے۔ پر اب اسے دیکھنے گئی ہوں تو وہ کہیں بھی نہیں ملی مجھے".  
 منہ پر ہاتھ پھیرتے، وہ بدحواسی کا شکار تھی.

"منہا نے..

تم نے اسے اکیلا ہی کیوں چھوڑا".

وہ سختی سے کہتا دوڑتے ہوئے ایڈمن کی طرف جا رہا تھا. اچانک سے دماغ میں کچھ کلک ہوا تو اپنے پیچھے آتی تائشہ سے رک کر پوچھا.

"منہا کہاں ہے؟"

اس کی تیز آواز پر تائشہ نے سمتے ہوئے اشارہ کیا۔

"وہاں۔ اس طرف گئی تھیں۔"

اور یہ سنتے ہی ضامن اور ضیغم دوڑے۔ اب وہ منہا کے سر پر جا پہنچے۔

وہ کنٹین میں موجود تھی۔ باہر تیز ہوائیں اور بادل کی گرج کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے بجلی بھی کرک رہی تھی۔ کافی اسٹوڈنٹس موسم کی خرابی کے باعث کنٹین میں ہی جمع تھے۔

"عینا کہاں ہے؟"

دھاڑ کر پوچھا کہ سب کی نظریں بچ و بچ بیٹھی منہا اور اس کے سر پر کھڑے ضیغم پر پڑیں۔

"کون عینا؟ مجھے کیا پتہ کہاں ہے۔"

بالوں کو جھٹکتی، اس کی دھاڑ کو نظر انداز کرتی بولی۔

"تم نے عینا کو ایڈمن بھیجا تھا نا اب کہاں ہے وہ؟"

اب کی بار وہ پہلے سے بھی تیز آواز میں دھاڑا کہ اس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ منہا بدک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا مطلب ہے کہ میں نے بھیجا تھا۔ میں وہیں تھی تو سر نے مجھے عینا کو بلانے کو کہا تھا۔ میں نے تو بس بلایا تھا۔"

منہا بھی اب تیز آواز میں ہر لحاظ بھلا کر بولی۔

"تم تو..."

"کیا؟"

ہاں!۔

پیچھے ہو کر بات کر۔"

ضیغم ابھی آگے بڑھ کر اسے کچھ کہتا اس سے پہلے ہی داؤد نے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔

وہ ابھی کنٹین میں داخل ہوا تھا کہ ضیغم اور منہا کو ایک دوسرے کے سامنے دیکھ کر انکی طرف ہی آگیا۔

"تو بچ میں نہ آ..

میں اس سے بات کر رہا ہوں"۔

انگلی اٹھا کر اسے پیچھے رہنے کا کہتے وہ سختی سے گویا ہوا۔

عینا مل نہیں رہی تھی۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا۔ اوپر سے مہنا کچھ بتا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ غصے اور اضطرابی کیفیت کا شکار تھا۔

"تو مہنا سے ایسے بات نہیں کر سکتا"۔

داؤد بھی اسی سخت لہجے میں انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تو ضیغم نے سر جھٹکا۔

"دیکھ اس سے پوچھو۔ عینا کہاں ہے"۔

بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ اضطراب کم کرنے کے جتن کرتا۔ کچھ حد تک نرمی سے بولا۔

"عینا!۔۔

وہی چشمش جو تمہارے ساتھ ہوتی ہے"۔



ذہن پر زور دیتے وہ کہنے لگا تو ضیغم نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا۔

"اسے تو میں نے کلاس روم میں جاتے دیکھا تھا، لیفٹ سائیڈ پر پہلی کلاس میں جارہی تھی وہ۔" داؤد سوچتے ہوئے بتا رہا تھا۔ اور یہ سنتے ہی ضیغم باہر کی طرف دوڑ گیا۔

باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک اب بھی جاری تھی۔

"Are you ok?"

ان کے جاتے ہی اس نے منہا سے کہا۔

وہ جو ضیغم کی عینا کے لیے بے چینی دیکھ کر اداس ہوئی تھی۔ داؤد کی اپنے لیے حملیت پر وہ حیران ہوئی۔ وہ تو اسے ایک بزدل شخص سمجھتی تھی۔ پر آج وہ اس کے لیے ضیغم کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہوں۔"

نظریں داؤد کی طرف موڑتی وہ دہیمے لہجے میں بولی۔

”اگر۔“

وہ کہہ کر اسی کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اور اس سے پھر سے وہی ہنسی مذاق شروع کر دیا تھا۔ جس سے پہلے وہ چڑتی تھی۔

آج وہ خاموشی سے اس کی سنی جا رہی تھی۔ اور داؤد بغیر اس بات کا اثر لیے کہے جا رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

وہ بارش میں بھگتا، بھاگ کر ایڈمن کے ساتھ ہی موجود بلڈنگ کے ہر کلاس روم میں جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اور آخری سرے پہ ہی ایک کلاس روم کے اندر عینا کانوں پر ہاتھ رکھے آنکھیں میچیں سکڑی سی بیٹھی تھی۔

”یہاں کیا کر رہی ہو تم۔“

کلائی سے پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کرتے وہ درشتی سے بولا۔ عینا جو پہلے خوف سے آنکھوں میں نمکین پانی لیے رونے کے در پہ تھی۔ اب آنسو ڈھلک کر گالوں پر بہہ گئے۔

"ضیغم آرام سے۔"

تائشہ نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا تو وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگ گئی۔  
ضامن نے بھی اسے پرسکون رہنے کا کہا۔ پر کچھ دیر پہلے کی اذیت وہ بھولا نہیں تھا۔ اور منہا پر  
نکالنے والا سارا غصہ اب وہ اس معصوم پر نکالنے جا رہا تھا۔

"میں نے پوچھا، یہاں کیا کر رہی تھی؟"

اس کی دھاڑ پر وہ ڈر کر مزید تائشہ میں بھیج گئی۔ تائشہ نے بھی مکمل اسے اپنے حصار میں لے  
لیا تھا۔

"سن نہیں رہا تمہیں۔"

وہ غرایا تھا۔ عینا کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ باہر بادل کے کڑکنے کی آواز اور اندر ضیغم کا  
گر جتنا اسے سہما رہا تھا۔

اسے تائشہ کے حصار سے جھٹکا دے کر باہر نکالتا وہ اس کی نم آنکھوں میں اپنی سخت تاثر لیے  
آنکھیں گاڑتا جواب مانگ رہا تھا۔

"تم ایڈمن گئی تھی تو یہاں کیا کر رہی ہو۔ تمہیں پتہ ہے اتنی سی دیر میں ہم کتنا پریشان ہو گئے تھے۔ کوئی عقل ہے تم میں یا نہیں۔"

ضیغم کے لہجے اور لفظوں میں ہی نہیں اس کی گرفت میں بھی سختی تھی کہ درد کی شدت سے عینا نے آنکھیں میچ لیں۔ خوف الگ تھا، ضیغم کا یہ رویہ اسے مزید سمہا رہا تھا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی کہ ضیغم نے سختی سے ہاتھ میں پکڑی اس کی کلائی کو جھٹکا دیا کہ وہ ڈہلک کر اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔

ضیغم، جس کے چہرے پر صرف نرمی اور شائستگی ہوتی تھی جو ہمیشہ اس سے آرام اور تحمل سے بات کرتا تھا جیسے وہ ایک چھوٹی بچی ہو۔ آج اس کا اتنا سخت رویہ دیکھ کر عینا کا دل پسچ گیا۔ انسان کی سائیکی ہی یہی ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جو ہمیشہ سے برا بھلا کہتا ہو، اس کی باتوں کی کڑواہٹ اتنی اذیت ناک نہیں ہوتی۔ جتنی اس شخص کی سختی اذیت دیتی ہے، جو پہلے ہمیشہ شائستگی برتنا ہو۔

اور اب تو ضیغم نے چپکے سے اس کے دل کا موسم ہی بدل دیا۔ اور اب اس طرح کا رویہ عینا کے دل کو ڈبو رہا تھا وہ بے آواز رونے لگی تھی۔ بجلی کی گرج چمک ابھی بھی ویسی ہی تھی۔ پر ضیغم کے برسنے پر وہ زیادہ سہمی ہوئی تھی۔

"وہ.. میں.. بارش.."

اٹک اٹک کر بے ربط الفاظ ادا کرتی وہ پھر ہچکی بھر کر رونے لگی۔

"ضیغم چھوڑ اسے معصوم ہے بچاری ڈر گئی ہوگی۔ باہر بادل بھی تو بہت گرج رہے ہیں۔" ضامن نے اس کی گرفت سے عینا کی کلائی چھڑائی۔ جسے ضیغم نے زور کا جھٹکا دے کر چھوڑا۔ تائشہ نے آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا۔ ورنہ جتنی زور سے ضیغم نے جھٹکا دیا تھا وہ ڈیسک سے جا ٹکراتی۔

"معصوم نہیں یہ بے وقوفانہ حرکت ہے۔ کیا کہتے بادل تمہیں؟ کھا جاتے؟"

تم تائشہ کے پاس بھی جاسکتی تھی۔ تمہیں پتہ تھا موسم خراب ہے تو تائشہ کے بغیر مت جاتی۔ یوں چھپ کر بیٹھنے سے کچھ اندازہ ہے مجھ پر کیا بیٹی ہے۔ کم عقل لڑکی۔ دماغ کہاں تھا تمہارا؟"

ضیغم کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس پر چلائے جا رہا تھا۔ اور عینا کا رونا اس کے ہر جملے پر تیز ہوتا جا رہا تھا۔

"بھائی میں خود اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اس میں عینا کی غلطی نہیں ہے۔"  
تائشہ نے ڈرتے ڈرتے بتایا تو ضیغم نے دونوں پر سخت نظر ڈال کر سر جھٹکا۔

"اسے کہو، یہ رونا دھونا بند کرے اور گھر جائے۔"

ہاتھ کے اشارے سے باہر کا راستہ دکھاتے تائشہ سے کہا۔

تائشہ بھی اسے اپنے ساتھ لگائے، باہر لے گئی۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ گھنٹے سے ڈرائیور  
باہر انتظار کر رہا تھا۔

"ضئی۔۔"

غصہ تھوک دے۔ وہ ٹھیک ہے۔"

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ تسلی دینے لگا۔

"عقل نہیں ہے اس میں۔"

بے دردی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکتا، وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔  
پیچھے ضامن سر میں ہاتھ مار کے رہ گیا۔

اتنا تو طے تھا کہ ضیغم نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ زخم جلدی  
بھرے گا یا ساری عمر اپنا نشان چھوڑ کر ہی جائے گا۔

\*\*\*\*\*

پہلے ہی کچھ دنوں سے روز اماں سائیں کا فون آرہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی لڑکی ہے اسے بھول  
جائے۔ اور شکیل کا کالگ اسے سمجھانے کے درپہ تھے کہ شہر کی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں، ویسی  
ہوتی ہیں۔

اب وہ کوئی اچھا موقع دیکھ کر عینا کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ پر وہ موقع تھا کہ اسے  
مل ہی نہیں رہا تھا۔ خود بھی پریشان تھا کہ اگر عینا نے نارمل ریکٹ نہ کیا تو اس ساری کشمکش  
میں وہ شدید ذہنی بے سکونی کا شکار ہو چکا تھا۔ اور پھر عینا کا یوں غائب ہو جانا۔ یک دم ہی سارا  
دباؤ لاوا بن کر عینا پر پھوٹ پڑا تھا۔

"کیا ضرورت تھی اس پاگل لڑکی کو، یوں چھپ کر بیٹھنے کی۔ کیسے خیال آرہے تھے۔  
عجیب پاگل پن ہے۔"

ابھی بھی وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اسے عینا کایوں ڈر کر دبک کر بیٹھنا سخت ناگوار لگا تھا۔

اصل بات یہ تھی یا پھر وہ ڈر، عینا کو کھو دینے کا ڈر۔ جواب اس کے مل جانے پر غصے میں بدل چکا تھا۔

بارش تھم چکی تھی وہ اب بھی مکمل بھیکا ہوا یونی کے گراؤنڈ میں کھڑا تھا۔ جہاں سے عینا اور تائشہ اسے گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے نظر آئیں۔ منہ پر پڑے پانی کے قطرے صاف کرتا وہ بھی اسی سمت چل دیا۔

\*\*\*\*\*

مریم بیگم آدھے گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہی تھیں باہر تیز بارش بھی اب تھم چکی تھی پر وہ نہیں لوٹی تھی۔ وہ اس کے ڈر کو باخوبی جانتی تھیں۔ وہ تو کسی کی تیز آواز بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اور بادل کی گرج برس تو اس کے اوسان خطا کر دیتی تھی۔ وہ کبھی بارش کے موسم میں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی لیکن جب سے اسلام آباد آئی تھی وہ کافی حد تک پرانی عادتیں

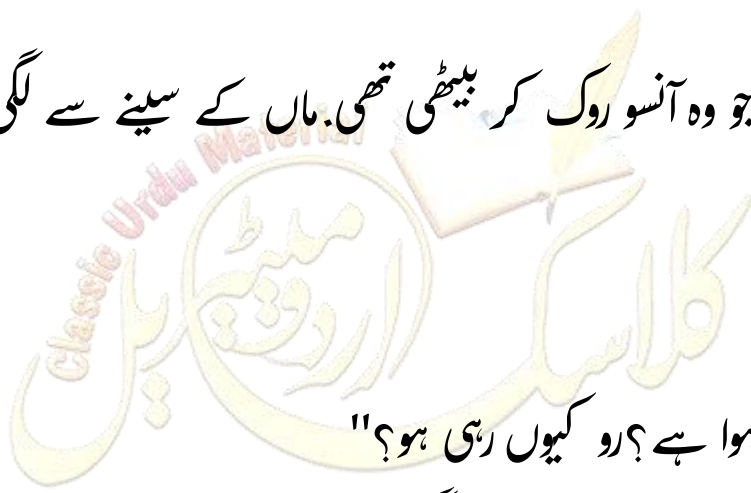


چھوڑ چکی تھی۔ ہر کسی سے ڈرنا اور گم سم رہنا بھی کافی حد تک کم کر چکی تھی۔ لیکن کچھ ڈر اپنا اثر اندر تک اتار دیتے ہیں کہ ان سے رہائی حاصل کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔

"مما۔"

مریم بیگم دروازے کے پاس کھڑی اس کا انتظار ہی کر رہی تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ بھاگ کر ان سے لپٹی۔

اور تائشہ کے کہنے پر جو وہ آنسو روک کر بیٹھی تھی۔ ماں کے سینے سے لگی پھر سے زار و قطار رونے لگی۔



"عینا میری جان۔ کیا ہوا ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟"

اسے خود سے لپٹائے وہ کمرے میں لے گئیں۔

کچھ گیلے سوکھے، بکھرے سے بال تھے۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کے آنسو صاف کرتیں وہ پچکار کر اس سے رونے کی وجہ پوچھنے لگیں۔ پر اس کا رونا کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔



"اما".

عینا نے دکھ سے پکارا

"جی میری جان!

ڈر گئی ہو کیا میں نے تو منع بھی کیا تھا۔ آج نہ جاو یونی موسم خراب ہے، دیکھو اب کیا حالت بنا کر آئی ہو۔ اچھا چپ کرو۔ میں تمہارے ابو کو بلاتی ہوں۔"

وہ اسکے چہرے سے چپکے بالوں کو ہٹا کر انہیں سہلاتی نرمی سے بول رہی تھیں۔ اور وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی۔

رونا ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ ضیغم کی بے اعتنائی اور اس کے غصے پر آ رہا تھا۔ کیا ہو جاتا اگر وہ اسے پہلے کی طرح نرمی سے سمجھا دیتا۔ شاید اس کا ڈر بھی ختم ہو جاتا۔ لیکن اس نے کتنی سختی سے بات کی تھی۔ ذرا خیال نہیں آیا تھا اسے کہ وہ اس کی دوست ہے۔

"جھوٹ کہتی ہے تشو۔ بالکل جھوٹ کہتی ہے۔"

زہن میں گردش کرتے تائشہ کے جملوں پر نفی میں سر ہلاتے سوچا۔

"عینا! میری جان، رونا تو بند کرو۔ کیا ہو گیا ہے بچے؟ تم مجھے ڈرا رہی ہو۔ تمہارے ابو آئیں گے تو مجھ پر غصہ ہوں گے۔"

وہ اسے چپ رہنے کا کہہ کر رحیم صاحب کو فون کرنے کے لیے گئی تھیں۔ اور اب واپس آئیں تو وہ پھر سے بری طرح رو رہی تھی۔ ان کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ لوگ جب سے اسلام آباد آئے تھے وہ پہلی بار اتنا ڈری تھی۔

\*\*\*\*\*

"السلام علیکم آیا!"

وہ شام میں کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اور گھر کے لاونج میں ہی امی اور آپا دونوں کو سر جوڑے دیکھ کر وہ ان کے پاس ہی آگئی۔

"وعلیکم السلام۔ ادھر آؤ نا۔"

آپا کے بلاتے ہی، امی نے ناراضگی سے منہ موڑ لیا۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں امی کو تنگ کیا ہوا ہے؟"

ان کے کہنے پر ایک نظر امی کو دیکھا جن کا رخ چاہے دوسری طرف تھا پر کان اس کی طرف ہی متوجہ تھے۔

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ امی ہی کو بہت جلدی ہے۔ مجھے گھر سے نکالنے کی۔" وہ بھی نروٹھے پن سے کہتی امی کو ہی دیکھنے لگی۔

"مجھے کوئی جلدی نہیں ہے سمجھی۔ پر تمہاری چار سال تک شادی نہ کرنے کی ضد بے معنی ہے۔ کوئی بھی اتنا انتظار نہیں کرے گا۔ پھر بیٹھی رہنا میرے پلو سے لگ کے۔" بولتے ہوئے ان کا سانس پھول گیا۔ تائشہ نے انکی پیٹھ تھکی اور محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"امی کوئی تو ہوگا، جو چار سال کے بعد بھی مل جائے گا۔" تائشہ کی بات پر غصے سے اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ خفگی سے دیکھنے لگیں۔

"ایک بار رشتہ دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ تمہاری مامی بھی پچھلے ہفتے ایک رشتہ بتا کر گئی ہیں۔ جو اچھا رہے گا اسی سے تمہاری شادی کر دوں گی"

وہ کچھ نرم پڑتی اسے بھی قائل کرنے کے لیے بولیں۔

"ہاں ایسا کچھ گاکہ میری لاش سے کروا دینا شادی۔ کیونکہ میرے جیتے جی تو یہ ہونے سے رہا۔"

ان کی تجویز پر ہتھ سے اکھڑتی پیر پٹخ کر کچن میں چلی گئی۔

"سمجھاؤ اسے کچھ، اسی عمر میں اپنے گھر کی ہو جائے گی تو مجھے بھی سکھ مل جائے گا۔"  
وہ اونچی آواز میں بظاہر آپا سے کہتیں، تالشہ کو سنانے لگی تھیں۔

اور تالشہ ان کی بات کو سرے سے نظر انداز کیے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ جیسے اس سے ضروری کچھ نہ ہو۔

\*\*\*\*\*

"کیا ہوا ہے عینا کو؟"

رحیم صاحب آفس میں تھے جب مریم بیگم کی کال پر سب چھوڑ چھاڑ کر وہ گھر دوڑے چلے آئے۔

مریم بیگم عینا کی پیٹھ تھپکتیں، اپنے ساتھ لگائے چپ کروانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ رحیم صاحب کے آتے ہی انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

"پتہ نہیں رحیم لگتا ہے بارش سے ڈر گئی ہے۔"  
وہ کہہ کر انکے لیے جگہ بنانے لگیں۔

"بابا۔"

انہیں اپنے قریب آتا دیکھ کر ماں کی آغوش سے نکلتے ان کے سینے سے جا لگی اور مزید اونچا اونچا رونے لگی۔

"میرا بچہ کیا ہوا ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟"

انکے پوچھنے پر نفی میں سر ہلاتی وہ روئے جا رہی تھی

رحیم صاحب کا دل مزید ڈوبنے لگا۔ کتنے عرصے سے وہ عینا کی طرف سے مطمئن تھے۔ وہ اسلام آباد آکر خوش تھی، پہلے کی طرح بات بات پر روتی نہیں تھی۔ اپنی یونی کی باتیں آکر ان سے کرتی تھی اور گھنٹوں بیٹھ کر باپ بیٹی کھلکھلاتے رہتے تھے۔ رحیم صاحب بھی اسے زیادہ وقت دینے لگے تھے یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ کافی حد تک نارمل ہوئی تھی۔ اور اب اچانک سے اتنا شدید رونا ڈالا تھا کہ رحیم صاحب اور مریم بیگم کے گھبراہٹ میں ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

کافی کوششوں کے بعد وہ چپ ہوئی تو اس کا سر اپنی گود میں رکھے وہ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے پوچھنے لگے۔

"مجھے یونی نہیں جانا۔"

وہ اب جا کہ بولی بھی تو کیا۔  
مریم بیگم کی مھنویں اکڑی تھیں۔

"کیا مطلب، یونی نہیں جانا؟"

وہ مریم بیگم کی اونچی آواز پر سمٹی۔

"بابا".

چہرہ اوپر کیے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھتی دکھ سے بولی.

رحیم صاحب نے سخت نظروں سے مریم بیگم کو دیکھتے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی اشارہ سمجھتی کمرے سے ہی باہر نکل گئی۔ وہ تو اس لڑکی کی روز کی نئی فرمائش پر خاصی چڑچکی تھیں۔

"اب بتاؤ کیا ہوا ہے۔ کیوں نہیں جانا یونی۔"

اسبکا سرگود سے اٹھا کر اپنے سامنے بٹھاتے پیار سے بولے۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟"

اس کی مسلسل خاموشی کے پیش نظر انہوں نے خود سے ہی بات جاری رکھی۔

آنکھیں صاف کرتی وہ نہ میں سر ہلا کر انہی کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔



"تو پھر یونی کیوں نہیں جانا؟"  
اس کے سر کو تھپکتے وہ بولے۔

"پاپا مجھے یہاں نہیں رہنا، گھر چلتے ہیں بابا۔"  
ان کے کندھے سے سر اٹھاتی وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"پر بیٹا کچھ پتہ تو چلے ناکہ ہوا کیا ہے۔"  
اس کی بات کو نظر انداز کیے وہ زور دیتے بولے تو عینا نے پھر سے جاموشی اختیار کر لی۔

"تمہیں اچانک سے کیا ہوا ہے؟ پہلے لاہور سے یہاں آگئی اور اب یہاں سے گھر جانے کی ضد  
باندھ لی ہے۔"

مریم بیگم اس کے لیے سوپ لے آئی تھیں اور اندر داخل ہوتے عینا کا جملہ سن چکی تھیں۔  
وہ کڑے تیور لیے کہ گور کر بولیں۔

"بابا، دیکھ رہے ہیں اپنی بیوی کو۔ مجھے کیسے ڈانٹ رہی ہیں۔"  
وہ پھر سے اپنا ضبط کھوتی ان کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی تھی۔

"عینا".

وہ صدمے سے اسے پکار کر رہ گئی.

"مریم کیوں تنگ کر رہی ہو اسے".

عینا کی حالت کو دیکھتے وہ سختی سے انہیں ٹوک گئے.

"رحیم آپ ہی اسے خراب کر رہے ہیں۔ یہ جو کہتی جائے گی ہم کرتے جائینگے؟ ہر سات آٹھ مہینوں کے بعد گھر چیلنج کرتے رہیں؟ اور تو کوئی کام کرنے کو رہ نہیں گیا۔ اور یونی نہیں جائے گی تو آگے کی پڑبائی کیسے کرے گی۔"

مریم بیگم اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اب عینا کے جواب کی منتظر تھی جو باپ کی آغوش پا کر مسلسل سسکیوں میں رو رہی تھی۔ اور رحیم صاحب اسے چپ کروانے میں ہلکان ہو رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

دوپہر سے رات کا وقت ہو گیا تھا، لیکن عینا کا رونا اور سسکنا ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے کسی بات پر پھر سے رونا شروع کر دیتی تھی۔ مریم بیگم تو اپنے تہیں کوشش کر چکی تھیں۔ اب رحیم صاحب ہی تھے جو اسے سنبھال رہے تھے۔

رات کا کھانا بھی اسے کمرے میں ہی بہلا پھسلا کر کھلایا تھا اور اب اسے کافی حد تک باتوں میں گھیر چکے تھے۔ ادھر ادھر کے قصے سناتے وہ اس کا سر اپنے بازو پر رکھے ہوئے تھے اور وہ بھی سکون کے تاثرات کے ساتھ انہیں سن رہی تھی۔

"بابا!"

کسی سوچ کے زیر اثر عینا نے انہیں پکارا۔

"جی میرا بچہ!"

اسکے سر پر بوسہ دیتے اسی شفیق نرم آواز میں کہا۔

"بابا.. میں ایسی کیوں ہوں؟"

ان کے بازو سے ذرا سا سر اونچا کیے ان کی ان کے چہرے پر نظریں دوڑاتی وہ پوچھ رہی تھی۔

"کیسی؟ میرا بچہ۔"

اسکے سر کو سہلاتے وہ تشویش سے استفسار کرنے لگے۔

"یوں ڈرنے والی۔"

اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ہتھیلی سے مسلتی، پھنسی سی آواز حلق سے نکلی۔ اور پھر سے آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

"نہ میرا بچہ،

دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی چیز سے ڈرتا ہے۔ اس میں رونے والی کیا بات ہے۔" وہ پیار سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر نمی صاف کرتے بولے۔ تو وہ ان کے ساتھ لیپٹ کر سسک پڑی۔

"میں تو ہر چیز سے ڈرتی ہوں۔"

آج پھر سے وہ خود ترسی کا شکار ہو چکی تھی۔

"تو کیا ہو گیا؟"

اس میں رونے والی تو کوئی بات نہیں۔

ڈرنا تو فطری چیز ہے میرا بچہ۔"

اسکی پیٹھ تھپکتے وہ عام سے لہجے میں بولے۔ دل تو اس کی ایسی باتوں سے ہی دکھ رہا تھا۔

"اور تمہیں پتہ ہے

(دو انگلیوں سے اسکی ٹھوڑی اوپر کرتے اشتیاق بھرے انداز میں بولے، تو وہ آنکھیں مسلتی انہیں دیکھنے لگی۔)

جو کہتا ہے کہ میں نہیں ڈرتا۔ دراصل وہ سب سے بڑا جھوٹا انسان اور بے وقوف بھی۔ کیونکہ سب کسی نہ کسی چیز سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنا کوئی بری بات نہیں ہوتی۔" عینا انکی آنکھوں میں دیکھتے، یقین چاہنا چاہ رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سوال پر وہ اثبات میں سر ہلاتے مزید بولے۔

"بالکل۔ ڈرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔ بڑے بڑے لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ڈرتے ہیں۔ جیسے میں آپ کی امی سے ڈرتا ہوں۔"

اسے یقین دلاتے آخر میں سرگوشیانہ انداز میں بات کو مزاح کا رنگ دیا۔ عینا کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکان رہینگ گئی۔

"ارے آپ ہنس رہی ہو۔ سچ میں آپ کی ماما سے بہت ڈرتا ہوں یا۔"

اسے ہنستے مصنوعی خفگی سے بولے تو عینا نے بھی مسکراتے ہوئے ان کی تائید میں سر ہلا دیا۔

رحیم صاحب جھوٹ سچ سے گھڑے اپنے ڈر کے قصے، عینا کو سنانے لگے۔ اور عینا ان کے سینے پر سر رکھے، سنتے سنتے ہی سو چکی تھی۔

سوتے ہوئے، اس کا چہرہ ہر قسم کے تفکر، ڈر سے پاک تھا۔ محبت سے اس کے چہرہ پر نگاہیں دوڑاتے وہ اس کے لیے ایک فیصلہ کرچکے تھے۔ بس عمل کرنا باقی تھا۔

\*\*\*\*\*

"سو گئی وہ؟"

رحیم صاحب عینا کو سلا کر پرسوج سے کمرے میں داخل ہوئے۔ مریم بیگم جو بیڈ کے کنارے پر بیٹھی کریم سے مساج کر رہی تھیں۔ ان کے اندر آنے پر پوچھا۔

"ہوں"

لحاف درست کرتے وہ ہنکار بھرتے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔"

انکے ہاتھوں پر نرم دباؤ ڈال کر پوچھا تو وہ سوچ سے باہر نکل کر انہیں دیکھنے لگے۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسا وہ کہے گی ویسا ہی ہوگا۔"

سنجیگی سے کہتے وہ اپنے فیصلے کے بارے میں بتانے لگے جسے سنتے ہی مریم بیگم کی آنکھیں کھل گئیں۔

"رحیم یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

وہ بچی ہے ابھی۔ آپ کو تو پتہ ہے وہ ایسی ہی ہے۔ ہر بار ایک نئی ضد لگا کر بیٹھ جاتی ہے۔"

مریم بیگم انہیں سمجھانا چاہا۔ پر رحیم صاحب نے سختی سے انہیں ٹوک دیا۔

"کبھی سوچا ہے وہ ایسی کیوں ہے؟

آج وہ مجھ سے سوال کر رہی تھی کہ بابا میں ایسی کیوں ہوں۔

کیا بتاتا اسے کہ بچپن سے اسے ایسا سمجھ کر ایسا بنا دیا کہ وہ خود کو سنبھال ہی نہیں سکتی۔  
مریم اگر تم نے آج تک اسے ایسا سمجھنے کی بجائے اس کے پیچھے کی وجہ جانی ہوتی تو وہ ایسی  
ہرگز نہ ہوتی۔"

رحیم صاحب کے لہجے میں افسوس اور دکھ بول رہا تھا۔ ایک ہی تو بیٹی تھی اور وہ بھی اس حال  
میں سسک رہی تھی۔ ان سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ وہ میری وجہ سے...؟"

مریم بیگم دکھ سے کہتیں منہ پر ہاتھ رکھے سسک پڑیں۔

آخر کو وہ انکی بھی اولاد تھی۔ اور ماں تو کبھی نہیں چاہتی کہ اس کی بیٹی ڈری سہمی رہے۔ وہ تو  
اپنی بیٹی کو باہمت اور بااعتماد بنانا چاہتی تھیں۔ اور رحیم صاحب نے کتنی آسانی سے سارا کا سارا  
ملبہ انکے سر پر گرا دیا۔

"مریم! میں نے یہ نہیں کہا"



وہ بے بسی سے ان کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولے۔  
مریم بیگم نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں نے جو فیصلہ لیا ہے مجھے پورا یقین ہے۔ ہماری عینا بھی خوش ہو جائے گی۔ بلیو می۔"  
اپنے تلخ لفظوں کا احساس ہوتے ہی وہ اب کی بار نرمی سے گویا ہوئے۔

"اور اس کی پڑھائی۔"

مریم بیگم نے اپنا خدشہ سامنے رکھا۔

"یہ فیصلہ ہم ان پر چھوڑ دیتے ہیں۔"

رحیم صاحب کہہ کر بیڈ پر دراز ہو گئے۔

اور مریم بیگم ناچاہتے ہوئے بھی سر ہاں میں بلا گئیں۔

\*\*\*\*\*

منہا وارث بخش، اپنی ذات سے محبت کرنے والی، ضیغم کی پرکشش شخصیت پر گرویدہ ہو چکی تھی۔ اور اسے پسند کرتی تھی۔ اپنی زبان سے تو اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ جو بھی تھا اس میں اپنا وقار اور انا کھونے کا وصف نہیں تھا۔

داؤد کی بزدلی کے قصے بھی وہ سن چکی تھی۔ اور ضیغم کی بہادری کے قصے بھی، یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اس کا رجحان ضیغم کی طرف بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پر آج تک ضیغم نے اس کے جذبات کو ہوا نہیں دی تھی۔ وہ تو ضامن اور شہریار کے علاوہ کسی سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔

اور پھر وہ لڑکی آئی، جس کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ دکھتا تھا۔ ایسا بھی کچھ خاص نہیں تھا اس لڑکی میں، لیکن ضیغم تھا کہ اس کے پیچھے لٹو تھا۔ یہاں تک کہ سب کے سامنے کتنی بدحفاظی سے اسے قصور وار ٹہرا رہا تھا۔

منہا ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو محض اپنی پسند کے لیے، ایسی حرکتوں پر اتر آتیں، وہ بھی اس شخص کے لیے جو کسی اور کے لیے باولا ہوا پھر رہا ہو۔

وہ اپنی اہمیت جتانے والوں میں سے تھی۔ نہ کہ اپنی اہمیت کسی لا حاصل چیز کے پیچھے کھونے والوں میں سے۔ آج ہوئی حرکت کے بعد، کہیں ضیغ کے لیے پسندیدگی تھی بھی تو وہ ختم ہو چکی تھی۔ اور منہا نے اپنی زندگی کا سب سے بڑے فیصلے کا اختیار اپنے ڈیڈ کو دے دیا۔ وہ چاہے ماڈرن لڑکیوں میں سے تھی۔ پر ہر ایلٹیٹ کلاس کی لڑکی اپنی پسند سے برچنے ایسا بھی کچھ لازم تو نہ تھا۔

"جی وارث بخش بات کر رہا ہوں۔"

منہا کی طرف سے اقرار کے بعد اسکے ڈیڈ نے منہا کے لیے آئے پیام کو بھی ہاں میں جواب دینے کے لیے فون کر دیا۔

"اسی بارے میں بات کرنی تھی۔ نہیں نہیں!"

ایسا نہیں ہے۔ بل کر بات کرتے ہیں۔ کبھی چکر لگائیے نا یہاں۔"

آگے سے شاید بے صبری سے سوال کا جواب مانگا گیا تھا۔

وارث بخش کی توپاؤں انگلیاں گھی میں اور سر کرٹائی میں تھا۔

وہ اپنی بیٹی کی شادی بڑے نامور گھرانے میں کروا کر ناصر بیٹی کا مستقبل محفوظ کر رہے تھے بلکہ اپنا ڈوبتا بزنس بھی سنوار رہے تھے۔

انہیں اپنی تربیت پر فخر ہونے لگا، جو ان کے لیے ہر اعتبار سے بہت قیمتی ثابت ہوئی تھی۔ اور وہیں مہنا کی زندگی کا فیصلہ بھی کس قدر خوش نخت ثابت ہونا تھا، یہ دیکھنا باقی تھا۔

\*\*\*\*\*

"السلام علیکم۔"

ظفر شاہ سائیں آج حویلی میں ہی موجود تھے۔ وہ اور انکی بیگم بیٹھے گاؤں کے کسی مسٹے پر بات چیت کر رہے تھے کہ ٹیلی فون بجنے پر انہوں نے فون کان سے لگا کر سلام کیا۔ جواب میں سلام کا جواب دے کر اپنا تعارف کروایا گیا تھا۔ ظفر شاہ کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ، کسی بہت اپنے سے بات کرنے کا اشارہ دے رہی تھی۔

"ہم پہچانتے ہیں۔ بخش کیسے ہو؟

بہت عرصے بعد ہماری یاد آئی؟"

خوشی پر قابو پاتے وہ کچھ خفگی کا اظہار بھی کر گئے۔

"ارے! سو بسم اللہ۔"

واقع ہی، تم نے تو میرا دل خوش کر دیا۔"

چند اور باتیں کر کے فون تو بند ہو گیا پر ظفر شاہ کی مسکراہٹ تھی کہ مدہم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"شاہ سائیں!

کیا کہا بخش بھانے؟ ماشاء اللہ آپ بہت مسکرا رہے ہیں۔"

محبت سے اپنے مجازی خدا کے چہرے پر خوشی کا عکس دیکھتیں وہ گویا ہوئیں۔ کم ہی تو ایسے نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔

"بیگم، بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

نخش سے کچھ عرصے پہلے ہم نے اپنی بیٹی کا ضیغم کے لیے ہاتھ مانگا تھا۔ آج اس نے کہا کہ وہ مل کر اس بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا جواب مثبت ہی ہوگا۔"

جہاں ظفر شاہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہاں اس ذکر پر بیگم سائیں کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ خبر ان کے لیے بھی خوشی کا باعث بنتی، اگر وہ ضیغم کی کسی شہر کی لڑکی سے محبت کا نہ جانتی ہوتیں۔

انہیں تو خوف کے سائے نے گھیرے میں لیا ہوا تھا، کیا قیامت آئے گی حویلی پر جب دونوں باپ بیٹے آمنے سامنے ہوں گے۔ وہ سوچ کر ہی کانپ گئیں۔

"کیا ہوا آپ خوش معلوم نہیں ہو رہیں۔"

انہیں کسی سوچ میں گم دیکھ کر وہ ان کے چہرے پر خوشی کھوجتے بولے۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے سائیں۔ اگر آپ ایک بار ضیغم سائیں سے بات کر لیتے تو..."

میرا مطلب ہے کہ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اگر اس سے پوچھ کر..."

گھبراہٹ پر قابو پاتے وہ کہنے لگیں۔ تو شاہ سائیں کے چہرے پر سختی دیکھ کر انہوں نے وضاحت کرنا چاہی۔

"ہم ضیغم سائیں کے باپ ہیں وہ ہمارے باپ نہیں ہیں۔ اور ہم فیصلہ لے چکے ہیں۔ آج تک ہم نے انکی ہر بات مانی ہے۔ اور ہمیں یقین ہے انہیں ہمارے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

ان کی بات کاٹ کر وہ کچھ اس انداز میں بولے کہ لہجے میں رعب تھا، یقین بھی، اور اس یقین پر بیگم سائیں نے لب بھیچے۔ وہ اب کیا کہتیں، انکا بیٹا کس بے دردی سے یہ یقین توڑنے والا تھا۔

کیا واقع ایسا ہونا تھا؟ یہ تو وقت نے ہی بتانا تھا۔

\*\*\*\*\*

کل دوپہر سے رات تک وقفے وقفے سے بارش برستی رہی تھی اور آج جس سی معلوم ہوتی تھی گھسٹن سی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے تپتی زمین پر پانی پڑا ہو اور وہ ٹھنڈی ہونے کے بعد اپنے اندر کی تپش باہر اندیل رہی ہو۔ ہوا کے نام پر ایک پتہ بھی نہیں ہل رہا تھا۔

عینا پر اپنا غصہ اور کھولن نکالنے کے بعد، جب دماغ کچھ حد تک سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اپنی غلطی کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پر ذہنی دباؤ اب بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔

کل شہریار کا نکاح تھا، اس کی بھی کوئی مدد نہیں کر پایا تھا۔ ضامن ہی اس کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے کام نبٹا رہا تھا۔ اور ضعیف وہ کل سے اب تک اپنے اندر کی بے چینی کے عوض کتنی ہی بار شکل کا کا کو ٹوک چکا تھا۔ اور وہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے چپ چاپ اس کی سنے جارہے تھے۔ جو اسے مزید کھولن میں مبتلا کر دیتا۔

صبح سے وہ ناشتہ کیے بغیر ہی لاونج میں بیٹھا چینل سرچنگ کر رہا تھا۔ سستی اس کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا، ابھی وہ ناشتے کے لیے شکل کا کا کو آواز دیتا اس سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سکرین پر ٹیلی کا نمبر نظر آ رہا تھا۔ سر جھٹکتا وہ پھر سے اماں سائیں کی باتیں سننے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

"اماں سائیں۔ ایک دفعہ جب کہہ دیا کہ میں نہیں چھوڑ سکتا تو آپ..."

فون کان سے لگائے، عجلت میں ادھر کی بات سننے سے پہلے ہی وہ انہیں باور کروا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتے، مردانہ کھردری آواز اس کی سماعتوں سے جا ٹکرائی۔



"اس... السلام.. علیکم.. بابا سائیں."

"وعلیکم السلام.. ضیغم سائیں!

آپ کس بارے میں بات کر رہے تھے۔"  
بارعب آواز میں پوچھے گئے سوال پر ضیغم نے لب بھینچے۔

"وہ کچھ نہیں بابا سائیں میں تو بس..."  
ضیغم نے مہر کر بات مکمل کرنا چاہی۔

"خیر چھوڑیں۔ ہم نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے کہ آپ کب تک حویلی کا چکر لگا رہے ہیں۔"

ان کے موضوع بدلنے پر ضیغم نے تشکر بھرا سانس لیا۔

"بابا سائیں ایک مہینے بعد پیپر ہیں۔ اس کے بعد میں حاضر ہو جاؤں گا۔"  
ضیغم کہہ کر خاموش ہوا۔

"اچھا ہے۔ ایک مہینے بعد تم ہمارے پاس ہو گے۔ ہم انتظار کرینگے۔ ہمیں تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم بابا سائیں۔"

انہوں نے ضروری بات بتائی نہیں تھی تو ضیغم نے بھی پوچھا نہیں۔ اگر انہیں بتانی ہوتی تو وہ بتا چکے ہوتے۔

"شکیل سے ہماری بات کرو دو۔"

سپیکر ابھرتی اس مانگ پر ضیغم کو کھٹکا لگا۔

"جی بابا سائیں۔"

ان کے حکم کی تعمیل کرتے وہ کاکا کے پاس فون لے گیا۔

جب تک کاکا نے بابا سائیں سے بات کی، ضیغم ان کے سر پر موجود رہا۔ آخر کو وہ کسی قسم کا خطرہ، وقت سے پہلے لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

\*\*\*\*\*

"عینا!

چلو شاباش تیار ہو جاؤ تمہاری دوست کا نکاح ہے نا آج۔"

مریم بیگم مصروف سی الماری میں سر دیے عینا سے بولیں۔ جو اپنے بابا کے ساتھ نجانے کون سے راز و نیاز کرنے میں مگن تھی۔

کل کا پورا دن رحیم صاحب نے عینا کے ساتھ گزارا تھا۔ اور آج تو اتوار تھا، آج بھی وہ صبح سے عینا کے ساتھ ہی مصروف تھے۔ دونوں باپ بیٹی کو یوں ہنستے کھیلتے دیکھ کر مریم بیگم نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ پرسوں جو حالت عینا کی تھی۔ دو دنوں سے رحیم صاحب کی شفقت اور محبت نے اسے کافی حد پر سکون کر دیا تھا کہ وقتی طور پر وہ سب بھول گئی تھی۔

"عینا میں تم سے ہوں جانا ہے کہ نہیں جانا؟"

عینا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پلٹیں۔

عینا اب بھی رحیم صاحب کے کان میں گھسی کچھ کہہ رہی تھی۔

"ہوں۔"

جی ماما؟"

عینا چونک کر متوجہ ہوئی۔

"شام میں تمہاری دوست کا نکاح ہے۔ تیار کب ہونا ہے؟"

کمر پر ہاتھ رکھے وہ دیوار پر ٹنگی گھڑی کی طرف اشارہ کرنے لگیں۔ جو چار بج رہی تھی۔ چھ بجے تک اسے ہیر کے گھر پہنچنا تھا۔ اور سات بجے مغرب کے بعد نکاح ادا ہونا تھا۔

"ابھی تو بہت ٹائم ہے۔ ہماری بیٹی نے صرف ڈیس ہی تو چیلنج کرنا ہے۔ ہم تھوڑا بڑی ہیں بعد میں ہو جائے گی تیار۔"

جواب رحیم صاحب کی طرف سے آیا تھا۔ عینا نے بھی سر ہلایا۔

"جی نہیں!"

آج میں اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کروں گی۔ اس کے بالوں کا پیارا سا سٹائل بناؤں گی اور تھوڑا سا میک اپ بھی کروں گی۔"

عینا کو انکے پاس سے اٹھاتے، محبت سے اس کی تھوڑی تلے ہاتھ رکھے وہ کہہ رہی تھیں۔ اور عینا وہ اشتیاق سے آنکھیں بڑی کیے، ان کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ مریم بیگم نے آج تک اسے

میک اپ کے قریب بھی بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ یہ واحد ایسی چیز تھی جو ان کی بھانجیاں کرتی تھیں، پر وہ اپنی بیٹی کو اس سے کوسوں دور رکھنا چاہتی تھیں۔ وجہ اس کے چہرے پر کھلی معصومیت تھی۔ اور انہیں ڈرتھا یہ مصنوعی زیب و آرائش کہیں اس کی معصومیت کو چھپا نہ دیں۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں۔"

اپنی تھوڑی تلے رکھے ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں قید کرتے، وہ بے یقینی سے بولی۔  
مریم بیگم اور رحیم صاحب بیک وقت مسکرائے۔

"بالکل سچ۔"

آخر کو تمہاری بیسٹ فرینڈ کا نکاح ہے۔ تمہیں سب سے پیارا لگنا چاہیے نا۔"

مریم بیگم نے پچکارتے ہوئے اس سے تاغید چاہی۔ عینا نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ارے واہ! ہماری بیٹی تو پہلے ہی اتنی پیاری لگتی ہے۔ تیار ہو کر تو چاند لگے گی۔"

رحیم صاحب کی طرف سے کہے گئے تو صیفی جملے پر عینا کی شرارتی ہنسی کی جھنکار گھر کے در و دیوار نے ایک بار پھر سے سنی تھی۔

\*\*\*\*\*

گھر کے درودیوار کے اطراف برقی قمقموں کی لڑیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ لان میں ایک کونے میں خوبصورت سیج سجایا گیا تھا۔

شام کا وقت تھا، چاند کبھی بادلوں کی اوٹ میں اوجھل ہوتا تو کبھی جھانکتے ہوئے اٹکیلیاں کرنے لگتا تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں اور عطر کی خوشبوؤں کی بوچھاڑ کو بہا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہی تھی، جیسے اس نکاح کی پرمسرت رسم میں وہ بھی اپنا حصہ چمک کر ڈال رہی ہوں۔

گلاب کے پھولوں اور موتیے کو لڑیوں میں پرو کر بیک سیج کا فسوں خیز منظر بنایا گیا تھا جب کہ پودوں پر قمقموں کی لڑیاں بچائی گئی تھیں۔ جن سے نکلتی رنگ برنگی روشنی ماحول کو مزید خوبصورت بنا رہی تھیں۔ رنگ برنگے بلب بھی لگائے گئے تھے جن سے نکلتی منظر کو خواب ناک تصویر بخش رہی تھی۔ بھائیوں نے اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور طریقے سے ہر ایک چیز کا خیال رکھا تھا کہ اکلوتی بہن کے ارمان پورے کیے جاسکیں۔

چار سوں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، ہنسی کی کھلکھلاہٹ تقریب کا پتہ دے رہی تھی، ہوا کے دوش پر لہلاتے آنچل اور سرگوشیاں کرتے مسکراتی ہوئی کھنکتی ہوئی آوازیں پورے ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔

عینا اور تالشہ بھی وقت سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ ہیر کو گھر پر ہی تیار کیا جا رہا تھا، البتہ پارلر والی کو بلا لیا گیا تھا۔

ہیر تیار ہونے سے پہلے خوب روئی تھی۔ اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کے بعد نہیں روئے گی۔ اس لیے جس نے بھی رونا ہے پہلے رو لے تاکہ بعد میں رونے کی وجہ سے اسکا میک اپ خراب نہ ہو جائے۔ میک اپ کے معاملے میں ویسے بھی وہ بہت حساس تھی، اماں نے بھی اس کے بھرپور لتے لیے تھے۔

"دلہا آگیا۔"

ہیر لگ بھگ تیار ہی تھی، پارلر والی اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔ جب باہر سے چھوٹی بچیوں کی ہنسی کی آوازوں کے ساتھ ساتھ یہ آواز بھی ہیر کے کانوں میں پڑی۔

نچلے لب کو دانت سے کچلتے، شرمیلی مسکراہٹ کو اندر روکنے کے جتن کر رہی تھی۔ اور اس سبب گلنار ہوئے جارہی تھی۔

"ہائے اللہ۔"

ہیر، ہم نے تمہارا دلہا دیکھا اتنا خوبصورت اور خوبرو کہ مت پوچھو۔"  
ہیر کی ماموں زاد کزن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بڑے اشتیاق سے بولی۔  
ہیر نے بھی دوپٹے کی کناری کو جھٹکا دیا اور گردن ذرا اور لمبی کی۔

"اچھا بس بس۔ اب نظر نہ لگا دینا انہیں۔"  
مصنوعی جھاڑ پلاتی ذرا اترا کر کہا۔

کمرے میں موجود باقی کزنوں نے پہلو بدلا۔

"ہم کیوں نظر لگانے لگے۔ ویسے حد ہے ہیر۔ اتنا بھی غرور اچھا نہیں۔"  
ان میں سے ایک بول ہی پڑی۔



"یہ تو شروع سے ہی ایسی اکڑ دکھاتی آئی ہے۔ اتنا اچھا دلہا مل گیا، اب تو اس کے پاؤں زمین پر ٹکنے ہی نہیں۔"

دوسری کزن نے بھی اپنی رائے دینی ضروری سمجھی۔ ان کے انداز پر عینا اور تائشہ نے ہنسی دبائی۔

"ہاں تو بنتا بھی ہے۔ آخر کو دنیا والوں کو دکھانا بھی تو ہے کہ ہیر جو کہتی ہے وہ کرتی بھی ہے۔ لگتے ہیں نا وہ بالکل ہیرو جیسے۔"

ویسی ہی اکڑی گردن، چہرے پر جھولتی بالوں کی لٹ کو پیچھے کو جھٹکتی بولی۔

ہیر کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ہر اس شخص کو پکڑ پکڑ کر اپنا ہونے والا دلہا دکھائے جو اس کے ہیرو کی تان کے جواب میں ہنستا تھا۔ تو آج وہ بھی اپنی کزنوں کے دل جلانے میں کوئی کسر نہیں رکھنے والی تھی۔

"مولوی صاحب آگئے ہیں۔"

انکی کھٹی میٹھی چپقلش جاری تھی کہ بڑی بھابھی نے آکر ہیر کے سر پر بھاری کامدار دوپٹہ اڑا کر اسکا گھونگھٹ نکال دیا۔

"ہیر یوسف ولد یوسف احمد، آپ کا نکاح شہریار عالم ولد عالم جہانگیر حق مہر ایک لاکھ سکہ ارج الوقت کے ساتھ قرار پایا ہے، کیا آپ کو قبول ہے؟"

مولوی صاحب کی آواز وہ گھونگھٹ میں چھپے سن رہی تھی۔ اس آواز سے گویا پورے جسم میں کرنٹ کی لہر دوڑ گئی۔

سیف بھائی نے اسے خاموش پا کر آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"قبول ہے۔"

آواز برآمد ہوئی۔

دو بار مزید اس سے یہی سوال کیا گیا جس پر قبول ہے کہا گیا۔

کمرے کے اندر اداسی کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ بھائی بھی اسے خود سے لپٹائے، اپنے آپ کو آنسو بہانے سے روکے رکھے ہوئے تھے۔

تالشہ اور عینا بھی اس کی ایک طرف کھڑی یہ سب کاروائی دیکھ رہی تھیں۔

\*\*\*\*\*

"بہت بہت مبارک ہو میرے شیر۔"

نکاح مکمل ہو چکا تھا۔ مبارکوں کا شور اٹھ رہا تھا۔ عالم صاحب اپنے بیٹے کے گلے لگتے محبت سے بولے جب کہ شہریار کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"ہماری بہن کو خوش رکھنا ورنہ... سمجھ رہے ہونا"

باری باری ہیر کے بھائیوں سے ملا تھا۔ اور سب نے ایک ہی جملہ کہہ کر اس کا گلا خشک کر دیا۔

"میں نے تجھے بہت سمجھایا۔ پر تو نے میری ایک بھی نہ سنی۔ اب اللہ تجھے بچائے رکھے۔"

ضامن شہریار کے گلے لگتا اس سے شکوہ کر رہا تھا۔ شہریار کا قہقہہ برجستہ تھا۔

"تو فکر نہ کر۔ میں بچا ہوا ہی ہوں۔"

شیری نے آنکھ دبائی، تو ضامن بھی ہنس دیا۔

"بہت بہت مبارک ہو۔"

ضامن کے بعد ضیغم نے بھی اس کے گلے لگ کر مبارک باد دی۔  
 سب سے مل کر وہ ہنستا مسکراتا، سٹیج پر اپنی دلہن کا انتظار کر رہا تھا۔ کتنا بے چین تھا وہ اسے  
 دیکھنے کو، آج تو اس کے سارے جملہ حقوق اپنے نام لکھوا لیے تھے۔ وہ جی بھر دیکھنے کا حق رکھتا  
 تھا۔

\*\*\*\*\*

"اف اس بھاری دوپٹے میں تو مجھے سانس ہی نہیں آرہی تھی۔"  
 جیسے ہی کمرے میں سے سب گئے، ہیر نے گھونگھٹ پلٹ دیا۔  
 تالشہ نے ہنسی دبائی۔ ہیر کے کزنوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ہیر صرف تمہارا دلہا ہی نہیں تم بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔"  
 عینا اپنے نرم لہجے میں ہیر کے ساتھ لگتی بولی کہ سب نے تاعیدی سر ہلایا۔

اپنی تعریف پر ہیر جھینپ کر پلکیں جھکا گئی۔ ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"دیکھو ابھی سے کیسے شرما رہی ہے۔"  
 تائشہ نے اسکی مسکراہٹ پر چوٹ کی۔  
 اپنی جھینپ مٹانے کو پوڑیوں سے بھری کلائی اس کی کمر پر ماری۔

"آہ ظالم، یہ ظلم دلہا بھائی کے ساتھ ہی کرنا۔"  
 اس کے کان میں سرگوشی کرتی قہقہہ لگا کر اس سے دور ہوئی۔ کچھ بعید نہ تھا وہ پھر سے مکوں  
 کی برسات کر دیتی۔

کمرے کی فضا جو کچھ دیر پہلے اداس اداس سی معلوم ہو رہی تھی۔ اب پھر سے پوڑیوں کی جھنکار  
 اور کھلکھلاہٹ بھری ہنسی کی گونج سے کھل اٹھی تھی۔

\*\*\*\*\*

لال رنگ کی خوبصورت نفیس کام والی چولی کے ساتھ بادامی رنگ کا شرارا جس پر سنہری تلے  
 سے باریک و نفیس کام کیا گیا تھا۔ خوبصورت سے جوڑے پر سنہری لٹو کا دوپٹہ جس کی کناری  
 پر بارڈر کی صورت میں نفیس پھولکاری کی گئی تھی، سر پر اوڑھا ہوا تھا۔

خوبصورت تو وہ تھی، پر آج خوبصورتی کو چار چاند لگ چکے تھے۔ مہندی میں رچے ہاتھوں سے اپنا شرارا سنبھالتی قدم قدم سبج کر لان کے گھاس پر رکھتی، شہریار کے دل کے تاروں کو بے ترتیب کر رہی تھی۔

خوبصورت تو وہ بھی لگ رہا تھا، بادامی شلوار سوٹ کے ساتھ گہرے بھورے رنگ کی واسکٹ زیب تن کیے، بالوں کو نفاست سے سنوارے، ہیر کا ہیرو ہی لگ رہا تھا۔

عینا اور ہیر کی کچھ کزنیں، ہیر کے سر پر دوپٹہ کا سایہ کیے، اس کے کناروں کو تھامے، ہیر کو سلج تک لے آئی تھیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر اس کے آگے اپنی ہتھیلی پھیلائی جسے ہیر نے نرمی سے تھام لیا تھا۔

شہریار نے ہاتھ پر دباو بڑھائے اپنے ساتھ لیے، صوفے پر بٹھایا۔ چاروں سوتالیوں کے گونج بج اٹھی۔

کئی کی رشک بھری نظروں سے یہ جوڑا گزر رہا تھا۔ ہیر اور شہریار دونوں ساتھ میں بیٹھے لگ رہا تھا کہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔

ہیر کے خاندان والے، لڑکے کو دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہیر کے گھر والے اس فیصلے پر خوش نظر آ رہے تھے کیونکہ خاندان والوں کے رشک بھرے جملے ان کے کانوں میں بھی پڑ رہے تھے۔

وہیں ہیر جیسی خوبصورت دامن دیکھ کر، شہریار کے خاندان والوں کی آنکھیں بھی کھل چکی تھیں۔ زلیخا بیگم جو پہلے کچھ حد تک گھبرائی ہوئی تھیں، نجانے خاندان والے کیا کیا باتیں بنائیں۔ اب کافی پرسکون تھیں۔ ان کے بیٹے کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ ہی اس کے خوش ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ اور ایک ماں کو کیا چاہیے ہوتا ہے، اگر اس کی خوشی ہیر سے منسلک تھی تو وہ بھی اس خوشی میں دل و جان سے خوش تھیں۔

\*\*\*\*\*

ضیغم جو ضامن کے ساتھ ہی سیج پر شہریار کے صوفے کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا شکل سے کافی حد تک بیزار لگ رہا تھا۔ نظریں گھوم کر جب لان میں آتی دامن اور اس کے ساتھ کسی بات

پر ہنستی لڑکی پر گئی تو کچھ پل کو مڑ ہی گئی۔ دماغ ماننے سے انکاری تھا، پر دل، وہ پہچان چکا تھا۔ ہاں وہ اس کی عینا ہی تھی۔

گہرے نیلے رنگ کی چولی کے ساتھ گرے رنگ کا لہنگا پہنے، ایک کندھے پر گرے رنگ کا ہی دوپٹہ پھیلائے جس پر سلور بارڈر کا کام کیا گیا تھا۔ بال جو ہمیشہ کرلی دکھتے تھے۔ آج انہیں اسٹریٹ کر کے، ایک سائڈ سے ٹوسٹ کر کے باندھا ہوا اور نیچے بالوں کو کھلا چوڑ رکھا تھا۔ اسٹریٹ کرنے کے بعد بالوں کی لمبائی کندھوں سے نیچے تک آنے لگی تھی۔

اور آنکھوں پر رہنے والا چشمہ بھی آج نہیں تھا، چہرہ بھی مصنوعی زیب و آرائش سے نکھرا ہوا تھا۔ صاف سنہری چمکتی رنگت، جسے کاسمیٹک کے ہلکے سے ٹچ سے مزید نکھرا بنا دیا تھا۔ ہونٹوں کو گلابی رنگ دیے وہ کوئی موم کی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔

ضیغ نے بنا پلک جھپکے نظریں اسی پر ٹکائی رکھیں یہاں تک کہ وہ بھی سلج پر ہیر کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

سارا ذہنی دباو پل بھر میں چھٹ گیا تھا۔ بیزاریت ہوا ہو چکی تھی۔ اور آنکھیں جھٹک جھٹک کر اپنے سامنے موجود وجود پر جا ٹکتی تھیں۔ دل عجب ترنگ پر تھرکنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ایک بار پھر محبت کا جذبہ اس پر غالب آ رہا تھا۔



عینا مسکراتے ہوئے شہریار اور ہیر کو ساتھ بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی دوست کی خوشی میں اس سے زیادہ خوش تھی۔ اس کی پہلی دوست کا نکاح تھا، اور یہ پہلی تقریب تھی جس میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔

سٹیج کا مسکراتی نظروں سے جائزہ لیتی، اس کی نظریں خود کو تکتے ضیغم پر پڑی تھیں۔ اور مسکراہٹ مدہم ہو کر، آنکھیں سکیڑے وہ اس کی مسکراہٹ کو گھور کر دیکھتی، نظریں پھیر گئی۔

اس کی اس حرکت پر جہاں ضیغم کا دل بجھا تھا، وہیں دل کے ایک کونے میں اس کی اس ادا پر واہ کا شور بھی بلند ہوا تھا۔ وہ تو خود اپنی اداؤں سے ناواقف تھی، کہ مقابل پر کون کون سے ستم ڈھا کر چلی جاتی ہیں۔

رخ موڑنے پر ہلتی چاند کی شکل کی بالی اب تک بل رہی تھی، اور ضیغم کی نظریں مسلسل اس جھولتی بالی سے ہو کر اس کے چہرے کے خدوخال کو حفظ کر رہی تھیں۔ اور جب دل شدید بے قابو ہوا تو چپکے سے اپنی نشست چھوڑ کر نامحسوس انداز میں شہریار اور ہیر کے پیچھے سے ہوتے ہوئے بالکل عینا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ سب اپنی موج مستیوں میں گم تھے۔ کسی کا بھی دھیان خود پر ناپا کر ضیغم نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عینا کے کان میں جھجک کر سرگوشی کی۔

اس کے جھمکوں کے ساتھ میرا دل  
جانے کیوں، دائیں بائیں ہلتا ہے

وہ جو بظاہر سامنے دیکھ رہی تھی، اور دل کی حالت اس سے یکسر مختلف تھی، اپنے قریب سے آتی  
مردانہ مدہوش آواز پر اچھل کر پیچھے مڑی۔ پشت ضیغم کے سینے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔  
وہ یہ تو نہ سمجھ پائی کہ کیا کہا گیا تھا پر ضیغم کو اپنے سامنے دیکھ کر حالت غیر ہو چلی تھی۔

"آپ کو اب عینا سے کیا کام؟"  
ہیر جو بھا بھی کی کسی بات پر مسکراتی ہوئی نظریں ادھر ادھر گھما رہی تھی۔ ضیغم کو عینا کے  
کان میں کچھ کہتے اور عینا کو اچھلتے دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

"وہ میں.. وہ دراصل میں عینا سے سوری کرنے آیا تھا۔"  
داڑھی کھجاتا وہ بات بنا گیا۔

"ہمم.. آپ کو کرنی بھی چاہیے۔ کیری آن۔"

حکم نامہ جاری کرتی، نظریں ان پر ہی گاڑ رکھی تھیں۔

"سوری"۔

کان کی لو مسلتا وہ کہہ کر پلٹنے لگا۔ عینا نے آنکھیں سکیڑیں دیکھا جیسے یہ انداز پسند نہ آیا ہو۔

"بس؟"

ہیر نے ابرو اچکائے۔

تائشہ اسی دن ہی یونی میں ہوئی ساری بدمزگی کے بارے میں بتا چکی تھی۔ اور ان دونوں کو یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ ضیغم عینا کے حوالے سے جزبات رکھتا ہے بس عینا کو اس بارے میں خبر دینی تھی۔

"ہاں.."

ہیر دادی۔

کند ہے اچکا کر اثبات میں سرہلاتے جس طرح آیا تھا ویسے ہی بڑبڑاتا ہوا واپس اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

\*\*\*\*\*

ضامن کی نظریں لان کے چاروں طرف طواف کر رہی تھیں۔ پر دل کی عجیب مضطرب کیفیت تھی جس سے وہ شناسا نہ تھا۔ شہریار کے کان میں کچھ کہہ کر وہ سیلج سے اترتا، پورے لان میں نظر ڈال کر گھر کے اندر ڈرائنگ روم میں جانے لگا۔ جہاں تقریباً سارے مرد براجمان تھے۔ گھر کا فنکشن تھا تو باہر سے کسی کو بلایا نہیں گیا۔ بس دونوں طرف سے چاچا، خالوں، ماموں اور چھوچھا ہی کے خاندان کو مدعو کیا گیا تھا۔

وہ جیسے ہی داخلی دروازے سے گھر کے اندر داخل ہوا۔ زوردار ٹکڑا کسی صنف نازک سے ہوئی جو لوکری میں بھر بھر کر گجرے رکھے جلدی میں چلتی آرہی تھی۔ کہ سامنے سے آتے لمبے پوڑے وجود کو بھی نہ دیکھ پائی۔

"اوشٹ! یہ کیا کر دیا آپ نے!"

لوکری کے ہاتھ سے چھوٹ جانے پر گجرے بھی لوکری سے باہر گر پڑے۔  
بمشل خود کو گرنے سے بچاتی، وہ اب گجروں کی حالت پر صدمے کا شکار ہوتی غصے سے سامنے آنکھیں پوری کھولے کھڑے لمبے تڑنگے وجود کو دیکھنے لگی۔

جیسے ہی نظر ضامن پر پڑی، غصے کی جگہ خفیف سی مسکراہٹ نے لے لی۔ اب پھر سے کوئی بات کر کے وہ اپنے لیے مصیبت کیوں کر کھڑی کرے۔ اس لیے چپ چاپ سی پنچوں کے بل بیٹھ کر گجرے چننے لگی۔ کچھ میں سے تو گلاب کے پھولوں کی پتیاں بھی ٹوٹ کر زمین پر پڑی تھیں۔ پر کچھ اب بھی ثابت حالت میں تھے۔

اپنے سامنے ہی پنچوں کے بل مصروف سی ہاتھ چلاتی لڑکی کو دیکھتے ہی جیسے ساری بے چینی اور اضطراب چھٹ گیا ہو۔

مہرون رنگ کے کرتے میں جس پر سنہری رنگ کے موتیوں سے سجدے بٹن لگے تھے، اس کے ساتھ سنہری ہی رنگ کا ٹراورز اور ہم رنگ دوپٹہ ایک کندھے پر پھیلا کر ڈالے۔ اپنے چھوٹے بالوں میں بھی آج اس کی دمکتی رنگت، کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ جیولری کے نام پر صرف گجرے دونوں ہاتھوں میں پہنے تھے۔ اور میک آپ کے نام پر صرف لپ سٹک ہی لگائی تھی۔ وہ بھی ہیر کی طرف سے کی گئی منت سماجت کے بعد۔

کرتے اور ٹراورز ویسے ہی تھے، جیسے وہ یونی پہن کر آیا کرتی تھی۔ پر آج جو رنگ منتخب کیا تھا، وہ اس کی دودھیارنگت کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔

وہ جو سیٹج پر بیٹھا کسی کی غیر موجودگی کو محسوس کرتا اٹھ کر آیا تھا۔ شاید نہیں یقیناً وہ یہی تھی۔

یہ خیال آتے ہی، سر جھٹکتا ہر اس سوچ کو جھٹکنے لگا۔ پر اب سوچ نے اپنے گہرے پنجے گاڑ لیے تھے۔ دل کی گدگداہٹ وقفے وقفے سے جاری تھی۔ دل کی اس بے وفائی پر وہ یہاں سے کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ پر یہ اتنا آسان بھی نہ تھا۔

خود بخود اس کے قدم وہیں تھم گئے جہاں تھے۔ نظریں اسکے ماتھے پر پڑی سلوٹوں پر رکیں ہوئی تھیں۔ اور پھر وہ بھی بیٹھ کر گجرے چن کر لوکری میں رکھنے لگا۔

"ارے! اُس اوکے آپ نہ کریں میں کر لوں گی۔"

وہ جو اپنے کام میں مصروف تھی، کسی مردانہ ہاتھ کو فرش پر گجرے چنتے دیکھ کر ٹھٹھک کر نظریں اٹھائیں تو ضامن کو یہ کام کرتے دیکھ کر منع کرنے لگی۔

"غلطی میں نے کی ہے، تو سدبارنا بھی مجھے چاہیے نا۔"

اسکے چہرے کے گرد نظریں دوڑاتا وہ خود کو جواز پیش کر رہا تھا یا تائشہ کو، اس کا فیصلہ مشکل تھا۔

"لازمی نہیں کہ ہر غلطی سدباری جائے۔ اور ویسے بھی، صرف آپ کی ہی نہیں غلطی میری بھی تھی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں آپ آرہے ہیں۔"

وہ شائستگی اختیار کرتی کہ کر مسکرا کر گجروں سے بھری لوکری اٹھا چکی تھی۔

آدھے مسئلے تو یوں ہی حل ہو جائیں، جب ہر کوئی دوسروں پر الزام تراشیوں کے بجائے، اپنی غلطی تسلیم کر لے۔

"آپ ہٹینگے سامنے سے، مجھے جانا ہے۔"

اسے وہیں جمے دیکھ کر تائشہ نے کہا۔

ضامن بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پر نظریں وہ تھیں کہ بیٹنے سے انکاری تھیں۔

"او.. ہاں شیور۔"

ایک طرف کو ہوتا اسے جانے کے لیے جگہ دی۔

اب اندر جانا بے کار لگ رہا تھا، کیونکہ جو کمی تھی وہ تو اب پوری ہو چکی تھلجی۔ دل بھی ہمک ہمک کر اس کے پیچھے جانے کے پر تول رہا تھا مجبوراً اس کے قدم بھی تائشہ کے پیچھے اٹھ گئے۔

\*\*\*\*\*

وہ ہیر کی سب کزنوں کو گجرے پکڑتی اب سیج کی طرف آرہی تھی۔ عینا اور ہیر کے لیے گجرے لے کر، عینا ابھی بھی ہیر کے ساتھ ہی موجود تھی۔

اس کے قدم اپنی طرف اٹھتے دیکھ کر، پھر سے دل کی بغاوت شروع ہو چلی تھی۔ جہاں جہاں وہ جاتی تھی۔ وہیں وہیں اس کی نظریں بھٹک کر اس کی ہر حرکت پر جاتی تھیں۔ کیسے مسکراتے ہوئے وہ سب کو گجرے دیتی، اور پھر کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستی۔

ضامن جو اس کے پیچھے ہی آیا تھا، شہریار کے بلانے پر اس کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ اب تائشہ کو دیکھ کر اسی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

کیا تھی یہ لڑکی، خول اندر خول سمٹی ہوئی، بالکل پیاز جیسی، ایک پردہ ہٹاؤ تو ایک نیا پردہ شخصیت کا ابھر آتا تھا۔

\*\*\*\*\*

رسمیں ادا ہو چکی تھیں، سب بڑی خواتین نے شگن کے طور پر مٹھائی دونوں کو کھلائی تھی۔ لڑکیاں بھی باری باری آکر دلے میاں اور دلہن کے ساتھ چھیر خانی کے بعد سیج سے نیچے جا چکی تھیں۔ اب سب پھر سے اپنی اپنی باتوں میں مشغول ہو چکے تھے۔



ہیر کی اماں اور زلیخا بیگم، آگے کا لاء عمل طے کر رہی تھیں۔ باقی پھوپھیاں، چاچیاں، مامیاں، ہیر کے دلے راجہ سے کر، کپڑوں اور گھر کی سجاوٹ تک کے بارے میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہیں لڑکیاں اپنے ہی قصے لے کر بیٹھیں، کبھی کسی کو چھیڑ رہی تھیں تو کبھی قہقہے لگا کر ہنس رہی تھیں۔

"انگھوٹی لائے ہیں نا۔"

ہیر نے شہیار کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہوں۔"

ہڑبڑا کر ہیر کی سرگوشی پر اسے دیکھا۔

وہ جو سامنے دیکھتا، ہیر سے بھی بات کرنے سے اجتناب برت رہا تھا۔ کیونکہ سب بظاہر اپنی باتوں میں لگن تھے پر نظریں سٹیج پر بیٹھے جوڑے پر ہی تھیں۔

"انگھوٹی۔ ڈامنڈ رنگ۔ لائے ہیں نا۔"

آواز کو مدہم رکھے وہ اسے انگلی میں پہنی اپنی انگھوٹی اتار کر دکھا رہی تھی۔

"ہاں! ہاں!.. لایا ہوں۔"

قمیض کی سائڈ جیب کو تھپکتا، انگھوٹی کی موجودگی محسوس کر کے کہا۔

"گڈ! اب پہنائیں مجھے۔"

سر پر لیے دوپٹے کا پلو جھٹکتی، پھر سے اکڑ کر بیٹھی بولی۔

"یہاں؟"

شہریار کی آنکھیں پھیلیں۔

"تو اور کہاں۔ میری سب کزنوں کو بھی تو پتہ چلے مجھے نکاح پر ڈائمنڈ رنگ ملی ہے۔ دیکھنا کیسے جل کر کوئلہ ہوتی ہیں۔ سیاہ کوئلہ۔"

اپنے ساتھ اور سلج سے نیچے بیٹھے مہمانوں کی وجہ سے آواز کو کم رکھتے، وہ اپنی خوشی چھپا نہیں پارہی تھی۔

"لیکن ہیر.. یوں سب کیا کہیں گے؟"

شہریار کو لوگوں کی فکر تھی کہ کیا سوچینگے۔

"کیا کہیں گے؟

یہی کہیں گے کہ لڑکا کتنا پیار کرتا ہے اپنی منکوحہ سے۔ آپ کی ہی تعریف ہے۔"  
جھٹکے سے مڑ کر دیکھنے پر بندیا جو ہلی تھی اسے ہاتھ کی انگلیوں سے سیٹ کرتے وہ منہ بنا کے  
بولی۔

"لیکن چھر بھی ہیر.... یوں اچھا نہیں لگے گا۔"  
شہریار نے اپنی تئیں سمجھانا چاہا۔

"کیا اچھا نہیں لگے گا۔"  
آنکھوں کو بڑا کیے، زبردستی چہرے پر مسکراہٹ جمائے گھورتے ہوئے بولی۔

"دیکھیں پہلے میری اماں نے میری منگنی نہیں رکھنے دی کہ نکاح سے پہلے یہ چونچلے اچھے نہیں  
ہوتے۔ اب تو نکاح ہو گیا اب کیا مسئلہ ہے۔

آپ پہنا رہے ہیں کہ نہیں، سب کزنوں کے سامنے میری عزت دو کوڑی کی کرنا چاہتے ہیں تو  
شوق سے کریں۔"

اور آخر میں اپنے قیمتی آنسو کی مدد سے وہ شہریار کو نرم کر ہی گئی۔

"اچھا ہاتھ آگے کرو۔"

جیب سے ڈبیا نکالتا وہ بولا۔ تو ہیر نے جھٹ سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔  
سُج کے نیچے بیٹھے سب کے منہ یک دم بند ہوئے تھے، اور آنکھیں سُج پر بیٹھے، ہیر اور شہریار پر  
تھیں۔

شہریار نے نرمی سے اسکے ہاتھ کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے، ایک ڈامنڈ کے نگ سے جڑی انگھوٹی اس  
کی بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی۔

"اب مجھے مٹھائی کھلائیں۔"  
ہیر نے ایک اور فرمائش سامنے رکھی۔ اب کی بار تو شہریار کی بھی پوری آنکھیں کھل گئیں۔

"میں کھلاؤں؟"

انگلی اپنی طرف کیے، وہ اب بھی بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

"اور کیا؟ سب دیکھ رہے ہیں، میں خود سے کھاتی ہوئی اچھی لگوں گی"

"تو میں کھلاتا ہوا اچھا لگوں گا۔"

شہریار اپنے ساتھ بیٹھے ضامن اور ضیغم کو دیکھنے لگا جو مسکرا کر اسکی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس سب کا الگ ریکارڈ لگنا تھا۔

"تو اور کیا! کھلائیں نا"

ہیر کے اصرار پر شہریار نے سامنے رکھی پلیٹ کو دیکھا۔

"ارے یہ نہیں برنی کھلائیں مجھے۔"

اسے گلاب جامن اٹھاتے دیکھ کر، ہیر نے ٹوکا۔

شہریار نے برنی کا ٹکڑا اٹھا کر اس کے منہ میں رکھا۔

ہر طرف سے تالیاں بجنے لگی۔ ہیر بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ایک اور ارمان پورا ہو چکا تھا، ہاتھ میں پہنی انگھوٹی کو دکھانے کی غرض سے کبھی گلے میں پہنے گلوبند پر ہاتھ پھیرتی، تو کبھی دوپٹہ درست کرتی۔

تائشہ اور عینا باری باری اس کی مخروطی انگلی میں پہنی رنگ کو دیکھ کر مبارک باد دے رہی تھی۔

اس سب کے بعد کمزوروں کا جھگڑا بھی سب کے اوپر لگ گیا تھا۔ کوئی انگھوٹی کے قیمتی ہونے کا کہہ رہی تھی تو کوئی لفظ ڈامنڈ پر ہی آنکھیں پھیلائے کھڑی تھی۔ ان سب کے تاثرات دیکھ کر ہیر کے دل میں ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔

اور شہریار وہ ہیر کے چہرے پر ناختم ہونے والی مسکراہٹ، کو دیکھتے خود بھی مسکائے جا رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

مغرب سے عشاء ہو گئی۔ اور اب رات کے دس بجنے والے تھے۔ قریب سے آئے رشتہ دار اپنے گھروں کو جانے لگے جب کہ دور سے آئے رشتہ دار آج انہیں کے گھر ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔ لان میں ہوا تیز چل رہی تھی، آسمان بھی بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ گہرے بادلوں نے چاند ستاروں کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ لان میں لگی سجاوٹ کو اتارا جا رہا تھا کیونکہ بارش کا قوی امکان تھا۔

مہمانوں کو کھانا بھی کھلایا جا چکا تھا۔ لڑکیوں نے ہلا گلا بھی خوب ڈالا اور اب سب تھک بار کر کمروں میں دہکی بیٹھی تھیں۔ بڑی بزرگ تو ایک جگہ بیٹھیں، خاندان بھر کی برائیوں میں مشغول تھیں۔ نکاح کے لیے لڑکے والوں کی طرف سے آئے مہمان بھی جانے کو تیار تھے۔

عینا کو ابھی تک ڈرائیور لینے نہیں آیا تھا، باہر بارش کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔ ننھا سا دل سہم کر دہڑک رہا تھا۔ تمام تر حسیات باہر متوجہ تھیں۔ ہیر نے تو کہا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں میں سے کسی سے کہہ دیتی ہے پر عینا نے صاف منع کر دیا۔ اور اب بے چینی سے دروازے کے پاس کھڑی چکر لگا رہی تھی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

ضیغم، باہر فون سننے نکلا تھا عینا کو گھر کے داخلی دروازے پر کھڑے دیکھ کر وہیں آگیا۔ عینا نے جواب دینے کی بجائے، منہ ہی دوسری طرف کر لیا۔ ناراضگی ظاہر کرنے کا انداز تھا۔ اس کی اس حرکت پر ضیغم کے لبوں پر مسکان سہی۔

"باہر بارش ہونے والی ہے۔ شاید بجلی بھی زور سے کڑکے، تو اچھا ہوگا اندر چلی جاو۔" سرسری سا کہتے، اور زور کو کھینچ کر کہا۔ پھر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

"مجھے.. گھر.. جانا ہے.. ڈرائیور نہیں آیا۔"

بارش اور بجلی کے ذکر پر گھبرا کر اٹک اٹک کر کہتی، امید بھری نظروں سے ضیغم کو دیکھنے لگی۔ لاکھ ناراضگی ایک طرف پر وہ بارش اور بجلی کی نظر نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"آو میں چہوڑ دوں".

اس کے چہرے پر خوف کے سائے دیکھ کر پیش کش کی۔  
اس پیش کش پر تذبذب کا شکار ہوتی وہ انگلیاں چٹھانے لگی۔

"بارش کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے۔ اگر ڈرائیور کا انتظار کرنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دو گھنٹے بعد آئے۔"

جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اسے انگلی میں گھماتا ایک بار پھر سے پلٹا۔

"رکیں.. مجھے بھی... اپنے ساتھ لے جائیں۔"  
وہ اسکی پشت کو دیکھتے بولی۔ ضیغم مسکرا کر پلٹا۔

"you are always welcome".

دل کے مقام پر ہاتھ رکھتا، اسے دوسرے ہاتھ سے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔  
وہ بھی اللہ کا نام لیتی چل پڑی۔



\*\*\*\*\*

ہیر اپنے کمرے میں موجود آئیے کے سامنے بیٹھی اپنی انگلی میں پہنی انگھوٹی کو دیکھ رہی تھی جس کی چمک آنکھوں کو خیرا کر رہی تھی۔

وہ تو آنکھوں میں قندیلیں جلائے آج بہت خوش تھی، ہر کسی کے منہ سے اپنے اور شہریار کی تعریف سن کو پھولے نہیں سمارہی تھی۔

تالشہ محبت پاش نظروں سے اس کی مسرت سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر دل ہی دل میں اس کے صدا برقرار ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ ہاتھ تیزی سے اس کے کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک تمام کزنیں یہیں پر موجود تھیں۔ اور ہر چیز بے ترتیب پڑی تھی۔ جو کہ تالشہ کی طبیعت کے برخلاف تھا، چیزوں کی بے ترتیبی اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ ہاں یہ الگ بات تھی اب تک وہ خود ہی بے ترتیب تھی۔

کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا، شہریار اور ضامن دروازے کی دہلیز پر قدم جمائے کھڑے تھے۔ شہریار نے ہاتھ بڑھا کر انگلی سے دروازہ بجایا۔

دروازہ کھٹکنے کی آواز پر ہیر اور تائشہ کی بیک وقت نظریں شہریار اور ضامن پر پڑی جو دروازہ دہکیل کر ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

"مجھے ہیر سے کچھ بات کرنی تھی۔"

دونوں کو اپنی جگہ ساکت دیکھ کر شہریار نے ذرا جھجھکتے ہوئے کہا تھا۔

بڑی مشکل سے سب بڑوں کی اجازت کے بعد وہ کچھ وقت اپنی نئی نویلی منکوحہ کے ساتھ گزارنے آیا تھا۔ اور اب تائشہ بھی یہیں موجود تھی، اسے یہاں سے ایسے نیچھنے پر جھجھک آرہی تھی۔

"شہر۔"

شہریار کی سوچ کے برخلاف، تائشہ مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی چیزیں سلیقے سے رکھتی ہوئی وہاں سے باہر چلی گئی۔ پر اس سے پہلے وہ ہیر سے گلے لگ کر ملنا نہیں بھولی۔ ویسے بھی دیر ہو چکی تھی۔ اور اب اسے گھر جانا چاہیے تھا۔

ضامن کے سامنے اس کی ایک نئی پرت کھلی تھی، وہ بہت نفاست پسند تھی۔ جیسے تیزی اور سلیقے کے ساتھ وہ نفاست سے چیزیں سمیٹ کر رکھتی، کتنی سکھڑ لگ رہی تھی۔

اپنے سامنے سے مسکرا کر گزرتی تائشہ پر نظر ڈالی تو دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگی تھیں۔ انہیں سنبھالتا نظریں پھیر کر، وہ مسکرا کر شہریار اور ہیر کو دیکھنے لگا۔ اور پھر شہریار کو وہیں چھوڑے، اپنے کوٹ کو جھٹکا دے کر مڑ گیا۔

\*\*\*\*\*

تائشہ لاونج میں آکر ہیر کے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی کہ کب وہ فارغ ہوں اور کب اسے گھر پہنچائیں۔ عینا کو تو جانے کی جلدی تھی، وہ جاچکی تھی۔ ہیر نے کہا تھا کہ عادل بھائی اسے چھوڑ دیں گے لیکن اب وہ تھے کہ نظر ہی نہیں آرہے تھے۔

ابھی وہ لاونج کے دروازے سے جھانک کر پلٹی ہی تھی کہ کسی سے زوردار ٹکر کے سبب، دوپٹہ پاؤں کے نیچے آگیا۔ اور پاؤں مڑنے کی وجہ سے وہ خود بھی گرنے لگی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔ مقابل نے اسے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو۔"

ضامن اسے دیکھتے ہی بے دہیانی میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا، اور اس کے پلٹنے پر ہوش میں آکر ایک طرف ہوتا اس سے پہلے ہی وہ اس سے ٹکرا چکی تھی۔

"آہ..."

بمشکل تکلیف کو سہتی وہ سسکی بھر کر وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ لب بھینچ لیے، ماتھے پر سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔ اور وہ ٹخنے پر ہاتھ رکھے ہوئی تھی۔ شاید اسے ٹخنے پر موج آئی تھی۔

"دکھاؤ! ادھر"

وہ بھی اس کے ساتھ فرش پر پنچوں کے بل بیٹھتا پاؤں کا جائزہ لینے لگا، تالشہ نے پاؤں سمیٹ لیے۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

دانتوں کو آپس میں پیوست کیے، وہ درد سے بولی تھی۔

"کہاں ٹھیک ہو؟"

اچھا آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

اس کا چہرہ اس کی تکلیف کا پتہ دے رہا تھا۔ تبھی کچھ سختی سے کہتا وہ ہاتھ بڑھاتا اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"نہیں میں عادل بھائی کے ساتھ چلی جاؤنگی۔"  
وہیں بیٹھے بیٹھے ہی صاف انکار کرتی وہ اپنا پیر سہلانے لگی۔

"لگتا ہے تم نے مجھے ابھی تک دل سے معاف نہیں کیا ہے۔"  
اس کا انکار بھلا نہیں لگا تھا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔"  
چہرہ اوپر کو اٹھا کر ضامن کو دیکھتی، ہلکی سی زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"تو پھر میرے ساتھ جانے میں کیا مسئلہ ہے؟"  
وہ پھر سے ہاتھ آگے بڑھا چکا تھا اور اس بار اسے سہارا دیتا اٹھانے لگا تھا۔

"پر وہ عادل بھائی..."  
ہیر کہہ چکی تھی اپنے بھائی سے اور اب یوں بغیر بتائے جانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"وہ باہر مصروف ہیں۔ ان کے آنے تک شاید تم درد سے ہی فوت نہ ہو جاؤ۔"

اپنے کندھوں سے بھی نیچے آتی اس چھوٹی لڑکی کو ہنس کر جواب دیا جس پر تائشہ بھی خفیف سا ہنس دی۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑے بہت احتیاط سے اپنی گاڑی تک لایا تھا۔ اور تائشہ درد کی شدت کو برداشت کرتے لب بھینچ گئی۔

\*\*\*\*\*

ضیغم عینا کو لیے اس کے بتائے گئے راستے پر لے جا رہا تھا۔ اچھا ہی تھا کہ عینا کا ڈرائیور اسے لینے نہیں آیا تھا، ضیغم کو موقع مل گیا تھا کہ اس سے اپنے رویے کی معافی مانگے۔ آج اچھا موقع تھا کہ لگے ہاتھوں وہ اپنا دل کھول کر بھی اس کے آگے رکھ دے۔ پر یہ سب وہ کرے کیسے، دماغ کے گھوڑے چلا رہا تھا پر کچھ سمجھ نہیں پارہا تھا۔ اسی کشمکش میں جھٹکے سے گاڑی روکی۔ شکر تھا کہ عینا سیٹ بیلٹ باندھے ہوئے تھی۔ تبھی سر ڈیش بورڈ سے لگتے لگتے بچا تھا۔

"آپ نے گاڑی کیوں روک دی۔"

باہر آسمان پر دوڑتی گھٹائیں، اسے خوف میں مبتلا کر رہی تھیں۔ نظریں سامنے نظر آتی خالی سڑک پر دوڑاتے پوچھا، سٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں سیاہ رات کے باوجود سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"مجھے گھر جانا ہے، بارش شروع ہو جائے گی۔"

ضیغم کی طرف سے خاموشی پا کر، وہ سختی سے کہتے کہتے آخر میں منت پر اتر آئی۔

ضیغم اس کی منت بھری سختی پر ہنس دیا۔

"ایک شرط پر گھر لے جاؤنگا، پہلے میری بات سننی ہوگی۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا مجھے گھر جانا ہے۔"

ضیغم کی شرط سننے بغیر ہی عینا نے فیصلہ سنا دیا۔

"تو ٹھیک ہے بیٹھی رہو یہاں۔"

اسٹیرنگ چھوڑے وہ بھی ٹیک لگا گیا۔

عینا کبھی اس کی طرف دیکھتی جو آرام دہ حالت میں بیٹھے اس کے چہرے پر رقم اضطراری کیفیت بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، تو کبھی سامنے آسمان پر چھائی گھٹا کو دیکھتی۔ آخر میں تھک کر لب بھینچے پوچھا۔

"کیا سنانا ہے۔"

"آئی ایم سوری۔"

اس دن میں بہت زیادہ سختی سے پیش آیا۔  
ضیغم نے نرمی سے اس کی طرف مڑ کر اپنی بات کہی۔  
عینا نے بھنویں سکیرے اسے سنا۔

"آپ نے کہا تھا آپ کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے لیکن آپ نے مجھے ڈانٹا بھی اور مجھے بیوقوف بھی کہا۔"

عینا نے یاد کروایا اور اسے شرمندہ کرنا چاہا۔



"اسکے لیے بھی سوری۔ پر تم میری بھی حالت سمجھو نا میں ڈر گیا تھا۔ تائشہ جس طرح میرے پاس آئی تھی کہ تم مل نہیں رہی مجھے لگا تھا میری سانسیں بند ہو جائیں گی۔"  
ضیغم کو یک ٹک دیکھے اس نے سوال کیا۔

"کیوں؟"

اس سوال پر ضیغم نے نظر بھر کر اس کے چہرے پر ٹپکتی معصومیت کو دیکھا۔ گہرا سانس بھر کر کہا۔

"کیوں کا جواب دے بھی دوں تو تم کہاں سمجھ پاؤ گی۔"  
اسے نظریں ہٹا کر سامنے سے آتی سٹریٹ لائٹ کی روشنی پر نظریں ٹکائے بے بسی سے کہا۔

"آپ پھر سے مجھے بیوقوف کہہ رہے ہیں۔"  
وہ منہ بسور کر اسے سرزنش کر رہی تھی۔ ضیغم اس کے انداز پر ہنسا۔

"میں جھلا تمہیں بیوقوف کیوں کہوں گا۔ تم تو بہت معصوم ہو۔"

ناک چڑھائے وہ ضیغم کو ہی تک رہی تھی۔ چھوٹی سی ناک، چھوٹے باریک سے ہونٹ اس پر تضاد، بڑی بڑی آنکھیں۔ ضیغم کا دل چاہا، ان آنکھوں کو اپنی انگلی کی پوروں سے چھو لے۔ لب بھیج کر اس خواہش کو دل میں دبایا۔

"اس دن تو کہہ رہے تھے کہ میں معصوم نہیں بلکہ بیوقوف ہوں۔" انداز جتلاتا ہوا تھا۔ ضیغم کان کی لو مسلنے لگا۔ آخر یہ لڑکی روتے وقت بھی ساری باتیں دھیان سے سن رہی تھی۔

"معاف کر دو۔ ویسے بھی دوستوں میں تو ایسی چھوٹی موٹی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں نا۔" مصالحت کی راہ اپنائے، وہ اسی نرم لہجے میں بولا جس کی عینا عادی تھی۔ عینا اس کے انداز پر ہنسی روک نہ پائی۔ یہاں ہنسی کا پھوارا اس کے منہ سے نکلا اور وہاں زوردار آواز میں ساتھ بادل گرے تھے۔ بادلوں کی گرج پر عینا چیخ مار کر آنکھیں میچ گئی، ہاتھوں کو کانوں پر رکھ کر اس گرج کی آواز کو کانوں میں جانے سے روکنے لگی۔ اسکا پورا جسم ہلکا ہلکا کپکپا رہا تھا۔

"عینا کیا ہوا ہے؟"

اسکے ہاتھ کو کان سے ہٹاتے وہ فکر مندی سے بولا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں۔"

عینا ڈی سہمی سی اس سے منت کر رہی تھی۔

ضیغم اسکی آنکھوں میں ڈر صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بادل کی گرج سے کیسے سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بارش سے خوف کھاتی تھی۔ تبھی اس دن بھی بارش اور بادلوں کی گرج برس پر اندر چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔

"عینا ہم چلے جائیں گے گھر پر یوں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ادھر دیکھو۔ عینا میں کیا کہہ رہا ہوں ادھر دیکھو۔"

آنکھیں ہنوز بند کیے وہ بادلوں کی کڑک پر ہلکے ہلکے لرز رہی تھی۔ ضیغم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا پر وہ سر جھکائے، آنکھوں کو سختی سے میچے گھر جانے کی رٹ لگائے بیٹھی تھی۔

"عینا!۔"

ضیغم نے اونچی آواز میں سختی سے اس کا نام پکارا تھا۔ وہ پل میں سکتے میں آگئی۔ بند آنکھوں کو دھیرے سے کھول کر ضیغم کی آنکھوں میں دیکھا جہاں سختی طاری کی گئی تھی۔

"نکلو باہر..."

گاڑی سے باہر نکلتا اسکی طرف کا دروازہ کھولے وہ اسے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ عینا بے بسی سے لب کچلتی نہ میں سر ہلانے لگی۔ گاڑی میں وہ پھر بھی خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی لیکن باہر کھلی سڑک پر کھڑے ہونا اسکے دل کو لرزا رہا تھا۔

"میں نے کہا۔ باہر آؤ۔ ورنہ میں تمہیں یہیں چھوڑ کر چلا جاؤنگا۔"

جب اس پر اس دہمکی کا بھی اثر نہ ہوا تو بازو سے پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر نکالا۔ عینا با آواز رونے لگی تھی۔ بادل اب بھی آگے کی طرف چل رہے تھے، ساتھ میں مخصوص آواز بھی بلند ہو رہی تھی جو عینا کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھی۔

"عینا چپ... شش"

ہونٹوں پر انگلی رکھے وہ اسے چپ کروا رہا تھا۔ رونا اب سسکیوں میں بدل چکا تھا۔ ضیغم آج رحم نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اسے ڈر سے نکالنے کے لیے نرمی نہیں بلکہ سختی وقت کی ضرورت تھی۔

"آہ..."

بادلوں کی گرج کے ساتھ اب کی بار تیز روشنی کے ساتھ بجلی چمکی تھی۔  
عینا اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے جکڑتی اس میں اپنا چہرہ چھپا گئی۔  
اس کا رونا ایک بار پھر سے شروع ہو چکا تھا۔

"عینا ادھر آؤ..."

اسے اپنے بازو سے الگ کرتے، اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"سامنے دیکھو..."

ٹھوڑی سے چہرہ اونچا کرتے آسمان پر اشارہ کیا تھا۔  
ہوا کے زور پر اس کے بال اڑ کر ضیغ کے چہرے پر جا لگے تھے، جنہیں ہاتھ کی مدد سے سمیٹتا  
وہ دوسرے کندھے پر رکھ چکا تھا۔

"عینا آنکھیں کھول کر سامنے دیکھو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں تمہیں یہیں  
چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

ضیغم کی دہمکی پر ناچار اس نے آنکھیں کھول دیں۔

بادلوں کی گرج تھم چکی تھی۔ اور بجلی بھی ابھی نہیں کڑکی تھی۔ صرف ہوا کی سرسراہٹ تھی جو سرک کے دونوں اطراف لگے درختوں کی باڑ سے ٹکرا کر سرسراتی آواز پیدا کر رہی تھی۔

"تمہارا بارش سے ڈرنا فطری ہے۔ پر یوں ڈر کر چھپ کر بیٹھنا یہ بزدلی ہے۔ بارش بہت خوبصورت موسم ہے۔ اور بجلی کی کڑک وہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ کبھی دیکھا ہے جب بجلی کڑکتی ہے، تو چاروں طرف اجالا ہو جاتا ہے پل بھر میں لگتا ہے کہ دن کی روشنی رات کی سیاہی کو اڑا گئی ہو۔ اور جیسے ہی بجلی غائب ہوتی ہے پھر سے سرمئی چادر ہر سو پھیل جاتی ہے۔"

وہ دھیرے دھیرے اس کا مائنڈ واش کر رہا تھا۔ اور عینا صرف اسے سن رہی تھی۔ آنکھوں میں ڈر سے پانی امد آیا تھا۔ پر وہ ضیغم کے حکم کی تعمیل کرتے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں واقع رات کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

"ہاں! اس کی آواز کافی خوفناک ہوتی ہے۔ لیکن جیسے پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں ویسے ہی بجلی کے ساتھ اس کی کڑکار آواز بھی ہوتی ہے۔ تو اس کی صرف آواز کی وجہ سے ڈر کر، سہم کر اس موسم کا مزہ ہی نہ لیں؟"

عینا نے گردن کو بل دیے اسے دیکھا تھا۔ ضیغم اس کی متورنم آنکھوں میں دیکھ کر نظریں چرا گیا۔

"سامنے دیکھو، جب بجلی کر کے گی تو یہ آسمان دو حصوں میں بٹتا ہوا محسوس ہوگا ایسا خوبصورت منظر تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا عینا!"

عینا کا ننھا دل آج بھی وہ یہ منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔  
پر ضیغم بضد تھا اسے یہ حسین منظر دکھانے کو اپنے ہاتھوں کی مٹھی کو سختی سے بھینچے وہ بمشکل اپنی ٹانگوں کے سہارے کھڑی تھی۔

"تمہارا سارا دھیان سامنے ہونا چاہیے، تمہارا سارا دھیان بجلی کی چمک پر ہونا چاہیے اس کی آواز پر نہیں۔"

اس کی پشت پر کھڑا، کندہوں ہر دباؤ ڈالتا اسے سمجھا رہا تھا۔  
اور پھر بجلی کرچی تھی، عینا نے آنکھیں کھولے روشنی کو دیکھا تھا جو سچ میں آسمان کو دو حصوں میں کاٹ رہی تھی۔ سفید روشنی چاروں طرف دوڑ گئی تھج اور یہ بس کچھ لمحوں کا کھیل تھا پھر سے وہی سناتا چاہ گیا اور اس سنائے میں ہوا کی سرسراہٹ اب بھی باقی تھی۔

"کچھ ہوا؟"

اسے خاموش پا کر ضیغم نے کان میں سرگوشی کی۔

عینا نے نفی میں سر ہلایا، بند مٹھی کو کھول دیا تھا جو پسینے سے بھگ چکی تھی۔ اس نے وہ خوفناک کرک کی آواز سنی ہی نہیں تھی جسے سنتے ہی اس کا دل ڈوب جاتا تھا۔ ضیغم نے صحیح کہا تھا اپنا سارا دھیان روشنی پر رکھنا اسنے ایسا ہی کیا تھا، تو اسے وہ آواز سنائی ہی نہیں دی یا پھر سنائی دی تھی لیکن خوفناک نہیں تھی۔

"مجھے گھر جانا۔"

ہاتھ کی پشت سے وہ رخسار رگڑتی، پھر سے التجا کرنے لگی۔  
ضیغم سرد آہ بھرتے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا کہتا خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا۔

مریم بیگم موسم کی خرابی کی وجہ سے الگ پریشان تھیں۔ اور ڈرائیور کے بتانے پر کہ گاڑی خراب ہو چکی ہے ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ رحیم صاحب بھی شام کے وقت شہر سے باہر گئے تھے ان کی واپسی صبح تک تھی۔  
عینا کو وہ کیسے سنبھالینگے یہ خوف انہیں کھائے جا رہا تھا۔ کئی بار اسے کال بھی کر چکی تھیں پر وہ فون ہی نہیں اٹھا رہی تھی۔



وہ اسی پریشانی میں سر تھامے بیٹھی تھیں کہ مین گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"شکر ہے، رحیم آگئے۔"

بھاگ کر وہ باہر پہنچیں تو عینا جلدی جلدی چلتی گھر میں داخل ہوئی۔  
گاڑی کے چلنے اور پھر جانے کی آواز پر انہوں نے دیکھا تو عینا اکیلی تھی۔

"مما۔"

وہ ان کے سینے سے جا لگی۔

"عینا میری جان کس کے ساتھ آئی ہو۔"

رحیم صاحب ہوتے تو گھر آتے پھر کس کے ساتھ آ سکتی تھی۔

"ضیغم.. بھائی کے ساتھ۔"

وہ کہہ کر ان سے الگ ہوئی۔

"ضیغم.. کون؟"

انکے ماتھے پر لکیر ابھری تھی۔

"یونی۔۔۔ میں ہم سے۔۔۔ سینیر ہیں۔"

مریم بیگم کے ماتھے پر پڑی شکن اب ڈھیلی پڑی تھی۔

"چلو آؤ۔۔ مجھے بتاؤ کیسا رہا فنکشن۔"

شکر تھا کہ باہر سے آتی بجلی کی کرک کی آواز پر عینا نے کوئی رد عمل نہیں دیا تھا۔ وہ اسی طرح اسے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتی تھیں تاکہ اس کا دھیان بٹا رہے۔

\*\*\*\*\*

وہ دروازہ بند کرتا قدم قدم اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ہیر و میں سٹول پر بیٹھی، اسے اپنے قریب آتے دیکھ کر نظریں جھکا گئی۔

چہرے پر کی گئی آرائش نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ ناک میں پہنی چھوٹی بالی نما ننہ، ماتھے پہ ٹکا جھومر، اور کانوں میں سفید موتیوں کی لڑیوں سے لٹکتے بڑے سے آویزے، اس کی نظروں کو بھٹکا رہے تھے۔ جب وہ یونی آتی تھی تو میک اپ ضرور کر کے رکھتی تھی۔ پر آج

برائیل لک میں وہ اسے دنیا کی حسین ترین لڑکی لگی۔ یہ خوبصورتی اس کی اپنی آنکھوں اور دل میں موجود اس کے مقام کی وجہ سے بھی تھی۔ وہ تھی ہی اتنے اونچے رتبے پر کہ اس کی ہر حرکت، ادا اور ہر انداز پیارا لگنے لگتا تھا۔

"نکاح مبارک ہو۔"

ہاتھ کی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلاتے وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔  
ہیر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اپنی جانب اس کی جڑوں سے چورنگا ہوں پر پھر سے پلکیں لرز کر  
آنکھوں پر سایہ کر گئیں۔

"آپ کو بھی۔"

سُج پر بیٹھے، اس کی بولتی بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اور اب پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔  
مردانہ ہتھیلی اب بھی اس کے سامنے نکچی ہوئی تھی۔ ہلکے سے اپنا ہاتھ مضبوط ہتھیلی پر رکھا  
تھا۔ جسے شہریار نے محبت سے تھام کر اسے سٹول سے اٹھانے میں مدد دی۔

"تمہارا یہ روپ دیکھ کر مجھے پھر سے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیے، دوسرے ہاتھ کی انگلی پر اس کی چہرے پر جھولتی لٹ کو لپیٹنے لگا۔

بہر اس انداز پر سٹپٹا کر نظریں ہی نہیں اٹھا پارہی تھی۔ وہ اپنی شادی کو بھی گڈے گڈی کا کھیل ہی سمجھی تھی۔ جہاں اسے من چاہا دلہا ملا تھا۔ اس کا دیوانہ، جیسے اسکے گھر والے اسکی ہر خواہش منہ سے نکلتے ہی پوری کر دیتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ خود کو خوش قسمت تصور کرنے لگی تھی۔ شہریار اسکے دل کو بھی بھایا تھا۔ بھاتا بھی کیوں نا جو شخص آپ کو مان بخشے، آپکی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے خود کو بدل ڈالے جس کے جزیروں کی صداقت اس کے اعمال دیتے ہوں۔ ایسا شخص دل کو بھی بھلا معلوم ہونا ہی تھا۔

"کچھ کہو گی نہیں۔"

وہ چہرے پر شرمیلی سرخی جمائے، ہونٹوں کو مہینچے اور پلکوں کی جھالر گرائے کھڑی اسے مزید جسارتوں پر آمادہ کر رہی تھی۔

بھاری اور جزیروں کے خمار میں ڈوبی آواز سے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ بھی اس کے منہ سے کچھ سننا چاہتا تھا، کچھ اپنے بارے میں کچھ اپنے نئے بنے رشتے کے بارے میں...

"کیا کہوں؟"

نظریں اٹھانے کی ہمت کی تھی، اس کے چہرے کے گرد نظروں کو گھماتے وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

شہریار بے اختیار ہنس دیا۔

"کچھ بھی... اچھا یہی بتا دو کہ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔"

اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں پر نظریں جمائے وہ بولا، جہاں انگلیوں کی پوروں کو مہندی سے بھرا گیا تھا اور ہتھیلی میں گولائی شکل دے کر ٹکی بنائی گئی تھی۔

"اچھے لگتے ہیں۔"

اپنی غیر ہوتی حالت پر قابو پاتی، دل کی دہڑکنیں جو آج ریس لگا کر دوڑ رہی تھیں ان کو سنبھالنے میں ہلکان ہوتی وہ اس کی چوڑی ہتھیلی میں موجود اپنے ہاتھوں پر نظر رکھے بولی۔

"صرف اچھا لگتا ہوں؟"

نرم ملائم ہاتھوں کی انگلیوں پر دباؤ بڑھاتے وہ پیار بھرے لہجے میں سوال کرنے لگا۔  
نظریں اپنے ہاتھوں پر ہی رکھے، وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"اچھا، پر تم مجھے صرف اچھی نہیں لگتی۔ میں تم سے شدید محبت کرنے لگا ہوں ہیر۔"  
 اچھا پر زور دیتے وہ اپنی حالت کے بارے میں بتانے لگا۔ لفظ لفظ سچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور لہجہ اسے  
 تو محبت کی آنچ پر سیکا گیا تھا۔

"دیکھو یہ مہندی کارنگ بھی میری تم سے شدید محبت کی گواہی دے رہا ہے۔"  
 مہندی کارنگ تیز آیا تھا۔ لوگ جو بھی کہیں پر ان کے ہاتھوں پر مہندی کارنگ تیز ہی آتا ہے یہ  
 ان کے ہاتھوں کی تپش کے اثر میں ہوتا ہے۔

"ارے نہیں.. مہندی کارنگ تیز آئے تو اس کا مطلب ہے ساس زیادہ پیار کرتی ہے۔"  
 ساری شرم ایک طرف پر اس معاملے میں ہیر اپنے علم کے خلاف کوئی بات سن لے اور اسکی  
 تردید نہ کرے کم ہی ممکن تھا۔

اب حقیقت کون جانے کہ مہندی کارنگ، کس کی محبت کا پتہ دیتا تھا۔ جتنے لوگ اتنی باتیں!

"شکر ہے تم بولی تو صحیح۔"

اس کے اچانک بولنے پر وہ ہنستے ہوئے اسکے دوسرے ہاتھ میں موجود دوپٹے کی کناری کو نکال کر اپنے ہاتھ میں لپیٹنے لگا۔  
ہیر بھی شرمیلا سا ہنس دی۔

سنو! مجھے اچھے لگتے ہیں  
یہ مہندی، یہ کنگن اور تم

انگلی اس کے ہاتھ کی پشت پر بنی گول ٹکی کے گرد گولائی میں گھماتے، اس نے پیار کے خمار بھری آواز میں سرگوشی کی تھی۔  
اور ہیر کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آن بسی تھی، پلکیں حیا کے بوجھ تلے دبی اٹھنے سے انکاری تھیں۔

جب کہ ہاتھ اب بھی اس کی قید میں تھا۔

شہریار کی نظریں اب بھی اپنی ہتھیلی میں قید اس کے ملائم ہاتھوں پر جمی تھیں۔ جہاں مٹھلی ہاتھوں کی پشت پر مہندی سے سرخ نقش دے کر گول ٹکی بنائی گئی تھی۔ انگلیوں کے سروں

پر بھی مہندی سبھی تھی۔ جس سے دودھیارنگ کے نرم و نازک ہاتھوں کا نکھار سرخ مہندی کے حسن سے مزید بڑھ گیا تھا۔

جب نظریں انگلی کے سروں سے ہو کر اس میں پہنی انگھوٹی اور اس میں چمکتے ہیرے پر بھٹکیں تو دل موہ لینے والی مسکراہٹ لبوں کا حصہ جا بنی۔  
اور پھر جھک کر انگھوٹی میں سب سے واحد ہیرے پر مکمل استحقاق کا ثبوت دیا تھا۔ اپنی محبت کی پہلی مہر ثبت کی تھی۔  
اور وہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر ہاتھ کھینچنے لگی۔

کلائی میں پہنے گجروں سے آتی گلاب اور موتیے کی خوشبو اسکے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اسکے ہاتھ پر دباؤ بڑھاتے، جھکے ہی ان کی خوشبو کو گہرا سانس بھر کر اندر اتارا۔

"یہ وہاں نہیں ہو سکتا تھا، تہی وہاں پہنانے کے حق میں نہیں تھا۔"

پھر سے اپنی شوخ نظریں اس کی آنکھوں میں ڈالے دلفریب لہجے میں کہا۔ ہیرے نے بے ساختہ آنکھیں میچ لی۔ نچلے لب کو کچلنے لگی تھی۔



معنی خیز خاموشی سے گھبرا کر اپنا ہاتھ اسکی نرم پکڑ سے نکالتی جھٹکے سے مڑی تھی۔ پر ابھی قدم اٹھایا بھی نہیں تھا کہ رک گئی۔ دوپٹے کی کناری جو شہریار نے اپنے ہاتھ پر لپیٹی تھی، جھٹکے سے مڑنے پر کلائی میں موجود گھڑی میں جا اٹکی۔

ہیر دوپٹے کو شہریار کے ہاتھ میں سمجھ رہی تھی جب کہ دوسری طرف شہریار بہت احتیاط سے دوپٹے کی کناری کو نکالنے کے جتن کر رہا تھا۔

وہ جو شہریار کی طرف سے کسی بات کی منتظر تھی یا پھر یہ کہ وہ کناری چھوڑ کر اسے جانے کا کہہ دے گا۔ اپنے پیچھے سے مسلسل خاموشی پا کر، دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں لیے ایک بار پھر جھٹکا دے کر وہ مڑی تھی کہ چرر کی آواز سے کناری اور اس کے ساتھ دوپٹے کے بارڈر کا کچھ حصہ بھی پھٹ گیا۔

صدے سے گنگ ہوتی اپنے دونوں ہاتھوں میں دوپٹے کو تھامے وہ اپنے چہرے کے پاس لائی جس کے پھٹنے کے بعد سامنے کھڑے شہریار کا چہرہ واضح دیکھا جاسکتا تھا۔

"اوو"

ہونٹوں کو گول کیے وہ داڑھی کھجاتا ہیر کو دیکھ رہا تھا جو اب آنکھیں سکیڑے چپ سادھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم ہی چاہتی تھی نا کہ تمہارا دوپٹہ گھڑی میں اٹکے، کسی فلمی سین کی طرح دیکھو..."  
شہریار کھسیانی ہنسی ہنستا بات ابھی پوری بھی نہیں کر پایا تھا۔ ہیر دبی دبی آواز میں غرائی۔

"اٹکنے کا کہا تھا، پھٹنے کا نہیں۔ میرا نکاح کا دوپٹہ پھاڑ دیا۔"  
آخری جملے تک آتے ہی وہ روبانسی ہو چکی تھی۔ نچلے ہونٹ کو باہر کی جانب لٹکائے، آنکھوں میں  
نی اترنے لگی تھی۔

"پھاڑ دیا؟ میں نے نہیں پھاڑا ہے، وہ تو تم پیچھے پلٹی تھی تو جھٹکے کی وجہ سے پھٹ گیا۔"  
شہریار نے وضاحت کی۔

"آپ کہنا چاہ رہے ہیں یہ میری وجہ سے پھٹا ہے۔"

آنکھوں کو بڑا کیے وہ اس سے استفسار کر رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اگر ہاں کہا گیا تو وہ جھپٹ پڑے گی۔ تبھی شہریار نے نہ میں سر ہلادیا کیونکہ اسی میں ہی عافیت تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا لڑکیاں کبھی اپنی غلطی نہیں مانتی اور ہیر تو کبھی بھی نہیں۔

"میرا خوبصورت دوپٹہ!"

پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی اسے۔

اسکے تنے ہوئے چہرے کے نقوش کچھ ڈھیلے پڑے تھے۔ پھر سے رونی صورت بنائے، دوپٹے کی کناری پر ہاتھ پھیرنے لگی جو اب پھٹ چکی تھی۔

"آئی ایم سوری.. میں ایسا ہی دوپٹہ لے دوں گا۔ تم رونا مت پلیز۔"

اپنی غلطی نہ ہو کر بھی معافی مانگنا لڑکوں پر فرض ہے اور وہ بھی ان لڑکوں پر جو محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبے ہوں۔

شہریار کی پیش کش پر اس کی آنکھیں چمکیں۔

"سچ؟"

رونا بھول کر وہ بشاشت سے گویا ہوئی۔

شہریار نے ہاں میں سر ہلادیا۔

"تھینک یو۔"

خوشی سے کہتی ایک بار پھر شہریار کو سرشار کر گئی۔ ابھی وہ کچھ کہتا اس جواب میں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور کوئی دروازہ دہکیل کر اندر آیا۔

"دلے صاحب! ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔"

مسکراتے ہوئے چھوٹی بھابھی اسے یہاں سے جانے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

ان کی بات سن کر مسکراتا ہوا، کچھ نجل سا، ایک بھرپور نظر ہیر کے سرپے پر ڈال کر، پاس سے گزر گیا۔

\*\*\*\*\*

"ٹھیک ہو؟"

تائشہ ہونٹوں کو آپس میں پیوست کیے تکلیف کی شدت کو برداشت کر رہی تھی، جو صاف اس کے چہرے پر رقم تھی۔ ضامن نے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"ہاں! ہم کب تک پہنچینگے"

لب بھینچے وہ سامنے راستہ دیکھنے لگی۔ ہلکی ہلکی پھورا شروع ہو چکی تھی۔ گاڑی کے شیشے سے ٹکراتے بارش کی بوندیں پھسل کر بہہ رہی تھیں۔ اور تالشہ کے پاؤں میں اٹھتی درد کی ٹھیس، اب اس سے مزید برداشت نہیں ہو پارہی تھی۔

"بس کچھ دیر میں لگتا ہے بارش تیز ہونے والی ہے۔"

ضامن کے تخمینے پر تالشہ نے محض سر ہلایا۔

ٹخنے پر آئی موج اور پھر پاؤں پر زور دیتے وہ لاونج سے پورش تک آئی تھی جس کی وجہ سے درد مزید بڑھ گیا تھا۔

"او! بارش تیز ہو رہی ہے، اور تیز بارش میں جانا مشکل ہے۔ کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں۔"

بارش کے تیز ہوتے ہی، گاڑی کو بریک لگا کر سڑک کے ایک طرف روکتا تالشہ سے بولا۔  
جو بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی۔

"میں کچھ ہیپ کروں، مجھے لگتا ہے موج آئی ہے۔ جھٹکا دینے سے ٹھیک ہو جائے گی۔"  
 ماتھے پر پڑی شکنیں، اور آنکھوں میں آئی ہلکی سی نمی کو دیکھتا وہ نرمی سے بولا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

سجھاو سے انکار کرتی وہ باہر دیکھنے لگی۔

وائپر سامنے کے شیشے پر پڑتی بارش کی بوندوں کو صاف کر رہا تھا۔ اور بارش وہ تیز سے تیز ہوتی  
 جاری تھی۔

چند پل خاموشی کے گزرے، ضامن نے اسے پکارا۔

"تالاشہ!"

"ہوں۔"

اس کی پکار پر نظریں سامنے برستی بارش سے ہٹائے، ضامن کی طرف موڑیں جو اسے ہی دیکھ رہا  
 تھا۔

"وہ.."

میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ اس تھپڑ کی وجہ سے، میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ پر نجانے کیسے میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اگر تمہارے دل میں اس حرکت کو لے کر اب بھی کچھ ہے تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ اور تائشہ اپنا درد بھولے اسے سن رہی تھی۔ وہ شرمندہ دکھ رہا تھا، کتنا کچھ بدل گیا تھا نا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے انفیکٹ مجھے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر دھماکا کر رہی تھی۔ ضامن ہونق پن سے اسے دیکھ رہا تھا جو تکلیف کے باوجود ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بیٹھی تھی۔

"کیوں؟"

ضامن کے سوال پر اس نے لمبا سانس خارج کرتے ہوا کے سپرد کیا۔

"کیونکہ اس تھپڑ نے مجھے سمجھایا کہ میں جس طرز کی زندگی گزار رہی تھی، وہ بس ایک دکھاوا تھا۔ میرا اصل وہ نہیں تھا۔ وہ تو خود کو بظاہر مضبوط دکھانے کے لیے وہ حلیہ اور وہ طرز زندگی اختیار کیا ہوا تھا۔ پر لڑکیاں اپنی حدود میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ یہ آپ نے مجھے سکھایا۔"

وہ ضامن کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ بس کسے جارہی تھی۔

"یہ دوسرا تھپڑ تھا جو مجھے اپنے زندگی میں پڑا تھا اور دوسری بار میری زندگی بدل گیا۔"

وہ سامنے چھم چھم کرتی پانی کی موٹی موٹی باندوں کو تکیے کہہ رہی تھی۔

"پہلا تھپڑ... (تلخ سی ہنسی نے لبوں پہ ڈیرا آ بسایا)

خیر اسے تھپڑ تو نہیں کہہ سکتے، وہ تھپڑوں کی بارش تھی جس نے میری زندگی بدل دی۔"

پھر رک کر نظریں موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے ضامن کو دیکھا جو انہماک سے اسے صرف سن ہی نہیں رہا تھا بلکہ غور سے اس کے چہرے کے خوخال حفظ بھی کر رہا تھا یہ لاعلمی میں ہی صحیح پر ہو رہا تھا۔

"پتہ ہے پہلے تھپڑ نے مجھے تالشہ سے تشو بنا دیا تھا۔"

کچھ توقف کے بعد بولی۔



"ہمیں آدھی جائیداد کوڑیوں کی صورت میں دے کر امی آپا اور مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ یتیم بچیاں ہیں کہاں جائینگی، کیسے رہینگی، کیا کرینگی۔ میں بھی اس وقت اسکول میں پڑھتی تھی۔ سمجھ بوجھ تو تھی کہ ہمارے ساتھ غلط ہو رہا ہے۔ بس بہادر بن کر پہنچ گئی چاچا کے پاس کہ ہمارے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں۔

اور انہوں نے مرے ہوئے بھائی کا بھی خیال نہیں کیا اور... تھپڑ مار دیا۔" وہ آنسو چھپانے کی خاطر ہنس پڑی تھی۔ اس کی آواز اور آنکھیں جھوٹی ہنسی کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ وہ بات پر ہنس رہی تھی، یا خود پر ضامن کے لیے فیصلہ کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ اب بھی چپ سادہ ہے اسے سن رہا تھا۔ نہ رونے سے روکا نہ ہی آنسو پونچے۔ بس آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے، اسے سنے گیا۔

"روتی روتی امی کے پاس گئی، تو پتہ ہے امی نے کیا کہا؟۔"

ہاتھ کی پشت سے گال صاف کرتی اس نے ایک سوالیہ نظر اس پر ڈالی اور پھر سامنے بوندوں کو دیکھا جو زور پکڑ چکی تھیں۔

"وہ کہتیں اگر سلیمان بھائی ہوتے تو کسی کی ہمت نہ ہوتی، نہ ہی ہمیں گھر سے نکالنے کی اور نہ ہی مجھے مارنے کی۔ پر وہ تو یہاں نہیں تھے۔" پھر سے اسے دیکھا تھا، وہ اب بھی خاموش تھا۔

"بس پھر پہن لیا بھائی کا کرتا۔ اور بن گئی تشو۔ بھائی نہیں تھا تو کیا ہوا میں خود ہی بن گئی اپنے لیے اس کے بعد میں اپنی ہر لڑائی خود لڑتی چلی گئی۔

پر میں بھول گئی تھی کہ لڑکوں جیسے بال چھوٹے کروا کر ان جیسے کپڑے پہن کر بھی وہ لڑکی ہی رہتی ہے۔ اسے مضبوط بننے کے لیے ان سب کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو اپنے رویے سے مضبوط ہوتی ہے۔"

بھگی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے صاف کرتی وہ پل بھر کو کی۔

"تھینکس ٹو یو۔ آپ نے مجھے پھر سے تائشہ بننے پر مجبور کر دیا۔"

وہ دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے، نم آنکھوں میں گلابی ڈوریں لیے اس سے مخاطب تھی، ہاں لفظوں میں طنز یا تلخی وہ ضرور تھی۔ آخر تھپڑ جیسی ہتک سے سامنا ہوا تھا، اتنا آسان بھی نہیں تھا سب بھلانا۔

یہ بھگی مسکراہٹ، ضامن کے دل پر چھریاں چلا رہی تھی۔ انجانے میں ہی صحیح، پر یہ سب بھی ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی پرت در پرت اس کے سامنے کھل رہی تھی۔ کیا تھی وہ، یہ جو اب دکھ رہی تھی یا وہ جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔

وہ تو خول تھا جسے اپنے اوپر چڑھائے ہوئے تھی۔ اپنے اندر کی کمزوریوں کو چھپانے کی خاطر ہنستی مسکراتی، اچھلتی کودتی تشو اندر سے تائشہ تھی۔ جو عام لڑکیوں کی طرح سلیقہ شعار تھی اس کا بڑھ چڑھ کر آج کام کرنا، چیزیں سمیٹ کر رکھنا، ادھر سے ادھر جا کر بھا بھئیوں کے ساتھ ہاتھ بٹانا اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

انسان کا پہلا تاثر ہی آخری سمجھا جاتا ہے پر کبھی کبھی وہ صرف مصنوعی تاثر بھی ہوتا ہے، اسے آخر مان لینا بیوقوفی کے سوا کچھ نہیں۔ ضامن نے بھی بے وقوفی کی تھی، تائشہ کی ظاہری حرکات سے وہ اسے لااوبالی اور بد لحاظ سمجھتا رہا پر وہ تو کچھ اور ہی تھی، بہت الگ اور منفرد!

"بارش رک گئی ہے۔"

تیز بارش اب رک چکی تھی۔ ہلکی ہلکی پانی کی بوندیں اب بھی ٹپک رہی تھیں۔

"ہوں۔"

وہ جو تائشہ پر نظریں جمائے اسکے بارے میں ہی سوچ رہا تھا، تائشہ کے بولنے پر چونکا تھا۔

"ہمیں گھر جانا چاہئے، بارش رک گئی ہے۔"

تائشہ نے سامنے اشارہ کرتے اس کی توجہ مبذول کروائی۔

ضامن بھی خفیف مسکراہٹ لاتا، سر جھٹک کر گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔

تائشہ کے بتائے گئے راستے پر اس کے گھر کے باہر گاڑی کھڑی کی تھی۔

بادل اب بھی بسیرا جمائے ہوئے تھے۔ بوندیں ٹپکنا ابھی بند ہو چکی تھیں۔

"آؤ میں ہیلپ کردوں۔"

وہ گاڑی سے اترتی تھی، پاؤں زمین پر رکھتے ہی درد کی لہر پھر سے منہ زور ہوئی تھی۔ لبوں کو کچلتے، سسکی روکتے وہ گاڑی کے سہارے ہی آگے بڑھ رہی تھی، ضامن نے ہاتھ آگے بڑھائے سہارا دیا تھا۔

"کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

تائشہ! میری بچی یہ کیا ہوا ہے؟

دروازہ کھلتے ہی امی نے شکایت شروع کر دی، پر اسے کسی لڑکے کے سہارے کھڑے دیکھ کر پھر اس کو لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوتے دیکھ، وہ حواس باختہ ہوئیں۔  
ان کی آواز سن کر اندر اپنے بیٹے کو سلاتی آیا بھی باہر نکل آئیں۔

"کچھ نہیں ہوا امی، بس ہلکی سی موج ہے۔"

آنکھیں بند کیے، درد برداشت کرتی دیوار کے سہارے لاونچ میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ مزید چلنا مشکل تھا۔

ضامن وہیں دروازے پر کھڑا تھا، تائشہ کی حالت دیکھ کر اسکی امی بھی پریشان اس کے پیچھے ہی چلی تھیں۔ اور اسے تو بھول ہی گئی تھیں۔

"دکھاؤ مجھے کیا کرتی پھر رہی ہو تائشہ۔"

اس کے پاؤں سے سینڈل اتارنے کو ہاتھ بڑبایا ہی تھا کہ تائشہ نے ان کے ہاتھت روک لیے۔

"امی ٹھیک ہوں میں۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"کیسے پریشان نہ ہوں؟ تائشہ کیوں امی کو پریشان کرتی رہتی ہو۔"  
آپا بھی اسکے برابر میں بیٹھیں، اسکے پاؤں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"یہ لڑکی اس عمر میں مجھے پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کہا بھی ہے کہ شادی کر کے اپنے گھر چلی جائے، میں روز روز کی پریشانی سے تو بچ جاؤنگی۔"  
وہ روتے ہوئے کہتی پلو منہ پر جما چکی تھی۔

ضامن انہیں خود میں مصروف دیکھ کر جانے لگا تھا کہ کانوں میں آخری جملہ پڑتے ہی قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اچانک سے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ عجیب وحشت سی طاری ہو رہی تھی۔ جس سے فی الوقت وہ ناواقف تھا۔

"دیکھو تو پاؤں سو جھ گیا ہے۔ موج آئی ہے۔ امی آپ فکر نہ کریں اسے میں سمجھاتی ہوں۔ جتنا پڑھنا ہوگا شادی کے بعد پڑھ لے گی۔"

آپا اس کے پاؤں کا معائنہ کرتی بولتی جا رہی تھیں۔ امی کو تسلی دیتی ایک بار پھر تائشہ کو سمجھانے لگی تھیں۔

درد پہلے ہی ناقابل برداشت تھا اوپر سے جس موضوع پر انہوں نے باتیں شروع کی تھیں وہ شدید ناپسندیدہ تھا۔

"آپ لوگ تو چپ کریں، وہ کہاں گئے؟"

اچانک سے ضامن کا خیال آتے ہی دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا

"کون کہاں گئے؟"

آپا نے پوچھا۔

"ہاں.. وہ لڑکا کون تھا؟"

امی کو بھی اب یاد آیا تھا۔

"شہریار بھائی کے دوست ہیں، چھوڑنے آئے تھے۔"

سر جھٹک کر کہتی وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند گئی۔

آپا اور امی پاؤں کے ساتھ ٹوٹکے آزماتے ہوئے، پھر سے شادی کا قصہ لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ پر

تالشہ ایک کان سے سنتی اور دوسرے نکال دیتی تھی۔ ایک مہینے سے وہ یہی کر رہی تھی۔ اور

اگے بھی یہی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

\*\*\*\*\*

وہ واپسی پر بے چین تھا، کیوں تھا؟ اس کا جواب جو سینے میں دھڑکتا دل دے رہا تھا، وہ قابلِ قبول نہ تھا۔

یعنی وہ بھی اسی راستے پر چل نکلا تھا۔ جس راہ پر چلتے مسافروں کا وہ مذاق اڑایا کرتا تھا۔ آج خود کا مذاق بن رہا تھا۔

یہ تو ریت چلی آرہی تھی، محبت خود پر ہنسنے والوں کو بھی اسی جگہ لا کھڑا کرتی تھی۔

ڈرائیو کرتا وہ مسلسل خود میں ہی الجھا ہوا تھا۔ دل بغاوت کر بیٹھا تھا اور اسے بھی باغی ہو جانے پر اکسا رہا تھا۔

بجٹے فون پر اس کی محویت لٹٹی تھی۔ وہ کب سے بے مقصد ہی گاڈی اسلام آباد کی سڑکوں پر دوڑا رہا تھا۔ گاڈی روکتا وہ الجھی ڈوروں کو کچھ پل کے لیے پس پشت رکھتا، فون کی سکرین پر چمکتے شیریں کا نمبر رسیو کر چکا تھا۔

"کہاں ہو تم دونوں۔ مجھے چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہو۔"



اسپیکر سے شیری کی جھنجھلائی آواز برآمد ہوئی۔

وہ ہیر کے گھر سے نکلا تھا تو ضیغم اور ضامن دونوں جاچکے تھے۔ وہ بھی گھر والوں کے ساتھ تھا۔ گھر پہنچ کر کچھ وقت ان کے ساتھ گزارا اور ان کے آرام کے لیے جانے کے بعد ضیغم اور ضامن سے ملنے کا دل ہوا تو دونوں کو کال ملا دی۔

ضامن ہلکا سا ہنسا تھا جب کہ ضیغم کا قہقہہ اسے بھی سنائی دیا تھا۔

"یار تم بھابھی جی کے ساتھ بڑی تھے تو میں بھی نکل آیا وہاں سے۔"

ضامن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"واہ، بھابھی جی بہت مثبت تبدیلی آئی ہے بھئی تم میں۔"

یہ ضیغم تھا، اور مثبت کا تو پتہ نہیں پر تبدیلی ضرور آئی تھی اور اسکی اندر کی دنیا ہلا کر جاچکی تھی۔

"اب تم لوگ باتوں پر وقت ضائع نہ کرو۔ ضیغم تو گھر پہ ہی ہے نا، میں آرہا ہوں تیرے گھر۔ ضامن تو بھی پہنچ۔"

سیکنڈوں میں پلان تیار تھا۔

"نہیں! نہیں! گھر نہیں۔ ایک تو میں گھر سے باہر ہوں اور دوسرا گھر پر ایک جاسوس موجود ہے۔ اب تو گھر پر کبھی نہ بلاؤں تم دونوں کو، پتہ نہیں کیا کیا بلواس کر دیتے ہو۔ اور شکل کا کا کان لگائے ہر ایک بات سنتے ہیں۔ میں کیا کروں انکا؟"

ضیغم کی پریشان آواز سپیکر سے گونجی تھی۔

"تو پھر وہیں ملتے ہیں، کافی پلا دینا۔ میرا تو سر دکھ رہا ہے۔"

سر میں درد کی ٹھیسیں اٹھ رہی تھیں، ضامن نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

دونوں بھی اس کے کہنے پر کافی شاپ پہنچنے لگے

\*\*\*\*\*

"کہاں گیا ہوا تھا جو آتے آتے اتنا وقت لگا دیا۔"

ضامن، تالشہ کو چھوڑنے دوسرے روٹ سے گیا تھا اور پھر گاڑی نجانے کہاں اور کن رستوں پر چلاتا رہا تھا کہ وہاں پہنچتے اسے کافی وقت لگا۔

"وہ کچھ کام تھا۔ تم لوگوں نے آرڈر نہیں دیا ابھی تک۔"  
جگہ سنبھالتا وہ ویٹر کو بھی بلا چکا تھا۔

"تین کافی..."

ویٹر جاچکا تھا۔ ضامن خاموش بیٹھا تھا۔ اور ضیغم، اس کی ہنسی تھی کہ رک نہیں رہی تھی۔ عجیب سرشاری سی بھری تھی۔

"تجھے کیا ہوا ہے؟ ایسی حالت میں کیوں بیٹھا ہے۔"  
شہیار نے کہنی سے ٹھوکا مارتے اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹھا۔

"ہسنے! نہیں تو کچھ بھی نہیں بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔"  
ماتھا مسلتے، وہ چہرے سے ہی تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

"اچھا، چل پھر چلتے ہیں تجھے ریست کرنی چاہیے۔"

"ارے نہیں، کافی پی لونگا تو ٹھیک ہو جاؤنگا۔"

شہریار اسے اٹھانے لگا تھا کہ ضامن نے ہاتھ پکڑ کر بیٹھا دیا۔

"یہ بتا، وہ جاسوس کونسی جاسوسیاں کر رہا ہے تیری۔"  
شہریار یاد آنے پر دریافت کرنے لگا۔

"وہی عینا والی بات، کاکا نے اماں سائیں کو بتا دی اور اب اماں سائیں میرے پیچھے پڑی ہیں کہ اسے چھوڑ کر فوراً حویلی آؤ۔ کل تو ابا سائیں کا بھی فون آگیا تھا، کہہ رہے تھے پیپر دے کر سیدہ حویلی آؤ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"  
ضیغم بجھے دل کے ساتھ سارا ماجرہ سنا رہا تھا۔

"یار، اگر سائیں انکل نہ مانے تو؟"  
شہریار نے اپنا خدشہ پیش کیا۔

"مجھے لگتا ہے، میں منا لونگا۔"  
وٹوق سے کہتا وہ میز پر رکھی گئی بھاپ اڑاتی کافی کو اپنی طرف کھسکا چکا تھا۔

"اور اگر عینا نہ مانی تو؟ اس دن جو تو نے اس بچاری پر غصہ اتارا تھا وہ تو تجھ سے شدید ناراض ہوگی نا۔"

یہ خدشہ ضامن کو لگا تھا۔

ضیغم کا دل چاہا وہ قہقہہ مارے، لیکن پبلک پلیس پر ہونے کی وجہ سے قہقہہ ضبط کرنے کے چکر میں چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ ہنسی الگ ہی نمودار ہو چکی تھی۔

"آئی تھنک وہ اب ناراض نہیں ہے۔"

آخری وقت میں عینا کا سہما سا چہرہ نظروں میں گھوم گیا جب وہ بادلوں کی آواز پر ڈر کر جھٹکا کھاتی اور پھر سے آنکھیں میچ کے ڈر کم کرنے کی کوشش کرتی، گھر پہنچنے تک وہ ایسے ہی خود کو ان اونچی، دل لرزا دینے والی آوازوں سے بچا رہی تھی۔

"انفیکٹ، ابھی اسے ہی ڈراپ کر کے آرہا ہوں۔ اور معافی بھی مانگی ہے۔ آئی ہوپ کہ وہ زیادہ دیر تک ناراضی پر قائم نہیں رہے گی۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔"

گرم کافی کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتا وہ شاد سا کہہ رہا تھا۔

شہریار اور ضامن نے سر ہلایا۔

"لیکن، گھر بات کرنے سے پہلے ایک دفعہ عینا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی پتہ ہے کہ وہ ہرگز نہیں سمجھے گی، لیکن ٹرائے کرنے میں کیا حرج ہے۔"

سر جھٹکتا وہ خاموش ہوا۔

اب کی بار پھر سے دونوں نے ہی اثبات میں سر ہلایا۔

"لگتا ہے تمہاری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے، آج بالکل خاموش ہو۔"

شہریار اسے چپ چپ دیکھ کر ایک بار پھر سے بول اٹھا۔

"ہاں.. مجھے بھی لگ رہا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے میرے ساتھ۔"

سر ہاتھوں میں جکڑے، کہنیوں کو میز کے سرے پر ٹکائے وہ مضطرب کیفیت میں مبتلا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ سمجھ نہیں آرہی..."

اچھا میں چلتا ہوں۔ کافی لیٹ ہو گیا ہے امی انتظار کر رہی ہونگی۔"

بے بسی چہرے سے عیاں تھی۔ آخری جملہ کہہ کر وہ دونوں سے ہاتھ ملاتا جا چکا تھا۔

آج اسے سوچنا تھا اسے ہوا کیا ہے، اور جو ہوا ہے واقعہ اس کا علاج ہے اور اگر ہے تو کیا؟

"اسے کیا ہو گیا ہے؟"

ضیغم نے پرسوج نظریں اس کی پشت پر ڈالے پوچھا۔

جواباً شہیار نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

\*\*\*\*\*

رات دہیرے دہیرے سرک رہی تھی، یہاں تک کہ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔  
آدھا جہان اس وقت نیند کی وادی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہیں وہ باہر سے وقفے وقفے سے آتی بارش کی  
پھوار پر کان دہرے، چت لیٹی تھی۔

مریم بیگم اسے سلاتے سلاتے خود سو چکی تھیں، پر اس کی آنکھوں سے نیند آج روٹھ چکی تھی۔  
جب دل مزید بے چین ہوا، باہر ہوتی پھوار کو دیکھنے کا دل للچانے لگا تو ایک نظر مریم بیگم پر  
ڈال کر دہیرے سے بیڈ سے اتری تھی۔

کمرے میں چھوٹے بلب کی روشنی، کمر کو مکمل اندھیرے میں ڈوبنے سے بچا رہی تھی۔ وہ

سست روی سے چلتی، کھرکی کے پاس جا کر۔ جس پر پردے پڑے تھے، دہیرے سے انہیں ہاتھ

سے کھسکاتی وہ کھرکی کے شیشے پر برستے چھوٹے چھوٹے پانی کے قطروں کی حرکت کو دیکھنے لگی۔ وہ کسی آنسو کی طرح پھسل کر کھرکی کی سطح پر بہہ جاتے تھے۔ اسی طرح ہر موتی کھرکی کے شیشے پہ لگ کر، اپنا سفر ایسے ہی مکمل کر رہا تھا۔

"دُرنا فطری ہے، لیکن ہمت دکھا کر اس دُر کو بھگانا ہی اصل طاقت ہے۔"

ضیغم نے اس سے گھر آتے وقت نرمی سے کہا تھا۔ ابھی وہ یہ ہمت کرنے جا رہی تھی۔ دُر تھا کہ اگر بارش کا پہلا قطرہ اس نے خود پر محسوس کیا اور اسی وقت بجلی کرک کر اسکے اوپر آگری، تو؟؟

عجیب وسوسے تھے جن کا نہ سر تھا نہ پیر، لیکن وہ تھے جو گہرائی میں دل و دماغ پر اثر چھوڑ چکے تھے۔

ہمت مجتمع کرتی، وہ سلائیڈز دہکیل رہی تھی۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ سلائیڈ پرے دہکیلے جا چکے تھے۔ سلائیڈز کے ہٹتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور اسکے ساتھ بارش کے چند قطرے اس کے منہ پر آپڑے تھے۔ بے ساختہ عینا نے جھر جھری لی۔

ہوا ٹھنڈی تھی، اور بارش کا پانی وہ بھی ٹھنڈا تھا، چہرے پر پانی کے قطرے اب بھی نمی کیے ہوئے تھے۔ نہ بجلی کرکی تھی نہ ہی بادل گرے تھے، اس بار اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو



کھڑکی سے باہر کیا تھا۔ بارش کا قطرہ جب پہلی بار اس کی ہتھیلی کو چھو کر ٹپکا تھا، تو اسے لگا کسی نے اس کی ہتھیلی گدگدائی ہو۔

ضیغم نے کہا تھا کہ فوکس کرو گی تو خوبصورتی کا اندازہ ہوگا۔

وہ آنکھیں بند کیے بارش کے قطروں کو ہتھیلی پر ٹپکتے محسوس کر رہی تھی۔ سرشاری اسکے وجود میں پھیلتی جا رہی تھی۔ ڈر وہ تو جیسے تھا ہی نہیں، چہرے پر کھلی کھلی سی مسکراہٹ تھی۔ بارش کا لطف لینے کی مسکراہٹ، ڈر کو ہر دینے کی مسکراہٹ، اس میں طاقت تھی ڈر سے لڑنے کی۔ بس ہمت چاہیے تھی۔ اور اب تو ڈر کہیں کسی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا تھا۔

\*\*\*\*\*

کیسا ان چھوہا سا احساس جاگا تھا۔ جو اس کے دن و رات کا چین اڑا کر لے گیا تھا۔ ایسی اضطراری کی کیفیت آج سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کل رات سے وہ بے چین تھا، کسی کل سکون میسر نہ تھا۔

آج جب شہیار نے دوستوں کو نکاح کی خوشی میں دعوت دی تھی۔ تو وہ لگے باندھے ہی اس میں شریک ہوا تھا۔ خوشی، غم کے جذبات محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ بس بے کلی چاہی تھی جو دل کو گھیرے میں لیے ہوئی تھی۔

باقی سب کو تو بارش کی وجہ سے طبعیت خرابی کا بہانہ بنا کر مطمئن کر چکا تھا۔ لیکن خود کو؟  
خود کی پریشانی سمجھنے بیٹھتا تو ایک ہی چہرہ آنکھوں میں ابھر آتا تھا۔ آخر کیوں وہ اس کے بارے  
میں اس قدر سوچ رہا تھا۔

"یا وحشت!"

وہ بڑبڑاتا ہوا دونوں ہاتھوں کو بالوں میں پھنسا کر اٹھ بیٹھا۔  
وحشت، گھٹن حد سے سوا تھی۔ آنکھوں سے نیند بھی روٹھ چکی تھی۔  
آنکھیں بند کیے وہ جس تشنگی کو محسوس کر رہا تھا، اس سے آنکھیں چراتا، سونے کی ناکام  
کوشش کر رہا تھا کہ ہاتھوں میں گجروں کی ٹوکری تھامے کھلکھلاتی ہوئی تائشہ اس کے دماغ پر  
چھپ گئی تھی۔

جھٹکے سے آنکھیں کھولتا وہ اس چوری پر خود کو سرزنش کرنے لگا تھا۔

کچھ بے ربط سے جملے تھے جو کل سے اس کے دماغ پر برس رہے تھے، وہ جتنا انہیں جھٹکنا چاہ  
رہا تھا وہ اتنے اس کے دماغ پر اپنی چھاپ گہری چھوڑ رہے تھے۔ اور دل وہ تو اپنی دھڑکنوں کی  
رفتار مزید تیز کر جاتا تھا کہ ضامن اپنی ہی کیفیت سے گھبرا اٹھتا۔

"یہ لڑکی اس عمر میں مجھے پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ کہا بھی ہے کہ شادی کر کے اپنے گھر چلی جائے، میں روز روز کی پریشانی سے تو بچ جاؤنگی۔"

"جتنا پڑھنا ہوگا شادی کے بعد پڑھ لے گی۔"

یہ جملے مسلسل اسے دل پر کاری ضرب لگاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے پر وہ اب بھی پتور دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"اففف! میری طرف سے وہ کل کی بجائے آج شادی کر لے۔"

وہ سر جھلا کر بڑبڑایا تھا۔

کمرے کی فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

قدم بڑھاتا کھڑکی کے پاس پہنچا اور جھٹکے سے اسے کھولا تھا۔

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسکے دل و دماغ میں چلتی جنگ پر کچھ افاقہ کر گیا تھا۔

کل بارش ہونے کے باعث آج کی رات کافی حد تک ٹھنڈی تھی۔ وہ بھی اس ٹھنڈک کو جلتے دل پر محسوس کرتا آنکھیں کھولے، نیچے سیاہ رات میں ڈوبے لان کو تک رہا تھا۔

جہاں رات کی سیاہی کے باوجود ایک آنچل لہراتا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ حیران ہوتا مزید آنکھیں پھیلائے دیکھنے کے جتن کرتا تو سنہری آنچل شانوں پر پھیلائے مہرون کرتے میں ملبوس تائشہ ہاتھ میں بھر بھر گجرے پہنے اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور پھر مسکراہٹ کھلکھلاہٹ میں بدلی تھی۔ اندھیرے میں وہ کسی چاندنی میں گھلی نمایاں نظر آرہی تھی۔ دہڑکتے دل کے ساتھ، ضامن نے آنکھیں زور سے میچیں تھیں۔ اور پھر جب کھولیں تو وہ منظر سرے سے تھا ہی نہیں، لان اب بھی اندھیرے میں مکمل ڈوبا ہوا تھا۔

گھبرا کر وہ کچھ قدم پیچھے ہوا تھا نظریں اب بھی کھرکی کے باہر جمی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟"

لبوں کو آپس میں پیوست کیے وہ الجھا سا خود سے دریافت کر رہا تھا۔

"کہیں.. میں تائشہ سے..؟"

نہیں، نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

میں بھلا اس کے بارے میں کیوں سوچوں گا۔ نہیں، مجھے اسکے بارے میں نہیں سوچنا۔"

وہ لب کچلتا بے بسی سے خود سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔

"لیکن میں اس کے بارے میں سوچ کیوں رہا ہوں۔"

وہ جھنجھلا کر بیڈ کے سرہانے پر جا بیٹھا۔

بیڈ کراون سے ٹیک لگائے، وہ آنکھیں زور سے بند کیے اسکے نظر آتے عکس سے چھٹکارا چاہ رہا تھا۔

کبھی وہ اسے گراؤنڈ میں چکر لگاتی نظر آرہی تھی، کبھی ہنستی، کبھی روتی، کبھی اس سے لڑتی ہوئی تو کبھی آنسو سے بھری آنکھوں کے ساتھ بولتی ہوئی۔

باری باری سب منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہے تھے۔ اور وہ بے بس سا آنکھیں میچے بیٹھا تھا۔

"مجھے شاید اس سے ہمدردی ہے اور کچھ نہیں۔"

وہ بھی تو میرے جیسے حالات سے گزر رہی ہے۔ شاید تبھی میں اسکے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" اندر سے اٹھے سوال کے جواب میں آنکھیں کھولے وہ بڑبڑایا تھا۔

یہ بہانہ سوال کا جواب دینے سے زیادہ خود کو یقین دلانے کی کوشش تھی۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ہمدردی دوستی کی طرف پہلا قدم ہے۔ اور دوستی....؟

اور دوستی پیار کی طرف پہلا قدم ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ دانت پیستا اپنی سوچ پر تف کرتا اٹھا تھا۔

"مجھے اس سے نہ کوئی دوستی ہے نہ ہی پیار۔"

قطعیت سے کہتا وہ اپنا آخری ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔

سگریٹ دراز سے نکال کر لائٹر سے سگریٹ جلائی۔

پہلا کش بھرتے ہی، ایک دم ساری پریشانی، اندر کی اور گھلی تھی۔ اور دہویں کی صورت اختیار کرتے ہوا میں جا ملی۔

وہ سب بھولے ہوا میں موجود دہویں پر نظریں جمایے ہوئے تھا کہ دیکھتے دیکھتے وہ بھی تائشہ کے عکس میں بدل چکا تھا۔  
آنکھیں حیرانی سے پھیلیں تھیں۔

جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے اس نے سگریٹ فرش پر پھینکا تھا۔

عکس مدہم ہو گیا تھا۔ دہواں بھی اب باقی نہ تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ منہ پر ہاتھ پھیرتا بڑی مشکل سے پھنسی آواز میں بولا تھا۔

اندر سے چیخ چیخ کر آوازیں آرہی تھیں کہ وہ بھی ان پیار کرنے والوں کی راہ کا مسافر ہو گیا ہے

لیکن نہیں وہ مسلسل دل میں ہمک کر گاتے جزبات کو ڈپٹ کر سلا رہا تھا۔ ان سے انجان

بننے کی پوری کوشش میں تھا۔ پر وہ کہتے ہیں نا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ وہ جتنا خود سے بھی اس کیفیت کو چھپالے لیکن یہ جزبات اس کے اندر انگڑائی لے کر جاگ اٹھے تھے اور اب انہیں جتنا تھپک کر سلا لیا جائے یہ اپنا اثر دکھانے تک کبھی ہار نہیں مانیں گے۔

مسلل چکر کاٹتا، وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا، اس جواب سے وہ متفق ہی نہیں تھا۔ کتنا عجیب جواب تھا، وہ لڑکی تائشہ ایک دن میں ہی اس کو اپنا اثر کیسے کر سکتی تھی کہ ہر چیز میں اسے وہی دکھ رہی تھی۔ اس قدر حواسوں پر سوار تھی کہ بھلائے نہیں بھول رہی تھی۔

وہ دہڑام سے اوندھے منہ بیڈ پر جاگرا، آنکھیں بند کیے، اپنے اوپر تکیے کو بھینچے وہ سونے کی کوشش میں محو رہا۔

پر سوچیں پھر سے تائشہ کے گرد گھوم رہی تھیں۔

کانوں میں اس کی شادی کے متعلق جملے بجتے جارہے تھے، اور ہر جملے کی آواز پر دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول جاتا تھا۔

وہ اسی جاگی سوئی کیفیت میں پوری رات رہا تھا۔ یہاں تک کہ صبح کی روشنی پورے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ جیسے رات کا اندھیرہ اس روشنی سے ہارا تھا ویسے ہی وہ بھی تائشہ سے ہار چکا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے باغی دل سے ہار چکا تھا۔

لیکن یہ ہمارے اب سکون بخش رہی تھی۔ پورے رات کی بے سکونی جیسے اب راحت میں ڈھل چکی تھی۔ کیونکہ وہ دل کی مان چکا تھا وہ جو مسلسل انکار کر کے خود کو بے سکون کیے ہوئے تھا۔ اب اقرار کرتے ہی سارا سکون لوٹ آیا تھا۔

کسی قسم کا پچھتاوا، ڈر گھبراہٹ، اضطرابیت کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا سوائے ایک ایسے جزبے کے جس سے وہ اب تک نا آشنا تھا لیکن آج وہی جزبہ اسکے پورے وجود کو شاد کر رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

آج سورج اپنے جو بن پر تھا، ابھی لگا تھا کہ ٹھنڈا آنے لگی ہے۔ پر گرمی، وہ تھی کہ چپکے سے پھر لوٹ آئی تھی۔

صبح کے گیارہ بجے ہی دھوپ کی شدت سے سب چھاؤں کی تلاش میں سرگردہ تھے، وہیں کوئی ابھی تک اپنی نیندیں پوری کر رہا تھا۔

موبائل کی بجتی رنگ نے اس کی نیند میں خلل ڈالا، یہ اسے ہرگز گوارا نہ ہوا تھا۔ بجائے موبائل اٹھانے کے تکیہ کانوں پر رکھ لیا گیا۔ پر آواز تھی کہ تکیے کی باڑ پھلانگ کر بھی کانوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا۔



"کون ہے، جسے میری نیند سے خاص بیر ہے۔"

بجائے سکرین پر چمکتے نام کو دیکھنے کے، کال اٹھاتی وہ سوئی جاگی کیفیت میں ڈپٹ کر بولی۔

"اہم... میں ہوں۔"

شہریار جو کب سے یونی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا، اور اب فون اٹھائے جانے اور اس پر ہیر کی آواز میں ڈانٹ سن کر، گلا کھنکھار کر متوجہ کیا۔

"کیا میں ہوں؟ کوئی نام بھی ہے کہ نہیں۔"

نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کو بند کیے گردن ایک طرف کو ڈھکائے فون کے پار موجود شخص کو گرکھ رہی تھی۔

"میں ہوں شہریار۔ اتنی جلدی بھول گئی۔"

شہریار کو شدید ناگوار گزرا تھا، آخر کو اس کی منکوحہ تھی، اس کی آواز ہی نہ پہچان پائی۔

یہ سنتے ہی ساری نیند ہوا ہوئی تھی، جھک سے آنکھیں کھولتی موبائل کو آنکھ کے سامنے کیا تو چمکتی سکرین پر شہریار کا ہی نام موجود تھا۔ شرمندگی کا گھونٹ بھرتے پھر سے فون کان سے لگایا۔

"وہ.. میں سو رہی تھی۔ آپ نے کیوں کال کی؟".  
اب نیند تو اڑ چکی تھی۔ اس لیے لحاف پرے کرتی وہ اکڑو بیٹھ گئی تھی۔

"ابھی تک سو رہی تھی؟ یونی نہیں آنا کیا؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں یہاں".

"یونی!"

نہیں میں نے نہیں آنا یونی، اب تو میرا نکاح ہو گیا ہے نا تو اب میں کیوں جاؤں یونی۔  
اور آپ میرا انتظار کیوں کر رہے ہیں وہاں".  
یونی کے ذکر پر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کیا مطلب نکاح ہو گیا ہے تو یونی نہیں آنا۔ میں نے تو نکاح اس لیے ہی رکھوایا تھا کہ چلو ایک مہینے تک ہم مل تو سکیں گے".

شہریار کو اسکی منطق تو سمجھ نہ آئی جب کہ اپنی منطق وہ صاف بیان کرچکا تھا۔

"اور میں نے بھی یہ پہلے ہی کہا تھا کہ میں آگے نہیں پڑھنا چاہتی، پھر میں کیوں آؤں یونی؟  
اب تو میرے پاس وجہ بھی ہے، میری شادی ہو رہی ہے۔ میں تو نہیں آؤنگی یونی۔"  
ہیر نے قطعیت سے کہا۔

"شادی کے بعد نہیں پڑھنے کا کہا تھا، تو وہ بعد کی بات ہے، بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو تم  
یونی تشریف لے آؤ۔"  
وہ بھی منطقی انداز میں کہتے، آخر میں لہجہ ضدی بنا گیا۔

"دیکھیں! اماں کہتی ہیں جس شہر جانا ہی نہیں، تو اس کا راستہ کیوں پوچھنا۔  
اسی طرح جب میں نے آگے پڑھنا ہی نہیں ہے تو اب یونی آکر کیا کرنا۔"  
ہیر کو اپنے مطلب کے وقت اماں کی کہی ہر بات موقعے کی مناسبت سے یاد آ جاتی تھی۔

"تم آؤ تو صحیح پہر بتاتا ہوں کیا کرنا ہے آکر، ہیر میں یہاں ویٹ کر رہا ہوں تمہارا۔ اگر تم نہ آئی تو ہو سکتا ہے میں تمہاری پڑھائی شادی کے بعد بھی نہ چھڑواؤں۔ ویسے بھی اب تمہارے لیے آگے کے سارے فیصلے میں نے ہی لینے ہیں۔"

تھمیل سے اسے دھمکی نما شرط بتاتا اسکے جواب کا منتظر تھا۔

"کیا...."

ہیر صدمے سے چیخ اٹھی، شہریار کی بتیسی باہر کو آئی۔

"آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے شہریار!"

وہ روبانسی ہو چلی تھی۔

اور شہریار وہ تو اس کے منہ سے نکلے اپنے نام پر ہی دل و جان ہار بیٹھا تھا۔

خود کو سنبھالتا وہ بے حد سنجیگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہیر تمہارے پاس دو ہی چوائس ہیں، یا تو آج آکر آگے کی پڑھائی سے جان چھڑواؤ یا پھر آج نہ آکر روز یونی آنے کی تیاری پکڑو۔ پر یاد رہے دونوں صورتوں میں یونی سے تمہارا پیچھا چھوٹنا مشکل ہی ہے۔"

ہنسی ضبط کرتا وہ ہیر کے متوقع رد عمل کو تصور میں لانے لگا۔

"ہائے اور ہا!"

میں نے تو سب کزنوں کو بھی کہہ دیا تھا کہ میں اور نہیں پڑھوں گی۔ اب میں یونی جاتی ہوئی اچھی لگوں گی، سب کیا سوچیں گی میرے بارے میں۔ میری ناک کٹ جائے گی، پلیز سمجھنے کی کوشش کریں شہیار!"

وہ پھر سے مناجات پر اتر آئی، انجانے میں وہی ہتھیار استعمال کر گئی جس کو سنتے ہی شہیار کی دل کہ دنیا اتھل پھل ہو جاتی۔ خود پر ضبط کے کڑے بند باندھے وہ لب بھینچ گیا۔

"مجھ سے پوچھ کر کہا تھا ان سے؟"

میں انتظار کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے تم آؤ گی۔  
یہ کہہ کر مچلتے دل کو تھپکتا فون کھٹاک سے بند کر گیا۔  
پیچھے ہیر پیش و تاب کھاتی، فون کو گھور کہ رہ گئی۔

"بھابھی میرے کپڑے نکال دیں۔ مجھے یونی جانا ہے۔"

کمرے سے ہی ہانک لگاتی پیر پٹ کر فریش ہونے چلی گئی۔

\*\*\*\*\*

ضامن اندر ہی اندر اپنی حالت سے بہت پریشان تھا۔ تائشہ اسے اچھی لگتی ہے کتنی مزاحیہ بات لگے گی نا، ہر کوئی ہنسے گا اس پر، ضیغم اور شہریار کو یہ بات پتہ چلے گی تو نجانے وہ کیا کہیں گے۔

یہ ساری سوچیں مل کر اس پر دباؤ ڈالے ہوئی تھیں۔ اوپر سے تائشہ نے بھی روز اسے پیچھے دن سے زیادہ اچھا لگنا ہوتا تھا۔ وہ جب بھی خود کو سمجھاتا کہ ایسا کچھ نہیں ہے، اتنا ہی زیادہ وہ اس کے حواسوں پر سوار ہو جاتی کہ اسے ہارنا ہی پڑتا۔

آج بھی وہ کلاس سے باہر اپنی ہی دہن میں آرہی تھی کہ دونوں کا تصادم ہوا۔

"آپ ہر وقت ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔"

خود کو سنبھالتی، وہ ماتھا مسلتی بولی، جو اس کے بازو سے جا ٹکرایا تھا۔

"شاید اب قسمت میں ٹکرانا ہی لکھ دیا ہے۔"

وہ ایک طرف ہوتا، اسے ہی نظروں کے حصار میں لیے کھڑا تھا۔

"کیا؟"

تائشہ نا سمجھی سے گویا ہوئی۔

"ہاں کچھ نہیں..."

ساری غلطی میری بھی نہیں تھی تم بھی تو دیکھ کر چل سکتی تھی نا۔  
ضامن اپنی ٹون میں واپس آچکا تھا۔

"میں نے نہیں دیکھا، تو آپ دیکھ لیتے۔"  
وہ گھورنے لگی۔

"آپ لوگ راستے سے ہٹ کر لڑ لیں۔"

تائشہ کی کلاس کی لڑکی، جو ان کے بیچ چپقلش سے واقف تھی، مشورہ دیتی سائیڈ سے گزرنے لگی۔

"ہم لڑ نہیں رہے۔"

دونوں یک زبان بولے تھے۔ اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔

"چلو باہر ہی چلتے ہیں۔"

ضامن نے اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

"ایک بات پوچھوں؟ کچھ پرسنل ہے۔"

ضامن نے کہا، وہ چلتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ سے باہر آچکے تھے۔

"پرسنل مطلب؟"

مشکوک نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ اس دن تمہاری امی، تمہاری شادی کا کہہ رہی تھیں۔ تو کیا تم شادی کر رہی ہو؟"

یہ بھی ایک ڈر جو سر پر سوار تھا۔ تائشہ کو اپنی زندگی میں لانے کو بھی نہیں مان رہا تھا۔ اور کسی اور کی ہو جائے اس کے لیے تو ہرگز راضی نہ تھا۔



"آپ ہماری باتیں سن رہے تھے۔"

اسے لگا تھا وہ فوراً ہی چلا گیا ہوگا۔ پر اس نے تو سب سنا تھا۔

"کان میں پڑ گئی تھیں۔"

ضامن نے کہہ کر کندھے اچکائے۔

"ویسے تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، اور پانچ سال تک تو ہرگز بھی ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"

تائشہ بات کو عام سی حد تک سرسری رکھتی، ضامن کو حیران کر گئی۔

"پانچ سال تو انتظار نہیں کروں گا میں۔"

حیرانی کے باعث، ضامن کے منہ سے نکلا۔

تائشہ نے نا سمجھی سے آنکھیں سکیریں۔

"میرے کہنے کا مطلب ہے پانچ سال کچھ زیادہ نہیں ہیں؟"

سنجھل کر کہا۔

"نہیں تو، ویسے بھی میری کونسی عمر نکلی جا رہی ہے۔"  
لاپرواہی سے کندھے اچکاتی، وہ آگے بڑھ گئی۔

"ہاں تمہارا قد بھی تو چھوٹا ہے پانچ سال تک بھی بچی ہی لگو گی۔"  
اس تک پہنچتے وہ جان بوجھ کر سرسری انداز اپنائے اسے چھیڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"ایک منٹ، آپ میرے قد پر مت جایا کریں۔ اور آپ کا قد جو اتنا لمبا ہے اسکا کیا، لمبو کہیں  
کے۔"

انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتی، غصے سے کہہ کر قدم بڑھائے۔

"دیکھو لڑائی ہو جائے گی پھر سے، تم نے مجھے لمبو کیوں بولا؟ چوہیا!۔"  
ضامن نے اس کی انگلی پر اپنی انگلی سے ضرب لگاتے کہا۔  
تالشہ کا گھورنا ہنوز برقرار تھا۔

"شروع آپ نے کیا تھا، اور میں چوبہیا نہیں ہوں۔"  
دانت پیس کر کہا۔

"پاگل بھی تو یہی کہتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔"  
ہنستے ہوئے کہہ کر وہ اسے وہیں چھوڑتا، تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔  
تالشہ پیر پٹخ کر اپنا غصہ اندر دبانے لگی۔ اس کی پشت کو گھورنا اب بھی جاری تھا یہاں تک کہ  
وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

\*\*\*\*\*

"اب بولیں کیوں بلایا تھا۔"  
ہیر جیسے تیسے ایک گھنٹے تک یونی پہنچ چکی تھی۔ اور اب شہیار کے مقابل کھڑی اسے گھور رہی  
تھی۔

"کیا مطلب کیوں بلایا تھا، میرا دل کر رہا تھا تم سے ملنے کو۔ تو بلا لیا، آو کنٹیں میں بیٹھتے ہیں۔"  
شہیار سکون سے کہہ کر مقابل کا سکون غارت کر گیا۔

"دل کر رہا تھا، تو مجھے نیند سے اٹھا کر یہاں بلا لیا۔"

تیوری چڑھائے وہ پوچھ رہی تھی۔

شہریار نے ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

"میں گھر جا رہی ہوں۔"

ہاتھ جھلاتے ہوئے غصے سے جانے کو پلٹی، شہریار نے کلائی تھام کر اسے جانے سے روکا۔

"ارے کیا یار، ابھی تو آئی ہو۔ اور ایک بات یاد رکھنا یہ سمیٹر تو پورا کر کے ہی تمہاری یونی سے چھٹی ہو سکتی ہے۔"

ہیر نے دانت پیسے تمسے، کتنا ارمان تھا اس کا کہ جلدی سے نکاح ہو جائے اور اسے یونی نہ جانا پڑے۔ پر یہاں تو نکاح گلے کو آگیا تھا۔

"اب چلیں۔"

کلائی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے اپنے ساتھ لیے قدم آگے بڑھائے تھے کہ نظر اس کے ہاتھ کی انگلی میں پہنی انگھوٹی پر پڑی۔ جہاں اس کی پہنائی گئی انگھوٹی کا ہیرا چمک رہا تھا، جسے دیکھ کر شہریار کو اپنے اندر سکون اترتا محسوس ہوا۔

اسے ساتھ لیے، وہ کنٹین کے قدرے خاموش گوشے میں آچکا تھا۔  
یہی دن تھے، جب وہ پورے استحقاق سے اپنی سنانا چاہتا تھا، کچھ اس کی سننا چاہتا تھا۔

"ہیر، تم آگے ناروز یونی۔"  
وہ اس سے پوچھ رہا تھا، ہیر نے محض گہور کر دیکھا۔

"آنا ہی ہے اور کوئی آپشن بچا ہے کیا۔"  
لفظ چبا چبا کر ادا کرتی وہ شہریار کو ہنسنے پر مجبور کر گئی۔

\*\*\*\*\*

"تم دونوں نے یوں شکلیں کیوں لٹکائی ہوئی ہیں؟

ہیر کا تو چلو سمجھ میں آتا ہے، زبردستی آئی بیٹھی ہے۔ پر تم کیوں منہ پھلا کر بیٹھی ہو۔"  
تائشہ نے ہیر اور عینا کے لٹکے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"منہ نہیں پھلایا ہوا پریشان ہوں میں۔"

عینا نے مزید منہ بنائے کہا۔

"اب کیا پریشانی ہے، ایک تو اس کی روز کی پریشانیاں۔"  
ہیر ماتھے پر ہاتھ سے ضرب لگاتی چڑ کر کہنے لگی۔ چڑچڑاہٹ تو ہونی تھی مرضی کے برخلاف جو  
موجود تھی۔

"کتنی کوئی مطلبی ہونا تم، دفعہ ہو جاؤ تمہیں بتا بھی نہیں رہی۔ ضیغم بھائی کا انتظار ہے وہی  
میری پریشانی دور کرینگے۔"

اسکے بازو پر دھموکا جڑتے، وہ روانی میں کہتی ہیر اور تائشہ کو پہر موقع دے چکی تھی۔

"اوو!"

ضیغم بھائی کا انتظار تھا، ویسے صلاح ہوگئی تمہاری ان سے؟"

تالشہ کے کہنے پر ہیر نے ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

"کب کی، میرے نکاح پر ہی، اس کے ضیغم بھائی آئے تھے سوری کرنے۔ اور میری معصوم بچی نے کر دیا ہونا معاف۔"

ہیر نے ہنستے ہوئے، اسے چڑانے کے لیے بھائی پر زور دیتی، اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر ہلایا، عینا نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"تم دونوں کتنی بد تعمیز ہونا۔ مجھے ان سے یہ ٹاپک سمجھنا تھا اور تم لوگ بکواس کر رہی ہو۔" خفگی سے انہیں جھڑکتی، پھر سے منہ بسور گئی۔

"ہاں تو تشو کس لیے ہے، یہ سمجھا دے گی نا۔ یا پھر صرف ضیغم بھائی سے ہی سمجھنا ہے۔"

"نہیں تشو سمجھاتی کم ڈانٹتی زیادہ ہے۔ ضیغم بھائی کی سمجھ بھی آتی ہے اور وہ ڈانٹتے بھی نہیں ہیں۔"

ہیر کی پیش کش پر صاف انکار کرتی وہ تشو کی برائی بھی کر گئی تھی۔ جو آنکھیں پہاڑے اسے سن رہی تھی۔

"شرم تو نہیں آتی تمہیں، پورے سمسٹر تمہیں ہر ٹاپک دو دو بار سمجھایا ہے اور اب ایسے بول رہی ہو۔"

"ہاں تو، تیسری بار پھر بھی مجھے ضیغم بھائی سے ہی سمجھنا پڑتا تھا نا۔"  
وہ دوبارہ جواب دے رہی تھی۔

"توبہ ہے! یہ لڑکی تو ہاتھ سے نکل گئی ہے۔  
ہاں بھئی ضیغم بھائی جو سرچڑھ کر بول رہے ہیں۔"  
تائشہ نے بھی اب کی بار حساب بے باک کیا تھا۔

"بہت بری ہو تم،  
ایسا کچھ نہیں ہے سمجھی۔"  
خفگی ہنوز برقرار تھی۔



"ایسا ہی ہے، اس دن میں وہیں تھی جب ضیغم بھائی تمہیں ڈھونڈنے کے لیے پاگلوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ کوئی اندھا بھی سمجھ جائے کہ وہ پیار میں گوڈے گوڈے ڈوبے ہوئے ہیں۔ پر اس اندھی کو سمجھ نہیں آ رہی۔"

تائشہ کی بھی سر پیٹنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ میڈم بھی گوڈے نہیں تو تھخنے تک تو ڈوب ہی گئی ہے۔"

ہیر نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔



"I Agreed!".

تائشہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

"مرویمیں پر۔"

روبانسی ہوتی، بیگ اٹھا کر چشمے کو دست کرتی چلتی بنی۔

"لو جی، پھر موڈ بن گیا۔"

ہیر نے اسے دیکھ کر کہا۔

"کوئی نہیں ابھی ضیغم بہائی سے مل کر ٹھیک ہو جائے گی۔"  
تائشہ نے لاپرواہی سے کہا۔

"آخر کو وہ صرف فریڈز ہیں۔"  
ہیر کے کہنے کی دیر تھی، دونوں کے قہقہے گونجے تھے۔

\*\*\*\*\*

کل ضیغم اسے کہیں نہیں دکھا تھا، شاید وہ چھٹی پر تھا۔ یا پھر جلدی چلا گیا تھا۔ آج عینا کو لازمی ضیغم سے ٹاپک سمجھنا تھا، تبھی گراؤنڈ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پر وہ تھا کہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔

چشمے کو درست کرتی وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی کہ نظر سامنے سے آتے ضیغم پر ٹکیں۔ مسکراہٹ خود بخود لبوں پر پھیل گئی۔

ابھی ضیغم اس کی طرف آہی رہا تھا کہ منہا کہیں سے اسکے راستے میں آگئی۔ نجانے وہ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔

وہ آنکھیں سکیڑ کر انہیں گھور رہی تھی۔ آج تو ضیغم بھی منہا سے مسکرا کر بات کر رہا تھا۔ اور وہ دانت پیس کر اس کی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی۔

منہا نے اسے فائل تھمائی، جسے ضیغم نے سر ہلا کر لے لیا تھا۔  
منہا کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب آکر نرمی سے مسکرایا تھا۔ عینا نے بھی زبردستی مسکرانے کی سعی کی تھی۔

"وہ کیا کہہ رہی تھیں۔"

ابھی وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھا ہی تھا کہ تجسس بھرا سوال حاضر تھا۔

"کون؟"

فائل کھولتے سرسری سا جواب آیا۔

"وہی منہا آپی، کیا کہہ رہی تھیں۔"

اس کے آپي کہنے پر ضیغم ہنسا تھا، عینا نے ناک چڑھائی۔

"کچھ خاص نہیں، بس ویسے ہی کچھ کام تھا۔"  
پھر سے عام سا جواب، عینا نے دانت پیسے۔

"تو پھر آپ ہنسے کیوں تھے؟"  
آنکھیں سکیرے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ضیغم نے نظر کی نظر اسے دیکھا تھا۔  
"کاش کہ تم بھی سمجھ جاؤ جو وہ کہہ رہی تھی۔"  
ضیغم بڑبڑایا تھا۔

"کیا بول رہے ہیں؟"  
عینا نے کان لگا کر سننا چاہا۔

"کچھ نہیں پراجیکٹ کے بارے میں ڈسکس کرنے آئی تھی، وہ کراچی جارہی ہے تو کچھ ہیلپ  
چاہیے تھی اسے۔ تم بتاؤ موڈ کیوں آف ہے۔"

ضیغم جانچتے ہوئے بولا۔

"نہیں میرا موڈ تو نہیں آف، وہ تو مجھے آپ سے کام تھا۔"

"اچھا کیا کام تھا؟"

اس کی طرف گھوم کر دیکھا، وہ اپنے اہلی انداز میں کرل بالوں کے ساتھ پرنڈ گھٹنوں تک آتی فراک اور جینز پہنے ہوئی تھی۔ اس دن والی تیاری تو نہیں کی گئی تھی، پر اس دل کو تو وہ ہر حال میں پسند تھی۔

"آپ فری ہیں نا۔"

عینا کو مروتا پوچھنا پڑا۔

"بہت جلدی خیال آیا ہے۔"

سوچ کر سر جھٹکا، اور ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

"پھر یہ سمجھا دیں، مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔"

انگلی سے کتاب پر کھولے صفحے پر نشاندہی کرتی وہ بولی۔  
ضیغم لب بھیج گیا۔

"ہمم... دکھاو!"

سارے دل کے آراں مٹی میں ملے تھے، گہرا سانس بھرتے وہ کتاب کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
منہا کے متعلق اس کا تجسس اسے کتنا خوش کر گیا تھا، لیکن یہاں تو اپنا ہی مطلب نکل آیا۔

\*\*\*\*\*

"اتنا نہ پڑھا کرو، پہلے چوہیا جتنا قد ہے اور چھوٹا ہوتا جائے گا پڑھائی کے بوجھ سے"۔

تائشہ کو کتابوں میں سر دیے دیکھ کر، ضامن اسی کے پاس چلا آیا تھا۔

دل کر رہا تھا کہ اس سے باتیں کرے، لیکن کیا کرے یہی سوچتے اس کی زبان سے یہ جملہ  
نکلا تھا۔

اپنے سر پر کھڑے ضامن کی آواز پر تائشہ نے آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھا تھا۔

"یہ کھمبا کبھی نہیں سدہر سکتا"۔

چوہیا لفظ پر کلس کر سوچا تھا۔

"آپ کو میرے قد سے آخر مسئلہ کیا ہے؟  
لیکن آپ کے لیے عرض کرتی چلوں کہ اس کا میں کچھ نہیں کر سکتی۔"  
تیکھے لہجے میں کہہ کر پھر سے نوٹس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

پیپرز سر پر آن پہنچے تھے، اسے ہر بار کی طرح لگ رہا تھا کہ اس بار کی تیاری اچھی نہیں ہے تو  
پھر کیا تھا کتابیں نکال کے بیٹھ گئی تھی۔

"ہماری کیا مجال، ہم تو بس ایسے ہی ازراہ ہمدردی کہہ رہے تھے۔"  
ہاتھ کی ہتھیلیاں گھاس پر ٹکاتے ان کے سہارے وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔  
آج تائشہ کی جلی کٹی سننے کے بعد بھی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، یہ دل بھی کیسے پدینترا کہا کر بدلا  
تھا۔

الگ انداز میں کہے جملے پر تائشہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اور پھر سے اپنے کام میں  
مگن ہو گئی۔

کچھ پل ایسے ہی خاموشی کے نظر ہو گئے۔ ضامن اسے تنکے جا رہا تھا، یہ پرواہ کیے بغیر کہ اگر سر اٹھا کر اس نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔

کالے بال اسکے جھکنے سے چہرے پر آجاتے تھے، جن کو وہ ہاتھ کی مدد سے کان کے پیچھے اڑستی، پر پھر کچھ دیر بعد نکل کر چہرے پر جھول جاتے، کالے بالوں کی چمک سے انکی ملائمت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

بالوں سے ہوتی نظر اس کے چہرے پر گئی تھی، تو مڑی ہوئی گھنی پلکیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں، چھوٹی سی ناک جسے چپٹی ناک کہتے ہیں، لیکن وہ بھی اسے اسکے چہرے پر بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

اس کی ناک آج غور سے دیکھی تھی کہ لب خود بخود مسکرا اٹھے تھے۔

"خود کی طرح ناک بھی چھوٹی ہے۔"

دل ہی دل میں ہنستا وہ سوچ کر سر جھٹکنے لگا۔

تائشہ کے ماتھے پر لکیر ابھری تھی، شاید وہ لکھتے لکھتے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس سے پہلے تائشہ ضامن کی طرف دیکھتی، ضامن نے نظریں پھیر لیں۔



"وہ۔ اس دن آپ کی پریزنٹیشن خراب ہوئی تھی۔ آپ کا رزلٹ خراب ہو گیا۔ نا میری وجہ سے، سوری۔ میں نا بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی کر دیتی ہوں۔

i am sorry for that"

وہ شرمندہ تھی، نمبر کم آجائیں تو کتنا دکھ ہوتا ہے وہ جانتی تھی۔ اور ضامن بھی تو ٹاپ سکورر تھا۔ اسے بھی دکھ ہوا ہوگا۔

"بندے کو ایسے کام ہی نہیں کرنے چاہیے جس پر معافی مانگنی پڑے۔"  
ضامن کا خالصتاً چڑانے والا انداز تھا۔

دل کو تو سکون ملا تھا، چلو دیر سے ہی صحیح اسے احساس تو ہوا کہ غلط اس نے بھی کیا۔

"یہ بات میں بھی کہہ سکتی تھی، جب آپ نے معافی مانگی تھی۔"  
تائشہ نے ناک چڑھا کر چخ کر کہا، ضامن نے ہنسی دبائی۔

"میرا ظرف بہت بڑا ہے نا، تبھی کہا نہیں۔"

منہ پھلا کر کہتی ضامن کو دل کھول کر ہنسنے پر مجبور کر گئی۔

"بہت بڑے ظرف کی مالک ہو تبھی بدلہ لینے کی ٹھانی تھی۔"

ضامن جتنا نہ بھولا تھا۔

"ہنہ.."

وہ بس ہنکار بھر کر رہ گئی۔

\*\*\*\*\*

پیپر ہونے میں تین ہفتے باقی تھے، سب کی ہی لائبریری کی دوڑیں لگ رہی تھیں۔ اور پراجیکٹ بھی مل چکے تھے، اس بار گروپس کی صورت میں پریزینٹ کرنا تھا۔ اور ان تینوں کا گروپ اب اسی پر کام کر رہا تھا۔

ضیغم کچھ وقفے کے بعد اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی عینا کو دیکھتا تو وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ ضیغم الجھ سا جاتا۔ وہ کیوں بے مقصد مسکرائے جا رہی ہے۔ پھر سے نظریں عینا کی طرف موڑتا تو اسے خود کو دیکھتا پاتا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟"

وہ بڑبڑایا، عینا نے اب نظریں اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر مرکوز کر لی تھیں۔

"کیا کہہ رہا ہے؟"

شہریار اور ضامن اس کی بڑبڑاہٹ پر متوجہ ہوئے۔

"نہیں کچھ نہیں!"

اچھا میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔"

اسکا دھیان عینا کی طرف تھا، اس لیے وہ کچھ دیر اس کے پاس جا کر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔

"کہاں جا رہا ہے؟ یار بہت کام پڑا ہے۔ تو نے ابھی تک ایک صفحہ نہیں لکھا۔ اور اب جا رہا ہے۔"

ضامن اسے لڑکنے لگا۔

ضیغم نے پھر سے نظریں عینا کی طرف اٹھائیں، جو اب مسلسل رجسٹر پر کچھ بنا رہی تھی۔ ضامن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو عینا بیٹھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی تالشہ ہمیشہ کی طرح کتابیں لیے بیٹھی تھی اور تن دہی سے نوٹس بنا رہی تھی۔

"جاو بھی!"

اب سمجھ آئی ہے بندہ محبت کے بعد ناکارہ کیوں ہو جاتا ہے۔"  
ضامن اپنی حالت پر قابو پاتا بولا تھا۔ تالشہ کو دیکھنے کے بعد اس کا اپنا دل کام چھوڑ دینے کا کر رہا تھا۔

"کوئی ناکارہ نہیں ہوا، بس اس سے کچھ نیچھنا ہے۔ آتا ہوں ابھی۔"

اسے جھڑکتا، وہ کہہ کر عینا کی طرف چل پڑا۔  
اس سب کے دوران شہریار اپنے دھیان میں لگن تھا۔ آج ہیر نے چھٹی کی تھی۔ وہ بھی بنا بتائے، تو موڈ خراب تھا۔ اور وہ چپ چاپ سا بیٹھا پڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب مزید دھیان نہ دے پایا تو ضامن کی سنے بغیر اٹھ کر چلا گیا، پیچھے ضامن بھی ناچار بیٹھا لکھنے لگا۔

\*\*\*\*\*

ضیغم جو اس کے نظر آتے انداز پر الجھتا اس کے پاس آیا تھا، تو دیکھا وہ گھٹنوں پر رجسٹر کو رکھے  
اب بڑے انہماک سے پنسل سے کچھ بنا رہی تھی، پر کیا؟ یہ وہ دیکھ ہی نہیں پایا اس سے پہلے

کہ مزید جھک کر دیکھتا اسی وقت عینا نے بھی سر اٹھایا اور ضیغم کی سابقہ جگہ پر نظریں دوڑائیں  
پر وہ وہاں ہوتا تو دکھتا۔

اس کے اس انداز پر ضیغم کے ہونٹ خود بخود مسکائے تھے۔ عینا اب بھی سامنے دیکھ کر اسے  
ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ اور پھر وہ اس کے سر پر  
ہلکی سے چپت لگا کر ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

سر پر پڑتی مخصوص چپت سے وہ سیکنڈ میں پہچان گئی کہ یہ اس کا دوست ہی ہے، تبھی  
اشتیاق سے مڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے ضیغم کو دیکھا، جو اسی کی انداز میں بیٹھا گھٹنوں پر ہاتھ  
دھرے اس کے آدھ کھلے رجسٹر میں جھانک رہا تھا، اس کی نظروں کے ارتکاز کو دیکھتی وہ جھٹ  
سے رجسٹر ہی بند کر گئی۔

"دکھاؤ مجھے، میں بھی تو دیکھوں اتنی دیر سے کیا کر رہی تھی؟"  
اس کے رجسٹر بند کرنے پر مزید الجھتا، وہ رجسٹر لینے ہی لگا تھا کہ عینا نے رجسٹر کو پیچھے چھپا  
لیا۔

"نہیں ابھی نہیں، یہ آدھورا ہے۔ جب پورا ہو جائے گا تب دکھاؤں گی۔"

ہلکی آواز میں مسناتی، ضیغم کو مسکرانے کی وجہ دے گئی۔ کچھ تو وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ آخر رجسٹر میں کونسا خزانہ چھپایا گیا ہے۔

"آدھوری چیزیں بہت لطف دیتی ہیں، دکھاؤ ادھر۔"  
ہاتھ کو پیچھے لے جاتے رجسٹر کو جھپٹ کر اپنی گرفت میں لیا تھا کہ عینا بس دیکھتی رہ گئی اور جب ہاتھ سے رجسٹر چھوٹا تو چیخ نکلی۔

"نہیں، پلیز!"

اس کی چیخ پر وہ جو اردگرد سے بے خبر اپنے ہی دھیان میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی، ہڑبڑا کر عینا کی طرف متوجہ ہوئی۔

تائشہ کی نظریں خود پر اور عینا پر محسوس کر کے ضیغم شرمندہ ہوا تبھی لب سوری کے انداز میں بے تھے۔

تائشہ کچھ پل تو غیر دماغی سے دونوں کو دیکھتی رہی پھر جب بات سمجھ میں آئی تو ہلکا سا ہنس کر کتابیں سمیٹتی جانے لگی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

ضیغم شرمندہ سا تھا پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہوگی۔ تبھی تائشہ سے پوچھا۔

"وہ مجھے کچھ سمجھنا تھا، ضامن بھائی سے سمجھ لیتی ہوں۔"

اس کا ارادہ تو لائبریری میں جانے کا تھا کہ سکون سے نوٹس بنا لے گی، لیکن ضیغم کے سوال پر وہ بہانہ بنا کر کچھ فاصلے پر بیٹھے ضامن کو دیکھتی بولی اور پھر اسی کی طرف چل دی۔

تائشہ کے جانے کے بعد ضیغم نے گہرا سانس بھرتے رجسٹر کھولا تھا، اور پھر اس کے ورق پلٹنے لگا، اس سے پہلے کہ وہ اپنے مطلوبہ صفحہ پر پہنچتا عینا نے دونوں ہاتھ رجسٹر پر رکھ لیے۔

"ابھی مجھے مکمل کرنے دیں پھر دیکھ لینا پلیز۔"

وہ منت کر رہی تھی، ضیغم کو تو ابھی ہی دیکھنا تھا۔

اسے دیکھنا تھا کہ اس کی معصوم، بے ضرر محبت نے آخر اس کی چھوی کو صفحے پر کیسے اتارا ہے، تبھی اسکی منت کو نظر انداز کرتا اسکے رجسٹر اسکے کو ہاتھوں کی قید سے نکالا۔

"مکمل بھی دیکھ لوں گا، لیکن ابھی مجھے آدھورا ہی دیکھنا ہے۔"

صفحے پلٹتے وہ کہہ رہا تھا، کہ نظر ٹھٹک کر کی۔

پنسل سے بنایا گیا اسکا آدھا سکیچ صفحے پر موجود تھا۔

بال، پیشانی، اور آنکھیں ابھی تک صرف یہی بنا پائی تھیں۔ اور وہ بالکل ضعیف کا ہی سکیچ تھا۔ پہلے حیرانی سے آنکھیں پھیلیں اور پھر دھیرے، دھیرے ستائش اتری جب کہ عینا منہ بسور کر بیٹھ گئی۔

"کمال! بہت زبردست!"

کہاں سے سیکھا سکیچنگ کرنا؟"

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں یہ ہنر بھی ہے۔

تعریف اور اسکے بعد اشتیاق سے پوچھے گئے سوال پر عینا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"کہیں سے بھی نہیں!"

رجسٹر اس کے ہاتھ سے لیتے بولی تو ضعیف نے ایک بار پھر سے سراہا۔

"بہت اچھا بنا لیتی ہو، تم میں یہ ٹیلنٹ ہے بتایا ہی نہیں کبھی!"

"یہ ٹیلنٹ تھوڑی ہے!"



مخصوص انداز میں چشمہ درست کرتی وہ نرمی سے بولی۔

"تو اور کیا ہے، یہ بھی ایک ہنر ہے۔ اور واقع ہی تم بہت اچھا سکیچ بنا لیتی ہو۔ ویسے ایک بات ہے تمہاری رائٹنگ دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی ڈرائنگ کر لو گی"

ہنستا ہوئے کہتا وہ اسے بھی ہنسا گیا۔

"ویسے کب تک مکمل ہو جائے گا یہ۔"

وہ جو اسکے پیشانی پر بکھرے بالوں پر پینسل پھیرتی انہیں گہرا کر رہی تھی، ضیغم کے سوال پر نظریں اٹھائیں۔

"جب آپ ایک جگہ ٹک کر بیٹھیں گے۔"

ہنستے ہوئے اس نے بھی لطیف سا طنز کیا تھا، ضیغم مسکراہٹ دباتا سر ہلا گیا۔

"تو یہ لو بیٹھ گیا ہوں ٹک کر، اب بناو تاکہ یہ جلدی سے مکمل ہو اور اسے فریم کر کے اپنے کمرے میں لگاؤں۔"

سکچ جتنا بھی بنا تھا وہ واقع کسی ہنر مند ہاتھوں سے بنا دکھ رہا تھا۔ پر یہ تو عینا تھی جسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر کیا کیا خوبیاں ہیں۔

"نہیں پلیز! اتنا برا بنے گا آپ روم میں مت لگائیے گا۔"  
 اتنی پزیرائی پر بھی وہ ڈھیٹوں کی طرح اپنے ہی سکچ کی برائی کر رہی تھی۔

"عینا یہ برا ہے؟"

کسی ماہر کے ہاتھ کا بنا لگتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ تم میں اتنا ٹیلنٹ ہے اور تم نے ابھی تک چھپا کر رکھا ہوا ہے بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں تم یہاں بی بی اے میں کیا کر رہی ہو تمہیں واقع ہی آرٹ کا ڈیپارٹمنٹ جوائن کرنا چاہیے تھا۔ وہاں تمہارے لیے بہت چانس ہو سکتے تھے۔" وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے ناصح ثابت ہوا تھا۔ عینا کئی بار سوچتی تھی کہ وہ کیوں نا پہلے ہی اسلام آباد آجاتی یا پھر ان سب کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی اس سے ملوا دیتے تو شاید آج وہ بہت مختلف ہوتی۔ لیکن یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں، جو جس وقت ہونا لکھا ہے وہ اسی وقت پر ہی ہو کر رہتا ہے۔

"اما کہتی ہیں کہ یہ آرٹس وغیرہ کا سکوپ نہیں ہے، اور آرٹس والے لوگ بس خود تک محدود رہ جاتے ہیں انہوں نے آرٹس میں جانے ہی نہیں دیا۔"

اسے یاد آیا تھا مریم بیگم نے اسے کتنا ڈانٹا تھا جب اس نے آرٹس جوائن کرنے کی خواہش رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ بات رحیم صاحب تک جاتی، مریم بیگم نے عینا کو آرٹس سے کافی حد تک متنفر کر دیا تھا۔

"کیوں سکوپ نہیں ہے؟ اور بات سکوپ کی نہیں شوق کی ہوتی ہے عینا۔ میرا ماننا تو یہ ہے کہ جو آپ کا شوق ہے آپ وہی کرو، دنیا کی باتوں میں آکر فیصلہ نہ بدلو۔ کامیاب بھی وہی ہوتا ہے جو اپنے فیصلوں سے دنیا کی سوچ بدلنا جانتا ہو نہ کہ دنیا کی سوچ کے مطابق خود کے فیصلوں کو بدل ڈالے۔"

ضیغم حقیقت پرست بن چکا تھا، اور اسے حقیقت دکھانا چاہ رہا تھا۔ عینا بھی سمجھتی تھی پر وہ کامیاب نہیں تھی، وہ بھی جانتی تھی۔ اور اب تو شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ فیصلہ بدل چکی تھی۔ اب جیسا تھا اسے ایسے ہی چلنا تھا۔

"خیر جو ہونا تھا ہو گیا، لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تمہارا جو شوق تھا اسے پروفیشن نہیں بنایا تو کیا ہوا۔ جو پروفیشن ہے اسے شوق بنایا جاسکتا ہے۔"

وہ نرمی واپس لوٹ آئی تھی، حقیقت پرست تو وہ اب بھی تھا، وہ حقیقت ہی سمجھا رہا تھا لیکن یہ تلخ نہیں تھی بلکہ نئی میٹھی راہ تھی، پھولوں سے سچی راہ ایک نئی منزل کی نوید۔  
 پہلے حیران ہوئی کہ وہ اسکے دل میں اٹھتی ناامیدی کو کیسے بھانپ گیا اور پھر الجھی کہ کیسا پروفیشن اور کیسا شوق۔ لیکن وہ تو اسکے چہرے پر رقم سوالوں کو بانٹتی پڑھنا جانتا تھا اسے ضرورت ہی کہاں تھی لفظوں کو اختیار کرنے کی۔

"عینا! ایک بات اپنے دماغ میں گراہ لگا کر رکھ لو جس کام کو بھی کرنے کے لیے چن لو، چاہے وہ پسندیدہ تھا یا نہیں، لیکن جب چن لیا تو اسے سو فیصد پسندیدگی سے کرو۔ پھر دیکھنا کامیابی کیسے قدم چومتی ہے۔  
 اگر بی بی اے کر رہی ہو تو لگن سے کرنا، صرف پاس ہونے کے لیے نہیں، بلکہ کچھ بننے کے لیے، اپنا مقام بنانے کے لیے۔ کیونکہ میں ایک دوست ہونے کے ناطے تمہیں کامیابی کی منزلیں پار کرتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اسکے لفظوں میں کیسا یقین بول رہا تھا۔ اور یہی یقین عینا میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ لیکن ضیغم کے لفظوں کا یقین اس کے اندر بھی یہ یقین کا جذبہ تھوڑا ہی صحیح پر پیدا کر رہا تھا۔

اسکے لفظوں کو سمجھتی سر ہلا گئی، ضیغم ماحول کو سنجیدہ ہوتا دیکھ پاؤں پھسار کر بیٹھتا اس کی توجہ بھی سکیچ کی طرف دلوائی۔

"چلو شاباش! اب جلدی سے اسے مکمل کرو، پھر دیکھنا کیا شاندار پیس بنتا ہے۔ ویسے زیادہ کمال تو میری خوبصورتی کا ہے نا، تبھی زیادہ اچھا لگ رہا ہے کیوں؟"

شرارت سے کہتے آخر میں بھنویں نچائیں کہ اس کی شرارت سمجھتی عینا نے بھی ناک سے مکھی اڑائی۔

اسکے انداز پر جہاں ضیغم کا قہقہہ پھوٹا وہیں عینا کی بھی کھلکھلاتی ہنسی نکلی۔

\*\*\*\*\*

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

وہ جو صفحے پر صفحے بھرنے کے چکر میں ہر فکر کو پس پشت ڈالے پڑھائی میں محو تھا، دشمن سکون کی آواز پر پھر سے فکر میں گرتا آنکھیں میچ گیا۔

"ہاں! کیوں نہیں؟"

مروتا بیٹھنے کا کہا، جب کہ یہ کارستانی دماغ کی تھی دل تو اس کی آمد پر اچھل ہی پڑا تھا۔

کچھ وقت تو دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق بنے بیٹھے اپنے کام میں لگے رہے۔ خیر تائشہ تو واقع ہی لکھنے میں مصروف تھی جب کہ ضامن صرف لکھنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ ورنہ اس کی موجودگی میں دل کہاں کچھ اور کرنے کا سوچ بھی سکتا تھا۔

جب مزید کچھ پل یوں ہی بیتے تو کتاب بند کرتا دل کی پرزور فرمائش پر دشمن جاں کو دیکھنے لگا۔

"چوہیا! اتنا نہ پڑھا کرو یا۔"

اسے مسلسل خود میں لگن دیکھ کر مجبوراً ضامن کو اسے مخاطب کرنا پڑا لیکن اس خطاب پر تائشہ نے گہرا سانس بھرتے اڈتے غصے کو دبانے کی خاطر آنکھیں میچی تھیں۔

"ضامن بھائی..!!"

چوہیا لفظ پر، وہ تنبیہ کرتی چلائی تھی۔

وہ جو چوہیا کہنے کے بعد زبان دانتوں میں دبا گیا تھا اب اس کے بھائی کہنے پر ضامن چونکا تھا۔

یہ پہلی بار تھا جب وہ اسے یوں مخاطب کر رہی تھی۔ پہلے کبھی مخاطب کرنے کے لیے نام پکارنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اور کبھی ذکر کرنا ضروری بھی ہوتا تھا تو چوہیا اور کھمبے کے علاوہ اور کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔

تالشہ کے لیے تو خیر یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی۔ اس کے دل میں کونسا چور چھپا تھا جو بھائی کہتے اس کی زبان لڑکھڑاتی، پر مقابل کا دل پسج گیا تھا۔  
بھائی لفظ جیسے اسے اپنا رقیب معلوم ہوا تھا۔

پہلے جو وہ اسی کشمکش میں تھا کہ وہ تالشہ کے لیے واقع ہی جزبات رکھتا ہے یا یہ محض وقتی کشش ہے۔ اب اس کے منہ سے اپنے لیے بھائی لفظ پر وہ بلبلا اٹھا تھا۔

"دیکھو لڑکی! میں تمہارا بھائی وائی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھے آئندہ بھائی مت بولنا۔"  
وہ انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتا، سختی دکھا رہا تھا۔  
اس کی آنکھوں اور لفظوں میں سخت تاثر دیکھ کر تالشہ ناک سکیڑ گئی تھی۔

"کیوں ضامن بھائی؟"

فوراً سوال آیا۔ اور ساتھ میں وہ شرارت سے باز نہیں آئی تھی۔ اتنا تو اسکا بھی حق بنتا تھا، آخر کو کتنے عرصے سے وہ اسے چوہیا کہے جا رہا تھا۔

ضامن نے بے بسی سے ماتھا مسلا۔

اسے آج ضیغم کی حالت کا اندازہ ہوا تھا، وہ کیسے اس بھائی لفظ کو برداشت کرتا ہوگا۔ جس کے لیے دل میں الگ مقام ہو، دل کی خواہش پر جسے زندگی میں ایک الگ رشتے سے لے آنے کا سوچا ہو، اس کے منہ سے اپنے لیے بھائی لفظ سننا کتنا دردناک ہوتا ہے۔ یہ آج ضامن پر آشکار ہوا تھا۔

اب اس کے کیوں کا وہ کیا جواب دیتا۔ سر کھاتے اس نے بے تکا سا جواب ڈھونڈ ہی لیا۔

"یار دیکھو، ضامن کے ساتھ بھائی لفظ کچھ جچتا نہیں ہے۔ اور ویسے بھی اب ہم دوست ہیں تو پھر یہ بھائی وائی والی فار میلیٹی سمجھ نہیں آتی۔"

وہ اسے ٹھہر کر اپنے دماغ میں آئے جواب کو سمجھا رہا تھا۔  
اور تالشہ مہنویں سکڑے اسے سن رہی تھی۔

"آپ سے کس نے کہا ہم دوست ہیں؟  
اور اگر بھائی نہیں کہونگی تو کیا کہونگی؟"  
تالشہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔



"سمیل سی بات ہے، پہلے ہم دشمن تھے اب ہم میں صلاح ہو گئی ہے تو ہم دوست بن گئے ہیں۔ آئی سمجھ؟

اور یہی بات کہ تم مجھے کیا کہو گی تو ضامن کہہ لو۔ فکر مت کرو مجھے بالکل برا نہیں لگے گا۔ وہ اسے اپنی عقل کے مطابق کافی حد تک مطمئن کر چکا تھا۔ تائشہ بھی سمجھتی سر ہلا گئی۔

لیکن اچانک سے اس کے ذہن میں خیال کوندا۔

"پر ہیر اور عینا بھی تو آپ کو ضامن بھائی کہتی ہیں، انہیں کیوں نہیں روکا کہ ضامن کے ساتھ بھائی اچھا نہیں لگتا۔"

تائشہ نے واقع ڈھونڈ کر پتہ نکالا تھا۔ اور ضامن اس کے سوال پر گڑبڑایا۔ اب کیا جواب دے، کن اکھیوں سے اسکی سوالیہ نظروں میں دیکھتا بہانہ بنانے لگا۔

"ارے وہ، ان کے منہ سے اچھا لگتا ہے نا۔

مسئلہ تو تمہارا ہے، اب چوہیا مجھے بھائی کہے گی تو کتنا عجیب لگے گا نا۔"

وہ اسے چڑانے کی خاطر چوہیا کہتا ہنستے ہوئے مذاق اڑا رہا تھا۔

ارادہ صرف اسے اس مدعے سے ہٹانا تھا۔

"اچھا!...."

وہ گھورتے ہوئے دانت پیس رہی تھی۔  
پھر شرارت سے آنکھیں پٹپٹاتی گویا ہوئی۔

"لیکن میرے منہ سے کھمبا لفظ بہت اچھا لگتا ہے اور اب میں آپ کو وہی کہوں گی۔"  
دانتوں کی نمائش کرتی وہ مقابل کے چھکے چھڑا گئی تھی۔  
وہ ایسے اٹکیلیاں کرتے ہوئے کتنی اچھی لگ رہی تھی، ضامن کے دل نے بے ساختہ ایک  
دہڑکن چھوڑی تھی۔

"چوہیا! مجھے کھمبا مت بلایا کرو۔"  
وہ مصنوعی رعب جھاڑتا اس کی کھنکھتی ہوئی ہنسی کا باعث بنا تھا۔

"کھمبا! کھمبا!"

وہ ہنستے ہوئے اسے چڑھانا جاری رکھے ہوئے تھی۔

اور ضامن وہ تو اس کی ہنسی میں خود کو گم ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔  
 اردگرد کا سارا منظر جیسے غائب ہو گیا ہو۔ وہ تھا اور اس کے سامنے بیٹھی اس کی چھوٹی چوہیا جو  
 ہنستے ہوئے دہری ہو رہی تھی۔ اور وہ بیٹھا آنکھوں سے ہی اس کے صدقے واری جا رہا تھا۔ دل کہہ  
 رہا تھا کہ اس کے چمکتے دانتوں کو چھو لے۔ جس کی ہنسی کی آواز کانوں میں رس گھول رہی  
 تھی۔ اور اس کے مسکراتے لب دل پر برف کی ڈلی رکھ کر اسے مزیف گدگار ہے تھے۔  
 وہ ایسی عجیب خواہشات کے سراٹھانے پر ہوش میں آیا تھا۔ اور بمشکل خود کو سنبھالتا نظریں  
 پھیر گیا تھا۔

\*\*\*\*\*

"ویسے سنا تھا، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ آج اپنی حالت تم جیسی ہوتی دیکھ کر  
 مجھے یقین آ گیا ہے کہ ایسا ہی ہے۔"  
 ضامن بے بسی سے گویا ہوا۔ اتنے دنوں سے اپنی اندر کی کیفیت سے پریشان ہو کر آج اس نے  
 ان دونوں سے بات کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔ اب جو مذاق بننا تھا، وہ دیکھا جائے گا۔ جو کیا تھا  
 اب اسے بھرنی بھی تھا، لیکن اتنا طے تھا کہ یہ دونوں مشورہ مخلصانہ دینگے۔

"کیا ہو گیا تیری حالت کو، صحیح سلامت تو ہے۔"  
شہریار نے اسکا مکمل جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اس وقت دونوں ضیغم کے گھر موجود تھے پیپر سر پر آن کھڑے منہ چڑا رہے تھے، اور پراجیکٹ کی بھرمار الگ تھی۔ اس لیے کچھ دنوں سے ان کا یہی معمول تھا۔ پہلے بھی پیپر آتے ہی وہ مل کر ہی تیاری کیا کرتے تھے اور اب تو آخری سمیٹر تھا۔ تیاری بھی زیادہ کرنی تھی، پر مسئلے تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

"ایک بات تو بتاؤ، کیا ایسا ممکن ہے کہ جو لوگ پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔ بعد میں کسی ایک کو وہ اچھا لگنے لگ جائے؟  
ایسا ہو سکتا ہے؟"

یہ سوال اسے اندر اندر ہی کھائے جا رہا تھا۔ تبھی پہلے تصدیق کرنا چاہی۔

"اس کے چانسز سب سے زیادہ ہیں، تو نے سنا نہیں لڑنے سے پیار بڑھتا ہے، جو زیادہ لڑتے ہیں ان کے بیچ پیار ہو جانے کے چانسز بھی زیادہ ہی ہیں۔"

ضیغم نے مصروف انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ جب کہ شہریار خاموش بیٹھا اسے جانچتا رہا۔

"کہیں تجھے تو پیار نہیں ہو گیا؟"

شہریار کے اچانک سوال پر وہ سٹپٹایا، ضیغم نے بھی چلتا ہاتھ روک کر ضامن کی جانب دیکھا۔

"پیار ویاں کا تو نہیں پتہ پر ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔"

سر کھجاتے ہوئے، ضامن نے بھی جرم کا اعتراف کر ہی لیا۔

"ویسے مجھے کوئی خاص حیرانی نہیں ہوئی، جب سائیں صاحب پیار جیسے مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ تو تمہارا تو بنتا ہی ہے۔"

شہریار کے کہنے پر جہاں ضامن کا اٹکا سانس بحال ہوا تھا وہیں ضیغم نے بھی اسے آواز نیچی رکھ کر بات کرنے کو کہا تھا۔

"شکر ہے کمینوں نے ریکارڈ نہیں لگایا"

ضامن کی دل سے آواز نکلی۔

"تو میں انسان نہیں ہوں، مجھے بھی کوئی اچھا لگ سکتا ہے۔ اور عینا سب سے مختلف ہے، شاید ویسی جیسی میں چاہتا تھا، تبھی اس نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ ہاں پیار اور محبت کے بارے میں میری اب بھی رائے وہی ہے جو پہلے تھی۔ عینا سے خاص انسیت ہے اور باقی یہ محبت وغیرہ تو شادی کے بعد، ابھی صرف پسندیدگی ہے۔"

ایک نظر بند دروازے پر ڈال کر وہ دہیمے آواز میں انہیں سمجھانے لگا، پر شہریار آج سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ہاں تو ایسا کر اپنی پسندیدگی پر لگا رہے، تب تک کوئی اور چشمش کو لے کر اڑ جائے گا۔" شہریار نے بھی دہیمی آواز میں خبردار کرنا ضروری سمجھا۔

"اپنی بکو اس بند نہیں رکھ سکتا۔"

ضیغم کو شہریار کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ تبھی سختی سے اسے ٹوکا تھا۔

"میں تو بند کر لوں گا بکو اس پر تو خود سوچ یہ جو انسیت ہے، یہ کب تک رہنی ہے۔ تیری اماں سائیں نے کہا کہ انکل تیرے لیے رشتہ ڈھونڈ کر بیٹھے ہیں، اب بتا کیسے کرے گا عینا سے شادی؟"

شہریار کی بات بھی حقیقت پر پوری اترتی تھی۔

"میں کر لونگا کچھ نہ کچھ۔"

شہریار سے زیادہ خود کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھتے ہیں۔"

شہریار نے بھی جتلاتے ہوئے کہا تھا۔

"کوئی میری بھی سن لو۔"

ان دونوں کے دہیمی سروں پر ہوتے مکالمے سے تنگ آکر ضامن چیخا۔

"ہاں بول! بلکہ پہلے یہ بتا یہ پیار تجھے ہوا کس سے ہے؟"

شہریار اب ضامن کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

ضیغم پھر سے لکھنے میں لگن ہو چکا تھا، ہاں وہ الگ بات تھی کہ شہریار کی کہی باتیں اس کی سوچوں کو منتشر کر رہی تھیں۔

"یہی تو اصل مسئلہ ہے، جو ڈسکس کرنا چاہ رہا تھا۔"  
جھنجھلایا سا وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"اب یہ نہ کہہ دینا کہ تجھے پتہ ہی نہیں ہے کس سے پیار ہوا ہے۔"  
شریار نے خدشہ ظاہر کیا۔ ضیغم کی بے ساختہ ہنسی نکلی۔ اور ضامن اس کا دل کیا، اپنا سر پیٹ لے۔

"اچھا اچھا بول، کیا مسئلہ ہے۔"  
ضامن کے سخت تیور دیکھ کر اس نے ہچکارا۔

"مجھے تائشہ اچھی لگنے لگی ہے۔"  
یہ دہماکا تھا جو وہ کب سے پھوڑنا چاہ رہا تھا۔

ضیغم کے ہاتھ سے پین چوٹ کر نیچے گرا، شریار کی آنکھیں جو اسی پر جمی تھیں، وہ مزید پھیل چکی تھیں۔



کچھ پل دونوں اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کر رہے تھے، کہ ابھی وہ کہہ دیگا کیسا لگا میرا مذاق۔ لیکن اس کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"لطیفہ اچھا تھا۔"

شہریار تالی بجاتا ہنستا ہوئے دہرا ہوا تھا، ضامن نے بے بسی سے اس کے منہ سے نکلتے ہنسی کے پھوارے دیکھے تھے۔

"یہ اب کونسا نیا مذاق ہے۔"  
جب کہ ضیغم نے جانچنا چاہا۔

"آئی ایم سیریس یار۔"

ضامن نے سر جھلایا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا، تمہیں تاثر اچھی لگنے لگی ہے؟ وہی پڑھیا، جس سے تجھے ہر وقت مسئلہ رہتا ہے۔ بول دے تو مذاق کر رہا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس کے سنجیدہ انداز پر شہریار کو تو مانو جھٹکا لگا تھا۔ آخر میں وثوق سے اپنی رائے بھی دی

"ایسا ہو چکا ہے۔ وہی پتوہیا، اب پتہ نہیں کیوں مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔"  
وہ کندھے جھکاتا، بے بس دکھا۔

"یہ معجزہ ہوا کب؟ ہمیں تو خبر نہیں ہوئی۔"  
شہریار کی طرف سے کیے گئے سوال پر ضامن نے کندھے اچکائے، جیسے کہنا چاہ رہا ہو مجھے خود  
خبر نہیں ہوئی۔

"بہت بڑی انہونی ہو چکی ہے، لیکن یہ ہو کیسے سکتا ہے۔ ابھی ایک مہینے پہلے تک تو مرنے  
مارنے پر اتر آئے تھے تم اور اب...  
حیرت ہے بھئی۔"  
ضیغم نے بھی حیرانی کا اظہار کرتے کندھے جھکائے کیا۔

"خود ہی تو کہا کہ جن کے بچ لڑائی زیادہ ہوتی ان میں پیار بھی بڑھتا ہے۔ اب اتنے بھی ویرڈ  
ایکسپریشنز نہ دو جیسے ناممکن بات کر دی ہو۔"  
ضامن صوفے سے ٹیک لگاتا، جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا چکا تھا۔

یہ تینوں کی عادت تھی، جب بھی بے سکونی یا کوئی پریشانی گھیر لیتی تھی، تو ایسے ہی سگریٹ پھونک کر پھپھڑے کالے کرتے تھے۔ لیکن اپنے بقول والدین سے اس گندی عادت کو چھپائے ہوئے تھے۔

"یار بھلا کبھی بلے اور پتوہیا میں پیار ہو سکتا ہے؟  
یہ ناممکن ہے میرے دوست۔"

شہیار کی ہنسی تھی کہ اب رک ہی نہیں رہی تھی۔ اور اسکی مثال پر ضامن نے دانت پیسے۔

"ہاں نا یہ ناممکن بات ہی کی ہے تو نے، اسے (سگریٹ) بجھا ابھی، ریڈ پڑ گئی تو تیرا کچھ نہیں جائے گا۔ ٹولی میں میری عدالت ضرور لگ جائے گی۔"

ضامن نے ابھی ایک کش ہی بھرا تھا کہ ضیغم نے کاغذوں سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ پھر ایک نظر بند دروازے پر ڈالی، اور سگریٹ چھین کر اپنے جوتے کے نیچے مسئلہ تھا۔

"یار میں شدید ٹینشن میں ہوں۔ اوپر سے تم لوگ بھی کوئی مشورہ نہیں دے رہے ہو۔ اچھے خاصے ایکسپیرینسڈ بندے ہو۔"

فرش پر پڑے مسلے ہوئے سگریٹ کو دیکھتے وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

"مسئلہ کیا ہے؟ اب اچھی لگنے لگ گئی ہے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔"

شہریار نے تو مانو بات ہی ختم کر دی تھی۔

"تو آگے کیا کروں میں؟ اسے بتادوں؟"

ضامن نے جاننا چاہا پر ایک بار پھر انہیں حیران کر گیا۔

"اسے پتہ نہیں ہے؟"

سوال ضیغ کی طرف سے اٹھا تھا۔

ضامن نے نہ میں سر ہلایا۔

"بس پھر تیار ہو جا، جوتے کھانے کے لیے۔ یا تو گنجا کرے گی یا پھر تیری ہڈیاں توڑ دے گی۔"

شہریار نے مستقبل کا نقشہ کھینچا۔

"شہریار صحیح کہہ رہا ہے۔ میں حیران تھا کہ وہ مان کیسے گئی۔ چلو جو حرکت تم نے کی تھی اس پر معاف کرنا تو سمجھ آتا ہے، لیکن پرنسز اکسیپٹ کرنا یہ تھوڑا ان پریڈیکٹبل ہوگا۔"

وہ بھی ایسے بندے کا جس نے اسے ہر جگہ نیچا دکھانے کی کوشش کی ہو، آئی تھنک تمہیں اپنے آپ کو کچھ ٹائم دینا چاہیے ہو سکتا ہے کہ یہ وقتی جزبہ ہو، محض اٹریکشن ہو۔ اس لیے تھوڑا انتظار کر، پھر سوچتے ہیں کچھ کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

ضیغم نے اپنی منطق کے حساب اسے اچھا مشورہ دیا تھا۔ شہریار بھی متفق دکھا تھا۔

"تجھے کیا لگتا ہے میں نے خود کو ٹائم نہیں دیا؟ اتنے ٹائم سے یہی تو کرتا آ رہا ہوں۔ پر نتیجہ وہی نکلا۔"

ضامن کی بات سن کر ضیغم سوچ میں پڑ گیا۔

"ایک بات بتا، تو سیریس ہے نا تائشہ کو لے کر؟ یہ نہ ہو کل کو تیرا ارادہ بدل جائے۔ اس سے بات کرنے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لے۔"

"کب سے میں یہی تو بول رہا ہوں، میں سیریس ہوں یا۔ اور میں نے کتنی لڑکیوں کے بارے میں آکر تم سے کہا کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہیں؟ تائشہ پہلی ہی ہے۔ اور عجیب حواسوں پہ سوار ہوئی ہے۔"

ضامن کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں کہتے کہتے وہ جھنجھلایا تھا۔

"اللہ صحیح گن گن کے تجھے سزا دے رہا ہے۔ اصل سزا تو یہ ہے بچو!"  
 شہریار نے اس کی جھنجھلاہٹ پر ہنستے ہوئے اسے مزید تنپایا تھا۔ ضعیف نے بھی ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلایا

"کوئی حل ہے یا میں جاؤں؟  
 اس کی باری تو بہت مدد کی تھی تو نے میری باری آئی تو ہنسی جا رہا ہے بس۔"  
 شہریار کی طرف اشارہ کرتے وہ ضعیف سے کہہ رہا تھا۔  
 "لڑکیوں رہا ہے۔ آرام سے بیٹھ سوچتے ہیں کچھ۔"  
 اس کی پیٹھ تھپکتے شہریار نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"میری مان تو تائشہ کو نہ بتا بلکہ سیدبا رشتہ بھیج دے۔ ماشا اللہ سے اس قابل تو ہے ہی کہ تجھے  
 کوئی رنجیکٹ نہیں کر سکے گا۔ باقی اگر کر دیتے ہیں رنجیکٹ تو پھر ناکام عاشق بننے کی بجائے  
 اپنے کام پر دھیان دے دینا۔"

ضعیف نے اچھا مشورہ دیا تھا۔ پر آخری بات پر ضامن شدید بدمزہ ہوا تھا۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے نا، وہ پانچ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتی۔"  
ضامن کی بات سن کر شہریار مصنوعی گلا کھنکھارنے لگا۔

"ابھی کہہ رہا تھا اسے پتہ نہیں ہے اور اب معلومات یہاں تک بھی حاصل کر لی ہیں۔"

"یہ بات کسی اور طرح پتہ چلی ہے۔"  
ضامن نے دانت کچکچاتے جواب دیا۔

"ویسے لازمی تو نہیں ہے جو وہ کہے ویسا ہی ہو۔ یہ اس کا فیصلہ ہوگا شاید اسکے گھر والوں کا نہیں۔ اور ہوتا تو وہی ہے جو گھر والے چاہیں۔"  
ناصرانہ انداز میں کہتا، وقفے وقفے سے اپنا کام بھی مکمل کر رہا تھا۔

"ضیغم صحیح کہہ رہا ہے اب ہیر بی بی اے نہیں کرنا چاہ رہی، پر یہ تو شادی کے بعد پتہ چلے گا نا کہ کون یونی چھوڑتا ہے۔ آخر کو فیصلہ تو میرا ہی مانا جائے گا۔"

بس تو اللہ کا نام لے کر بھیج دے رشتہ۔ ویسے بھی یہ تھوڑا دیکھ کر ہی ہاں ہو جانی ہے مان لے۔"

شہریار نے اپنی رائے کے ساتھ ساتھ اسے مفت مشورہ بھی دیا تھا۔  
اپنی تعریف پر ہنستا وہ شہریار کا ہاتھ جھٹکنے لگا جسے وہ اس کے چہرے پر رکھ کر جائزہ لے رہا تھا۔

"ضامن گنجا ہو نہ ہو، تجھے تو ہیر نے گنجا کر ہی دینا ہے۔ وہ ابھی بڑی مشکل سے یونی آتی ہے۔ اگر بعد میں تو نے یہ بات کی بھی نہ تو کہیں تجھے گھر سے ہی نہ نکال دے، پھر میرے پاس نہ آنا مسکین بن کر۔"  
ضیغم نے ہنستے ہوئے اسے خبردار کرنا چاہا۔ ضامن نے بھی پورا ساتھ دیا۔

"ہاں!"  
اب تجھے اللہ میاں کی گائے مل گئی ہے تو یوں ہی ہنسے گا نا ہم پر۔ لیکن کوئی نہیں ہمارا ٹائم بھی آئے گا۔"

شہریار نے بھی قرض مستقبل میں چکانے کی ٹھان لی تھی۔

"بلی کہاں ہے ابھی..."



پتہ نہیں کتنے پا پڑ بیلنے پڑیں گے۔"

پھر سے تناؤ اس کے چہرے پر چھا گیا۔ بظاہر تو نظریں سامنے پڑے کاغذ پر مرکوز کی تھیں۔ پر سوچ وہ ابھی بھی اسے ہی رہا تھا۔

"مل جائے گی یار۔"

اپنے سامنے بیٹھے ضیغم کو دیکھتے، شہیار نے امید دلائی۔  
ضیغم نے سر ہلایا۔

"اچھا چلو، کام ختم کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے، کہیں کا کا ہی نہ اٹھ جائیں۔"  
سامنے دیوار پر لٹکی گھڑی پر وقت دیکھتے، جو کہ رات کے گیارہ بج رہی تھی۔ انہیں کام کی تلقین کی۔

دونوں سر ہلا کر اپنی اپنی سوچوں کو جھٹکتے کام میں مشغول ہو گئے۔ سوائے ضیغم کے اسکی سوچوں پر اب بھی عینا سوار تھی، اور یہ بھی کہ وہ کیسے عینا کا حصول یقینی بنائے گا۔ پر کبھی کبھی ہم جو پلاننگ کر رہے ہوتے ہیں، اس کے مخالف ایک اور پلاننگ بھی چل رہی ہوتی جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بھلی لگنے لگ جاتی ہے۔

\*\*\*\*\*

"ضامن یہ دیکھو تصویریں، کتنی پیاری پیاری بچیاں ہیں ماشاء اللہ!

آج تو تم مجھے فائل کر کے بتا ہی دو۔ کتنے دنوں سے میں پوچھ رہی ہوں۔"

صلہ بیگم ہاتھ میں تصویریں لیے اسکے ساتھ بیٹھ چکی تھیں۔ اور اب ایک ایک کر کے تصویریں اسکے سامنے رکھ رہی تھیں۔

واقع لڑکیاں پیاری تھیں، پر تائشہ جتنی نہیں، دل نے آواز اٹھائی تھی۔ اور ضامن بے بسی سے ماں کو دیکھے گیا۔ جو کتنے دنوں سے اسے تصویریں دکھا کر کسی ایک لڑکی کے لیے قائل کرنا چاہتی تھیں۔

"اب ان سب پیاری بچیوں سے شادی کرنی پڑے گی مجھے؟"

ایک نظر سامنے میز پر رکھی تصویروں کو دیکھ کر صلہ بیگم سے کہا تھا۔

"شرم کرو، صرف ایک ہی کا کہہ رہی ہوں کوئی ایک پسند کر کے بتاؤ مجھے۔ اور اب زیادہ ٹال مٹول نہیں چلے گی۔ خود سے سلیکٹ کر لو یا پھر میں خود کوئی سلیکٹ کر لیتی ہوں۔"

تصویریں میز سے اٹھاتی وہ قطعیت سے بولیں۔

"یہ دیکھو مجھے تو یہ بہت پسند آئی ہے، لمبی بھی ہے، آنکھیں دیکھو بڑی بڑی ہیں۔ اور بال ما شاء اللہ کتنے لمبے ہیں۔ تم بتاؤ۔"

ایک تصویر اٹھاتیں وہ ایسی خصوصیات بتانے گئیں، جو تائشہ کے بالکل تضاد تھیں۔

"امی! مجھے نہیں پسند بڑے قد کی لڑکیاں اور لمبے بالوں والی بچیاں۔"  
جھنجھلا کر کہتا وہ تصویر پرے ہٹا گیا۔ یہ دیکھ کر ہی اسکا دل خراب ہونے لگا تھا۔

ویسے بھی آپ بھول رہی ہیں آپ نے کہا تھا، میری مرضی سے شادی کروائیں گیں۔  
ضامن نے کچھ جتلاتے ہوئے کہا تھا۔ البتہ چہرہ مسکرا رہا تھا۔

"ہاں تو کرو نا پسند۔"

دوبارہ سے تصویریں اس کی گود میں پڑے لیپ ٹاپ پر رکھتیں وہ ضد سے کہنے لگیں۔

"ان میں سے نہیں۔"

تصویریں اٹھا کر ان کے ہاتھ میں رکھتا نرمی سے گویا ہوا۔

"تو پھر؟"

صلہ بیگم نے اسے نا سمجھی سے دیکھا۔

ان کے سوال پر لیپ ٹاپ بند کر کے میز پر رکھتا، ان کی طرف پورا کا پورا گھوم کر بیٹھا۔

"پھر یہ کہ ایک لڑکی ہے...."

ان کے چہرے پر نظریں دوڑائیں، وہ اسے ہی سن رہی تھیں۔ اور آنکھوں سے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"یونی میں ہی پڑھتی ہے، اچھی لگتی ہے مجھے۔ باقی آخری فیصلہ تو آپ کو پسند آتی ہے یا نہیں اس کے بعد ہی ہوگا۔"

ضامن نے تحمل سے بات ختم کی۔

"یہ تو اچھی بات ہے نا، مجھے اتنی بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ کون ہے، کہاں رہتی ہے، فیملی میں کون کون ہے؟"

صلہ بیگم تصویروں کو پرے کرتیں، خوشی سے بولی تھیں، وہیں ضامن کا اٹکا سانس بھی بحال ہوا تھا۔

"بتایا تو ہے لڑکی ہے، رہتی کہاں ہے وہ بھی بتادوں گا اور فیملی میں کون کون ہے اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے..."

باقی آپ بتائیں خوش ہیں نا؟

ان کے سوالوں کے جواب دیتا آخر میں انہیں دیکھ کر سوال کیا۔ جب کہ چہرہ ان کی خوشی کی صاف گواہی دے رہا تھا۔

صلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"لڑکی کا کوئی نام وام بھی ہوتا ہے۔ اور تمہیں فیملی کا کیوں نہیں پتہ؟  
لڑکی کو پتہ ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو۔"

اسے جھڑکتے ہوئے پوچھا تو ضامن نے نفی میں سر ہلایا۔

"نام تائشہ ہے۔ اور میری ہمت نہیں ہے اسے خود سے بتانے کی۔ بس آپ پیپرز کے بعد لے

جائیے گا رشتہ۔ باقی گھر کا ایڈریس میں آپ کو دے دیتا ہوں۔"

رسان سے کہتا، میز پر رکھے کاغذ پر پتہ لکھا اور ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہو گیا۔ میں ابھی تمہارے ابو کو خوش خبری دے آؤں۔"  
وہ کاغذ تھامتیں، کہہ کر جانے لگیں۔

"امی پیپرز کے بعد جائے گا۔"  
ضامن کی یاد دہانی کو بھی یکسر نظر انداز کیے۔ مسکراتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

"امی تو مان گئیں، اب چوہیا تم بھی مان جاو۔"  
ان کے جانے کے بعد ہاتھ جھاڑے، جیسے بڑا معرکہ سر کر چکا ہو۔ اور خود کی حالت پر ہی ہنستا  
وہ پھر سے کام میں مشغول ہو گیا۔ پر اب مسکراہٹ چہرے پر کھلی ہوئی تھی۔

\*\*\*\*\*

ضامن کے بتانے کی دیر تھی کہ صلہ بیگم اپنے بیٹے کی پسند کی لڑکی دیکھنے چلی گئیں۔ اتفاقاً  
تائشہ بھی گھر پر موجود تھی۔ چھوٹی سی صاف رنگت کی مالک، اچھے بول چال کی تائشہ انہیں  
بہت پسند آئی تھی۔

گھر کا پتہ تو اسی دن ضامن انہیں دے چکا تھا، نواز صاحب سے بات کرنے اور ان کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ہی وہ تائشہ کے گھر پہنچی تھیں۔

ضامن کی تصویر بھی دے آئی تھیں۔ ان کے اخلاق سے ہی تائشہ کی امی اور آپا متاثر نظر آرہی تھیں۔ تائشہ تو اچانک سے کسی عورت کو گھر میں دیکھ کر ہی ماں اور بہن کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ان کے خوشی خوشی گھر سے جانے کے بعد وہ انہیں اپنا فیصلہ سنانے لگی تھی۔ جس کا دونوں نے ہی کوئی اثر نہ لیا تھا۔

مسرت بیگم نے میز پر رکھے لفافے میں سے تصویر نکال کر دیکھنا چاہی تھی۔

پھر تصویر پر نظر پڑتے ہی انہیں کچھ دن پہلے تائشہ کے ساتھ آئے لڑکے کا گمان گزرا تھا۔ اب دماغ میں وہ تائشہ کے گریز سے متعلق تانے بانے بننے لگی تھیں۔ تائشہ مسلسل اپنی آپا کو قائل کر رہی تھی کہ مسرت بیگم کی آواز کمرے میں گونجی۔

"کسے پسند کرتی ہو تم؟"

ان کی تیز آواز پر تائشہ کی چلتی زبان کی تھی۔ ماں کو دیکھا جو تیوری چڑھائے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"میں..؟"

انگلی سے اپنی جانب اشارہ کرتی پوچھا۔ مسرت بیگم نے ہاں میں سر ہلایا۔

"میں نے کس کو پسند کرنا ہے؟ اور امی، آیا آپ دونوں سن لیں اگر میری شادی کروانا اتنا ہی ضروری ہو چکا ہے تو گھر داماد بنا کر لے آئیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

پیر پٹخ کر وہ کہہ کر جانے لگی تھی کہ مسرت بیگم کی آواز پر رک گئی۔

"اگر پسند نہیں کرتی تو پھر اس لڑکے کا رشتہ تمہارے لیے کیوں آیا ہے۔"

اسکی آخری بات کو بمشکل نظر انداز کرتیں انہوں نے تصویر اسکی طرف بڑھائی۔

وہ جو جانے کے لیے قدم بڑھا چکی تھی، پلٹ کر ماں کے ہاتھ میں تصویر دیکھی تو ششدر رہ گئی۔

تصویر میں ضامن تھا، جو سوٹ میں دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ تائشہ کو لگا وہ اس کا مذاق اڑا کر مسکرا رہا ہو۔



تصویر کو اپنے ہاتھ میں لیے وہ قریب سے دیکھنے لگی، چہرے پر بے یقینی رقم تھی۔

"یہ... یہ نہیں ہو سکتا۔"

تائشہ نے وثوق سے کہا۔

آپا نے بھی آگے بڑھ کر تصویر دیکھی تو منہ سے بے ساختہ ماشا اللہ نکلا تھا۔

رشتہ تو وہ بھی سسرال سے اپنی بہن کے لیے لائی تھیں۔ پر اندر سے وہ مانتی تھیں کہ تائشہ کے لیے وہ بس گزارا لائق ہی تھا۔ لیکن صلہ بیگم کی زبانی ان کے بزنس، خاندان اور اب بیٹے کی تصویر دیکھ کر، یہ ہر طرح سے تائشہ کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ تائشہ جھٹکے سے تصویر ہاتھ میں لیے کمرے میں جا گھسی۔

"امی میں تو کہتی ہوں، ہاں کہہ دیں۔ ماشا اللہ سے لڑکا دکھنے میں ہی بہت شاندار ہے باقی میں عالیان کے ابا سے کہو نگلی کہ چھان بین کر کے بتائیں۔"

تائشہ کو اپنے پیچھے آپا کی آواز باآسانی سنائی دے رہی تھی۔ لب بھیج کر ادھر ادھر موبائل کو ڈھونڈنے لگی جو تکیے کے نیچے سے مل ہی گیا۔

ہاتھ تیزی سے کانٹیکٹ لسٹ میں سے ضامن کا نمبر ڈھونڈنے لگے جو کچھ دن پہلے ہی تالشہ نے کچھ نوٹس کی تیاری کے لیے لیا تھا۔

بیل جا رہی تھی، پر آگے سے کال اٹھانے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ یہاں تالشہ بے صبری سے فون کان سے جوڑے، چکر کاٹ کر اپنے اندر سے اٹھتے غصے کے لاوے کو شانت کر رہی تھی۔ تصویر کو گیند کی صورت میں ڈھال کر مٹھی میں بند کیا ہوا تھا جیسے وہ ضامن کی تصویر نہ ہو بلکہ ضامن خود ہو۔

آخر کار کال اٹھالی گئی تھی۔

"ہیلو.. تالشہ؟"

سپیکر سے حیران آواز ابھری تھی۔

ضامن کی آواز سنتے ہی، اس کے غصے کا گراف مزید بڑھ گیا۔

"آپ! اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟"

مجھے اتنا گرا پڑا ہوا سمجھ لیا ہے کیا؟

کچھ دن ہنس کر بات کیا کر لی۔ آپ کو لگا لڑکی سیٹ ہو گئی ہے۔ آپ کو میں تعلق بنانے والی لگی ہوں کیا۔

معاف کر دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں بھول جاؤنگی، آپ نے میرے ساتھ کیا کچھ کیا ہے، میں وہ تھپڑ اب بھی نہیں بھولی۔ لیکن خود کو سمجھا لیا کہ غصے میں انسان سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آپ کو مارجن دیا میں نے اور آپ نے بھی اپنی ٹھہر دکھا دی۔۔۔"

بولتے بولتے اس کا تنفس بگڑا جب کہ لہجہ حد درجہ تک تنفر سے بھرا تھا۔

ضامن نے حیرت اور پریشانی سے اس کی غصے میں بھری آواز سنی تھی۔ اور جب الفاظوں پر دھیان دیا تو غصہ اس طرف بھی بڑھ چکا تھا۔

"کیا بکو اس کر رہی ہو۔ میں نے اب کیا کیا ہے جو تم بغیر کچھ بھی سوچے سمجھے بولی چلی جا رہی ہو۔"

درشتی سے اس کی بات کاٹتا وہ دبی دبی آواز میں غرایا تھا۔

اس وقت وہ یونی میں موجود تھا اور نہیں جانتا تھا کہ صلہ بیگم آج تائشہ کے گھر گئی ہوئی تھیں، ابھی تک گھر گیا ہی نہیں تھا کہ اسے خبر ہوئی۔

"میں بکواس کر رہی ہوں؟

جو حرکت آپ نے کی ہے اس کے بعد میرا دل کر رہا ہے میں آپ کا سر پھاڑ دوں۔ سمجھ کیا رکھا ہے مجھے ہاں؟

لڑکیوں کی طرح رہا کرو، ارے آپ لوگ لڑکیوں کی طرح رہنے ہی کہاں دیتے ہو۔ لڑکی کی مجبوری دیکھی نہیں اس کا فائدہ اٹھانے آجاتے ہو۔ اس سے اچھا تو میں وہی تشوٹھیک تھی۔ عزت تو بچی ہوئی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایسی حرکت کرنے کی۔"

وہ دانت پیس کر کسے جارہی تھی اور ضامن لب بھیجے بہت مشکل سے اس کا ہر الزام سن رہا تھا۔ آخر میں تائشہ کی آواز نمی میں گھلی ہوئی محسوس ہوئی۔

"صاف صاف کہو جو کہنا ہے۔

کیسی حرکت کی ہے یہ بتاؤ تم۔"

سرد لہجے میں، وہ ٹھنڈا ٹھار انداز تھا۔

"بول تو ایسے رہے ہیں جیسے پتہ نہ ہو۔"

تائشہ بھرائی آواز میں چیخنی تھی۔

"جتنا کہا ہے وہ بتاؤ، کیا حرکت کی ہے جس سے تمہاری عزت نہیں رہی؟"  
وہ اس کی چیخ پر خود بھی اونچی آواز میں بولا تھا کہ تائشہ کو وقتی چپ لگ گئی۔

"آپ نے میرے گھر رشتہ کیوں بھیجا ہے؟"

تائشہ نے سیدبا سوال کیا تھا۔

ضامن کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑے تھے۔

"تو بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی۔"

اور سوچتے ہوئے کنپٹی کو انگلی سے دبایا۔

"تو اس میں تمہاری عزت کہاں سے کم ہو گئی۔ بلکہ عزت کے ساتھ رشتہ بھیجا ہے۔ اس سے زیادہ عزت کون دے سکتا ہے۔"

پہلے والی سختی اب نہ لفظوں میں تھی نہ لہجے میں، بس تحمل سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"کس حق سے رشتہ بھیجا ہے۔"

ضامن کی نرمی پا کر وہ پھر سے چیخنی تھی۔

"حق کا بھی پتہ لگ جائے گا اور رشتہ بھی، ہاں تو ہو لینے دو"۔

بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ ہنس کر بولا تھا۔

اس کی ہنسی تائشہ کو مزید تپا گئی تھی۔

"ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

تائشہ نے قطعیت سے کہا تھا۔

"دیکھتے ہیں۔"

ضامن نے پرسکون انداز میں کہہ کر کال ہی بند کر دی۔

کال بند ہوتے ہی تائشہ نے گھور کر فون کو دیکھا تھا۔ دل چاہ رہا تھا وہ سامنے ہو اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

"مجھے کوئی نہیں کرنی شادی نہ اس سے اور نہ ہی کسی اور سے۔"

تصویر کا گولا ہاتھ کی مٹھی سے جھٹک کر سامنے پڑی میز پر مارتی وہ بولی تھی۔

آپا اور مسرت بیگم دونوں نے ایک نظر آنکھیں سکیڑے، ناک پھلائے کھڑی تائشہ کو دیکھا تھا۔

"یہ فیصلہ کرنے کے لیے میں زندہ ہوں۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔"

سختی سے اسے باور کرواتیں وہ آپا کی طرف متوجہ ہوئیں۔

تائشہ تلملا کر رہ گئی اور پیر پٹخ کر کمرے میں چلی گئی۔

\*\*\*\*\*

وہ آج ناشتہ کیے بغیر ہی سیدھا یونیورسٹی آئی تھی۔ کچھ امی سے کل ہوئی بحث کی وجہ سے بھی وہ ناراضگی کا اظہار کرتی ناشتہ کیے بغیر ہی نکلی تھی۔ اور ضامن سے ملنے کر اس کی درگت بنانے کی جلدی بھی تھی۔

وہ مل کر اس کا دماغ درست کرنا چاہتی تھی۔ یونی پہنچی تو ادھر ادھر دیکھنے کے باوجود ضامن اسے کہیں نہیں ملا تھا۔ کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد ہیر اور عینا کو بنا بتائے وہ پھر سے ضامن کی تلاش میں نکلی، جو اسے لائبریری جاتا ہوا دکھا تھا۔

اپنے بیگ پر گرفت مضبوط کرتی، دانت کچکچا کر اس کی پشت کو گھورا اور تیز قدموں سے لائبریری تک پہنچی تھی۔

ضامن لائبریری کے اندر نجانے کس ریک کے پاس موجود تھا۔ شروع کے تمام ریکس کے پیچھے وہ دیکھ چکی تھی۔

"کہاں مر گیا یہ شخص؟"

بڑبڑاتی وہ مزید دو چار ریکس کی طرف بڑھی تھی۔

اور زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ ضامن اپنے دھیان میں ہی ایک بک ریک کے پیچھے سے کتاب کے ورق پلٹتا باہر نکلا تھا۔

اسے دیکھتے ہی پھر سے تائشہ کو غصے نے آن گھیرا تھا۔  
ساری تعمیز بالائے طاق رکھتے وہ پاؤں پٹخ پٹخ کر چلتی اس تک جا پہنچی۔

"آپ نے رشتہ کیوں بھیجا؟"

بنا کسی تمہید کے وہ اسکے سر پر کھڑی سوال کر رہی تھی۔  
ضامن نے چونک کر اسے دیکھا تھا، چھوٹی ناک غصے سے پھولی ہوئی تھی۔

"رشتہ کیوں بھیجتے ہیں؟"

اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ پرسکون لہجے میں گویا ہوا۔



تائشہ کو تو پتنگے لگ گئے۔

"جس لیے بھی بھیجتے ہیں، پر میرے گھر کیوں بھیجا۔"

اسکی آنکھوں میں ابھری چمک سے خائف ہوتی نظریں پھیر کر دبی آواز میں چلائی تھی۔ آخر کو لائبریری میں کھڑی تھی۔

"کیونکہ۔۔۔"

ہمم، کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

نظریں اس کے چہرے کے گرد طواف کر رہی تھیں۔ کتاب کو سینے میں بھیپنے وہ پہلے سوچتا اور پھر آواز میں پیار کا خمار لیے بولا تھا۔

انداز پر سکون تھا، جو تائشہ کو پتنگے لگانے کے لیے کافی تھا۔

اور تائشہ اس کے یوں کہنے پر سٹیٹائی تھی، ساتھ میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔

"تو جو اچھی لگتی ہیں، انکے گھر رشتہ بھیج دیتے ہیں۔"

ایک نیا پینڈورا باکس اسکے کہاتے میں کھل چکا تھا۔

ضامن سخت بدمزہ ہوا۔

"صرف تم اچھی لگی ہو، اسی لیے صرف تمہارے گھر ہی رشتہ بھیجا ہے۔"

صرف پر زور دیتے ضامن نے جتلیا تھا۔

پر وہ تائشہ ہی کیا جو بال کی کھال نہ اتارے۔

"اور میرے بعد کوئی اور اچھی لگے گی تو اسکے گھر بھی رشتہ بھیج دیں گے؟"

ضامن کو اس کے انداز پر ہنسی آئی جسے وہ بمشکل چھپاتا سخیگی سے بولا۔

"ابھی سے جیل سی ہو رہی ہے، آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

کتاب کو ساتھ والے ریک میں رکھتے آنکھ دبا کر کہتا، تائشہ کو لا جواب کر گیا۔

"چھچھورا۔"

سوچتے ہوئے، نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

"میں یہاں بس اتنا کہنے آئی ہوں، آپ اپنا رشتہ واپس لے لیں۔"

ضامن کی بات کا اثر زائل کرتے وہ سختی سے لب بھیج کر دہونس سے بولی تھی۔  
 ضامن کے ہاتھ ریک پر کتاب رکھتے ہوئے رکے تھے۔  
 گردن کو بل دے کر، اپنے پیچھے کھڑی چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا تھا جو غصے میں پوری کی پوری  
 بھری ہوئی تھی۔

"رشتہ ہے، کوئی قرض تو ہے نہیں جو میں واپس لے لوں۔"  
 کندھے اچکا کر وہ خود کو بے بس ثابت کر رہا تھا۔  
 تائشہ نے گھور کر اس کی بے تکی بات سنی تھی۔  
 "میں آپ سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔"  
 انگلی اٹھا کر منطقی انداز اپنائے کہا تھا۔

"یہ تو ٹوٹلی تمہاری مرضی ہے، میں تمہیں فورس تھوڑی نہ کر سکتا ہوں کہ پلیز تائشہ مجھ سے  
 شادی کرلو۔"

مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا، اسی پرسکون لہجے میں کہہ کر ہاتھ باندھے اسے دیکھنے لگا۔ جو  
 دانت پیس کر اپنے غصے پر قابو پارہی تھی۔

ضامن کا انداز ایسا تھا کہ نہیں کرنی تو نہ کرو، تالشہ کو خود پر افسوس ہوا کیا ضرورت تھی اس انسان کے آکر منہ لگنے کی۔ وہ کونسا محبت کرتا ہے جو منتیں کریگا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ تو کیا وہ اس کی منتیں سننے کے لیے آئی تھی؟

نہیں نہیں، نفی میں سر جھٹکتی وہ اپنے خیال سے باہر آئی تھی۔

ضامن دلفریب مسکراہٹ لیے اسے ہی تک رہا تھا۔

"اور اگر انکار کرنا ہی ہے تو جا کر اپنی امی سے کہو نا کہ تالشہ و سیم خان کو ضامن نواز خان پسند نہیں ہے۔ میں تو اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

خود کو لاچار دکھاتا، کہہ کر اپنی مطلوبہ کتاب ڈھونڈنے لگا جو تالشہ کے پیچھے ریک میں رکھی ہوئی تھی۔

اور تالشہ کے لیے آگے کنواں تھا پیچھے کھائی، امی اور آپا تو کل رات سے ہی ہاں کہنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

اور یہاں ضامن نے بھی کلین چٹ دکھا دی تھی۔

"جب مجھے آپ سے شادی ہی نہیں کرنی تو آپ کیوں نہیں منع کر سکتے!"

تائشہ اب منتوں پر اتر آئی تھی، جھنجھلا کر کہتی وہ ضامن کے جواب کی منتظر تھی۔  
ضامن دو قدم آگے بڑھا تھا۔

"پر مجھے تو کرنی ہے نا۔"  
اسے دیکھنے سے گریز کرتا وہ کہہ کر مزید قریب ہوا تھا۔  
تائشہ نے نامحسوس انداز دو قدم پیچھے لیے تھے۔

"کیوں کرنی ہے؟"  
دوبدو جھنجھلا کر سوال کیا۔

"کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"  
وہی پرسکون لہجہ، تائشہ نے لب بھینچے۔

"اور کب سے میں اچھی لگنے لگی ہوں؟"  
تائشہ کے طنز پر وہ مسکرایا تھا۔

"بس کچھ حادثات ہو جاتے ہیں۔"

دل فریب انداز میں کہتا وہ اسکے پیچھے بک ریک پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔

تائشہ آدھی اس کے حصار میں آچکی تھی۔ اس قربت سے ہنسی بھکتی، وہ دوسری طرف سے نکلنے لگی تھی جب ضامن نظریں ریک پر لگائے دوسرا ہاتھ بھی ریک پر رکھ چکا تھا۔ اب وہ مکمل ضامن کے حصار میں تھی۔

ابھی وہ اسے دہکا دے کر خود سے دور کرتی کہ وہ ہاتھ میں کتاب اٹھائے پیچھے ہوا تھا۔ تائشہ اپنے آپ میں شرمندہ ہوئی تھی۔ جن طنزیہ نظروں سے ضامن مسکرا کر دیکھ رہا تھا، تائشہ نے بے ساختہ نظریں پھیریں۔

"ترس کھا رہے ہیں مجھ پر۔"

کسی خیال کے پیش نظر اس نے کہا۔

ضامن کی مسکراہٹ پل بھر میں غائب ہوئی تھی۔ پھر خود کو سنبھالتا مصنوعی ہنسنے لگا۔

"ترس کیوں کھاؤں گا تم پر، تم کیا لنگڑی لولی ہو یا بول نہیں سکتی۔"

ضامن نے سرسری سا اس کا جائزہ لیتے، ہنستے ہوئے کہا۔

تائشہ نے مٹھیاں بھیج لیں۔

اور پھر مزید قدم بڑھاتا، اس کے پاس سے گزرنے لگا۔  
وہ اتنا قریب تھا کہ اس کی سانسیں تالشہ اپنے کان کی لو پر محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں بس قد چھوٹا ہے۔ پر میں پھر بھی تم سے شادی کر لوں گا، پتوہیا۔"

یہ کہہ کر وہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہنستا ہوا آگے چل دیا۔  
تالشہ کو جب تک بات سمجھ آئی تھی وہ کچھ قدم آگے بڑھا چکا تھا۔

"کھمبا۔"

وہ اونچی آواز میں چیخنی تھی۔  
ضامن کے کانوں میں اسکی چیخ پڑی تھی، پر وہ کوئی اثر لیے بغیر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔  
پیچھے تالشہ منہ بسور کے رہ گئی۔

ایک امید تھی کہ ضامن سے لڑے گی، جھگڑے گی، تو وہ خود ہی رشتہ واپس لے لیگا۔ پر یہاں تو  
ڈھیٹ پن کا ریکارڈ قائم تھا۔

\*\*\*\*\*

کیا؟

یہ کب ہوا؟ ہمیں بتایا کیوں نہیں تم نے، کتنی میسنی ہونا تم۔"  
ہیر اس کے بازو پر سختی سے ہاتھ مارتی، وہ ڈھیروں سوال کر چکی تھی۔

"اس میں میسنی والی کیا بات ہے بھلا؟

کل ہی پتہ چلا ہے اور آج تم لوگوں کو بتا دیا ہے۔"

وہ رنج سے کہتی گھاس کریدنے لگی تھی۔ کتابیں ایک طرف پڑی تھیں۔ آج تو پڑھنے کا دل بھی  
نہیں کر رہا تھا۔

"ارے واہ! تبھی کل تم نے چھٹی کی تھی۔ اس کا مطلب تو ہوا کہ تمہیں پہلے سے پتہ تھا۔"  
ہیر کی آواز میں شکوے کے ساتھ ساتھ خوشی بھی چھلک رہی تھی۔ تالشہ نے سرد تاثر کے ساتھ  
اسے خوش ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

"نہیں پتہ تھا مجھے۔ اگر پتہ ہوتا تو میں کیوں کرتی چھٹی؟"

کریدی ہوئی گھاس کو اچھالتی وہ چڑ کر بولی تھی۔

اس سب کے دوران عینا خاموشی سے دونوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔



"او!

تو پھر آنٹی نے کیا سوچا ہے؟"  
ہیر نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔  
عینا کے بھی کان کھڑے ہوئے تھے۔

"وہ تو پہلے مجھ پر الزام لگانے لگیں کہ میں پسند کرتی ہوں اور جب میں نے منع کیا تو آپا اور امی دونوں ہی رشتے سے خوش لگ رہی تھیں۔"  
بے چینی حد سے سوا تھی۔  
ہیر بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"ویسے کتنا فلمی سین ہے نا، پہلے تم دونوں کی لڑائی ہوتی رہتی تھی پھر اچانک سے معافی تلافی اور اب ضامن بھائی کو تم سے محبت ہو گئی۔ امیزنگ!"  
ہیر سارا قصہ سمجھتی، آخر میں تالی مار کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"کیا امیزنگ ہے اس میں؟

اور اسے کوئی محبت و حبت نہیں ہوئی کہہ رہا تھا کہ اچھی لگتی ہو۔  
اسے جھڑکتے ہوئے، ضامن کی کچھ دیر پہلے کی کہی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔  
ہیر اس کے انداز پر صدقے واری گئی۔

"ہائے او رہا!

سو رو مینٹک۔

اچھی لگتی ہو، تالشہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔"  
اداؤں کے ساتھ جملے کو بار بار دہراتے۔ وہ اور عینا ہنس ہنس کر دہرے ہو گئیں۔

"مر جاؤ تم دونوں کسی کنویں میں جا کر۔ میں اتنے بڑے مسئلے میں پھنسی ہوئی ہوں اور تم  
لوگ یوں ہنس رہی ہو۔"

وہ دونوں کو دھمو کے جڑتی، ناک کے نتھنے پھلا کر غصے سے بولی تھی۔  
عینا اور ہیر نے بمشکل ہنسی چھپائی۔

"اس میں مسئلہ کیا ہے، ضامن بھائی اتنے اچھے ہیں اور آنٹی کو بھی پسند ہیں تو کر لو شادی۔"  
عینا کے لیے تو یہ سمجھنا بہت آسان تھا۔

تائشہ نے افسوس سے دیکھا۔

"اس سے کر لوں شادی جس نے میرے ساتھ اس ایک سال میں کیا کچھ نہیں کیا۔ بات بات پر طعنے دیے ہیں۔ میرے پیچھے کتے کو لگوا یا۔ مجھے ٹیم سے نکلوا یا اور پھر، مجھے تھپڑ بھی مار دیا۔ اور اب میں اچانک سے اسے اچھی لگنے لگی ہوں۔ واؤ کیا کہانی ہے۔"

تائشہ بدگمانی کا شکار ہو چکی تھی۔ گنتیوں پر اس کی، کی گئی نا انصافیاں گنواتے ہوئے وہ عینا کو چپ کروا گئی تھی۔

پر ہیر کے پاس جواب موجود تھا۔

"تو تم نے اسے آسانی سے معاف کیوں کیا؟

خود ہی معافی دی تھی۔ اور جب معاف کر دیا جائے تو بار بار اس بات کا ذکر کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔

اور اس میں کوئی انہونی تو نہیں ہے، اگر تم اچھی لگی ہو اور انہوں نے دائرے میں رہ کر طریقے کے ساتھ رشتہ بھجوا یا ہے تو اس میں برا ہی کیا ہے؟"

ہیر نے اسے سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ پر اس سے پہلے کے وہ اس حق میں سوچتی سر جھٹک کر ہر اس سوچ کو بھی جٹکنے لگی۔

"ہاں تم تو کہو گی ہی، آخر کو شہریار بھائی کی وجہ سے تم اسکی ساعیڈ ہی لوگی۔"  
تائشہ کے پاس بدگمانیوں کا سٹاک موجود تھا۔  
ہیر نے ہوا میں سر مارا۔

"میں بھلا کیوں اس کی ساعیڈ لوں گی۔ میری تو شہریار سے اس بارے میں کبھی بات بھی نہیں ہوئی۔ اور میں تو تمہاری طرف داری کر رہی ہوں۔ ضامن بھائی دل کے بہت اچھے ہیں۔ پہلے جو بھی ہوا اس میں تمہارا بھی برابر کا رول رہا ہے۔"  
ہیر جتنا نہ بھولی تھی۔  
عینا نے بھی تاعید میں سر ہلایا۔

"تم کوئی اچھا مشورہ نہیں دے سکتی، تو بخشو مجھے۔"  
تائشہ نے ہاتھ جوڑ کر اسے مزید بولنے سے باز رکھا تھا۔

"اس سے اچھا مشورہ کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ تشو ہیر کی بات مان لو۔"  
یہ عینا تھی جو ہیر کی بات سے متفق تھی۔

"یار!

تم لوگ مجھے سمجھ کیوں نہیں رہے۔"  
وہ جھنجھلائی تھی۔

"ہم تو سمجھ رہے ہیں۔ ایک تم ہی ہو جو نہ نہ کی رٹ لگائے ہوئے۔ ایک یہ جو بیٹھی ہے اسے ضیغم بھائی صرف دوست لگتے ہیں۔ اور تمہیں ضامن بھائی صرف دشمن۔"  
ہیر نے جھڑکتے ہوئے ساتھ عینا کو بھی لپیٹا تنا، جو اپنے ذکر پر سٹپٹائی تھی۔

"اور اتفاق دیکھو، تمہارا دشمن ہو کر بھی رشتہ بھیج دیا ہے جب کہ ابھی تک دوست نے شادی کا سوچا بھی نہیں ہے شاید۔"

کندہ سے عینا کے کندھے پر ضرب لگاتی وہ چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔  
عینا نے جھینپ کر اسکی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے، بے ساختہ آنکھیں میچی تھیں۔

"دیکھا کیسے شرمارہی ہے۔ کچھ تم بھی شرم کر لو۔"

عینا کو ٹھوکا مارتے تائشہ کو شرم دلائی جو بے بسی کی تصویر بنی اسے دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*\*\*

جیسے وقت بدلا، سوچ بدلی، ویسے ہی زندگی جینے کا انداز بھی بدلا تھا۔ زندگی رنگین لگنے لگی تھی۔ باطن اور ظاہر دونوں ایک ہو چکے تھے۔ اور اس رنگین زندگی کے رنگ اس پر صاف دکھنے لگے تھے۔

نارنجی رنگ کا کرتا زیب تن کیے، ہم رنگ دوپٹہ شانوں پر پھیلائے جس کی کناری پر بہت خوبصورت کام تھا کہ دیکھنے والوں کی توجہ کھینچنے کے لیے کافی تھا۔ کناری پر لگی لڑیاں اسکے قدم رکھنے پر جھولتی تھیں، اور وہیں جو لڑکے اسے تشو کے روپ میں دیکھ کر چھ فٹ کی دوری بنا لیتے تھے، اب اس روپ پر نگاہوں کو بے باک کیے بس تکے جاتے تھے۔

حالات اگر بدلے نہ ہوتے تو وہ پاؤں میں پہنی سینڈل اتار کر ان کی عزت کرنے سے بھی نہ ڈرتی لیکن اب وہ خود کو ایک دائرے میں قید رکھے ہوئے تھی، وہ نہیں چاہتی تھی اب ایسا کچھ ہو کہ کوئی ضامن جیسا شخص اسے اپنی ہی نظروں میں گرا دے۔

وہی جانتی تھی کہ کس مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا تھا، کتنا مشکل ہوتا ہے بار بار اس شخص کو دیکھنا اس سے بات کرنا جس نے آپ کو دو کوڑی کا کیا ہو۔

کئی آوازیں کسب جاتی تھیں، کئی لڑکوں نے اس سے دوستی کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا، اور وہ حیران ہوئی تھی کہ ایک بدلاؤ نے لوگوں کی سوچ اس کے بارے میں کتنی بدل دی تھی۔ وہ ضامن کے پروپوزل کو بھی اسی نظر میں تول رہی تھی۔ لیکن آج کے دن یہ تیسری بار تھا جب بے باکی سے اس کے دوپٹے کی کناری ہاتھ میں لے کر جھٹکا دیا تھا کہ وہ کچھ پل کو ٹھٹھکی تھی۔

"سوری!"

وہ شرٹ کے بٹن میں اٹک گیا تھا۔

ڈھیٹوں کی طرح ہنستا، وہ اسی کا کلاس فیلو تھا، جو پہلے اس سے ہمیشہ دوری بنائے رکھتا تھا کیونکہ تائشہ وسیم خان نے پوری کلاس کے سامنے اس کی درگت جو بنائی تھی۔ لیکن جب سے تائشہ نے خود سے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا تب سے ہی اس چیونٹی کے پر نکل آئے تھے۔

دوپٹے کے لٹکے پلو کو اپنے ہاتھ میں جکڑتے نخوت سے مہنویں سکیر کر اس کی بد تعمیزی برداشت کرتی جانے کو پلٹی تھی۔

ابھی دو قدم بھی اٹھانے پائی تھی کہ شانے پر سے دوپٹہ ڈھلکا تھا، جو پیچھے سے کسی کی گرفت میں موجود تھا۔ آنکھیں حیرانی اور غصے سے پھیلی تھیں۔ دوپٹے کو شانے پر دست کرتی اور گرفت کو مضبوط کیا تھا۔ پھر جھٹکے سے مڑی تھی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ اس لوفر کا منہ توڑ دے لیکن بھری محفل میں وہ خود کا مزید تماشہ نہیں لگوانا چاہتی تھی پھر ضامن کی، کی گئی حرکت کے بعد ایک ڈر اور جھجھک تھی جو ہر عام لڑکی میں پائی جاتی تھی، اب شاید وہ اس کا حصہ بھی بن چکی تھی

لب بھینچے ایک نظر ڈھیٹوں کی طرح ہنستے لڑکے کو دیکھا اور پھر ساتھ میں کھڑے اس کے گروپ کے لڑکوں کو جو اپنے دوست کی اس بے ہودہ حرکت پر شان سے مسکرا رہے تھے، اور پھر جھٹکے سے اپنا دوپٹہ کھینچ کر اس کی گرفت سے نکالتی وہ بے بس سی جانے کو آگے بڑھی تھی۔ دل میں شدید خواہش تھی کہ ان سب کے منہ پر مکار کر دانت توڑ دے لیکن ہاتھ تھا کہ اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ پر آخر کب تک وہ بھی تالش و سیم خان تھی، اور برداشت جلتی بھی تھی اس میں کم ہی تھی۔

بمشکل کچھ فاصلہ طے کرتی، پلکوں کو جھپکتی، نچلا ہونٹ دانتوں سے کترتی، اضطرابی حالت میں بڑھ رہی تھی کہ ایک بار پھر وہ کی تھی، اب کی بار بھی دوپٹے کو ہی گرفت میں لیا گیا تھا۔ اور



یہاں اس کی برداشت کا مشکیزہ بھر چکا تھا اور چھلکنے کو تیار تھا۔ مٹھی بند کیے وہ غصہ دبانا چاہ رہی تھی، پر اب لاوا اس قدر شدید تھا کہ وہ پلٹی اور بنا دیکھے ایک زوردار تمپھڑ مقابل کے گال پر چھاپ دیا

"چٹاخ"

کی آواز پر سب متوجہ ہوئے، وہ بھی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کی خاموشی پر ہنس رہے تھے اب اسے فارم میں آتا دیکھ حلق تر کرنے لگے۔

اور ضامن ایک ہاتھ میں اسکے دوپٹے کی کناری کو قید کیے کھڑا تھا، جب کہ دوسرا ہاتھ بائیں گال پر رکھا تھا۔ تالشہ نے دائیں ہاتھ کا الٹا تمپھڑ اس کے بائیں گال پر اس زور سے مارا تھا کہ ضامن جیسے لڑکے کے کان بھی سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ وہ دکھتی اس سے چھوٹی تھی، پر اس کا ہاتھ ضامن کے گال تک بہت آسانی سے پہنچا تھا اور اپنی چھپ چھوڑ گیا تھا۔

غصہ اور جھنجھلاہٹ تھی جو وہ ایک تمپھڑ کی صورت میں اتار چکی تھی، پر جب سامنے ضامن کو تمپھڑ کھاتے دیکھا تو پہلے آنکھوں کی پتیلیاں پھیلیں اور پھر سکڑی تھیں، اور اس کے بعد وہ آنکھیں میچ گئی۔ یعنی اب پھر سے اسے تمپھڑ پڑنا تھا۔

اسے آنکھیں میچے کئی پل سرک گئے پر ضامن کی طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو آنکھیں ہولے سے کھولی تھیں، سامنے ہی ضامن ہلکے سے اپنا گال سہلا رہا تھا، جہاں انگلیوں کے نشان صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

"چوہیا! دانت توڑ دیئے میرے۔"

نہ وہ غصہ کر رہا تھا نہ ہی شکوہ، بس بتا رہا تھا۔  
تالشہ خاموشی سے تھوک نگلتی اسے سن رہی تھی۔

"مجھے تمھیں مار سکتی ہو تو انہیں کیوں نہیں۔"

اور پھر وہ اسکے کان کے پاس جھکا تھا، آواز میں اب کی بار سختی بھی تھی اور شکوہ بھی کہ تالشہ دو قدم پیچھے ہوئی۔

آنکھیں اب بھی وہی سخت تاثر دے رہی تھیں، جن پر تالشہ کی نگاہ گئی تو ضامن نے آنکھوں سے ہی اسے وہ کرنے کو کہا جس کی خواہش وہ کچھ دیر پہلے دبا چکی تھی۔

"جاؤ!"

وہ خود کو مارے گئے تمھڑ کو تو بھول گیا تھا، بلکہ وہ اسے لڑنے کے لیے بھیج رہا تھا، تائشہ حیران صورت بنی اسے تک رہی تھی جب ضامن نے دھیمے پر سخت لہجے میں کہا۔

ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کچھ فاصلے پر موجود اس گروپ کو جو ان کے پیچ چلتی بازگشت کو سن ہی نہیں پائے تھے۔

وہ خواہش اب سر اٹھائے کھڑی تھی، ہاتھ میں کھجلی الگ ہو رہی تھی، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا وہ بھی دوپٹے کو کس کر باندھتی ان کے سر پر جا پہنچی۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کھینچ کر دو تمھڑ اسی لڑکے کو مار دیئے، اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی سنبھلتا اور تائشہ کی طرف ہاتھ اٹھاتا، ضامن نے آگے بڑھ کر اپنے سے جونیئرز لڑکوں کو ایک جھانپڑ لگایا کہ سارے ہی نو دو گیارہ ہو گئے۔

تائشہ کے ہاتھ میں اٹھتی کھجلی کو بھی اب آرام آیا تھا، ہاتھوں کو جھاڑتے بندھے دوپٹے کی گراہ کھول کر اسے درست کرتی وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"آج بہت تیار ہو کر آئی ہو۔"

ضامن کے تحت یہ کمپلیمینٹ تھا جب کہ تائشہ کے ہاتھ پل بھر کو ساکت ہوئے۔

وہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ تیار ہو کر آئی ہے تاکہ لڑکے اس کے پیچھے لگیں، تائشہ کے دماغ نے تو یہی سوچا تھا۔

ملامت کرتی نظریں اٹھائیں تو ضامن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، پھر گرا سانس بھرتے تصبیح کرنا چاہی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

بالوں میں ہاتھ پھیرتا بولا تو تائشہ کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں کچھ کم ہوئی تھیں۔

وہ ایسے چھپھورے انسان کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی، وہ بھولی تو نہیں تھی کہ اس شخص نے کچھ دن پہلے ہی اس کے گھر رشتہ بھیجا تھا۔

"لڑکی، لڑکی لگ رہی ہو۔"

اسے خاموش دیکھ کر مزید کمپلیمنٹ دینا چاہا تھا، پر پہلے کی طرح اب بھی وہ غلط بول گیا۔ تائشہ اب بھی خاموش رہی تھی، نہ جانے کب اس شخص کو وہ تھپڑ یاد آجائے، تبھی وہ فی الحال یہاں سے جانا چاہتی تھی لیکن وہ تھا کہ عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"سوری!۔

میرا مطلب وہ نہیں تھا۔"

تائشہ نے محض سر ہلا دیا۔

"تائشہ!

ایک تھپڑ میں نے مارا تھا، اور ایک تم مار چکی ہو۔ حساب برابر اب بھول جاؤ پلیز۔"

اسے اپنے سامنے سے گزرتے دیکھ، وہ پھر سے اس کے سامنے آیا تھا۔ تائشہ کے قدم تھمے تھے جب کہ آنکھیں صاف شکوہ کر رہی تھیں۔

"میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم کمزور ہو یا کوئی لڑکی کمزور ہو۔ اور ان جیسے لڑکوں کو موقع ملے ایسی نیچ حرکتیں کرنے کا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ لڑکی اتنی مضبوط ضرور ہو کہ اس سے بات کرتے وقت بھی ایسے چھوندر سو بار سوچیں۔

لیکن تمہارے معاملے میں، میں سمجھ ہی نہیں سکا بس جو ظاہری دکھتا رہا اسے ہی حرفِ آخر مان لیا۔ میری نظر میں تم ایک بد تعمیز اور بد لحاظ لڑکی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ان میں سے ہو جو کسی کی غلط بات سہتی نہیں ہیں۔ اور میں خود کی غلطی کبھی سمجھ ہی نہیں پایا۔

اسی چکر میں بات آگے تک بڑھ گئی۔ جس میں میرا قصور کئی زیادہ ہے۔"

اس کا شکوہ پڑھتے وہ رسائیت سے گویا ہوا۔

لجے میں سچائی بول رہی تھی، اور تائشہ وہ آج خاموش رہنا چاہتی تھی، وہ شرمندہ تھا وہ مانتی تھی لیکن اس شرمندگی کے عوض جو وہ مانگ رہا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔

اس کے پروپوزل نے پرانے زخموں کو کھلایا تھا جن کو وہ بھول جانا چاہتی تھی، زندگی میں آئے باقی تلخ لمحوں جیسے ان لمحوں کو زندگی کے صفحے سے مٹا دینا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ مٹتے پھر سے ان زخموں کو کھلایا گیا کہ خون رسنا شروع ہوا اور نشان جم گئے کہ اب مٹانا مشکل تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

اتنا تو اس کے برابری کے جملے بھی اذیت نہیں دیتے تھے، جتنی اذیت اس کی خاموشی دے رہی تھی۔

"میں جواب دے چکی ہوں۔"

وہ جو پوچھ رہا تھا تائشہ سمجھتی تھی، تبھی زور دے کر کہا۔

"پر مجھے وہ جواب پسند نہیں۔"

بڑے لاڈ سے کہا گیا کہ تائشہ نے چھبٹی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ آخر کو ان کا ایسا رشتہ تھا ہی کب کہ ایسے لاڈ دکھائے جائیں۔

"اس کا میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

اکھڑے لہجے میں کہہ کر اب کی بار اس کے جواب کی منتظر بھی نہیں رہی بلکہ قدم اٹھاتی اس کے سامنے سے گزر گئی اور وہ ملال آنکھوں میں بھرے اس کی پشت تکتا رہا۔ کاش کہ اس نے ہاتھ نہ اٹھایا ہوتا، یہ صدا دل سے اٹھی تھی۔ لیکن اگر وہ ہاتھ نہ اٹھاتا تو شاید وہ اس سفر پر بھی نہ چلتا۔

ہاتھ بے ساختہ بائیں گال پر گیا تھا، جہاں نہ اب انگلیوں کے نشان تھے، نہ ہی کوئی تکلیف تھی۔ بس کسی کی انگلیوں کا لمس اور مہک تھی جسے محسوس کرتا وہ تناؤ میں بھی مسکرایا تھا۔

\*\*\*\*\*

ضیغم کے پیپر ختم ہو چکے تھے پیپر ختم ہوتے ہی شکیل کا کانے حویلی جانے کی رٹ لگا رکھی تھی۔ جب کہ ضیغم نے انہیں کچھ دن کے بعد جانے کا کہا تھا۔ ایک تو اسے یہاں کچھ کام

تھا۔ اور دوسرا وہ عینا سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔ جو پیپرز کے درمیان نہیں ہو پائی تھی پیپرز کی ترتیب ہی اس طرح تھی کہ وہ پورا ایک ہفتہ نہ اسے دیکھ پایا تھا اور نہ ہی بات ہو پائی تھی۔

آج عینا کا آخری پیپر تھا، جو دوپہر کے ساڑھے دو بجے سے شام پانچ بجے تک تھا۔ ضیغم عین وقت پر یونی میں موجود تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پیپر ختم ہوتے ہی وہ گھر نہ چلی جائے۔ اور اگر ایسا ہوا تو اس سے ملنے کے امکانات شدید کم ہو جاتے۔

یونی پہنچ کر اس نے کلاس سے لے کر کوریڈور اور ہر اس جگہ کو چھان لیا جہاں عینا موجود ہو سکتی تھی۔ پر اسے عینا کہیں نہیں دکھی، یعنی وہ جا چکی تھی؟ یہ سوچ آتے ہی وہ بے سکون ہوا تھا۔

ابھی سست قدموں کے ساتھ پارکنگ ایریا کی طرف جا ہی رہا تھا کہ عینا پر نظر پڑی تو بے سکونی کی جگہ اب راحت نے لے لی تھی۔

عینا منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی چلی جا رہی تھی۔ ضیغم کے لب اسے دیکھ کر مسکائے۔ قدم اسکی طرف اٹھائے ہی تھے کہ نظر اسکے ساتھ کھڑے لڑکے پر گئی۔ وہ لڑکا بھی ہنستا ہوا اس سے کچھ کہہ



رہا تھا۔ عینا نے مشکل ہنسی روک کر اسے دوسری سمت اشارہ کیا تھا جسے شاید وہ سمجھتا ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

ضیغم کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر ہی شعلے اگلنے لگی تھیں۔ پہلی بار اسے شدید جلن کا احساس ہوا۔ اچانک سے ہی غصہ اعصابوں پر چھا گیا تھا۔ آخر کوئی اور کیسے اس سے ہنس کر، بات کر سکتا تھا۔

آج تک عینا اس کے ساتھ ہنس کر باتیں کرتی تھی، کچھ اپنی کہتی تھی۔ کچھ اسکی سنتی تھی۔ لیکن آج کسی اور کو اس کے ساتھ ہنستا دیکھ وہ شدید مضطرب ہوا تھا۔

مضبوط قدم اٹھاتا وہ عینا کی طرف بڑھا تھا، جب کہ چہرہ از حد سنجیدہ تھا۔ عینا بھی ولید کے جاتے ہی مسکراتے ہوئے، کتابوں کو سینے سے لگائے چلی آرہی تھی کہ نظریں اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود ضیغم پر اٹھیں۔ دو قدم تیزی سے لے کر اس تک پہنچی تھی۔ مسکراہٹ ہنوز چہرے پر کھلی تھی جو ضیغم کو زمر سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

"کون تھا وہ لڑکا؟"

عینا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ ضیغم کی سرد آواز اسے پل بھر کے لیے خاموش کروا گئی۔

"کون؟

اچھا وہ..

وہ ولید تھا۔"

ضیغم کے بے تکی سوال پر آنکھیں چھوٹی کیے، اسے دیکھنے لگی پھر یاد آنے پر جواب بھی دیا۔

ضیغم کے تو مانوسر پر لگی اور تالوں پر بھی۔ وہ کیسے دھڑلے سے اسکا نام لے رہی تھی۔ جبرے بھیجنے بمشکل کچھ سخت کہنے سے خود کو روکے ہوئے تھا۔

"کون ولید؟"

منہ میں انگارے چباتے، اس نے چبھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ولید، ہمارا کلاس فیلو۔"

اسکے پھر سے ولید کہنے پر ضیغم نے آنکھیں میچ کر اپنا غصہ اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی تھی۔

"بھائی بولو..."

ولید کو بھائی بولو۔"

لب بھیچے وہ بولا تھا، عینا نے نا سمجھی کا تاثر دیا تو ضیغم نے زور دے کر کہا۔

"ولید کلاس فیلو ہے، اسے کیوں بھائی بولوں؟"

ضیغم کے لہجے سے وہ سہمی ضرور تھی۔ پر ہمت جمع کر کے اپنی الجھن بھی بتائی تھی۔

"وہ جو کوئی بھی ہو۔ اگر آئندہ تم نے بھائی نہ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

انگلی اٹھا کر تنبیہ کی تھی۔

عینا نے بے اختیار آنکھیں میچی تھیں۔

"آپ مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔"

معصومیت سے کہتی وہ ضیغم کو کسی حد تک نرم کر چکی تھی۔

"میں ڈانٹ نہیں رہا سمجھا رہا ہوں۔ میری باری تو تمہیں بات بات پر ضیغم بھائی کہنا یاد رہتا ہے

تو اسے کیا، سب کو ہی تم اب سے بھائی کہو گی..."

کہو گی نا۔"

"آپ تو بڑے ہیں نا تبھی بھائی کہتی ہوں۔ ولید تو کلاس فیلو ہے۔"  
عینا نے ایک بار پھر سمجھانا چاہا۔

"بھائی بولو اسے کتنی بار سمجھایا ہے۔"  
وہ غصے میں لفظ چبا کر بولا تھا۔

"کہو ولید بھائی۔"  
اسے چپ کھڑے دیکھ کر ضیغم نے کہا۔

"ولید بھائی۔"  
دہیمی آواز میں کہتی وہ ضیغم کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا کر چکی تھی۔

"ارے یار!  
ناراض ہو گئی ہو؟

اچھا سنو تو۔"

عینا نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ضیغم کو اپنی سختی کا احساس ہوا تھا۔

"اچھا سوری۔۔۔"

دیکھو کوئی بڑا ہو یا چھوٹا یا پھر ہم عمر وہ ہے تو تمہارا بھائی۔ ہے نا؟"  
ضیغم کے کہنے پر عینا نے سر اثبات میں ہلایا۔

"تو بھائی صرف بڑوں کو ہی کیوں کہنا، ہم عمر کو یا چھوٹوں کو بھی بھائی کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ تو مجھے تم سے بڑا ہی دکھاتا تھا۔"  
ولید کے ذکر پر پھر سے چھبن ہونے لگی تھی۔ پر اب وہ نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ عینا بھی سمجھتی سر ہلا گئی۔

"اس لیے اب سے تم سب کو بھائی کہو گی۔۔۔ سوائے میرے۔"  
آخری دو لفظ اس نے ہلکی آواز میں کہے تھے۔ پر عینا کی سماعتوں کا حصہ بھہ یہ الفاظ بن گئے۔

"آپ کو کیوں نہیں؟"

عینا کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ تالشہ جو کہہ رہی تھی کیا وہ صحیح تھا؟

"وہ.. میں تو دوست ہوں نا تمہارا، اور دوست کو نام سے بھی بلایا جاسکتا ہے نا"۔

ضیغم اس کے سوال پر سٹپٹایا تھا۔ پھر سنبھل کر بات بنائی۔

عینا کا دل پھر سے اپنی پرانی رفتار میں آچکا تھا۔

تسو ہمیشہ جھوٹ بولتی ہے۔

نچلا لب کھلتے اس نے سوچا تھا۔

"آو تمہیں گھر چھوڑ دوں"۔

وہ دونوں پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے جب ضیغم نے اسے پیش کش کی۔

"نہیں، ڈرائیور انکل آچکے ہونگے"۔

"آج یہاں میرا آخری دن ہے۔ اس کے بعد پھر کب ملیں؟ کوئی نہیں جانتا، اس لیے آخری دن

میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ میرا گھر بھی اسی جگہ ہے جہاں تم رہتی ہو۔ تم اپنے ڈرائیور کو بھیج

دو میں چھوڑ دیتا ہوں"۔

آخری دن کے ذکر پر عینا یک نخت اداس ہو گئی۔

"آپ پکے پکے چلے جائیگے۔"

اس کے مشورے پر دھیان دیئے بغیر وہ اداسی سے بولی تھی۔

"ہمم۔۔"

تم بھی چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں؟"

وہ پوچھ رہا تھا، عینا نے تو فوراً سے نہ میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

اس کے چہرے کے نقوش آنکھوں میں بساتے اس نے بھی فوراً جواب مانگا تھا۔

"کیونکہ آپ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اور آپ ہمیشہ میرا ساتھ دیتے ہیں۔ آپ چلے جائیگے تو

مجھے کون پرپرینٹیشن تیار کروائے گا؟"

وہ پوری سچائی سے بولی تھی۔

اتنی سی دیر میں اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ تو بھول ہی چکی تھی کہ ضیغم کلاسٹ سمیٹر تھا۔ اب وہ یونی چھوڑ جائیگا۔

اب یاد آتے ہی اسے ڈھیروں فکروں نے آن گھیرا تھا۔

"ایک آغیٹا ہے میرے پاس جس سے میں ہمیشہ تمہارے آس پاس رہوں گا۔" یہ کہتے ہی اسکے لبوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔ عینا بھی الرٹ ہوئی تھی۔

"کون سا آغیٹا؟"

"لیکن تمہیں پہلے وعدہ کرنا ہوگا کہ تم اس میں میرا ساتھ دوگی۔"

ضیغم نے وعدہ لینے کو ہتھیلی سامنے پھیلائی تھی جسے عینا نے جھٹ سے تھام لیا تھا۔ وہ کیسے ایک اچھا دوست گنوا سکتی تھی۔

"ویری گڈ!"



اب آئیڈیا یہ ہے کہ کچھ دنوں بعد جب میں کچھ مانگنے آؤں گا تمہارے گھر تو تم ہاں کہہ دو گی۔۔ کہو گی نا؟"

اس نے چمکتی آنکھوں سے سوال کیا تھا، یہ خیال دل گدگدانے کو کافی تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ اس کی ہوگی۔  
دل تو پر امید تھا۔

"پر میں تو..."  
عینا نے اسکے گھر آنے کے ذکر پر کچھ کہنا چاہا تھا۔ ضیغم نے بیچ میں ہی اس کی بات ٹوک دی۔  
"کوئی پرور نہیں... اب تم نے وعدہ کیا ہے۔"  
اسے تنبیہ بھی کی تھی۔

"چلیں پھر۔"

وہ پارکنگ میں پہنچ چکے تھے، ضیغم نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے اسے آنے کو کہا تھا۔  
عینا کا ڈرائیور بھی کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

"ڈرائیور آگیا ہے، ماما ڈانٹیں گی اگر ان کے ساتھ نہ گئی تو۔"  
 دہیہ لہجے میں اس نے انکار کی وجہ بتائی تو ضیغم مسکرا دیا۔

"اچھا.. کوئی بات نہیں۔ جاؤ!"

کس دل سے اس نے کہا تھا وہی جانتا تھا۔ آخری دیدار تھا تو بھرپور نظر ڈال کر اسے حفظ کر لینا چاہتا تھا۔

عینا بھی ہاتھ ہلا کر بائے کہتی چل دی تھی۔  
 اور ضیغم وہیں کھڑا اسے تکتا رہا جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھی۔

\*\*\*\*\*

ایک ہفتے سے وہ ادھر ادھر کاموں میں اتنا مصروف رہا تھا کہ حویلی جانے کا ارادہ منسوخ کر چکا تھا۔ اماں سائیں کے بھی فون آچکے تھے۔ لیکن ضامن اور شہریار کے ساتھ مل کر وہ کچھ ضروری کام نبٹانے میں لگا ہوا تھا۔

اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر ایک دفعہ چلا گیا، تو بابا سائیں اب آنے نہ دیں۔ ضامن اور شہریار نے اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا کہ وہ واپس آئے گا۔

نجانے آگے اس کے لیے کیسا امتحان منتظر تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تھا۔

شکیل کا کاکی تیاری دیکھ کر تو اسے شدید خدشات نے گھیر لیا تھا۔ وہ گھر کا سارا سامان پیک کر چکے تھے، اور فرنیچر پر سفید چادریں چڑھا چکے تھے۔ پہلے جب ملنے جاتے تھے تو چند سوٹ ساتھ لے کر نکلتے تھے، لیکن اس بار تو بیگ کے بیگ بھر کر اپنا اور ضیغم کا سامان تیار کر چکے تھے۔ جیسے وہ تو ٹھان کر بیٹھے ہوں کہ واپس نہیں آنا۔ ضیغم کا ماتھا ٹھنکا، شکیل کا کاہر وہ کام کرتے تھے جن کا حکم بابا سائیں کی طرف سے آتا تھا تو کیا بابا سائیں نے ایسا کرنے کو کہا تھا؟

شام میں ہی وہ اپنے گاؤں پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کی روایتوں سے جتنا وہ بھاگتا تھا۔ گاؤں سے اور حویلی سے کشش بھی الگ تھی۔ آخر کو اس کا آبائی گھر تھا۔

اس کی اماں سائیں اور بابا سائیں اس حویلی میں رہتے تھے۔ وہ جتنا اس ماحول سے دور رہ لے انکی دعاؤں کے سائے میں رہتا تھا۔ اور یہاں سایہ دار شجر موجود تھے، تو کیوں نہ دلی سکون ملتا۔

آج بھی سندھی روایت کے عین مطابق تعمیر کی گئی حویلی میں قدم رکھتے ہی، چہل پہل نے اس کا استقبال کیا تھا۔

شکیل کا اپنے اذلی مؤدب انداز میں ہاتھ باندھے ضیغم کے پیچھے ہی چلتے آرہے تھے۔

سامان گاڑی سے نکال کر حویلی کے ملازم تیزی سے اٹھائے حویلی کے اندر جارہے تھے۔

وہ دہڑکتے دل کے ساتھ ہال میں آن پہنچا تھا۔ راستے میں حویلی کا جو ملازم آتا جا رہا تھا، جھک کر سلام کرتا اور ایک طرف ہو جاتا۔ ضیغم بھی سر کو خم دے کر آگے بڑھ گیا۔

ہال میں قدم رکھتے ہی، بابا سائیں پر نظر پڑی جو ہمیشہ کی طرح سر پر خاندانی دستار باندھے، اجرک ایک کندھے پر ڈالے، کلف لگے کاٹن کے سوٹ میں موجود تھے۔

اپنے اذلی بارعب انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے، عادت کے برخلاف مسکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔

مزید آگے بڑھا تو کچھ دیر پہلے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ اب چھپ گئی تھی۔

اماں سائیں نے کچھ دن پہلے فون کر کے شاہ بخش کی آمد کی خبر دی تھی۔ اور ساتھ میں ظفر شاہ سائیں کی خواہش، جو حکم سے کم نہ تھی، وہ بھی بتلائی تھی۔ اس وقت وہ اس بات کو محض اماں کی طرف سے آلہ کار گردان رہا تھا۔

لیکن آج اپنی آنکھوں سے شاہ بخش کو بیٹھے دیکھ کر سارے خدشات پھر سے سر اٹھانے لگے تھے۔

خشک لبوں پر زبان پھیرتا وہ بلند آواز میں سلام کرتا بابا سائیں کی طرف بڑھتا تھا۔ جو اسکی آواز پر ٹھٹھکے تھے۔ اور پھر کھڑے ہو کر اپنے جوان بیٹے سے بغل گیر ہوئے تھے۔

کتنا خوش کن احساس ہوتا ہے جب آپ کا اپنا سپوت کندھے سے کندھا ملائے آپ کے ساتھ کھڑا ہو۔ آپ کا مان غرور، فخر اسی کے دم سے دگنا ہونے لگتا ہے۔  
ایسا ہی حال ظفر شاہ کا بھی تھا، ان کے چہرے کا نقش نقش مسکرا کر بیٹے کے لیے محبت کا ثبوت دے رہا تھا۔

ضیغم کے چہرے پر بھی باپ کے لیے عزت و ادب رقم تھا۔ اسکی آنکھیں بھی باپ کے لیے محبت کی گواہی دے رہی تھیں۔

بخش سائیں باپ، بیٹے کی محبت دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"آگیا میرا شیر..

بہت وقت لگا دیا آتے آتے کوئی نہیں دیر آئے، دست آئے".

ضیغم کو شانوں سے تھامے وہ محبت سے بولے تھے.

ضیغم کو ان کی آنکھ میں نمی کا گمان گزرا تھا. وہ ان کی محبت پر مسکرا دیا.

"ان سے ملو۔

بخش سائیں سے، جانتے تو ہو گے نا".

ضیغم نے ہاں میں سر ہلایا.

وہ بھی پرتپاکی سے ملے تھے.

خوبرو اور خوش اخلاق ضیغم انہیں پہلی نظر میں پسند آیا تھا. ضیغم کا بچپن ان کے سامنے گزرا تھا. جوانی میں جب وہ اسلام آباد پڑھنے گیا تھا تب بھی وہ اس سے ملتے رہتے تھے. آج بھی وہ ویسا ہی تھا، کم گو خوش شکل ضیغم. بس فرق آیا تھا تو اس کی جسامت میں، اب وہ دبلا پتلا پندرہ سال کا ضیغم نہیں، بلکہ کسرتی جسم کا حامل چوبیس سال کا ضیغم تھا.

"ماشاء اللہ!

ظفر بھا! ضیغم نے تو آپ سے بھی بڑا قد نکالا ہے۔"  
 بخش کے کہنے پر ظفر شاہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔  
 ضیغم صرف مسکرا دیا۔

چند باتوں کے بعد اجازت چاہتا وہ تویلی کے اندرون خانہ داخل ہوا تھا۔

اس کی آمد کی خوشی میں یقیناً اماں اس کی پسند کے کھانے بنوا رہی ہونگی۔ مسکراتا ہوا اماں  
 سائیں کے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم اماں سائیں!"

ان کے گلے میں بانہیں ڈالتا وہ لاڈ سے بولا تو اس کی آواز پر اماں سائیں کے سینے میں ٹھنڈک  
 پڑ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ پلٹ کر بیٹے کی شکل دیکھتیں، یاد آتے ہی چہرے پر خفگی کے تاثرات سجا  
 لیے۔

"وعلیکم السلام۔ مل گیا وقت حویلی آنے کا۔ ابھی بھی نہ آتے، رہ جاتے اپنی اس شہر والی میڈم کا دم چھلا بن کر۔"

اس کے ہاتھ جھٹکتی نروٹھے پن سے بولی تھیں۔ ضیغم نے ہنسی دبائی۔

"کیا کروں اماں سائیں، جو مزہ آپ کے پلو سے لگ کر بیٹھنے میں ہے وہ کہاں اس شہر والی میڈم کا دم چھلا بن کر گھومنے میں ہے۔"

ان کے پیروں میں فرش پر بیٹھتا، وہ اپنا سر ان کی گود میں رکھ چکا تھا۔ وہ بھی خود پر جبر کیے اس کا سر سہلانے کے لیے اٹھایا گیا ہاتھ کھینچ چکی تھیں۔

"زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جاؤ جا کر آرام کرو تھک گئے ہو گے۔"

خفگی ہنوز قائم تھی۔ وہ کہہ کر اٹھنے لگی تھیں کہ ضیغم نے انہیں روک لیا۔

"آپ کو دیکھتے ہی ساری تھکن اتر گئی ہے، ابھی تو آپ سے بات کرنے کا دل کر رہا ہے۔"

"بخش سائیں سے ملے ہو؟"



اماں سائیں نے اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو سنوارا اور جانچتی نظروں سے سوال کیا۔  
ضیغم نے محض سر اثبات میں ہلادیا۔

"دیکھو ضیغم سائیں، شاہ سائیں آج نہیں تو کل تم سے رشتے کی بات ضرور کریں گے۔ تم ان کے خلاف مت ہونا۔ تمہیں میری تربیت کا واسطہ ہے۔"  
وہ آنسو پیتیں، منت سے بولی تھیں۔  
ضیغم تڑپ کر اٹھا تھا۔



"اماں سائیں!  
ادھر دیکھیں..

میں بابا سائیں کے خلاف کبھی نہیں جاؤنگی۔  
لیکن مجھے بھی تو حق ہے نا اپنی رائے دینے کا۔ اور میرا یقین کریں میں انہیں قائل کر لوں گا۔"  
ان کے ہاتھوں کو نرمی سے پکڑے وہ اماں سائیں کو قائل کر رہا تھا۔  
انہوں نے نفی میں سر ہلادیا۔

"وہ جس بات پر اڑ جائیں پھر انہیں کوئی قائل نہیں کر سکتا۔

تمہاری پڑھائی کے لیے میں نے ان پر بہت دباؤ ڈالا تھا، اگر آج تم ایسی کوئی رائے ان کے سامنے رکھو گے۔ تو شاہ سائیں کے غصے سے کوئی بچ نہیں پائے گا۔"

"اماں سائیں آپ کو مجھ پر بھروسہ ہونا چاہیے۔

میں ضرور منالوں گا۔"

وہ اپنی بات پر زور دے رہا تھا۔

"بات منانے کی نہیں ہے ضعیف سائیں۔

بات تمہاری پسند کی ہے، ہم نہیں جانتے تم کس لڑکی کو پسند کر آئے ہو۔

اور بات اس بچی کی ہے جسے بچپن سے، ہم اور شاہ سائیں تمہارے لیے پسند کرتے آئے

ہیں۔ یہاں تک کہ اتنی کوششوں کے بعد بخش بھامانے ہیں۔

تمہیں کیا لگتا ہے، تمہارے بابا سائیں تمہاری بات مان لیں گے۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ اور

اس بار میں بھی انکے ساتھ ہوں۔"

وہ قطعیت سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑواتی چلی گئیں۔

جتنا وہ سوچتا تھا، حالات مزید خراب لگتے تھے۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی بابا سائیں کی مخالفت کرے گا۔ ہاں اس نے حویلی سے باہر جا کر شہر میں پڑھنے کا فیصلہ لیا تھا، پر اس میں بھی مخالفت نہیں عرضی تھی جسے قبول کر لیا گیا تھا۔

"بھائی جان!..."

میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ بھائی جان!"

لگ بھگ بیس سال کی عمر کی لڑکی بھاگ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔

ضیغم اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ ارادہ تھکان اتارنے کا تھا، اتنا تو سفر نے نہیں تھکایا تھا، جتنا منزل پر پہنچ کر سوچوں نے اعصاب جکڑ لیے تھے۔ اور تناؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اب پورا جسم تھکن سے چور تھا۔

اپنی چھوٹی بہن کی اشتیاق بھری آواز سن کر وہ جی جان سے مسکرایا تھا۔

"سنبل جان!، کیسی ہے میری چھوٹی بہن۔"

اس کی ناک کو پکڑ کر ہلکے سے دائیں بائیں گھماتے وہ محبت سے بولا تھا۔

"بالکل ٹھیک آپ کیسے ہیں۔"

بھائی جان آپ کو پتہ ہے بابا سائیں نے آپ کی شادی کی بات اماں سائیں سے کی ہے۔ بخش چلو بھی آگئے ہیں۔ اور ان کی بیٹی بھی آئی ہوئی ہے۔

بہت پیاری ہے، اور..."

چمک کر اپنا حال بتاتی، وہ رازدانہ انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی کہ ضیغم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سنبل جان۔ زبان کو تھوڑا سکون دے دو۔"

ہوا میں سر مارتے وہ منت کر رہا تھا۔

سنبل نے آنکھیں گھمائیں۔

"آپ کو ہی اندر کی بات بتا رہی تھی۔ لیکن لگتا ہے اماں سائیں پہلے ہی بتا چکی ہیں۔ ورنہ آپ مجھے چپ نہ کرواتے۔"

بتایا ہے نا اماں سائیں نے۔"

آنکھیں چھوٹی کیے وہ گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ضیغم نے سر ہاں میں ہلایا۔

"مجھے پتہ تھا، اماں سائیں اپنے لاڈلے بیٹے سے کچھ چھپائیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟  
بولتی بولتی وہ کی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"ویسے بھائی جان! اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھیں گے نہیں۔ میرے کمرے میں ہے۔ اس سے پہلے کہ بابا سائیں آخری فیصلہ سنائیں ایک بار دیکھ لیں۔  
ویسے تو وہ بہت پیاری ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کو وہ اچھی نہ لگے اس لیے یہ آفر دے رہی ہوں۔"

دل بڑا کرتے، گویا احسان کی صورت میں مشورے کے ساتھ ساتھ، خبردار بھی کر دیا تھا۔  
ضیغم بنا کچھ کہے آگے چل دیا تھا۔

"یہ آفر محدود مدت کے لیے ہے اور ٹیکس بھی کچھ زیادہ نہیں صرف دو جوڑے کپڑوں کے، دو سیٹ چوڑیوں کے اور دو..."  
وہ پیچھے سے ہانک لگا کر بولی تھی۔  
اس کی مانگیں پوری ہونے سے پہلے ہی ضیغم پلٹا تھا۔

"یہ ٹیکس کی لسٹ بہن تم اپنے پاس رکھو۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"  
وہ ہاتھ جوڑتا صاف انکار کر گیا تھا۔

"سوچ لیں۔ وہ بہت پیاری ہے۔"  
ایک آخری کوشش تھی منانے کی۔

"نہیں چاہیے۔"  
سر جھٹکتا وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھٹ اس کے منہ پر بند کر چکا تھا۔

"توبہ ہے اتنا نخرہ،"  
بڑبڑاتے، جس انداز میں بھاگتی ہوئی آئی تھی اب اسی طرح بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا رہی  
تھی۔  
کیا پتہ دوسری طرف کوئی اس ڈیل پر قائل ہو جائے۔

\*\*\*\*\*

پیپرز ختم ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا۔ تائشہ نے پھر سے گھر کے چھوٹے موٹے کام سنبھال لیے تھے۔ ہفتے بھر سے مسرت بیگم اسے منانے کے جتن کر چکی تھیں۔ پر وہ بے نیازی برتتے ہوئے، ان کی ہر منت کو نظر انداز کر جاتی تھی۔

پیپرز کے دوران تو وہ اس واقع کو بھول ہی چکی تھی، امی اور آپا نے بھی توجہ بٹانا ضروری نہیں سمجھا۔ اور وہ خود بھی سب کچھ پس پشت ڈال کر پڑھائی میں لگن رہی تھی۔ آخر کو جس کے لیے، وہ شادی اور رشتے سے منع کر رہی تھی۔ اب یوں ایک پریشانی کے تحت پڑھائی کو نظر انداز کرنا تائشہ کے بقول احمقانہ حرکت تھی۔

لیکن اب جب سے وہ گھر پر موجود تھی۔ ہر دن کے ساتھ امی کی طرف سے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ پر وہ کان لپیٹے انہیں سن کر بات کا رخ ہی بدل دیتی تھی۔

آج بھی امی نے آپا کو بلوایا تھا۔ وہ جلد سے جلد تائشہ کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ ان کے داماد نے بھی ضامن کے بارے میں تمام معلومات جمع کر لیں تھیں۔ اور ان کا بھی کہنا تھا کہ رشتہ اچھا ہے، ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ آپا تو پہلے دن سے ہی ضامن کے حق میں بول رہی تھیں۔ اور آج وہ خاص تائشہ کو منانے آئی تھیں۔

"کب سے کچن میں مصروف ہو۔ بہن کے ساتھ بھی تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔"  
 آپا بڑے چاہ سے اسے ساتھ لگاتیں شکوہ کر رہی تھیں۔  
 ان کے شکوہ پر تائشہ مسکرائی۔

"آپ کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ پیے گی نا؟"  
 چائے کیوں میں انڈیلیتی وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں کیوں نہیں۔ ایسا کرو چائے اپنے کمرے میں لے آؤ۔ ویسے بھی مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

تائشہ جان گئی تھی کہ کیا بات ہوگی، پھر بھی سر ہاں میں ہلا دیا۔  
 آپا پہلے ہی کمرے میں جا چکی تھیں۔ وہ بھی دو کپ ٹرے میں رکھتی، ایک بار پھر انکار کرنے  
 کے لیے خود کو تیار کرتی کمرے کی طرف چل دی۔

"آؤ بیٹھو میرے پاس۔"

بیڈ کے سرہانے بیٹھیں وہ اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔



وہ کپ انہیں تھماتی، خود کا کپ لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"احمد سے ضامن کے بارے میں پتہ کروایا ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ اچھا خاصا بزنس ہے۔ صرف دو ہی بھائی ہیں۔ لیکن ایک بھائی باہر چلا گیا تھا۔ اب صرف ضامن ہی اپنے اماں ابا کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی تمہارے لیے ضامن صحیح لگا ہے۔ مجھے تو خیر شروع سے ہی پسند آگیا تھا۔ اب تو امی بھی راضی ہیں۔"

بنا تمہید کے انہوں نے بات جاری رکھی۔

تالشہ نے بات سننے کی حد تک سنی تھی۔

ان کے چپ ہوتے ہی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"آپ سب کو پسند آگیا، بہت اچھی بات ہے۔ پر میں نے جب شادی کرنی ہی نہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

بے نیازی سے کندھے اچکاتی، وہ کپ منہ سے لگا کر چائے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔  
آپا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"کیوں نہیں کرنی شادی۔ کیا چاہتی ہو امی اپنا فرض ادا کیے بغیر ہی اس دنیا سے چلی جائیں۔ اور تم اکیلی کیا کرو گی؟

امی ہیں تو دھڑلے سے آ، جا رہی ہو۔ امی نہیں رہیں گی تو اس پڑھائی کا کیا کرو گی۔ یہ دنیا پھر تمہیں اکیلے رہنے دے گی؟"

وہ بنا کسی لحاظ کے سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔  
تالشہ کا دل اس ذکر پر مٹھی میں آگیا تھا۔

"اللہ نہ کرے آپا!

کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اللہ ہمیشہ امی کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔"  
وہ تڑپ اٹھی تھی۔ یہ سوچ ہی جان سلب کرنے کے لیے کافی تھی وہ تو بالکل اکیلی ہو جاتی ان کے بغیر، آخر ماں سے جدائی کسے برداشت تھی۔

"میں بھی کہتی ہوں اللہ نہ کرے کہ انہیں کچھ ہو۔ لیکن کل کس نے دیکھی ہے؟ وہ تمہاری طرف سے بہت پریشان ہیں۔ سلیمان ہوتا تو وہ کبھی تمہارا پڑھائی سے لگاؤ دیکھ کر شادی پر زور نہ دیتیں۔ پر سلیمان ہی تو نہیں ہے، وہ تو ایسا روٹھ کر گیا ہے کہ نہ بہنوں کا خیال آیا نہ بوڑھی

ماں کا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں کسی کی سرپرستی میں دینا چاہتی ہیں۔ تمہیں ہنستا بستا دیکھنا چاہتی ہیں۔ تو کیا وہ غلط چاہتی ہیں؟

کیا انہیں حق نہیں کہ وہ اپنے جیتے جی تمہاری خوشیاں دیکھیں۔"

اس کے آنکھوں سے اڈے پانی کے قطروں کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتیں وہ پوچھ رہی تھیں۔

تائشہ نے آنکھیں جھپک کر مزید خود کو رونے سے روکنا چاہا۔

"آپ آپ کو کیا لگتا ہے میں نہیں چاہتی امی خوش ہوں۔ پر آپ بھی تو سوچیں اگر میں امی کو چھوڑ کر چلی گئی تو امی پیچھے اکیلی ہونگی۔ انہیں کون سنبھالے گا؟

آپ نے سلیمان بھائی کی بات کی، آپا اگر بھائی ہوتے تو میں خوشی خوشی امی کی بات مان لیتی۔ لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے میں امی کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤنگی۔"

وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی، اصل مسئلہ تو یہی تھا۔ وہ اپنی امی کو اکیلے چھوڑ کر کیوں کر جاتی جبکہ ابھی تو انہیں، اس کی ضرورت تھی۔

"تائشہ میری جان!

امی اکیلی کہاں ہونگی۔ تم اور میں آتے رہیں گے نا ان سے ملنے اور وہ کونسا تمہاری آج ہی شادی کروا رہی ہیں؟ کچھ وقت تو لگے گا نا۔ پر تمہاری شادی کے بعد وہ مطمئن ہو جائیں گی۔ کیا تمہیں ان کے اطمینان سے زیادہ کچھ عزیز ہے؟"

"آپ مجھے ایوشنل بلیک میل کر رہی ہیں۔"

معصومیت سے شکوہ کرتی وہ انہیں بہت پیاری لگی پیار سے اسے خود کے ساتھ لپٹاتے وہ پچکارنے لگیں۔

"میں تمہیں ایوشنل بلیک میل کیوں کروں گی؟"

میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔

تم تو جانتی ہو نا میں اور امی کبھی تمہارا برا نہیں چاہیں گے۔

تو پھر تم ہماری بات مان کیوں نہیں لیتی۔"

تائشہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا پر آپا بھی آنکھوں سے التجا کرنے لگی تھیں۔

"چالے پیو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

اسے پھر سے رونے کی تیاری پکڑے دیکھ کر وہ محبت سے بولیں۔

"اور میری باتوں پر غور ضرور کرنا"۔  
اس کے سر کو سہلاتیں وہ پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

"ہوں"۔  
وہ بمشکل چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتی کہہ پائی تھی۔

\*\*\*\*\*

آپا جا چکی تھیں، پر اس کی سوچ اسی مدار کے گرد گھوم رہی تھی۔ کبھی وہ خود کو حق پر گردان کر اپنے فیصلے پر اٹل رہتی تو کبھی آپا کی کہی باتیں اسے جھنجھوڑ دیتیں۔ رات سے دن ہو چکا تھا، پر وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔

امی نے بھی آکر اس سے مان جانے کی التجا کی تھی۔ پر وہ اس دل کا کیا کرتی جو انہیں چھوڑ جانے پر کسی صورت پر متفق نہیں تھا۔

آپا اور امی کی باتوں نے اس حد تک اثر ضرور کیا تھا کہ پتھر میں شگاف ڈل چکا تھا، وہ اس بارے میں سوچنے لگی تھی عین ممکن تھا کہ اس کا فیصلہ ہاں میں ہوتا۔

رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ پوری رات وہ سوچتی رہی کہ اسے ہاں کرنی چاہیے کہ نہیں۔ ایک طرف امی تھی جنہیں چھوڑ کر جانا اس کے لیے مشکل تھا، اس کی پڑبائی تھی، خواب تھے۔ اور دوسری طرف وہی امی تھیں، جو امید لیے کئی بار اسکے پاس آئی تھیں کہ وہ مان جائے ان کی خواہش کا مان رکھ لے۔

لیکن پلڑا تو اس کی سوچوں کے حق میں ہی باری تھا تبھی فال نہ کا ہی نکلا تھا۔ ایک خیال ذہن میں آیا تھا، وہ چاہتی تھی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، تو بس پھر کیا تھا صبح تڑکے ملا ہی دیا ضامن کا نمبر۔

وہ جو نیند میں اسے ہی ہنستا مسکراتا دیکھ رہا تھا، مسلسل بجتے فون سے تنگ آیا تھا، لیکن پھر بھی وہ خوابوں کی وادی چھوڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پر فون کی رنگ ٹون ہی ایسی تھی کہ خوابوں میں جھلک دکھلاتی تالشہ ڈر کر، روٹھ چکی تھی۔ اب مزید نیند کا کیا فائدہ جب وہ خواب سے ہی چلی گئی، پھر سستی سے ہاتھ میز پر مارتا فون اٹھایا اور بنا دیکھے ہی کان سے لگا لیا۔

"کسے موت پڑی ہے صبح صبح"۔

اب بیزاری تو ہونی تھی، آخر کو خواب ٹوٹا تھا۔

اسپیکر کے پار سے آتی جھنجھلائی آواز پر اسے احساس ہوا کہ اتنی صبح فون نہیں کرنا چاہیئے تھا، پر اب تو کال اٹھائی جا چکی تھی، تو تھوڑا اور ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتی گلا کھنکھارا تھا۔

"میں بات کر رہی ہوں، تائشہ۔"

کہہ کر خاموش ہوئی تھی جب کہ وہ جو سستی سے آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا، فوراً سے اٹھ بیٹھا موبائل کو سامنے کر کے دیکھا تو وہ حقیقت میں ہی اس کی آواز سن رہا تھا۔ آنکھیں اور لب بیک وقت مسکرائے۔

"تم نے کال کی، اس وقت؟ خیریت؟"

حیران تو تھا پر وقت دیکھتا کچھ پریشان بھی ہوا تھا۔

"وہ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس کے مہر کر تمہید باندھنے والے انداز پر ضامن ٹھسکا تھا۔

"نہیں!"

اگر تم نے نہ کہنے کے لیے فون کیا ہے تو میری طرف سے بھی نہ ہے کہ مجھے تمہاری نہ ہرگز منظور نہ ہے۔"

سر کو تکیے پر پٹختا وہ آنکھیں موند کر کچھ بے بسی اور ضد کی کیفیت کے زیر اثر بولا تھا۔  
تائشہ نے دانت کچکچائے، پر فی الحال وہ شانت رہ کر معاملہ سلجھانا چاہتی تھی تبھی سہن کرتی دھیمے سروں میں اسے منانا چاہا۔

"میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ انفیکٹ میں کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی، میرے ڈھیروں خواب ہیں جنہیں مجھے پورا کرنا ہے۔"

Please try to understand"

وہ مناجات پر اتر آئی تھی۔

"اور میرے خوابوں کا کیا، جن میں صرف اور صرف تم بسی ہو۔"

کچھ نیند کی وجہ سے بھی آواز بھاری ہوئی تھی، اور کچھ جڑبوں کا خمار بھی تھا۔

تائشہ کو شدت سے احساس ہوا کہ اس کھمبے کو فون کر کے اس نے غلطی ہی کی ہے، پر اب تو یہ غلطی ہو چکی تھی تبھی صبر کا دامن بڑی مشکل سے تھامے وہ گویا ہوئی۔



"مجھے آپ پسند نہیں ہیں اور ویسے بھی مجھے ایم بی اے کمپلیٹ کرنا ہے پھر جاب کرنی ہے تو آپ ایک احسان کریں، اپنے خواب کسی اور کے ساتھ سجائیں جو قد میں بھی آپ کی برابری کی ہو۔"

آخر میں تو اس نے ضامن کا طرز اسے لٹایا تھا پر ضامن اس کی بات کا مطلب سمجھتا قہقہہ لگا گیا۔

"آب اس دل کا کیا کریں جسے چھوٹی چیزیں ہی پسند آنے لگی ہیں۔"  
پاس پڑے تکیے کو بھینچتا شوخ انداز میں کہا کہ تائشہ موبائل کو گھور کر رہ گئی۔

"میں آخری بار پوچھ رہی ہوں، آپ انکار کریں گے کہ نہیں؟"  
انداز تنبیہ کرنے والا تھا۔

جب کہ ضامن سنجیگی کے موڈ میں نہ ہوتے ہوئے بھی مکمل سنجیگی کا مظاہرہ کرتا گویا ہوا۔  
"نہیں۔"

قطعیت سے ایک لفظی جواب دیتے وہ مقابل کی جھنجھلاہٹ سننا چاہتا تھا پر اس سے پہلے ہی کال کاٹ دی گئی تھی۔

اس کے لیے یہی خبر خوش کن تھی کہ تالشہ کا ہر پدینتر ناکام جا رہا تھا اور اب اس کی آخری کوشش بھی ضامن نے ناکام بنا دی۔ یعنی وہ دن دور نہیں جب فیصلہ اس کے حق میں ہی آئے گا۔

\*\*\*\*\*

دلائل اکھٹے کرتے، اپنے حق میں استعمال کرنے والے الفاظوں کو ترتیب دیتے، وہ آدھی رات گزار چکا تھا۔

بابا سائیں نے کل ضروری بات کرنے کو کہا تھا، وہ جانتا تھا ضروری بات کیا ہوگی۔ اور اب وہ کیسے بابا سائیں کا فیصلہ رد کرے یا پھر انہیں قائل کرے یہی سوچتے سوچتے، نیند کب اسکی سوچوں پر غالب آئی اسے اندازہ ہی نہ ہوا۔

توبلی پر رات کی تاریکی چھٹ کر صبح کا اجالا نمودار ہوا تھا۔ ویسے بھی دیہی علاقوں میں صبح فجر سے ہی ہو جاتی تھی۔

کل رات سے وہ کمرے میں موجود تھا، تنہا کا کہہ کر کھانا بھی نہیں کھا سکا تھا۔ پریشانی میں بھوک لگتی بھی کسے ہے۔

باہر سے آتی آوازیں، اور پیٹ میں دوڑتے پتھروں کے زیر اثر وہ بیدار ہو چکا تھا۔

وقت دیکھا، تو گھڑی صبح کے سات بج رہی تھی۔

ناشتے کی میز لگ چکی ہوگی۔

یہ سوچ آتے ہی اپنے حلیے کو دیکھا جو سفر میں اور پھر نیند کے باعث ملگجہ ہو چکا تھا۔

ناشتے کے لیے جانے سے پہلے اپنا حلیہ درست کرنا اسے زیادہ ضروری لگا۔

جب تک وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تھا۔ بابا سائیں جا چکے تھے، سب ہی آہستہ آہستہ ناشتہ کر کے اپنے کاموں پر لگ چکے تھے۔

"السلام علیکم چچی"۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر چاچی سائیں پر پڑی تھی۔

وہ اب بھی ویسی ہی دکھتی تھیں جب سات سال پہلے انہیں دیکھا تھا۔ ان پر عمر نے کوئی خاص اثر نہیں کیا تھا۔

"وعلیکم السلام، کیسے ہو بیٹا"۔

اپنے سامنے لمبے چوڑے لڑکے کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھیں۔

ضیغم کے پہلو میں اپنی بیٹی کو تصور کرتے وہ بشاشت سے بولی تھیں۔

"الحمد للہ ٹھیک۔ باقی سب کہاں ہیں؟"  
ارد گرد نظر دوڑاتے پوچھا۔

"تمہارے چلو تو ظفر بھا کے ساتھ ڈیرے پر گئے ہیں۔ باقی سب یہیں ہیں۔ ناشتہ کرو گے؟"  
انکے پوچھنے پر سر ہلاتا، ان کی تقلید میں چلا تھا۔

شاہ بخش نے خاندان سے باہر شادی کی تھی، اور اسی باعث انہیں بھائیوں سمیت باپ نے بھی خاندان سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس وقت ظفر شاہ نے انہیں ناصرف اپنی حویلی میں جگہ دی بلکہ ہر اعتبار سے ان کی مدد کی تھی۔ دونوں چچا زاد بھائی تھے، اور دوستی مثالی تھی۔ گوکہ بخش سائیں، ظفر شاہ سے کافی چھوٹے تھے، پر انکا یارانہ بہت گمراہ تھا۔ اور اسی بنا پر ظفر سائیں نے شاہ بخش کا مکمل ساتھ دیا تھا۔

وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ گزر رہا تھا جب اچانک شاہ بخش کے والد شدید بیمار پڑ گئے، بیٹے کی محبت میں انہوں نے مجبوراً تمام رسموں کو کمزور پاؤں میں کچل ڈالا تھا۔ بالآخر وہ شاہ بخش کو آخری وقت میں اپنی محبت اور شفقت کے ساتھ ساتھ جائیداد میں حصہ بھی دے گئے

تھے۔ لیکن بھائیوں کے دلوں میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ انہوں نے شاہ بخش اور ان کے نئے بنے رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

شاہ بخش جائیداد بیچ کر شہر میں کاروبار کی غرض سے جانکے اور پھر کچھ عرصے بعد اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہر لے گئے۔

اس پورے وقت میں ان کے ہر ایک فیصلے پر ظفر سائیں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔۔۔ ضیغم کو امید کا سرا ملا تھا۔ جب ایک دوست کی محبت کی خاطر وہ خاندان والوں سے الگ کر انہیں ان کا حق دلوا سکتے تھے۔ تو کیا اس کے بابا سائیں اس کے لیے ایسا نہیں کریں گے۔ وہ اب قدرے مطمئن تھا، مکمل طور پر تو نہیں کیونکہ وہ جانتا تھا۔ بات جب دوسروں کی حد تک ہو تو معاملہ سلجھانا آسان لگتا ہے لیکن جب پھندا اپنے گلے میں آن پڑے تو سلجھانے کے چکر میں رسی مزید الجھتی چلی جاتی ہے۔

کچھ اطمینان اور کچھ اضطراری سمیٹتا وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جو ابھی چاچی ملازمہ کے ذریعے میز پر لگوا کر گئی تھیں۔

\*\*\*\*\*

شام کی چائے کا وقت تھا۔

اسے یاد تھا یہ بابا سائیں کی عادت تھی، وہ عام دنوں میں شام کی چائے سٹڈی میں پیتے تھے۔ اور اس دوران کوئی نا کوئی کتاب پڑھتے تھے یا پھر کوئی اہم مسئلہ سلجھاتے تھے۔

آج بھی انہوں نے کسی اہم مسئلے پر بات کرنے کے لیے ضیغم کو اس وقت بلوایا تھا۔

وہ اطمینان چہرے پر سجائے گہری سانس بھر کر سٹڈی میں داخل ہوا۔

سامنے ہی بابا سائیں ٹانگ پر ٹانگ جمائے کتاب کو گود میں رکھے اس کے ورق پلٹ رہے تھے۔ ساتھ میں اماں سائیں سے بھی کچھ کہہ رہے تھے۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی دونوں نے بیک وقت دروازے کی جانب دیکھا تھا جو ہلکی مسکراہٹ سجائے انہیں ہی تک رہا تھا۔

بابا سائیں نے آنکھوں کو جنبش دے کر اسے اندر آنے کا کہا۔ اور کتاب کو ساتھ رکھی میز پر دہرتے، آنکھوں پر لگائے نظر کے چشمے کو اتارنے لگے۔

"تھکن اتر گئی ضی؟"

ضیغم کو پیار سے وہ ضئی بلاتے تھے۔

ان کے اس طرز تخاطب پر ضیغم کا دل چاہے قہقہہ لگائے، پر وہ ضبط کر گیا۔ وہ ان کے اس لاڈ کی وجہ سے خوب واقف تھا۔

"جی بابا سائیں۔"

مؤدب سا سر ہلایا۔

وہ، ضیغم ظفر شاہ جسے اپنے پیچھے پھرتی جی حضوری کرنے والی فوج چاہلوس اور جاہل لگتی تھی۔ وہ خود اپنے بابا سائیں کے سامنے نظریں جھکا کر بات کرتا تھا، یہ نہ ڈرتا تھا نہ سکھلائی گئی پٹی۔ یہ تو اس کی عقیدت تھی اپنے بابا سائیں کے لیے پر وہ یہ بھی سمجھ نہ پایا تھا کہ چھوٹے سائیں کا راگ آلا اپنے والے اس کے ارد گرد پھرتے مزارعے بھی اس سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ پر ہر بات کو سمجھنے کا خاص وقت معین ہے، اور اس خاص وقت کو بہت جلد آنا تھا۔

ضیغم کے اطمینان پر اماں سائیں دہڑکتے دل کے ساتھ اس کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنا مکمل منظر لگ رہا تھا دونوں باپ بیٹے آمنے سامنے، چہرے پر مسکان لیے بیٹھے تھے۔ پر کچھ وقت کے بعد یہی مسکراہٹ....

اماں سائیں نے سوچتے ہی سرد آہ بھری۔

"ضیٰ ہمیں تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو ہم تمہیں کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ تم ہمارا مان رکھو گے۔" وہ تمہید باندھ رہے تھے۔

ضیغم دل کی حالت چھپاتا، آنکھیں جھکائے سر ہلا رہا تھا۔

"جی بابا سائیں۔ آپ حکم کریں۔" آہستگی سے کہتے وہ انکی اگلی بات کا منتظر تھا۔

"کاش ضیغم سائیں تم ایسے ہی انکے حکم کی تعمیل بھی کر لو۔" اماں سائیں کے دل سے صدا نکلی تھی۔

وہ اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھیں۔ اب جو طوفان اٹھنا تھا وہ بس اسے روکنے کے لیے دعا ہی کر سکتی تھیں، وہ کر رہی تھیں اور جو تدبیر کر سکتی تھیں، وہ کر چکی تھیں۔

"ہم نے تمہارے مستقبل کے حوالے سے ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔"



نخش شاہ، ہمارے جگری دوست کی بیٹی کا ہاتھ ہم نے تمہارے لیے مانگا ہے۔"  
وہ کہہ کر رکے تھے۔

پر ضیغم کی طرف سے مکمل خاموشی پا کر انہوں نے بات جاری رکھی۔  
جب کہ ضیغم کی خاموشی اماں سائیں کا دل لرزا رہی تھی۔

"ضی، ہم جانتے ہیں تمہیں حویلی کے رواج کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔ اور تمہیں یہ بھی اعتراض ہوگا کہ ہم نے تم سے بغیر پوچھے تمہاری شادی کا فیصلہ کیسے لے لیا؟  
لیکن ایک بات یاد رکھنا ضیغم سائیں کے ہم زبان دے چکے ہیں۔ اور ظفر شاہ کو جان سے جانا منظور ہوگا پر زبان سے پھرنا ہرگز نہیں۔"  
وہ تحمل سے کہتے، آخر میں لفظوں اور لہجے دونوں میں اٹل انداز اپنا گئے۔

ان کی ازحد سنجیگی پر اماں سائیں نے پہلو بدلا، وہ تو چاہ رہی تھیں کہ اس جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کہیں روپوش ہو جائیں، آخر کیسے باپ اور بیٹے کو آمنے سامنے آتا ہوا دیکھ سکتی تھیں۔

ان کے بات ختم کر جانے پر، ضیغم نے ایک نظر اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اماں سائیں کو دیکھا تھا جو آنکھوں سے التجا کر رہی تھیں۔

اور پھر اپنے سامنے بیٹھے بابا سائیں کو جو نظروں میں سوال لیے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اور پھر اس نے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ اماں سائیں کی التجا کو ناامید نہ چھوڑا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بابا سائیں۔

آپ کی عزت پر میری وجہ سے کوئی حرف آئے میں یہ سوچ لگی نہیں سکتا۔"

ضیغم تو بات کہہ کر چپ ہو گیا پر اماں سائیں ورطہ حیرت میں گم ہو گئیں۔

انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا، لیکن جب نظر ظفر شاہ کے خوشی سے دکتے چہرے پر پڑی، تو وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوئیں۔

"آؤ میرے شیر!۔"

ضئی ہمیں اپنی تربیت پر پورا یقین تھا، تم ہمیں کبھی رسوا نہیں ہونے دو گے۔"

وہ کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کو پاس بلاتے اسے سینے میں بھینچ گئے تھے۔

اندر سے کہیں انہیں بھی ڈر تھا، وہ بھی خدشات کا شکار تھے۔ کہیں ضیغم انکار نہ کر دے، آخر کو اس کی ہر سوچ نرالی ہوتی تھی۔ پریوں اس کے مان جانے پر انہیں لگا ڈھیروں خوشیاں ایک پل میں ہی انکے کندھوں پر ڈال دی گئی ہوں۔

"ہمیشہ خوش رہو۔"

اسے خود سے الگ کرتے، ماتھا چوم کر دعا کی۔

ضیغم کے لبوں پر مسکان اب بھی برقرار تھی۔

اماں سائیں اس کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ، کا مطلب نہیں سمجھ پارہی تھیں۔

وہ تو اس لڑکی سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا، تو ایسا فیصلہ کرتے ہوئے اسکے دل کو کچھ نہ ہوا تھا۔

وہ اسے جانچ رہی تھیں، لیکن وہ مسکراہٹ بکھیرتا ان کی طرف ہی بڑھا تھا۔

"میں بہت خوش ہوں میری جان۔"

تم بھی خوش ہونا؟

وہ ان سے سر پیار لے رہا تھا جب اماں سائیں نے سرگوشی کی تھی۔

ان کی آواز میں بیٹے کے لیے تڑپ تھی جسے وہ بانٹتی سمجھتا تھا۔

عقیدت سے ان کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لیتا، محبت بھرا بوسہ دیتا وہ ہاں میں سر ہلا گیا۔  
اماں سائیں کے دل کو اطمینان اب بھی نہیں ہوا تھا۔  
لیکن وہ بھی بھگی آنکھوں سے اسے دعا دیتیں مسکرانے لگیں۔

"بابا سائیں مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔"  
چائے پی جا چکی تھی۔

اس سے پہلے کے بابا سائیں سڑی سے اٹھ کر جاتے، ضیغم اپنے مطلب کی بات پر آیا تھا۔  
اماں سائیں جو کچھ حیرت اور کچھ خوشی میں ڈوبی تھیں، اب پھر سے ضیغم کی بات پر ان کا  
دل کانپ سا گیا۔  
لب بھینچے وہ ظفر شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ضیغم کو بات جاری رکھنے کا کہہ رہے تھے۔  
اماں سائیں کو بیٹے کی سوچ پر افسوس ہوا تھا۔ وہ کیا یہ سوچ رہا تھا کہ بابا سائیں کی عزت بھی  
باقی رہے اور وہ اپنی محبت بھی حاصل کر لے۔  
اماں سائیں نے تاسف بھری نگاہ اس پر ڈال کر نظریں پھیر لیں۔

"پر ضیغم سائیں تم یہ نہیں جانتے کہ اس رشتے کی وجہ صرف ان کی دی گئی زبان نہیں ہے  
بلکہ اس بچی سے ان کا لگاؤ اور محبت ہے۔ وہ زبان بھی واپس لے سکتے ہیں پر کبھی اس بچی

کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ پر اس بات کے بعد نجانے وہ تمہارے ساتھ کیا کریں ضیغم۔"

ان کا دل آنسو بہا رہا تھا، وہ سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

ایک طرف شوہر کی محبت تھی، جو حق پر تھے تو دوسری طرف بغاوت کی طرف قدم بڑھاتا ان کا بیٹا۔

ضیغم کی سوچ سے سو اختلاف صحیح، پر بیٹا تو تھا ہی۔ وہ بمشکل ضبط کرتیں دل میں اس سے مخاطب تھیں

کچھ دیر پہلے ملا سکون اب کہیں نہیں تھا۔

"بابا سائیں۔ آپ جانتے ہیں میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اور آپ کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں۔..."

وہ تمہید باندھ رہا تھا اور ظفر شاہ کو اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ بات شروع سے جانتے تھے تبھی ٹوک گئے۔

"اصل بات پر آؤ ضیغم سائیں۔"

ضیغم نے گہری سانس لی۔

"بابا سائیں۔ میں نے آپ کی بات کا مان رکھ کر، جیسے آپ کا فیصلہ مان لیا ہے۔  
میں چاہتا ہوں آپ بھی میری ایک درخواست مان لیں۔"  
ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ کہہ رہا تھا۔  
اور ظفر شاہ کے ماتھے پر پڑے بل میں اضافہ ہوا تھا۔

"تو تم ہمارے ساتھ سٹیلیمینٹ کرنا چاہتے ہو۔ ضیغم سائیں۔"  
دو انگلیاں مونچھوں پر پھیرتے وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"سٹیلیمینٹ نہیں بابا سائیں۔ بس ایک خواہش سمجھ لیجیے یا ایک درخواست۔"  
ہاتھ کی ہتھیلی مسلتا، وہ اطمینان سے گویا ہوا۔  
بابا سائیں کے ماتھے پر پرسوج لکیریں ابھری تھیں۔

"کیسی خواہش؟"

"بابا سائیں۔"

آپ جانتے ہیں، میں نے زندگی کا زیادہ عرصہ حویلی سے دور گزارا ہے۔ شہر میں رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔

اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے حویلی کے نظام، اور زمینوں کی کاشت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

وہ تمہید باندھ رہا تھا۔ تمہید وقت کی ضروری بھی تھی۔

بابا سائیں کچھ کچھ سمجھ رہے تھے، پر فی الحال وہ چپ اختیار کیے ہوئے تھے۔

بابا سائیں کی آنکھوں میں ایک پل کو دیکھ کر، وہ نظریں جھکائے اب اصل بات پر آیا تھا۔

"بابا سائیں،

میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہاں کے ریت رواج، یکسر مختلف ہیں۔ جن کے ساتھ میرا نبھا کرنا انتہائی مشکل ہے۔"

وہ کہہ کر چپ ہوا تھا۔

سڈی کے کمرے میں پل بھر میں سکوت چھا گیا۔

دونوں نفوس اپنی اپنی سوچوں میں مبتلا تھے۔

جب کہ ضیغم اپنی کہہ کر اب اطمینان سے بیٹھا تھا۔

بابا سائیں کو تو جیسے سانپ سونگ گیا تھا۔ وہ کتنا خوش تھے، ضیغم کے لوٹ آنے پر، کئی سال انہوں نے ضیغم کے بغیر گزار دیے۔ اور اب بیٹے کی بے وفائی تو دیکھو کہ اب بھی دور جانے کی بات کر رہا تھا۔

جب کہ اس عمر میں تو اسے ان کا سہارا بننا چاہیے تھا۔ اور وہ یہاں کے رواجوں سے گھبرا کر جانا چاہتا تھا، کیا ان کا خون اتنا پتلا ہو گیا تھا کہ اس میں ابال بھی نہ آیا، یہ بات سوچتے ہوئے بھی؟

ان کے اکڑے ہوئے کندھے ڈھیلے پڑتے گئے، مان جیسے کرچی کرچی ہونے لگا تھا۔

وہیں اماں سائیں کا دماغ بھی سائیں سائیں کرنے لگا۔ ابھی تک تو انہوں نے اس کا آنا بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ان رشتوں کے چکر میں وہ اپنے بیٹے کا چاہ کے مطابق استقبال بھی نہیں کر سکی تھیں۔ اور وہ پھر سے جانے کی بات کر رہا تھا۔

کئی سال وہ صرف مہمانوں کی طرح رہنے آتا تھا اور پھر مہینوں ان سے دور پردیس میں گزار دیتا۔ اس کی یاد میں آنکھیں مینہ برسا کر خشک ہو جاتیں، اور اب جب آنکھوں کی ٹھنڈک لوٹی تھی تو ایک نیا فرمان سن رہی تھی۔

یہ دکھ کم تھا کہ اس کے لفظوں سے ان کا دماغ کچھ اور ہی اخذ کر بیٹھا تھا۔



"تو کیا، ضیغم سائیں تم شہر بس کر اپنی محبت کو پانے کے خواب دیکھ رہے ہو؟  
اگر ایسا ہے ضیغم، تو تم نہیں جانتے اپنے بابا سائیں کو، وہ ہرگز اس بچی کے ساتھ یہ ظلم نہیں  
یونے دینگے۔"

بیٹے کی جدائی کی فرمائش کم اذیت ناک تھی کہ سوچوں کے سانپ نے بھی ڈسنا شروع کر دیا  
تھا۔

یہ خیال آتے ہی ان کی آنکھوں میں پانی کے قطرے بھرنے لگے تھے۔  
اور وہ نظریں جھکا کر انہیں دل میں اتارنے لگی تھیں۔

ظفر شاہ نے کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ دفعتاً دروازہ بجا۔  
خاموشی میں ہلکی سی دستک بھی تینوں کو دروازے کی طرف نظریں اٹھانے پر مجبور کر گئی۔

"آؤ بخش، آگے گھر دیکھ کر۔"

خود کو سنبھالتے وہ بشاشت لہجے میں سماتے، شاہ بخش سے بولے تھے۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ  
سڈی کی چوکھٹ پر موجود تھے۔

"جی ظفر بھا۔ آپ لوگ کوئی ضروری بات کر رہے تھے؟ ہم نے کہیں غلط موقع پر دخل اندازی تو نہیں کردی۔"

تینوں کے چہروں کو جانچتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر ظفر شاہ کے ساتھ رکھی کرسی سنبھال چکے تھے۔

ان کی بیوی بھی نرمی سے مسکراتی، اماں سائیں کے ساتھ بیٹھ چکی تھیں۔

"ارے نہیں۔"

ہم تو بس ایسے ہی بیٹھے تھے۔"

مصنوعی ہنستے وہ کتاب میز سے اٹھا کر گود میں رکھ چکے تھے۔

"بخش بھا۔ آپ کے لیے چائے منگواؤں۔"

وہ صبح سے حویلی کے اوپر والے پورشن کی طرف تھے۔ کئی سال پہلے وہ پورشن ان کے لیے ہی بنوایا گیا تھا۔ اور اب شاہ بخش نے حیدر آباد میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے اپنے پورشن کی مرمت اور رینویشن کا کام دیکھ رہے تھے۔

"جی بھا بھی سائیں۔"

بہت طلب ہو رہی ہے۔"

اماں سائیں ہاں میں سر ہلاتیں خادمہ کو آواز دینے لگی تھیں۔

اور اس طرح بات اس وقت کے لیے ٹل گئی۔ پر کمان سے نکلا تیر، لگنا تو تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ نشانے پر لگے یا نشانہ خطا ہو جائے۔

\*\*\*\*\*

"ارے ہیرا!

یہ کیا کر رہی ہو؟"

وہ جو چائے کے لیے چولے پر آدھی پتیلی پانی کی چڑھا چکی تھی۔ اور اب اس میں فریج سے دودھ نکال کر ڈالنے لگی تو بھابھی کے ٹوکنے پر دودھ کی بوتل رکھ کر مڑی تھی۔

"چائے بنا رہی ہوں۔"

جھنجھلا کر بولتی دوبارہ سے دودھ اٹھا لیا تھا۔

"چندا چائے بنا رہی ہو تو چولہا بھی جلا لو۔"

اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر رکھتے ہوئے انہوں نے ٹھنڈے چولے کی طرف نظر دوڑائی۔  
ہیر شرمندہ ہوتی ماچس کو ڈھونڈنے لگی۔

"چائے بنانا مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن یہ آسان بھی نہیں ہے کہ سب کچھ مکس کر دیا اور  
چولے پر رکھ دیا۔

اچھی چائے بنانے کے لیے تھوڑی سی محنت تو لگتی ہے نا۔"  
اوپر بنی لکڑی کی کبرڈ سے ماچس نکالتے وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔  
ہیر کچن کی گرمی سے الگ تنگ تھی کہ چہرے پر بیزاری سجائے وہ سننے کی حد تک ہی متوجہ  
تھی۔ سمجھنا اس سے کوسوں دور تھا۔

شادی کو تین مہینے باقی تھے۔ دسمبر کے شروع می ہی شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔  
اور کل ہی اماں نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ اب ہیر بھی گھر داری سیکھ لے، بھائیوں نے تو  
اماں کو بہت سمجھانا چاہا پر انہوں نے بھی سو دلائل دے کر انہیں چپ کروا دیا۔  
اور بیچاری ہیر کو آج بھیج دیا چائے بنانے، وہ یہ تو جانتی تھی کہ چائے میں کیا کیا ڈلتا ہے۔ پر  
کب کیا ڈالنا ہے اس سے وہ سرے سے ناواقف تھی۔

"اب دھیان سے سنو!

دو کپ چائے بنانی ہو تو آدھا کپ پانی لو اور پہلے اسے چولے پر گرم کر لو۔

پھر چائے ڈالو، اور جوش آنے دو۔

ابال آنے کے بعد تین کپ دودھ کے ڈالو۔ اور پھر چینی ڈال کر ایک دو ابالے آنے دو۔

اور چائے تیار!"

ہیر کو متوجہ کرتے، وہ تیزی سے ہاتھ چلاتیں، جیسے جیسے کچھ ڈالنے لگتی اسے بھی بتاتیں۔ اور وہ سمجھ کر سر ہلا دیتی۔

چائے کو دوسرا ابال آتے ہی بھابھی نے آنچ بہت دہیمی کر دی۔  
اور اسے کپ لانے کو کہا۔

"ہیر۔

ایک بات پوچھوں"

ہیر جو ٹرے میں دو کپ رکھ رہی تھی۔ بھابھی کے سوال پر گردن ہاں میں ہلائی۔

"یہ تمہارے ڈرامے اور فلموں والے چائے بنانا نہیں سکھاتے کیا؟"

انداز سرسری تھا، پر لبوں پر شریر مسکان دہی ہوئی تھی۔

"کیوں؟"

وہ بھی نا سمجھی سے سراٹھا کر انہیں دیکھنے لگی پر جب انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تو بات سمجھ میں آئی۔

"بھابھی!"

آپ بھی مجھے تنگ کر رہی ہیں۔  
 ٹرے ان کے سامنے کرتی وہ خفگی سے بولی تھی۔

"ارے نہیں میری چنڈا!"

میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔

ویسے تمہارا کیا خیال ہے ان ڈرامے والوں کو چائے بنانی تو سیکھانی ہی چاہیے نا۔  
 آخر کو ہماری ہیر جیسی اور بھی کتنی لڑکیاں ہوں گی، جو ان کے چکر میں گھر گھرستی نہیں  
 سیکھ سکتی۔ اب انہیں بھی تو ان لڑکیوں کا سوچنا چاہیے۔"  
 اسے پیار سے بہلاتے وہ پھر سے شرارت کر گئی تھیں۔  
 ہیر نے بھی ان کی ہاں سے ہاں ملانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

آخر کو ان کی وجہ سے چائے تیار ہوئی تھی۔ اتنا تو ان کا حق بھی بنتا تھا۔

"ویسے بھابھی اماں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

چائے کپوں میں انڈیلتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

"ہاں ویسے تمہاری شادی کروا کر اچھا نہیں کر رہیں"

بھابھی نے شرارت سے پھر ٹانگ کھینچنا چاہی تھی۔ ہیر نے گہرا سانس بھرا۔

"ارے نہیں نا!"

اب دیکھیں انہوں نے بھیج دیا مجھے چائے بنانے یہ بھی نہیں سمجھسیا کہ چائے بناتے کیسے ہیں۔ کیا ڈالتے ہیں اور کب؟

اگر آپ نہ ہوتیں تو مجھ سے جو کچی پکی چائے بنتی وہ سو کیڑے نکالتیں اس میں، اور باتیں الگ سننی پڑتی۔"

چائے انڈیلتے ہوئے ہی بات پوری کی تھی۔

کپوں کو کناری سے کچھ نیچے تک بہا رہا، یہ بھی بہا بھی نے ہی بتایا تھا کہ کپ مکمل کناری تک بہر کر نہیں دیتے ورنہ چائے چمک کر گرنے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔

"مجھے بھی تو انہوں نے ہی بھیجا ہے تاکہ تمہیں سیکھا سکوں۔ آج تو میں نے بنادی پر کل سے تم نے خود بنانی ہے۔

اور ابھی رات میں روٹیاں بھی بنانی سیکھنی ہے۔ اس لیے تم اس گرمی کی عادت ڈال لو۔" اسے بار بار دوپٹے سے پسینہ پونچھتے دیکھ کر آخر میں پھر شرارت سے کہتیں ٹرے لے کر کچن سے باہر چلی گئیں اور ہیر قسمت کے یوں پلٹا کھانے پر بوجھل دل کے ساتھ اسے کوسنے لگی۔

پڑھائی اور گھر کے کام یہی دو چیزیں تھیں جن سے اسے موت پڑتی تھی۔ لیکن اب یہی دو چیزیں اس کے گلے کا پھندا بن چکی تھیں۔

وہ تو شادی کروا کر آرام و سکون سے ٹی وی دیکھنا چاہتی پر یہاں تو اس کی اماں نے اسے چولے میں جونک دیا تھا۔

\*\*\*\*\*



تیرے ناز نخرے اٹھاتا، میں چلوں  
 تجھے بے نام سی دنیا میں لے جاتا، میں چلوں  
 تجھے سات رنگوں میں سجاتا، میں چلوں  
 تجھے کل کائنات بناتا، میں چلوں  
 مانگ تیری چاند تاروں سے سجاتا، میں چلوں  
 تو روٹھے تو تجھے منا کر مسکراتا، میں چلوں  
 بات ہو وفا کی تو تیری مثال دیتا، میں چلوں  
 تو جو مسکرائے تو اس دنیا سے جاتا، میں چلوں  
 محبت کے گیت تیرے سنگ گاتا، میں چلوں  
 کیونکہ تجھ سنگ نکھرتا، میں چلوں

فاطمہ افضل

شام میں مغرب کی سمت پھیلی زردی مائل سرخی سرک چکی تھی۔ اور رات سرمئی چادر اوڑے تمام اجالوں کو اپنے اندر سمائے، اپنے اوپر ملکیش کی صورت میں پروئے تاروں کی روشنی چاروں سو پھیلا رہی تھی۔

تویلی کی پچھلی طرف لان کی گھاس پر چپل میں مقید پاؤں بھاری قدم رکھ رہے تھے۔ پرسوچ نگاہیں، آسمان پر ٹم ٹم کرتے تاروں کے منظر پر ٹکی تھیں۔ اور لبوں پر پراسرار سا تبسم بکھرا تھا۔

دفعۃً موبائل پر بجتی رنگ ٹون نے اسے میٹھی سوچوں کے روش سے نکالا تھا۔ اور وہ بدمزہ ہوتا، عجلت میں موبائل کی سکرین کو دیکھے بغیر ہی کال اٹھا چکا تھا۔

"ہیلو۔ کون؟"

روکھے لہجے میں کہتے وہ لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

پاؤں چپل سے نکال کر کرسی کی سامنے پڑی پلاسٹک کی میز پر رکھتے وہ لیٹنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔

"ابھی تجھے گئے ہوئے ایک دن نہیں ہوا۔ اور ہم سے پوچھ رہا ہے، کون؟"  
 اسپیکر سے آتی غصیلی آواز کو پہچنانا مشکل نہ تھا۔  
 سکون سے آنکھیں موند کر وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

"کتنا بدل گیا ہے تو ضئی۔"

ضامن نے بھی خفگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

اب کی بار ضیغم کا قہقہہ دونوں نے سنا تھا۔

"بدلا نہیں ہوں یار۔"

بس دھیان نہیں گیا تھا سکرین پر۔

کچھ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ضیغم اپنی ہنسی روکتا، صلح جو انداز میں بتانے لگا۔

"تیرا دھیان ہے کہاں آج کل؟"

شہریار نے طنز کیا تھا۔

"آہ۔۔۔"

اب تو صرف ایک ہی بندے پر دھیان ہے۔"

بازو موڑ کر ماتھے پر ٹکاتے، وہ سوچ کے پردے میں عینا کے عکس کو دیکھتا، بے خیالی میں بولا تھا۔

"خیر ہے تجھے؟

کیا بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔"

ضامن اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہوا تھا۔  
آخر کو ضیغم کے منہ سے ایسی باتیں کہاں زیب دیتی تھیں۔

"سچ میں بہت بدلاؤ آگیا ہے صرف ایک ہی دن میں تو سائیں سے، سسی کاپنوں بن گیا۔"

اب کی بار شہریار نے پرانا حساب بے باک کیا تھا۔  
ضیغم اس کی بات سمجھتا نفی میں سر ہلانے لگا۔

"ہو گئی بکواس؟"

سجیگی سے پوچھتا وہ مزید پھیل کر بیٹھا تھا۔

"نہیں۔ ابھی رہتی ہے۔"

شیری بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ پرسکون لہجے میں کہہ کر قہقہہ لگایا۔

"ویسے آج اپنی ہیر جی سے فرصت مل گئی جو کانفرنس کال لگا دی ہمیں۔"

یہ بھی ضیغہ تھا۔ ادھار رکھنا، اسے کہاں پسند تھا۔

بھگو بھگو کر مارنے کی پرانی عادت تھی۔

"سوچا کبھی دوستوں کو بھی وقت دے دیں۔"

کیا پتہ کب کوئی محبت کے امتحان میں بارے اور اسے ہمارے کندھے کی ضرورت پڑ جائے۔  
شہیار بھی دانت کچکچاتا طنز کا تیر پھینک چکا تھا۔

وہ الگ بات تھی کہ ہیر آج کل اسے کوئی خاص گھاس نہیں ڈال رہی تھی۔

"کونسی محبت میں بار رہا ہے یہ؟"

ضامن نے سرسری سا سوال کیا تھا۔

اس کی جب سے اپنی محبت کی کہانی شروع ہوئی تھی وہ اردگرد سے غافل ہو چلا تھا۔

"اس کی اپنی زندگی میں کی گئی اکلوتی محبت..."  
شہریار نے اکلوتی پر زور دیا تھا۔

"اور تو کتنی کر چکا ہے محبتیں؟"

ضیغم نے بھی محبتیں پر زور دے کر اسے لتاڑا۔

شہریار کو وقتی چپ لگ گئی تھی۔ ضیغم کا کوئی بھروسہ نہ تھا، اس کے کسے مذاق میں جملے کو بھی ریکارڈ کر کے ہیر تک پہنچا سکتا تھا۔

اس نے بھی چن کر دوست کے روپ میں دشمن ڈھونڈے تھے۔ ویسے بھی آج کل ہیر کے مزاج نہیں مل رہے تھے۔ اور اب وہ کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"یہ چھوڑو، توبلی کی خیر خبر سناؤ۔ دھماکہ کیا یا ابھی کرنا ہے؟"

شہریار نے موضوع ہی بدل دیا۔

"جیسے اس کی بانچھیں کھل رہی ہیں، مجھے تو لگتا ہے نا صرف دھماکہ کیا ہے بلکہ دھماکہ کامیاب بھی ہو گیا ہے۔"

ضیغم کے جواب دینے سے پہلے، ضامن نے اپنی دانش کے مطابق تیر اندھیرے میں چھوڑا تھا۔

"کیا مطلب!"

چشمش کے لیے مان گئے سائیں انکل؟"

ضامن کے جواب پر شہریار نے ضیغم کی طرف سوال داغا۔

"وہ نہیں مانے، بلکہ میں نے ان کی مان لی ہے۔"

ویسے ہی آنکھیں موندے وہ بیٹھا تھا۔ ایک پاؤں جھلاتا وہ فون کے پار سے آنے والے رد عمل کا منتظر تھا۔

"کیا!"

یہ کیا کہہ رہا ہے؟

تو کیسے مان گیا یار، پیار تو عینا سے کرتا ہے اور شادی کسی اور سے کر رہا ہے۔"

توقعات کے مطابق رد عمل شدید تھا۔

"تو سچ میں بدل گیا ہے، ورنہ تو نوڈل کو کبھی نہ چھوڑتا۔ ایک دن میں کتنا بدل گیا ہے تو۔"

ضامن کے لہجے میں بھی افسوس کا عنصر نمایاں تھا۔

ضیغم نے تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

"یار مجھے بابا سائیں کی بات ماننی ہی تھی۔ تبھی تو وہ میری بات مانتے۔  
اب تم لوگوں کے ساتھ بھی تو بزنس کرنا ہے۔ تو بابا سائیں کی خواہش کا احترام کرنا پڑا مجھے۔"  
دہیمہ لہجہ اپنائے، وہ دوستی کے لیے اپنا پیار قربان کر دینے کی بات کر رہا تھا۔

"مطلب، تو چشمش کو چھوڑ دے گا۔"

شہریار کو تو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

عینا کے لیے بار بار نوڈل اور چشمش کے القابات پر اسے غصہ تو بہت آیا پر فی الوقت وہ اسے  
ظاہر نہیں کر سکا۔

"اب دوستوں کے لیے اتنا تو کیا جاسکتا ہے۔"

وہ داد ہی کھجاتا، دانت پیس کر بولا تھا۔

اسپیکر کے پار موجود دوست اس کے لہجے سے ہی کمیئے پن کی بو محسوس کر چکے تھے۔



"سائیں، تو ہمارا دوست ہے اور ہم اچھے سے جانتے اور مانتے ہیں، تو دوستی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

پر معاف کرنا تو یہ احسان نہیں کر سکتا۔"

ضامن نے بھی پوری سچائی کے ساتھ اسے کھڑے میں کھڑا کیا تھا۔  
 ضیغم کی آنکھوں کی چمک دگنی ہوئی تھی۔  
 مونچھوں تلے عنابی ہونٹوں پر مبہم مسکراہٹ آن بسی تھی۔

"سیدہی اور صاف بات بتا، تیرے دماغ میں چل کیا رہا ہے؟"

شہیار نے بھی اسے بھانپتے ہوئے صاف سوال داغا تھا۔

"میرے دماغ میں فی الحال کچھ الٹا سیدھا نہیں چل رہا۔"

فی الحال پر زور دیتے صاف اور سچی بات کہی تھی۔ اور لہجہ بھی اس کے سچے ہونے کا گواہ تھا۔  
 پر دوستوں کو یقین آتا ہی کب ہے، جب وہ ایک دوسرے کی خصلت سے اچھے سے واقف ہوں۔

"پر مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔"

"مجھے بھی!"

ضامن نے بھی شہریار کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"اب میں تمہارے اندھے بہرے یقین کا کچھ نہیں کر سکتا۔"

ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہتا وہ آنکھیں کھولے، حویلی کی کھڑی عمارت کو دیکھنے لگا۔ جہاں ابھی بھی سنبل کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔

سرد سانس ہوا میں خارج کرتے وہ پھر سے آنکھیں موند گیا۔

"بدل گیا ہے تو جانی!"

ضامن نے پھر جتلیا تھا۔

"اب یہ تو ملاقات ہوگی تو پتہ چلے گا نا کہ کون بدلا ہے اور کتنا؟"

ضیغم پھر سے انہیں باتوں میں الجھاتا، مسکرا دیا تھا۔

"مطلب کہ تو سید ہی طرح نہیں بتائے گا کہ کیا سوچ کر بیٹھا ہے۔"

شہریار کی اسی تان پر ناگواری سے ہنکار بھراتھا۔

"اوں ہوں!"

کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں سوچ رہا۔ شاہ کی زبان پر یقین نہیں ہے کیا؟"  
شاہوں کے خون میں ابال آیا تھا، تبھی وہ کچھ دھونس سے بولا تھا۔

"شاہ کی زبان پر تو یقین آجائے۔ پر شاہ کے دماغ پر کون کمبخت یقین کرے۔"  
اس کی دھونس کو یکسر نظر انداز کرتے، شیریں شوخ پن کا مظاہرہ کرتا، ضامن کو قہقہہ لگانے پر  
مجبور کر گیا۔

"کھینے ہو دونوں۔"

شہریار کے بے تکے شوخ پن پر بے ساختہ جھرجھری لیتا وہ جھڑک کر کھٹاک سے فون بند کر گیا۔

\*\*\*\*\*

"سنبل!"



کہاں گھوم رہی ہو تم۔"

اماں سائیں نے کرخت لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔ جو فریج سے کچھ اٹھائے برق رفتاری سے اپنے کمرے کی سمت جارہی تھی۔

اماں سائیں کے ٹوکنے پر وہ لب دانتوں میں دبائے، آنکھیں میچ گئی۔ ہاتھ میں پکڑے پیالے پر گرفت مضبوط ہوئی تھی۔

"وہ.... اماں سائیں یہ!"

کناری تک آسکریم سے بھرا پیالہ سامنے کرتے وہ ہکلائی تھی۔ اماں نے سخت گھوری سے نوازا تھا۔

"پتہ بھی ہے موسم بدل رہا ہے، رات میں یہ فضول چیز کھانے کی کیا تک ہے؟" اس کے ہاتھ سے پیالہ کھینچتی میز پر پٹخا، سنبل نے بیچاگی سے چہرہ جھکا لیا۔

"اماں سائیں، میں اپنے لیے تو نہیں لے کر جارہی تھی۔ یہ تو..." ابھی اسکی بات منہ میں ہی تھی کہ اماں سائیں نے ٹوک دیا۔

"نہ تم کھاؤ گی نہ وہ۔ اور نہ ہی کوئی اور۔  
اب آگئی ہو تو میز پر برتن ترتیب سے رکھو۔"  
وہ پیالے کو اٹھس کر دوبارہ فریج میں رکھنے کے لیے لے جانے لگیں اور ساتھ ہی اسے حکم بھی  
سنا دیا۔

سنبل لبوں کو باہر نکالے روہانسی ہوئی تھی۔  
پلیٹ کو پٹخ پٹخ کر میز پر رکھ رہی تھی۔ تبھی اماں سائیں دوبارے سے اسکے سامنے آئیں۔

"یہ مجھے دو، تمہارے ہاتھ لگے تو ٹوٹ جائیگی۔  
ایسا کرو اپنے بھائی جان کو بلا لاؤ۔"

اس کے ہاتھ سے پلیٹ لیتیں، وہ نیا حکم نامہ جاری کر چکی تھیں۔  
نئے کام کا سن کر اسکی بانچھیں کھلیں تھیں، اس سے پہلے کے اماں سائیں کوئی اور کام  
ذمے لگاتیں وہ وہاں سے پلٹ گئی تھی۔

"رکو!"

بھائی کو کھانے پر بلا کر لانا، پر یہ نہ بتانا کہ اماں سائیں نے کہا ہے۔"

انہوں نے اسے پٹی پڑھائی تھی۔  
 آخر کو ضیغم سے ناراض تھیں، جسے دکھانا بھی تھا۔  
 پر سنبل کسی کی پڑھائی پٹی پر عمل کر جائے، یہ ناممکنات میں سے تھا۔

"اچھا؟"

نا سمجھی سے انہیں دیکھتی، سمجھنے کے انداز میں سر ہاں میں ہلا کر تویلی کے پچھلی طرف چل دی۔

اسے پتہ تھا بھائی جان کارات کی تنہائی میں یہی مسکن تھا۔

"بھائی جان!"

وہ اب بھی سنبل کے کمرے کی کھڑکی کو ہی دیکھ رہا تھا، جب دوسری بار اپنے نام کی پکار پر ٹھٹھک کر خیال سے باہر آیا تھا۔

"ہوں۔"

سنبل کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"تم یہاں؟"

ایک نظر کھلی کھرکی میں لگے نفیس پردوں سے آتی بلب کی روشنی کی چمک کو دیکھا۔ اور پھر اپنے سامنے کھڑی سنبل کو۔

"تف ہے تجھ پہ ضئی۔"

تاسف سے سر جھٹکتا وہ پاؤں میز سے اٹھا کر گھاس پر رہ چکا تھا۔

"جی، میں تو کب سے یہاں کھڑی ہوں۔"

پر آپ کن کے خیالوں میں تھے؟

گھوم کر اپنی کھرکی کو دیکھتی اور پھر معنی خیزی سے اپنے بھائی جان کو دیکھا جو اسے گھورنے کا کام سر انجام دے رہا تھا۔

"اپنے چھوٹے سے دماغ کو زحمت نہ دو۔"

یہ بتاؤ اس وقت یہاں، کیا کر رہی ہو؟

مصنوعی رعب جھاڑتا، وہ پاؤں میں چپل اڑستا اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"او میں تو بھول ہی گئی۔"

ماتھے پر ہتھیلی سے ضرب لگاتی وہ کچھ یاد آنے کا ڈرامہ کر رہی تھی۔

"وہ اماں سائیں نے مجھے بھیجا کہ آپ کو کھانے کے لیے بلا لاؤں۔

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کو نہ بتاؤں کہ آپ کو انہوں نے بلانے کا کہا ہے۔"

آخری بات ضیغم کے کان میں سرگوشی کی صورت میں کی تھی۔

ضیغم نے اچنبھے سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"کیوں؟"

سنبل نے کندھے اچکا دیے۔

"آپ دونوں میں کوئی ناراضی چل رہی ہے کیا؟"

ویسے ہی سرگوشی میں سوال کے بدلے سوال کیا۔

ضیغم نے نفی میں سر ہلایا۔

کیونکہ اب تو انہیں اس سے خوش ہونا چاہیے تھا تو پھر یہ ناراضی کیسی؟



لیکن ایسا تو تب ہی ہوتا تھا، جب وہ ضیغم کی کسی بات سے ناراض ہوتی تھیں۔ فکر بھی کرتی تھیں، پر بنا بتائے، بنا دکھائے۔

\*\*\*\*\*

وہ کھانے کی میز پر آیا تو سوائے اس کے کوئی موجود نہ تھا۔ ملازمہ سے بابا سائیں کے متعلق پوچھا، تو پتہ چلا وہ مزارعوں کے ساتھ ڈیرے پر موجود ہیں، چاچا سائیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اور اماں سائیں، چاچی کے ساتھ اپنے کمرے میں موجود تھیں۔ سنبل بھی کزن پلس دوست کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ زبردستی چند لقمے حلق سے گزاتا اٹھ گیا، اور سیدہ اماں سائیں کے کمرے کی طرف گیا تھا۔

"اماں سائیں!"

دروازے پر رک کر انگلی سے کھلے دروازے کو بجایا۔ اماں سائیں جو الماری میں بابا سائیں کے کپڑے سلیقے سے درست کر رہی تھیں۔ اسکی پکار پر وہ ہاتھ روک گئیں، لیکن پلٹی نہیں۔

ضیغم نے چاچی سائیں کو کمرے میں نہ پا کر سکھ کا سانس لیا۔

"کہانا کیوں نہیں کہایا آپ نے؟"

وہ ان کے ہاتھوں سے کپڑے لے کر خود ان کی تہہ لگاتا، انہیں الماری میں رکھنے لگا۔  
اماں سائیں بغیر کوئی جواب دیئے پلٹ گئیں۔

"ناراض ہیں مجھ سے۔"

انہیں کمرے سے باہر جاتا دیکھ، ضیغم برق رفتاری سے ان تک پہنچا تھا۔

"تو کیا نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بھی سختی سے جواب دیتیں، اس کے سامنے سے جانے لگیں۔

"لیکن اتنا تو بتادیں، میں نے آخر کون سی غلطی کردی ہے جو آپ اتنی سخت ناراضی دکھا رہی ہیں۔"

وہ ان کے ہاتھ تھامتا، منت کر رہا تھا۔

اماں سائیں نے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا، اور خود کمرے میں ہی موجود لٹریچر صوفے پر جا بیٹھیں۔

ضیغم بھی ان کی تقلید میں، ان کے پاؤں کے پاس فرش پر جا بیٹھا۔

"اچھا میں معافی مانگتا ہوں، جو بھی غلطی ہوئی اس کے لیے، آپ کو تو آج خوش ہونا چاہئے لیکن آپ مجھ سے ناراض ہو رہی ہیں۔"

لاڈ سے کہتے، ضیغم نے انکے گھٹنوں کے گرد بازؤں سے حصار بنایا اور وہیں اپنا سر رکھ دیا۔

"کس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ تم ہمیں، اپنے ماں باپ کو ہی دھوکا دینا چاہتے ہو۔ دوسری شادی کی پلاننگ کر رہے ہو۔ اور میں تم سے ناراض بھی نہ ہوں۔"

آخر کہاں میری تربیت میں کمی رہ گئی تھی۔ جو تمہارے اندر اتنی بچ سوچ پنپنے لگی۔"

بولتے ہوئے ان کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور آخر میں آنسو آنکھ سے ٹوٹ کر رخسار پر پھیل گیا۔

آخر کو تربیت پر سوال آیا تھا، دل خون کے آنسو رونے کے در پہ تھا۔

"دوسری شادی؟"

ضیغم کے دماغ میں تو یہ لفظ گردش کر رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اماں سائیں کو دیکھنے لگا، جو دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

نجانے ایسی کتنی لانتناہی سوچیں اپنے ذہن میں لیے بیٹھی ہوں گی۔

"کون سی دوسری شادی اماں سائیں؟"

ضیغم نے سرانگی گود سے اٹھاتے استفسار کیا تھا۔

اماں سائیں نے جواب دینے کی بجائے اس کے ہاتھوں کا حصار اپنے گھٹنے سے ہٹایا تھا۔

"پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ اماں سائیں!"

کون سی دوسری شادی؟"

وہ ویسے ہی فرش پر بیٹھا تھا، پر نظریں ان کی آنکھوں سے ملاتا جواب کے لیے بضد تھا۔

"زیادہ بھولے نہ بنو، ضیغم!"

شہر جانے کی بات کیوں کی تم نے؟

اسی لیے ناکہ وہاں اس شہر کی میڈم سے جا کر شادی کر سکو۔

پر ایک بات یاد رکھو شاہ سائیں، اپنے جیتے جی یہ نہیں ہونے دینگے۔"  
ان کے اٹل لہجے میں ڈہلی بدگمانی پر سرد آہ بھرتا وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں دیکھے گیا۔

"آپ نے اس شہر کی میڈم کو دیکھا ہے؟"  
میڈم لفظ کو کھینچ کر ادا کرتا وہ ان کے ہاتھوں کو اپنی ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ چکا تھا۔

"قطعاً ضرورت نہیں ہے مجھے اس میڈم کو دیکھنے کی، سن لو ضیغم سائیں!"  
غصے سے اس کے ہاتھوں کو جھٹکتی، وہ اٹھ کر جانے لگیں۔  
کہ ایک بار پھر ضیغم نے ان کے ہاتھ پکڑ کر، انہیں بیٹھنے پر مجبور کیا۔

"تو سنیے اماں سائیں!"

وہ میڈم کوئی اور نہیں عینا رحیم شاہ ہے، شاہ رحیم بخش کی بیٹی۔ آپ کی اور بابا سائیں کی  
بھتیجی۔"

ضیغم ایک ایک لفظ سچائی کے ساتھ بیان کرتا، ان کی بے یقین آنکھوں میں دیکھنے لگا۔  
جہاں حیرت، بے یقینی صاف چھلک رہی تھی۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔"

لفظوں سے تو نہیں پر ان کی آنکھیں یہی سوال کر رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں کے سوال کا جواب ضیغم نے سر اثبات میں ہلا کر دیا۔

"آپ کو اپنی تربیت پر اتنا بھروسہ تو ہونا چاہیے تھا۔ مانتا ہوں توہلی سے دور رہا ہوں، پر میرے اندر بھی شاہوں کا خون ہے اماں سائیں۔

شاہ جب کسی کو اپنی زندگی میں شامل کر دیتا ہے تو پھر کسی دوسرے وجود کی چاہ بھی اپنے اندر نہیں لاتا۔

اور اگر وہ عینا نہ بھی ہوتی، تو میں ہرگز اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں بابا سائیں سے بات کرتا، انہیں مناتا اور اگر وہ پھر بھی انکار کر دیتے تو میں اپنے باپ کی عزت کی خاطر ان کی خواہش کے آگے سر جھکا جاتا اماں سائیں۔

لیکن کبھی ایسا نہیں سوچتا، بغاوت کرنا شاہ کے خون میں نہیں ہے۔ اور وہ بھی اپنے ہی ماں باپ سے تو ہرگز نہیں۔"

وہ تحمل سے انہیں سچائی سے روشناس کروا رہا تھا۔

اور وہ اب بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھیں، رب تعالیٰ کی ذات یوں بھی معجزے کرتی ہے، کہاں وہ کیا کیا سوچے بیٹھی تھیں۔ اور کہاں وہ عزیزم بابرکت ذات پہلے ہی ضیغم کے دل میں اس کے لیے محبت ڈال چکا تھا۔

ضیغم کے لہجے میں اماں سائیں سے شکوہ صاف عیاں تھا۔ شکوے کے باوجود وہ اپنی بات کہہ کر انکے گود میں رکھے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیے ان پر سر رکھ چکا تھا۔ وہ ماں تھی، اور ماں سے ناراضگی کیسی؟ جب کہ وہ رنجیدہ ہوا تھا، ایسی بے اعتباری پر دل دکھا تھا ہر مقابل ماں تھی تو دکھ خود باخود چھٹ ہی گیا۔

"ضیغم سائیں!"

کچھ توقف کے بعد وہ بولیں۔

"جی!"

اسی حالت میں سر ان کی گود میں رکھے وہ دہیمے سے بولا تھا۔

"مجھے معاف کر دو!"

اپنے ہاتھوں کو اسکے سر سے نکالتیں، بالوں میں انگلیاں چلانے لگی تھیں۔  
ضیغم کو لگا سال بھر کی تھکاوٹ ان انگلیوں کے لمس سے ہی غائب ہو چکی ہے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں، اماں سائیں!"

ان کے ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیتا، عقیدت سے اسے آنکھوں اور پیشانی سے لگایا تھا۔  
اماں سائیں اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت اور عقیدت پر نرم آنکھوں سے مسکرائیں۔

"ایک بات پوچھوں؟"

کافی دیر عینا کے مطلق، اس سے یونی میں ملاقات اور پھر یہاں حویلی میں اس سے ملاقات کا  
بتاتے، ابھی وہ خاموش ہوا ہی تھا کہ اماں سائیں نے بالوں کو سنوارتے اس سے اجازت چاہی  
تھی۔

"سو پوچھیں۔"

ہنستے ہوئے آنکھیں موندے ہی جواب دیا تھا۔



"اگر عینا گریا وہ نہ ہوتی جس سے تماری شادی طے کی ہے، تو پھر بھی تم اپنے بابا سائیں کے خلاف نہ جاتے؟  
آخر کیوں؟"

وہ شاید اس کی محبت اور اس محبت کی گہرائی کا امتحان لینا چاہ رہی تھیں۔  
ضیغم نے کچھ لمحے سوچتے ہوئے گزار دیے۔  
اور پھر جب بولا تو اماں سائیں مسکرا دیں۔

"میں عینا کو پسند ضرور کرتا تھا۔ پر میں سچ کہہ رہا ہوں اماں سائیں، میں نے کبھی خود کے اندر پلتے جزبات کو نہ عینا پر ظاہر کیا تھا اور نہ ہی خود انہیں منہ زور ہونے دیا تھا۔ میرے نزدیک کل تک وہ انسیت ہی تھی۔

ہاں اس انسیت کو میں ایک مضبوط رشتے میں باندھنا ضرور چاہتا تھا پر میں اپنے حالات اور رواج سے بھی بانٹوئی واقف تھا۔ اس لیے میں نے خود میں ہر طرح کے فیصلے کی سختی کو برداشت کرنے کی ہمت بھری تھی۔

پر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اللہ مجھ پر ایسے کرم بھی کرے گا کہ بن مانگے ہی اسے میری جھولی میں ڈال دیا۔"

وہ سچائی سے کہہ رہا تھا، چہرے پر ناختم ہونے والی مسکراہٹ تھی۔ ذہن کے پردے میں گھومنے والا صبح کا منظر جسے پورے دن میں کتنی ہی بار وہ سوچ چکا تھا۔

اسے تو خود یقین نہ آیا تھا کہ جس کے لیے وہ اتنا کچھ کہنے کی ہمت مجتمع کر رہا تھا وہ پہلے سے ہی اسکے نام کردی گئی تھی۔

اور یہ خیال آتے ہی تمام سوئے جزبے سر اٹھانے لگے تھے۔ انسیت شدید محبت میں بدل گئی تھی۔

محبت تو پہلے بھی تھی، پر وہ شاید خود کے ساتھ فریب کر رہا تھا۔  
اور اب جب حقیقت کا روپ دہارے وہ حسین خواب اسکے سامنے کھڑے تھے تو محبت کے لطیف جزبے کو محسوس کر کے اس کے رگ و پے میں سکون سرائیت کر گیا تھا۔

\*\*\*\*\*

صبح جب ناشتے کی میز پر وہ مریم بیگم (چاچی سائیں) کی تقلید میں آیا تھا۔ اس وقت ناشتے کی میز پر صرف سنبل موجود تھی۔

مریم بیگم نے ملازمہ سے ناشتہ لانے کو کہا، اور پھر ضیغم کو ناشتہ کرنے کا کہہ کر وہ کسی کام کی غرض سے وہاں سے چلی گئیں۔

"بھائی جان، بہت تھکے تھکے لگ رہے ہیں۔"  
 ٹوسٹ کا نوالہ منہ میں رکھتی وہ ضیغم سے بولی تھی۔ جو کسی سوچ میں کھویا ناشتہ کر رہا تھا۔

"ہوں؟"

سوچوں سے چونک کر وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگے۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہیں آپ؟"

وہ جانچتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

ضیغم نے اس کے سوال پر سر جھٹکا، وہ تو یہ سوچ رہا تھا کون سے سیلے بہانے بنا کر بابا سائیں کے سامنے اپنی بات رکھے۔

"آپ آج کل بہت نخرے دکھا رہے ہیں۔"

گھوریوں سے نوازتی وہ بڑبڑائی تھی۔

ضیغم نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔

ضیغم اپنی سوچوں میں اس قدر ڈوبا تھا کہ اپنے پاس آتے ہی مخصوص مہک پر اس کا دھیان بٹا، اچانک سے دماغ پر زور پڑا تو اسے اندازہ ہوا کہ تیسرا وجود جو اس میز کے پاس آکر رکا ہے وہ وہی ہے جسے اس کے نام لگایا جانا ہے۔

مکمل ارادے کے ساتھ اس نے سر مزید پلیٹ کی طرف جھکا دیا اور تن دہی سے ناشتے میں مگن ہو گیا۔

لیکن جانی پہچانی آواز پر منہ کو جاتا ہاتھ ہوا میں آویختہ رہ گیا۔

"آپ؟"

اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان لے، اور پھر جھکے سر کے ساتھ سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں ہر سہرا دوسرے سرے سے ملتا جا رہا تھا۔

وہ کیسے بھول گیا، کہ اس کی کزن کا نام عینا رحیم ہی ہے۔ شاید کافی عرصے سے گھر سے دور رہنے کے باعث وقتی طور پر وہ بھول چکا تھا۔ اور کچھ بابا سائیں کو منانے کی غرض سے دماغ ماؤف ہوا پڑا تھا۔

اور اب یہ خیال آتے ہی، کہ جسے دل کی دنیا کا مکین بنایا، وہ پہلے سے ہی اس کے گھر کی مکین تھی، اور اب گھر والے اسے ہی اس کے کمرے کا مکین بنائے بیٹھے تھے۔

گہرا سانس بھرتے، اور ڈھیروں خوشی اپنے اندر اتارتے جھکا سر اٹھایا تھا۔

اور سامنے ہی متاعِ جان جس کو پانے کے لیے کتنے ہی دنوں سے وہ سب کچھ بھلائے بس  
اسی تگ و دو میں تھا۔

آج آنکھوں میں خوشگوار حیرت کی چمک لیے، ہونٹوں پر نرم سی مسکان سجائے استفسار کر رہی  
تھی۔

"آپ یہاں؟"

اس کے یوں خود کو یک ٹک دیکھے جانے پر عینا نے اپنا سوال دہرایا تھا۔  
جہاں سنبل بھی اپنے بھائی جان کی ساکت نظریں عینا کے چہرے پر ٹکی دیکھ رہی تھی بالآخر  
مصنوعی گلہ کھنکھارا۔

ضیغم ہوش میں لوٹتا بمشکل نظریں پھیر گیا۔

"گڑیا، یہ بھائی جان ہیں، تمہارے ضئی..."

ضئی لالا اور بھائی جان یہ گڑیا ہے آپ کی...

میرا مطلب ہماری کزن، بخش چلو کی بیٹی۔"

دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرواتے وہ معنی خیزی سے بات آدھوری چھوڑتی اور پھر عینا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بات بنا جاتی۔

جب کہ ضیغم اس کے ہر لفظ کی کارستانی باخوبی سمجھتا تھا۔ عینا کے تو چہرے پر مسلسل کھلی کھلی مسکراہٹ تھی، ضیغم اب بھی اسے خواب ہی تصور کر رہا تھا، صرف سنبل کی وجہ سے وہ خود پر جبر کیے خاموش بیٹھا اس کی مسکراہٹ کے جواب میں ہلکا سا سر ہلا گیا۔ ورنہ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر، اس بات کا یقین کر لینا چاہئے تھا کہ خدا اس پر مہربان ہو چکا ہے، جس معجزے کی اس نے دعا بھی نہیں کی تھی، اور وہ ہو چکا تھا۔

ضیغم کے صرف سر ہلا دینے پر، عینا کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔ وہ تو اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہ رہی تھی کہ میں بہت خوش ہوں آپ کو یہاں دیکھ کر۔ اور ایسی کئی باتیں، وہ پل بھر میں سوچ چکی تھی پر ضیغم کی طرف سے ایسے ٹھنڈے ٹھارہ عمل پر وہ خفت سے سر جھکا گئی۔ اور اس سب کے دوران سنبل بہت غور سے دونوں کی حرکات کو دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

ضیغم جب مزید خود پر لا تعلق، اور بے پرواہی کا مصنوعی نول نہ چڑھا سکا تو کرسی دھکیل کر بھاری قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

بچے عینا ایسے عمل پر ہونق بنی دیکھ کر بڑبڑائی۔

"ضیغم بہائی کو کیا ہوا؟"

اس کی بڑبڑاہٹ ساتھ بیٹھی سنبل کے کانوں میں پڑی تھی۔ اور جس کا گلاس منہ سے لگاتے لگاتے کی تھی۔

"ضیغم بہائی۔"

منہ میں ہی وہ بڑبڑائی تھی۔ ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی خود سے دو سال چھوٹی گریا کو دیکھا تھا۔ جو بالکل کسی موم کی گریا کی طرح تھی۔

کرل بال جنہیں کل ہی اس نے مزید اچھے سے کرل کیا تھا۔ بالوں کا ساعیڈ ٹوئسٹ بنا کر چھوٹی سی کلپ سے باندھا گیا تھا۔

بڑی بڑی خوبصورت، کالی آنکھوں کی پتیلیوں کو گول چشمے کی باڑ پہنائے بیٹھی تھی۔ بڑا سا دوپٹہ اس کے گلے اور شانوں پر لٹک رہا تھا، جو اس کی معصومیت، اور اناڑی پن دونوں کو عیاں کر رہا تھا۔ گلابی رنگ کی نفیس سی کڑھائی میں کاٹن کا سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھی، جس میں گندمی رنگت مزید کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

سنبل کو اس کی نظروں میں پہلے خوشی اور پھر اداسی کی رمت دیکھ کر شک گزرا، اسکی فون پر عینا سے بات ہوتی رہتی تھی اور کل تک وہ ضئی لالا کے نام سے ہی پکارتی آرہی تگی۔ تو آج ضئی لالا سے ضیغم بھائی کیسے بن گیا۔

جب کہ عینا ضیغم جیسے دوست کی ایسی بے رخی اور اکھڑے انداز پر بمشکل آنسو روک پائی تھی۔

\*\*\*\*\*

"او!

تو بھیا جی، کزن جی نکل آئے ہیں۔ اب کب یہ کزن جی سیاں جی بنیں گے؟  
ہمیں تو اسی دن کا انتظار ہے۔"

عینا کی ساری بات سننے کے بعد کچھ پل تو ہیر اور تائشہ شاکی رہیں۔

"کبھی نہیں۔"

اکھڑے لہجے میں کہہ کر وہ تکیے میں منہ گھسا گئی۔



"ایسے بھوتا کیوں لٹکایا ہوا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے دوست، ضیغم بھائی تمہارے کزن نکل آئے۔ اور تم ہو کہ..."

اس کی اداسی پر تائشہ نے لتاڑا تھا۔ جس پر عینا مزید روہانسی ہوئی۔  
تکیے پر سے منہ اٹھاتی وہ تکیہ گود میں بھیچے اٹھ بیٹھی۔

"تشو!"

ضیغم بھائی بدل گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچانا بھی نہیں، نہ ہی مجھ سے بات کی، ایک چھوٹی سی سائل بھی پاس نہیں کی۔  
وہ سسکاری بھر کر ضیغم کا نظر انداز کرنا یاد کر رہی تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟

بڑی ہونگے شاید یا پھر..."

تائشہ اس کے سسک کر کہنے پر سمجھانے لگی تھی کہ عینا نے اس کی بات بیچ میں سے اچک لی۔

"نہیں تشو وہ بدل گئے ہیں۔"

شہادت کی انگلی سے ناک پر جمے چشمے کو دست کرتی روتے ہوئے بات دہرائی تھی۔

دروازے پر کھڑے ضیغم کے کانوں نے یہ جملہ باخوبی سنا تھا۔ ابھی وہ سنبل کو اماں سائیں کے پاس چھوڑ کر آ رہا تھا، ارادہ اپنے کمرے میں جانے کا تھا۔ پر صبح سے نظریں جس ہستی کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ اور دل بھی ہمک ہمک کر جس کے پاس جانے کی ضد باندھے ہوئے تھا۔ وہ یہ خوبصورت موقع گنونا نہیں چاہتا تھا، راستہ صاف دیکھ کر وہ دروازے تک پہنچ آیا تھا۔ اور پھر جو کچھ سنا، اس سے اس چھوٹی سی لڑکی پر بیک وقت پیار اور ترس آیا تھا۔ آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک تھی، جس کا ساتھ لب بھی مسکا کر دے رہے تھے۔

انگلی کو ہلکے سے دروازے پر بجایا تھا۔ وہ جو اپنی ہم راز دوستوں کے ساتھ مزید دل ہلکا کرنے لگی تھی۔ دستک کی آواز پر بیٹھے ہی گردن کو بل دے کر دروازے کی جانب دیکھا تھا۔ وہاں ضیغم کو پا کر وہ فوراً ہی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوئی تھی، دوپٹہ جو سنبل کی دیکھا دیکھی وہ لینے لگی تھی، وہ بھی اب نجانے کہاں پڑا تھا۔

آنکھوں پر حسب معمول گول چشمہ لگا تھا، بال پونی میں قید تھے، چند آوارہ لٹیں اسکے چہرے کے گرد جھول رہی تھیں، اس کی ملگجہ حالت پر ضیغم نے مسکراہٹ دبائی۔

ضیغم رات کے اس پہر اسے نئے روپ میں دیکھ کر پل بھر کو ٹھٹھکا تھا، اور پھر بمشکل نظریں اس کے چہرے پر جھولتی لٹ اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے ہٹا کر کمرے میں دوڑانے لگا۔ سست روی سے قدم اٹھاتا وہ اس کے قریب جا پہنچا، اتنی سی دیر میں عینا کال کاٹ چکی تھی، اور اس کے قریب پہنچنے پر کچھ جگہ بنائی تھی۔ یہ بھی ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔

"کیسی ہو؟"

وہی نرم لہجہ، اس کی طرف متوجہ انداز جس کی وہ عادی تھی۔

"ٹھیک"

ایک لفظی جواب دے کر ناک سکیر کر دائیں بائیں ہلانے لگی۔  
ضیغم اس کی اس ادا پر مسکرا دیا۔

"لگتا ہے ناراض ہو؟"

بیڈ کی پائنٹی پر بیٹھتے اسے بھی کلائی سے پکڑ کر کھینچا تھا۔  
اچانک افتاد پر وہ کھینچتی ہوئی دھپ سے اس کے ساتھ جا بیٹھی۔

"آپ کون ہیں جو میں آپ سے ناراض ہوں؟"

صبح کا واقعہ وہ بھولی تو نہیں تھی، جب اجنبیوں جیسا رویہ ضیغم نے اختیار کیا تھا۔ اس کی آواز میں بھی خفگی بھری تھی، ضیغم اس کے اس قدر غصہ دکھانے پر لب دبا گیا۔

"یہ تو بہت جلد پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔"

فی الحال کے لیے یہ یاد رکھو کہ میں دوست پلس کزن ہوں۔"

ضیغم نے سنجیدہ لہجے میں، دوست اور کزن پر زور دیتے ہوئے بولا تھا۔ عینا نے اس کی بات مانو ہوا میں اڑائی ہو۔

"صبح تو ایسا کچھ نہیں لگ رہا تھا۔"

پہلا جملہ تو اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ اسے تو دوست لفظ ہی سنائی دیا تھا جیسے..

"صبح تمہیں اچانک سے سامنے دیکھ کر مجھے سمجھ ہی نہیں آیا۔ کیا ریکٹ کروں اور کیسے، اس لیے میں اٹھ کر چلا آیا۔"

کچھ کچھ سچائی بھی تھی لفظوں میں، لیکن عینا ہنوز روٹھی ہوئی بیٹھی تھی۔

"اب ناراضگی ختم کیسے ہوگی؟"

اس کی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر چہرہ اپنی طرف موڑا تھا۔

جہاں اس کی انگلی کی پور نے اس کے چہرے کی نرمی محسوس کی تھی، وہیں عینا کی دہرکنیں بھی بے ترتیب ہوئی تھیں۔

یک دم سے تائشہ اور ہیر کی کہی گئی باتیں اس کے دماغ میں جھومنے لگی تھیں، جس کے باعث اسکے اندر انجانے سے جذبات سر اٹھانے لگے تھے۔ چہرے کو ہلکے سے موڑا تھا کہ انگلی ٹھوڑی سے سرک گئی۔

"ہوں۔ بتاؤ بھی۔"

فورا سے پہلے اس کے چہرے کو چھوڑتے وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔  
عینا نے ہنوز پلکیں جھکائی ہوئی تھیں۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔"

وہ انگلیاں چٹائی مسمنائی تھی۔

ضیغم اس کے جواب پر نثار ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہو گیا، ورنہ مجھے تو منانا ہی نہیں آتا تھا۔"

وہ ہلکا سا قفقہ لگاتے بیڈ سے اٹھا تھا۔

عینا بھی اس کے اٹھتے ہی اٹھ چکی تھی۔

اسے آرام کرنے کا کہتے وہ قدم اٹھاتا کمرے سے نکل کر بہت احتیاط سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ضیغم کو بھی سنبل کے آجانے کا ڈر تھا،

یا حویلی میں سے کسی گھر کے فرد یا پھر ملازمہ اسے رات کے وقت عینا کے کمرے میں دیکھ لیتی تو ایک نئی عدالت لگ جاتی۔ اور فی الحال وہ جس دہرائے پر کھڑا تھا، اور جو بات بابا سائیں سے منوانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بابا سائیں کو لگے کہ ضیغم ظفر شاہ نے اپنے باپ کی زبان کی لاج رکھی ہے۔

بیچھے عینا اس کی چھوڑی گئی جگہ کو گھورتی رہی، پورا دن کتنی بے چینی میں گزرا تھا۔ اور اب ایک پل کو آئے اور منا کر چلے گئے۔ الٹا خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ مان کیوں گئی۔ پر شاید کچھ لمحوں کے اثر میں آکر اسے ہار ماننا ہی پڑی۔

جیسے ہی کچھ پل سر کے تمام سوچیں کئی غائب ہو گئیں۔ اور وہ اپنے حال میں جینے والی لڑکی پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہوئی۔ کال وہ کاٹ چکی تھی۔ اور اب سنبل بھی آنے والی ہوگی، بس یہی سوچتے وہ سکون کی نیند لینے کے لیے بستر پر لیٹ گئی۔

\*\*\*\*\*

مسرت اس کی آنکھوں میں صاف دیکھی جاسکتی تھی، یہ آنکھیں ہی تو سب اگل دیتی ہیں جیسے اس کی خوشی کا منہ بولتا ثبوت تھیں یہ آنکھیں، جب سے عینا پر دل آیا تھا ایک پل سکون نہیں ملا تھا ہر وقت بس بابا سائیں کو منانے کی فکر میں ہی گھلتا رہتا تھا لیکن صبح عینا کو دیکھ کر ساری بے سکونی چھٹ گئی، اور اب سکون ہی سکون تھا۔

وہ جو صبح سے عینا سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا، اب عینا سے مل کر اس کی ناراضی ختم کر کے اپنے کمرے کی طرف آیا تھا۔

نہ پریشانی میں نیند آتی ہے اور نہ خوشی میں۔

سوچتے ہوئے وہ چت لیٹا، چھت کو گھور رہا تھا۔

دونوں بازو کو سر کے نیچے رکھے وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ ہی آگے کے سپنے بننے لگا تھا۔

تبھی اس کی سماعتوں سے فون کی رنگ ٹون ٹکرائی، رات کے پہر کا خیال کرتا وہ چھت پھاڑ  
 قہقہہ مارنے کی خواہش گلے میں ہی دبا گیا، جانتا تھا خبر آگ کی مانند پھیل ہی چکی ہوگی، دیر سے  
 ہی صحیح پر اب تک تو اس کے دوست بھی اس خوشی میں شریک ہو چکے ہوں گے۔  
 کچھ انتظار کرواتا وہ کال کاٹ گیا اور خود سے ویڈیو کال ملا دی۔  
 وہ ان کے چہرے پر رقم تاثرات دیکھنا چاہتا تھا تبھی زچ کرنے والی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر  
 فون اپنے سامنے کیا تھا۔  
 پر یہ کیا صرف ضامن کی شکل ہی نظر آرہی تھی، شیریں کی شکل تو سرے سے غائب تھی بلکہ  
 سرخ رنگ ہی نظر آ رہا تھا۔  
 اور پھر آہستہ سے سرخ نشان کی جگہ ہاتھ کی ہتھیلی دکھی تھی، اور جب بات سمجھ میں آئی وہ  
 منہ پر ہاتھ رکھتا قہقہے کو بے دردی سے دبائے لگا۔

شیریں ابھی بھی ہتھیلی کا رخ کیمیرے کی طرف کیے اس پر ڈیجیٹل لعنت بھیج رہا تھا۔  
 صرف ضامن ہی تھا جو انجان سا ہونق بنا ان دونوں کی حرکات دیکھ رہا تھا۔

”کمیئے، کتے، (گالی)۔۔۔“



کوئی سو جھوٹے مرے ہوں گے تو، تو پیدا ہوا ہے۔"  
 جب لعنت بھیجنے سے بھی لگے کی ہنسی نہ کی تو کیمرے کے سامنے آتا وہ آخری حربہ آزمانے لگا،  
 پر یہاں شرم کسے آئی تھی۔

"ہوا کیا ہے؟ کوئی مجھے بھی بتائے گا؟"  
 ضامن کو بالآخر بیچ میں بولنا ہی پڑا۔

"جا بچہ تو سوتا ہی رہے، یہاں یہ کمینہ انسان ہم پر احسان کرنے چلا تھا۔ مجھے پہلے سے ہی پتہ  
 تھا تو اور اتنا اچھا!  
 ہو ہی نا جائے۔"  
 پہلے ضامن کو جھڑکتا، پھر ضیغم کو بھی لپیٹے میں لیا۔

"بہت سست میڈیا ہے تیرا،"  
 بمشکل ہنسی روکتا وہ اشارتاً ہیر کا کہہ رہا تھا۔ آخر ہی کی طرف سے ہی اسے خبر ملنی تھی۔

"تو تیز ہے نا وہی بہت ہے، مھلا دوستوں سے بھی کوئی جھوٹ بولتا ہے؟"

چڑ کر کہتا وہ مزید اسے شرمندہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں کہا، یہ گواہی تو ضامن بھی دے گا۔ کیوں ضامن؟"  
ہاں اس نے تو جھوٹ نہیں کہا تھا اس نے تو کہا تھا کہ وہ بابا سائیں کی پسند کو ترجیح دے گا۔ وہ الگ بات ہے کہ اس نے چھپایا تھا۔

"مجھے کچھ پتہ چلے گا تو ہی بولوں گا نا۔"  
جھنجھلا کر کہتا وہ انہیں سیدھے مدعے پر آنے کو کہہ رہا تھا۔

"میں تو بھول ہی گیا، تیرے تو ابھی کنکیشن ہی نہیں بنے، میڈیا ورکنگ میں کہاں ہوگا تیرا  
بھلا۔"

مصنوعی افسوس جھاڑتا پھر سے بتیسی کی نمائش کر گیا۔  
ضامن تو انجان ہی رہا اس کے طنز پر، لیکن شہریار سمجھ چکا تھا۔  
اور پھر مختصراً ضامن کو بتا ہی دیا کہ موصوف ہمارے سامنے جو مظلوم بننے کا نالک کر رہے  
تھے اسکا ڈراپ سین یہ رہا۔

"تو کتنا بڑا کمینہ ہے!"

جہاں سنتے ہی ضامن کی حیرت بھری آواز آئی تھی، وہیں شہیار نے بھی ضامن کی تائید میں سر ہلایا تھا۔

جب کہ ضیغم کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا، ہنسی تھی کہ رک ہی نہیں رہی تھی۔

"یار قسم سے میں تو ابھی شیری کو کال کرنے لگا تھا کہ کچھ کرتے ہیں تیرے لیے پر تو تو۔"

ضامن اب بھی افسوس ہی منا رہا تھا۔

"اچھا بس بھی!"

بتانے ہی والا تھا تم دونوں کو، پھر سوچا تھوڑا مزہ لے لیا جائے۔"

پہلے سنجیدہ بننے کی کوشش کی، پھر آنکھ کا کونا دبا کر ہنس دیا۔

"تبھی تیرے دانت اندر نہیں جارہے تھے۔"

ضامن نے حقیقت پر قیاس کیا تھا۔

"خوش رہ کیئے۔"

بہت ستانے کے بعد شیریں نے محبت سے اس کی ہنسی دیکھتے کہا تھا۔  
ضامن نے بھی پیار کا اظہار گالی کی صورت میں ہی کیا تھا۔

"تو بھی فکر نہ کر، تیری والی بھی مان جائے گی۔"

اب ریلیکس سا بیٹھتا وہ ضامن کو بھی امید دے رہا تھا۔ خود کو تو صبر کا پھل مل چکا تھا۔

"اللہ کرے مل جائے۔"

صبح تائشہ کے آئے فون کے بارے میں سوچتا وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"یار ضئی، تینوں ساتھ میں شادی کریں؟"

یہ شیریں تھا، جو ہیر کی سنگت میں رہ کر اب اس جیسے ہی خیالات سوچنے لگا تھا۔

"ساتھ میں؟ مطلب؟ آپس میں!۔"

کیا بکواس ہے؟"

ضامن کا تو دھیان تھا ہی نہیں، تبھی بات کا نجانے کون سا مطلب نکال گیا تھا۔

"او ہیلو، ساتھ میں مطلب ایک ہی دن، تینوں اپنی اپنی دہنوں سے شادی کریں۔"  
ایک دن اور اپنی اپنی دہنوں پر زور دیتے وہ تفصیلاً بتاتا، دانت کچکچا کر کراہیت سے بولا تھا۔

"او!"

لیکن پہلے میری والی تو مان جائے۔"  
کھسیانا سا سر کجھاتا منہ بسور گیا۔

"کچھ کرتے ہیں تیرا بھی۔"  
ضیغم پر سوچ سا بولا تھا کہ شیری اور ضامن کھل کر بنے تھے۔  
اب تو تالشہ کو ماننا ہی پڑے گا، پلان جو ضیغم ظفر شاہ کا تھا۔

\*\*\*\*\*

عینا کا اس دن رونا دھونا اور پھر گھر جانے کی ضد باندھ لینا، رحیم صاحب کو کافی پریشان کر گیا تھا۔ اور پھر انہوں نے ایک فیصلہ لے ہی لیا۔ اور وہ تھا عینا کی ضیغم سے شادی، ظفر شاہ نے تو عینا کے پیدا ہوتے ہی یہ خواہش ظاہر کر دی تھی پر رحیم صاحب اپنے بڑے بھائی جیسے

دوست کو صاف نہ اقرار کر سکے تھے اور نہ ہی انکار، شاہ سائیں بھی اس کی حالت سمجھتے تھے تبھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ لیکن اب جب ضیغم اپنی پڑھائی مکمل کر کے لوٹ رہا تھا، تو انہوں نے پھر سے رحیم بخش صاحب کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ دل سے تو وہ بھی مان چکے تھے، لیکن عینا کی طرف سے کچھ پریشان تھے۔ پر اب وہ اتنا جان گئے تھے کہ لپٹوں کے بیچ رہ کر عینا بھی ایک نارمل اور پرسکون زندگی جی سکے گی، اپنا بزنس بھی سمیٹ کر وہ واپس ظفر شاہ کے ساتھ ہی رہنا چاہتے تھے، اور عینا بھی ان کی آنکھوں کے سامنے رہے گی اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

ایک لڑکی کے لیے کامیابی یہی تو ہے کہ اچھے نصیب کے ساتھ اچھا ہمسفر مل جائے، اچھا سسرال مل جائے اور یہاں مائیکہ جیسا سسرال تھا تو مریم بیگم بھی اپنی بیٹی کے لیے خوش تھیں۔

لیکن ایک عینا رحیم ہی تھی جو ان سب منصوبہ بازی سے نا آشنا تھی۔ اس کے پیپرز سے پہلے ہی اسے رحیم صاحب نے خوش خبری سنائی تھی کہ وہ لوگ اس کے پیپرز کے بعد اپنے گھر جا رہے ہیں۔ عینا کی تو خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس دن بھی جب ضیغم نے گھر آ کر کچھ مانگنے کا وعدہ لیا تھا تب بھی وہ یہی بتانا چاہتی تھی لیکن ضیغم نے اس وقت سنی ہی نہیں۔

اور پیپرز ختم ہوتے ہی اگلے دن وہ لوگ حیدرآباد کے لیے نکل گئے، تایا جان اور تائی سائیں کی تو جان بستی تھی اس موم کی گڑیا میں، سنبل اس سے دو سال بڑی تھی، لیکن ان میں بھی بہت

گہری دوستی تھی۔ جب سے وہ حیدرآباد آئی تھی، مریم بیگم کی تو ساری پریشانیاں دور ہو گئی تھیں۔ سنبل کی دیکھا دیکھی میں اس نے اپنی فیشن سینس کسی حد تک سدھار لی تھی اور اس سب میں تائی سائیں نے بھی بہت پیار سے اس کی مدد کی تھی۔ اب تو اسے تائی سائیں کے ہاتھ کے بنے کھانے اتنے پسند آئے تھے کہ سیکھنے تک کا شوق چڑھا تھا اور یہاں سنبل بری طرح پھنسی تھی۔ کیونکہ جو شوق عینا کو چڑھا تھا وہ سنبل کے لیے زحمت تھا۔ عینا تو خیر خوشی خوشی ہی سیکھ رہی تھی، پر سنبل کو تو زبردستی تائی سائیں سیکھا رہی تھیں، آخر کو جلد اس کے ہاتھ پیلے بھی کرنے تھے۔

"سو گئی ہو کیا؟"

عینا کو لیٹے ابھی کچھ وقت ہی ہوا تھا کہ سنبل اپنے حصے کے کام نبٹاتی جلدی سے اپنے اور عینا کے مشترکہ کمرے میں آئی تھی، آخر سے صبح سے وہ عینا سے اگلوانے کے چکر میں تھی پر وہ تھی کہ اداس صورت بنائے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے آئس کریم لانے کا بھی کہا، تب جا کر صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اور ضیغم ایک ہی یونی میں پڑھتے تھے۔ اور اب سارا سچ اگلوانے کا وقت تھا۔

"ہاں جی۔"

وہ آنکھیں کھول کر سنبل کو دیکھتے نوٹھے انداز میں دوبارہ سے آنکھیں بند کرتی بولی تھی۔

"تو پھر فوراً سے اٹھ جاؤ، اور مجھے بتاؤ یونی میں ساتھ پڑھتے تھے تو اس سے آگے کا سارا قصہ سناؤ شاباش اٹھو۔"

اس کی نیند اور ناراضی دونوں کی پرواہ کیے بغیر اسے اٹھاتی وہ حکم دے رہی تھی۔

"کیوں؟ کیوں بتاؤں میں آپ کو؟" آئس کریم لائی ہیں میرے لیے؟"  
بمشکل اٹھتی پاس میز پر پڑے چشمے کو آنکھوں پر لگاتی خفا سی جتلا کر بولی تھی۔ ویسا ہی ناراض  
انداز تھا۔

کزنز میں ایک سنبل ہی تھی جو اسے پسند تھی ایک تو سنبل کا اخلاق اور دوسرا اس کا رنگ  
روپ شکل صورت سے ماورا ہو کر سوچنا جب کہ اس کی باقی کزنز تو صرف شکل صورت کو ہی  
فوقیت دیتی تھیں۔

سنبل کا رنگ بھی عینا جیسا ہی تھا اور ان دونوں نے گندمی رنگت اپنے اپنے بابا سے چرائی  
تھی۔ جب کہ ضیغم کا سرخ و سفید رنگ اماں سائیں پر گیا تھا۔

"لا ہی رہی تھی پر تمہاری تائی سائیں نے دیکھ لیا، کل پکا کھلاؤں گی۔"



پہلے تو اس کے نخرے دکھانے پر مہنویں اچکائی اور پھر صلاح جو انداز اپنائے کل کا لارا لگایا۔

"پکا؟"

اس نے یقین دہانی چاہی اور سنبلنے جھٹ سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"ہاں پکا! اب بتاؤ نا جلدی سے، سب کچھ بتانا ٹھیک ہے۔"

وہ تیزی سے بولی تھی، اب تو تجسس بھی آخری سلج پر پہنچ چکا تھا۔

اور پھر عینا اسے سب بتاتی چلی گئی، کیسے وہ یونی میں ملے پھر کیسے ضیغم نے اس کی ہر جگہ مدد کی، اپنی دوستوں کے بارے میں تو وہ پہلے ہی سنبل کو بتا چکی تھی۔ لیکن ضیغم کے بارے میں نہ کبھی فون پر بات ہوئی اور نہ ہی حیدر آباد آنے کے بعد یہ ذکر چھیڑا گیا۔ ضیغم کو سنبل بھائی جان کہہ کر پکارتی تھی اور باقی سب گھر والے اس کی غیر موجودگی میں پیار سے ضئی کہتے تھے یہ نام بھی بچپن میں عینا کا ہی دیا ہوا تھا جب وہ اسے ضئی لالا کہتی تھی۔

اور ضئی لالا تو اسے بچپن سے ہی پسند نہیں تھے، خود میں رہنے والا گھمنڈی لڑکا، تبھی اس کے بارے میں خود سے پوچھنے کی غلطی بھی عینا نے نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عینا پہلے پہچان ہی نہیں پائی ضئی لالا، جسے وہ گھمنڈی لڑکا تصور کرتی تھی، وہی اس کا ضیغم دوست ہے۔

"او! تو تم اور بھائی جان دوست ہو۔"

آنکھیں چھوٹی کیے، لبوں کو آپس میں جوڑے اور انہیں دائیں بائیں ہلاتے، تمام قصے سننے کے بعد سنبل کی پرسوج آواز برآمد ہوئی تھی۔

عینا نے صرف ہاں میں سر ہلا دیا۔

"گڈ! مطلب صرف دوست ہو؟ اور کچھ نہیں؟" انداز ویسا ہی تھا، اب کی بار وہ ساتھ میں جانچ بھی رہی تھی۔

عینا باخوبی اس کی الجھن سمجھتی تھی، اب اتنی سمجھ تو اس میں آ ہی گئی تھی۔ اس کے جواب میں دھیرے سے ہاں میں ہی سر ہلا دیا جو کہ سچ بھی تھا۔

"کچھ نہیں ہے تو کیا ہوا میں کس لیے ہوں، شادی سے پہلے کچھ نہ کچھ فیلنگز ڈال ہی دوں گی۔" مسکرا کر دیکھتی، آنکھوں میں نئے مشن کی شرارت لیے وہ دل میں بولی تھی۔ جس کی عینا کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔

"او اچھا!۔"

میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی، وہ کیا ہے نا کہ میری اور سرد، میرا منگیترا جو اس دن تم لوگوں سے ملنے بھی آیا تھا، ہاں وہی!

ہماری دوستی پورے خاندان میں مشہور تھی، اور پھر پتہ ہی نہیں چلا کب اس کی طرف سے دوستی پیار میں بدلی اور رشتہ آگیا اور اب لگے سال شادی بھی ہونے والی ہے۔  
مجھے لگا شاید تم لوگ بھی۔۔۔۔۔

لیکن چلو خیر ہے، ہوتا ہے۔"

بڑی چالاک سے اپنے دوستی اور پھر منگنی کا قصہ سناتی وہ عینا کے چہرے پر آتے اتار چڑھاؤ کی جھلک دیکھ رہی تھی۔

"ویسے مجھے لگتا ہے کہ دوست آپس میں شادی کریں تو فیوچر میں بہت فائدہ ہوتا ہے وہ پہلے

سے ہی آپ کو سمجھتا ہے، لائک ڈس لائکس کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمہارا خیال ہے؟"

وہ دونوں لیٹی ہوئی تھیں، کہ سنبل نے پھر سے جان بوجھ کر وہی موضوع چھیر دیا اور یہاں عینا کیا جواب دیتی، آنکھیں زور سے میچ کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔"

اور چادر کو منہ پر ڈال دیا۔

"سو جانا، پہلے میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔

تم بھائی جان کو ضیغم بھائی کیوں کہتی ہو؟"

چادر کو چہرے پر سے سرکاتے سنبل نے بھائی پر زور دیتے بھول پن کی خاصی اچھی اداکاری کی تھی۔

عینا نے جھٹ سے آنکھیں کھولے خود پر آدھی جھکی سنبل کو دیکھا جو جواب کے انتظار میں آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

"تو پھر کیا کہوں؟"

آگے بھی عینا تھی جو خود کافی بھولی تھی۔

"ارے دوست ہیں تو دوستوں کی طرح ٹریٹ کرو، نام سے بلاو اب جیسے میں سرمد کو شروع سے سرمد ہی بلاتی آرہی ہوں۔ بعد میں کوئی پرالیم نہیں ہوگی نا۔"

عینا کا سوال کرنا اسی کے گلے پڑ گیا تھا، اور سنبل پھر سے اسی موضوع پر آگئی تھی جسے عینا فلحال کے لیے نظر انداز کر دینا چاہتی تھی۔

اور اگر ضیغم کو اس بات کا اندازہ ہوتا کہ اس کی بہن اس کی محبت، کے دل میں اس کے لیے محبت جیسے جزبات پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے تو شاید نہیں یقیناً وہ اس کی تمام مانگوں کی لسٹ خوشی خوشی پوری کر دیتا۔

\*\*\*\*\*

"تم سب نے تو مجھے سچی کانکما سمجھ لیا ہے، آج میں بنا کر دکھاتی ہوں روٹیاں کہ بنتی کیسی ہیں۔ کوئی ضرورت ہی نہیں ہے میری مدد کے لیے آنے کی کر لوں گی میں سب کچھ خود۔۔۔ بہت شکریہ تم سب کا۔"

ابھی تازہ تازہ اماں سے بے عزتی کروا کر وہ پکے عزم کے ساتھ کچن میں داخل ہوئی تھی اور پھر بھا بھی کو بھی وہاں سے جانے کا کہہ دیا۔

کل ہی بھا بھی نے اسے روٹی بنانی سکھائی تھی، اس وقت تو سب آسان لگ رہا تھا لیکن اپنے سامنے گندھے آٹے کو دیکھ کر اب اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے روٹی بنائی جائے۔ تبھی تیز تیز بڑبڑاتی جھنجھلاہٹ بھی نکال رہی تھی۔

جیسے تیسے کر کے پیڑا بنایا اور پھر دنیا میں کسی ملک کے نقشے کے برابر روٹی گرم توے پر ڈال ہی دی۔

اور یہاں روٹی کا نقشہ بنا دیکھ کر جہاں اس کا دل برا ہوا تھا، وہیں ایک روٹی تو بنی، والی خوشی بھی محسوس ہوئی تھی۔

ماتھے پر آٹے پسینے کی بوندوں کو آٹا لگے ہاتھوں سے صاف کرتی روٹی کے پکنے کے انتظار میں تھی، اس سے پہلے کہ ایک حصہ جل کر کوئلہ ہو جاتا، اسے خیال آ ہی گیا کہ توے پر پڑے پڑے روٹی نہیں پکے گی بلکہ اسے پلٹنا بھی ضروری ہے، تبھی چمٹے کی تلاش میں نظریں گھمائیں، پر وہ سامنے ہوتا تو ملتا۔

پہلے چمٹے کی تلاش میں گرم تھی، اوپر سے روٹی کی پریشانی الگ، گرمی نے الگ بے حال کیا تھا اور اب کاؤنٹر پر پڑا فون بج اٹھا تھا۔ ایک ساتھ اتنے کاموں سے تنگ آتی پاؤں پٹختا تھا۔

"کیا مصیبت ہے میں نہیں بنا رہی روٹی۔"

چولہا بند کرتی فون اٹھاتی، آدھی جلی روٹی کو توے پر ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑتی دھپ دھپ قدم اٹھاتی، بڑبڑاتی ہوئے اماں کے سامنے سے گزرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ بنا کر کھلائے گی ہمیں روٹی، اس نے بنائی اور ہم نے کھائی۔

جا شاباش دیکھ آ کیا ستیاناس کر کے آئی ہے۔"

اماں نے بھی اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں اونچا سناتے ہوئے بھا بھی کو بھیجا تھا۔

اور بھا بھی کمر پر ہاتھ رکھے پھیلے کچن کو دیکھ رہی تھیں۔ جانجا آٹے کی گرد پھیلی ہوئی۔ برتن الٹ پلٹ ہوئے پڑے تھے اور روٹی کے نام پر جلی ہوئی ٹھنڈی ٹھار پاپڑ والی روٹی توے پر پڑی تھی۔

"ہیلو!"

کمرے میں جاتے تک فون ایک بار بج کر خاموش بھی ہو گیا تھا اور اب دوبارہ بجنے لگا تھا۔  
سکرین پر نام دیکھ کر دل تو ناچا فون اٹھانے کا آخر کو اس شخص کی وجہ سے آج یہ مصیبت اس کے گلے پڑی تھی۔، لیکن یہ نکاح والی مجبوری بھی تھی، تبھی فون اٹھانا پڑا۔

"کیسی ہو؟"

وہ تو بڑے آرام سے بیٹھا، فرصت سے بات کر رہا تھا۔  
اور یہاں سنگار میز کے شیشے میں اپنا عکس دیکھتی صدمے بھرے الفاظ منہ سے پھسلے تھے۔

"بہت بری۔"

بال اجڑے ہوئے تھے تو چہرے پر ہر جگہ آٹا لگا تھا، اوپر سے لگتا تھا پسینے نے آٹے کو جلد کے اندر جذب کر دیا ہو۔

"میں تو نہیں مانتا، میری ہیر تو بہت اچھی ہے۔"  
صدمے بھری آواز پر شہریار عالم ہنستا بہت پیار سے بولا تھا۔

"اچھی تھی۔ بالکل تھی۔ لیکن آپ سے نکاح سے پہلے، اب تو زندگی عذاب ہو گئی ہے۔"  
اور یہاں ہیر پھٹ پڑی تھی، شہریار عالم تو اس کی جھنجھلائی آواز پر ہی حلق تر کرنے لگا تھا۔  
وہ ان میں سے تھا جس کے لیے یہ رشتہ بہت اہم تھا، اس کی محبت بہت اہم تھی۔ اور محبت کی ناراضی تو وہ مرتے دم تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہوتے ہیں نا ایسے بھی جن کے لیے اس محبت کی خوشی سب سے مقدم ہوتی ہے۔



"کیا ہوا ہے؟ پریشان ہو؟"

اس کے لفظوں پر غور دیا ہی نہیں تھا، یا پھر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اور یہی بہتر تھا کیونکہ لفظ تھے بہت تلخ پر لہجہ ایسا تھا کہ لفظوں کی تلخی کو بھی تلخ نہیں لگنے دیا تھا، تبھی وہ سہن کر گیا۔

"شہریار!"

اور یہاں وہ روبانسی ہوتی اسے پکار گئی۔

"ہاں؟"

وہ تو تھا بھی اسے سننے کے لیے، فوراً سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

"مجھ سے نہیں بنتی روٹی، پلیز مجھے روٹی نہیں بنانی۔ آپ اماں کو کہہ دو نا کہ آپ کو مجھ سے

روٹیاں نہیں بنوانی پلیز پلیز۔ شہریار!

مجھ سے نہیں ہوتے کچن کے کام میرے ہاتھوں میں درد ہوتا ہے۔"

اور وہ صدا کی ڈرامہ باز اپنے ہمدرد کو پا کر بھرپور ہمدردی بٹورنے کے جتن کر رہی تھی۔

اور اب شہریار نے لہجے سے زیادہ لفظوں پر دھیان دینا ضروری سمجھا تھا۔ لہجہ تو ایسا تھا کہ فوراً سے اس کی مان لے لیکن لفظوں نے تو اس کے آرائوں کا خون کیا تھا۔ وہ تو سوچ بیٹھا تھا کہ ہیر کے ہاتھ کے بنے کھانے کھائے گا، آخر کو اس کی ہیر، ہیروئن سے کم تو نہ تھی پر وہ بھول گیا تھا وہ صرف دھننے میں ہی ہیروئن تھی۔

"شہریار!

آپ سن رہے ہیں۔"

وہی دل فربہ لہجہ اور یہاں شہریار بار مان گیا۔

"ہاں۔ کوئی بات نہیں اگر کچن کا کام نہیں ہوتا تو ویسے بھی کک ہے نا یہاں تمہیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے ٹھیک ہے؟  
میں آنٹی سے بات کرتا ہوں۔"

دل کے کس کونے کی مان کر اس نے یہ کھٹور منظوری دی تھی وہی جانتا تھا۔

اور ہیر تو اس کے جھٹ سے مان جانے پر خود کی اداکاری کو شاباشی دینے لگی تھی۔

شہریار کو سراسر اپنا گھاٹا کرنے کی عادت تھی وہ مانتا تھا پر یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا، کچھ دن سے جو سرد جنگ ہیر کی طرف سے کھڑی کی گئی تھی اب وہ ختم ہو چکی تھی یعنی کہیں نہ کہیں شہریار عالم کا بھی فائدہ نکل ہی آیا تھا۔

\*\*\*\*\*

"اگر اس دن آپ میری بات مان لیتے، تو شاید آپ کو اسی دن خوشی مل جاتی۔ اور دو دن مجھے بھی آپ کا لٹکا منہ دیکھنے کو نہ ملتا۔"

شام کا وقت تھا، وہ بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا ہی تھا، کہ سنبل اسی کے انتظار میں تھی تو دروازے پر ہی دھر لیا تھا۔

"کون سی خوشی اور کون سی بات؟"

قمیض کے بازو کہنیوں تک فولڈ کرتا وہ سرسری نظر ڈال کر آگے بڑا۔

پیچھے سنبل نے اپنے بھائی کی اداکاری پر ستائشی انداز میں مہنویں نچائیں اور اسی کے پیچھے چل دی۔

شام کی چائے کا اہتمام آج خاص حویلی کے لان میں رکھا گیا تھا، سب ہی وہاں موجود تھے عینا بھی روز کی طرح اپنی تائی سائیں کے ساتھ مل کر ان سے چھوٹے موٹے کام سیکھ رہی تھی، جیسے کباب فرائے کرنا چائے بنانا اور آج کی چائے بھی اس نے، ان کے ساتھ مل کر ہی بنائی تھی، تبھی وہ ان کے ساتھ ہی لان میں مصروف تھی۔

اور یہاں سنبل کو موقع ملا تھا، اپنے بھائی جان کی ٹانگ کھینچنے کا، جسے وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں عینا، آپ کی دوست ہے۔"

اپنے بھائی جیسا ہی سرسری انداز اپنائے وہ اس کے ساتھ چلتی اسے ہی دیکھ رہی تھی، لہجہ چاہے سرسری تھا پر نظریں سرسری نہیں تھیں۔

ضیغ کے قدموں کو بریک لگا تھا، یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عینا سنبل کو بتا دے گی یا شاید خوشی میں وہ اس پہلو کو سوچ ہی نہ سکا۔

"تم سے کس نے کہا؟"

انداز ایسا تھا کہ یہ تو جھوٹ ہے۔

"آپ کی دوست نے!"

دوست پر زور دیتی آج وہ بخشنے کے موڈ میں تو نہیں تھی۔

"تمہیں کیا چاہیے؟"

وہ رک کر اس کے سامنے آیا تھا اور اب دو ٹوک بات کرنے کا وقت تھا، تبھی صاف مدعے پر آنا چاہا۔

"آفر وہی ہے، منہ بند رکھنے کی"۔  
ہاتھ کی دو انگلیوں سے لبوں پر زپ کا اشارہ کرتی پرانی آفریاد دلائی تھی۔  
ضیغم نے گہرا سانس بھرا۔

"منظور ہے، لیکن منہ بند کا مطلب منہ بند"۔

اسی کے انداز میں انگلیوں کو آپس میں ملائے ہونٹوں پر زپ کا اشارہ کرتے تنبیہ کی تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا، سنبل کی زبانی بابا سائیں یا پھر حویلی میں کسی کو بھی معلوم ہو۔ اماں سائیں کو تو اچھے سے جانتا تھا، وہ اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کریں گی لیکن اپنی سنبل جان

کا کیا کرتا۔ وہ ان میں سے تھا جو اپنا امیج نہایت صاف شفاف رکھنا چاہتا تھا۔ اور ضیغم ظفر شاہ اس بات کی بھنک بھی نہیں لگنے دینا چاہتا تھا، پر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سنبل کے کانوں تک آئی بات پوری حویلی کے کان بھی سن سکتے ہیں۔ تبھی اس کا منہ بند کرنا ضروری تھا۔

"ہاں تو منہ بند رکھنے کا کہا ہے، تو منہ ہی بند رکھوں گی نا۔"  
وہ تو کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا پیچھے سنبل بھی اس کی تقلید میں بڑبڑاتی چلی جا رہی تھی۔

\*\*\*\*\*

"ضامن بیٹا! ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے ابھی تک جواب نہیں آیا۔"  
وہ لاونج میں بیٹھا موبائل پر مصروف تھا، جب اسے اپنے ساتھ بیٹھی صلہ بیگم کی فکر مند آواز آئی۔

"کیسا جواب امی؟"  
وہ ایک نظر انہیں دیکھ پر پھر مصروف ہو گیا۔

"ارے تمہارے رشتے کا جواب، جلدی سے جواب دیں تاکہ اسی دسمبر ہی تمہاری شادی کی تاریخ رکھوں۔ ابھی تو یاسر کو بھی بلانا ہے شادی پر، جتنی جلدی شادی رکھوں گی اتنی جلدی ہی وہ آئے گا نا۔"

صلہ بیگم تو دور کا سوچے بیٹھی تھیں۔ جب کہ ضامن نے ان کی سوچ پر ستائشی انداز میں انہیں دیکھا۔

"او تو میری شادی کی جلدی اس لیے ہے کہ آپ کو یاسر بھائی سے ملنا ہے۔ وہی تو میں سوچوں بیٹھے بیٹھائے آپ کو میری شادی کی سوچھی کیسے؟"

موبائل کی مصروفیت کچھ دیر کے لیے ملتوی کرتا وہ گھوم کر ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تو اور کیا، اب تم پوچھ کر بتاؤ تائشہ بیٹی سے کہ کب تک جواب دینے والے ہیں۔ چلو شاباش فون ملاو اسے۔"

ان کی نئی مانگ پر ضامن نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"میں!"

میں فون کروں؟"

انگلی سے خود کا سینہ بجاتا وہ زور دے کر بولا تھا۔

"تو کیا میں کروں؟ دو بار تو مسرت بہن کو کال کر چکی ہوں۔ وہ تو یہی کہہ رہی تھیں کہ بس کچھ دنوں میں آپ کو جواب دیتی ہوں۔ لیکن ابھی تک جواب نہیں آیا۔"

"تو آپ تیسری بار بھی کر لیں نا کال۔"

ملبہ ان کے سر ڈالتا وہ خود کو اس مصیبت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔ اگر فرض کرو وہ پوچھ بھی لیتا تو اس نے کہاں، ہاں میں ہی جواب دینا تھا۔ اور اب اس میں مزید نہ سننے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

"ہاں! سب میں ہی کروں۔ شادی والے دن بھی قبول ہے میں ہی بول دوں گی۔" چپت اس کے سر پر لگاتیں وہ چڑ کر جانے لگیں کہ ضامن کا فون بج اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھاتا کال کاٹی جا چکی تھی۔

"کس کا فون ہے؟ اٹھا کر تو دیکھتے کہیں یا سر تو نہیں۔"



خیر گھر کے دون کی رنگ ہو یا کسی کے بھی موبائل کی رنگ بچے ان کے ذہن میں صرف یاسر کا خیال ہی گونجتا تھا۔

"نہیں! کوئی انجان نمبر ہے۔"

اس نمبر سے پہلے بھی ایک دو مس کالز آچکی تھیں پر اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اب پرسوچ سا موبائل کی سکرین پر آئے نمبر کو دیکھ کر سیو کر لیا تھا۔ ارادہ نمبر کی انفارمیشن نکلوانے کا تھا۔

"اچھا!"

یاد آیا تمہارے ابو گھر پر نہیں ہیں، تو تم لے جاؤ گے مال یا چلی بھی میں خود ہی جاؤں۔"

وہ جو موبائل کی رنگ پر کی تھیں اب اسے طنز کے ساتھ کام کہتی اس کی طرف سے جواب کی منتظر تھی۔

"ارے! امی آپ تو ناراض ہی ہو جاتی ہیں، میں نہیں لے جاؤں گا تو کون لے جائے گا۔ آپ تیار ہو کر آئیں میں ویٹ کر رہا ہوں۔"

نمبر کی فکر کو فی الوقت پرے رکھتے، اور اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کا ارادہ کل پر ملتوی کرتا، بشاشت سے گویا ہوا تھا کہ صلہ بیگم بھی مسکراتیں کمرے میں اپنا بیگ لینے چلی گئیں۔

\*\*\*\*\*

ایک حسین شام حویلی کے لان میں اتری تھی، ہری ہری گھاس، کیاریوں میں کھلے کھلے پھولوں سے اٹھتی مہک اس پر دھیمے دھیمے چلتی مہکتی ہوئی ہوا۔  
اور اس خوبصورت سے منظر کو مکمل سب گھر والوں کی موجودگی نے کیا تھا۔  
لکڑی کی بنی کرسیاں جس پر رنگ برنگ کی پھولکاری کی گئی تھی اس پر تمام بڑے چھوٹے  
براجمان تھے، درمیان میں ہی میز پر چائے کے ساتھ ساتھ لوازمات بھی رکھے تھے۔ اور سب خوش  
گپیوں میں مصروف تھے۔

عینا اپنے تایا جان کی گریٹا سائیں، ان کے ساتھ ہی بیٹی اپنے ہاتھ سے فرائی کیے کباب ان کی  
پلیٹ میں پروس رہی تھی اور خود بھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔  
ضیغم بھی گائے بگائے اس پر نظر ڈال لیتا اور گھر والوں کا خیال کرتے بخش صاحب کے  
ساتھ ہی بیٹھا باتوں میں مشغول رہا۔

"گریا سائیں! ضئی سے مل لیا ہوگا آپ نے؟"

خالی کپ کو میز کی سطح پر رکھتے وہ بلند آواز میں بولے تھے، جہاں عینا نے حلق تر کیا تھا وہیں ضیغم نے بھی ایک بھرپور نظر عینا پر ڈال کر نظریں بابا سائیں پر مرتکز کر لیں۔

کل سنبل کی دوست، دوست کی تان نے اس کا سارا سکھ چین ہی چھین لیا تھا اب بھی ضیغم کی موجودگی میں وہ بہت مشکل سے بیٹھی تھی۔ اس کی کہی باتیں سر چڑھ کر بول رہی تھیں، کچھ خود دل بھی بے ایمانی پر اترتا تھا، اور زیادہ باتھ اس کی دوستوں اور پھر سنبل کا بھی تھا۔ لیکن جب ضیغم کی طرف سے کچھ تھا ہی نہیں تو وہ بھی اپنے خیالات کی نفی کرنے کے در پر ہی تھی۔

"بابا سائیں!

آپ کی گریا سائیں کی ملاقات میں نے کل ہی اس کے ضئی لالا سے کروا دی تھی۔ کیوں بھائی جان؟"

اس سے پہلے عینا اقرار کرتی، سنبل نے بولنا ضروری سمجھا تھا بولتے بولتے ضئی لالا پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا جسے کوئی اور سمجھے نہ سمجھے ضیغم ظفر شاہ باخوبی سمجھتا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے سنبل جان، ہماری گڑیا سائیں یہاں بور تو نہیں ہو رہی نا؟"۔  
 نرمی سے مسکراتے سنبل کو جواب دیا اور اس کے بعد عینا کے سر پر شفقت و محبت بھرا ہاتھ  
 پھیرتے انہوں نے استفسار کیا۔

"نہیں، بتایا جان!"

مدہم آواز میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھتی بولی تو گھر کے تمام نفوس کے چہرے  
 پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان میں ضیغم بھی تھا جس نے محبت بھری مسکراہٹ لبوں پر آتے  
 ہی روک لی تھی۔

"ضیغم سائیں، بخش اور ہم ڈیرے پر جارہے ہیں۔ جب فراغت ملے تو رات میں ڈیرے کا چکر  
 ضرور لگانا ہمیں تم سے کچھ ضروری معاملات پر بات کرنی ہے"۔  
 بخش کو چلنے کا اشارہ کرتے وہ کھڑے ہوئے تھے۔

"ابھی بھی فارغ ہوں، آپ کہیں تو آپ کے ساتھ آ جاتا ہوں۔ فوراً سے پیشتر کپ کو میز پر  
 رکھتے، وہ تعمیل کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں ابھی تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے، بات چیت کرو تمہاری اماں سائیں بھی ہم سے شکوہ کریں گی کہ تم انہیں وقت نہیں دیتے۔  
رات میں ملتے ہیں۔"

وہ خود بھی چاہتے تھے، ضیغم عینا کو دیکھ لے تاکہ بعد میں کوئی شکوہ شکایت جنم نہ لے۔ تبھی بات کو گول مول کرتے اسے رات میں آنے کا کہا تھا۔  
وہ بھی سمجھتا، تابعداری سے سر ہلا کر واپس بیٹھ گیا۔

بابا سائیں اور رحیم نخش صاحب کے جانے کے بعد وہ عینا کی طرف ہی دیکھنے لگا جو بظاہر سنبل کی کسی بات پر سر ہلا رہی تھی لیکن ضیغم کی موجدگی محسوس کرتے انگلیاں چٹخا کر رہ گئی۔ اس کا یہ گھبرایا سا انداز ہمیشہ ضیغم کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا، جیسے اب مسکراہٹ کو روکنے کی خاطر اس نے کپ لبوں سے لگا لیا تھا۔ لیکن نظریں پھر بھی نہیں ہٹائی تھیں۔

\*\*\*\*\*

ہاتھ میں شاپنگ بیگ پکڑے وہ ایک دکان سے نکل کر مال کے سیکنڈ فلور پر جانے لگی تھی کہ ایک طرف لگے جھمکوں کے اسٹال پر نظر ٹھٹک گئی۔

یہ نظریں تو تب سے ٹھٹکنے لگی تھیں، جب سے اپنے ہر شوق کو خود ساختہ تسکین کی خاطر کچلا گیا تھا، اور پھر بے دردی سے نظروں کو پھیر لیا کرتی تھی لیکن آج نہ نظریں پھیریں تھیں اور نہ جاگی خواہش کو ظالمانہ طریقے سے کچلا تھا بلکہ قدم خود ہی اسٹال کی طرف بڑھ گئے۔

ہر جھمکا دوسرے سے خوبصورت لگتا تھا۔ وہاں نہ صرف جھمکے گلے میں پہننے والی چین سے لے کر پاؤں میں پہننے والی پازیب تک موجود تھی اور ہر چیز اس کی توجہ کی طلب گار تھی۔ اور وہ بھی مکمل توجہ دے رہی تھی۔ ہاتھوں سے ان کی خوبصورتی کو چھو رہی تھی۔ پازیب کے گھنگھروں پر انگلی سے بجاتی تو ساز بج اٹھتا، اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کر جاتی۔ پسند تو چھوٹی بالیوں سے لے کر بڑے بڑے جھمکے بھی آئے تھے، لیکن وہ لینے کی روادار نہیں تھی۔ اب بھی ایک جھجھک تھی ان چیزوں کو پہننے کی، جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ اچھا لگے گا تم پر۔"

وہ جو صلہ بیگم کو مال لے کر آیا تھا اور خود بھی شاپنگ کا ارادہ رکھتا جینٹس پورشن میں جانے لگا تھا، اچانک سے نظر مڑ گئی۔ ہلکے سبز رنگ کے سوٹ میں شانوں پر سفید چادر پھیلائے کندھوں سے نیچے آتے بالوں والی لڑکی اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ وہ نظریں پھیر لیتا اگر دھیان

اس کے چھوٹے قد پر نہ جاتے، اسے گمان گزرا کہ یہ تالشہ ہی ہے۔ لیکن اب بال وہ کندھے سے اوپر تک باب کٹ نہ تھے۔

اسی بات کی تصدیق کے غرض سے وہ آگے بڑھا اور پھر پل بھر کو ساکت ہو گیا، وہ تالشہ ہی تھی بڑے ہوتے بالوں کے ساتھ وہ واقع ہی لڑکی لگ رہی تھی۔ اب تو حلیہ بھی یکسر مختلف تھا۔ لباس بالکل لڑکیوں والا ہی تھا، اس پر سفید چادر اور لمبے بال، کمی تھی تو بناؤ سنگھار کی۔۔۔

اس واقع کو دو مہینے ہونے کو آئے تھے، اور شاید تب سے ہی اس نے بال نہیں کٹوائیں ہونگے، یہ ضامن کا قیاس تھا جو بالکل درست تھا۔

کچھ پل اسے دیکھتے گزر گئے جو ارد گرد سے بے خبر جھمکوں کو چھونے میں مصروف تھے۔ ہر جھمکے کو محبت و حسرت سے دیکھ رہی تھی کہ ضامن اس کے ساتھ کھڑا ہوتے، اس کی توجہ اپنی جانب کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

اپنے پاس سے آتی جانی مانی آواز پر وہ بدک کر کچھ فاصلے پر ہوئی تھی۔

اور پھر شرمندگی سے نظریں مال میں گھمانے لگی تھی، آپا اور امی بھی اس کے ساتھ ہی آئی تھیں انہی کہ خیال سے وہ نظریں گھما گئی۔

جب کہ کچھ شرمندگی جھمکوں کے اسٹال پر کھڑے ہونے سے بھی ہو رہی تھی۔

"کیا سوچ رہا ہوگا۔"

کن اکھیوں سے ضامن کو دیکھتے وہ جانے کو پلٹی تھی۔

"سنو!"

کچھ خریدو گی نہیں۔"

اسے یوں جاتا دیکھ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"نہیں! مجھے یہ سب پسند نہیں ہیں۔"

نجانے کیسی جھجھک تھی، کہ وہ صاف انکار کر گئی۔ وہ تنہائی میں بھی جب آپا کی بالیاں پہنتی تو جھجھک تب بھی اس پر نمایاں ہوتی تھی، اب تو سامنے ضامن تھا۔

جب کہ ضامن اس کے سفید جھوٹ پر بھنویں سکڑ گیا۔

"او!"

ویسے اچھا کیا جو بال بڑھالیے، مجھے لمبے بالوں والی لڑکیاں ہی پسند ہیں۔"



وہ اسے بھاؤ نہیں دے رہی تھی اور وہ اتنا ہی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔  
اب ایک نئی بحث، تائشہ گہرا سانس بھرتی کی تھی۔

"تو یہ اسلام آباد کیا، پورا پاکستان بھرا پڑا ہے لمبے بالوں والی لڑکیوں سے، خدا کا واسطہ ہے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

تائشہ چُح کر بولی تھی، اور آخر میں صرف ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"ہاں! پر ان سب میں تائشہ وسیم خان صرف تم ہی ہونا۔"

کندھے اچکاتا وہ خود کو ہر طرح کے اختیار سے عاری دکھا رہا تھا۔

تائشہ جواب دیئے بنا ہی آگے بڑھ گئی، معلوم تھا وہ پیچھے آتا رہے گا اور سر کھاتا رہے گا پر ایسا ہوا نہیں۔ وہ وہیں کھڑا اس کے قدم اٹھانے پر بالوں کا جھولنا دیکھتا رہا اور پھر قدم پیچھے کو اٹھائے۔

کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد یہاں تک کہ وہ سیکنڈ فلور پر بھی پہنچ گئی لیکن ضامن نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی، تبھی اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ پر پیچھے لوگوں کی بھیڑ تو تھی پر

ضامن نہیں تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا، کندھے ڈھیلے چھوڑتی وہ گردن موڑ کر سامنے ہوئی تو سامنے ہی وہ مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔

یک دم سے اسے سامنے دیکھ کر پہلے تو سانس رکا تھا، پھر جب بحال ہوا تو ایک بار پیچھے دیکھ کر پھر سامنے دیکھا تھا، وہ اب بھی مسکراتا ہوا اسے ہی تک رہا تھا۔

"اچھا لگا، تمہارا مجھے دیکھنے کے لیے مڑ کر دیکھنا۔"

بڑے دل فریب انداز میں اس کی چند لمحے قبل کی بے اختیاری کا بتلاتا وہ تائشہ کو شرمندہ کر گیا۔

"ضامن بیٹا!"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی چھنیپ مٹانے کو کچھ کہتی، مسرت بیگم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی، جہاں ضامن نے دائیں طرف گردن گھمائی تھیں وہیں تائشہ کا سانس بھی خشک ہونے لگا تھا۔ یعنی ایک نئی عدالت لگنا تھی۔

"السلام علیکم! آنٹی۔"

مسرت بیگم بھی اسے پہچان گئی تھیں، اور ضامن بھی انہیں پہچان گیا تھا آپا بھی مسکراتی ہوئی دونوں کو ساتھ کھڑے دیکھ رہی تھیں۔

"کیسے ہو بیٹا؟ امی کیسی ہیں اور یہاں کیسے؟"

ایک ساتھ کئی سوال کیے تھے، اور پھر ایک نظر تائشہ کو دیکھا تھا، جو خود ان سب سے لا تعلق ظاہر کر رہی تھی۔

"اللہ کا شکر بالکل ٹھیک، امی بھی ٹھیک ہیں۔ انفیکٹ امی کے ساتھ ہی شلپنگ کے لیے آیا تھا۔ اور یہ تائشہ کے ہاتھ سے شلپنگ بیگ چھوٹ گیا تھا وہی دینے آیا تھا۔"۔  
چھوٹے سائز کا شلپنگ بیگ آگے کرتے زبردستی تائشہ کو پکڑایا تھا کہ وہ بھی سمجھ نہ پائی۔ اب نہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی ورنہ امی اور آپا یقیناً کچھ غلط سوچ بیٹھتیں۔ تبھی مزاحمت کیے بغیر اسے تھام لیا۔

"او اچھا!"

مسرت بیگم سمجھتی سر ہلا گئیں۔

"اچھا آئی چلتا ہوں اب۔"

ان کے آگے احتراماً جھکتا ان سے سر پر پیار لیتا وہ تائشہ کو ایک نظر دیکھ کر روانہ ہو گیا۔

"ماشاء اللہ بہت تعمیز دار بچہ ہے۔"

"بالکل! آپ نے دیکھا دونوں ساتھ میں کھڑے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔"

"ہاں ماشاء اللہ! بس تائشہ کو تھوڑی عقل آجائے تو زندگی سنور جائے گی اس کی۔"

تائشہ بھی سنجیدہ صورت بنائی آگے چلنے لگیں پیچھے امی اور آپا کی باتیں بھی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں، جن پر وہ دھیان نہیں دینا چاہتی تھی پر دھیان تھا کہ خود بخود بٹ رہا تھا۔

\*\*\*\*\*

وسیع میدان کے گرد، پکی اینٹوں کی چار دیواری کھڑی تھی۔ ایک طرف تین کمرے ایک ساتھ تعمیر کیے گئے تھے جب کہ اس کے سامنے ہی مٹی کا میدان تھا، جس کے بیچ و بیچ چارپائیاں رکھی ہوئی تھیں، ان پر ہاتھ سے کڑھائی کیے گاوتکیے موجود تھے۔

رات کے آٹھ بجے تھے، اور چار سوں سناٹا تھا، سوائے جانوروں کی وقفے وقفے سے آتی آوازوں کے۔

بجلی کے بلب کی روشنی میں تین نفوس الگ الگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔

"ہاں تو ضیغم سائیں، کل شہر جانے کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔"  
مزارعے سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ گیٹ پر گن مین موجود تھے اور ظفر شاہ، بخش شاہ  
کی موجودگی میں ضیغم سے مخاطب ہوئے تھے۔

اور ضیغم بخش شاہ کی موجودگی کا خیال کرتا خاموش رہا۔

"ضیغم سائیں کھل کر کہو، آخر کو بخش شاہ کی بیٹی کا مستقبل تمہارے فیصلے سے جڑا ہے۔ تو  
بخش شاہ کی یہاں موجودگی اتنی ہی ضروری ہے جتنی تمہاری یا ہماری۔"  
سجیگی سے رحیم صاحب کی موجودگی کے بابت بتاتے وہ اسے بات شروع کرنے کا عندیہ دے  
چکے تھے۔

"بابا سائیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے شہر میں بزنس کرنے کی اجازت دے دیں۔"  
باپ اور چاچا کو ایک نظر دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"ہم اس کی وجہ جان سکتے ہیں؟"

بابا سائیں سنجیگی سے سوال کیا۔

جب کہ رحیم صاحب خاموش رہے، کیونکہ انہیں ظفر شاہ پر مکمل بھروسہ تھا، وہ جانتے تھے ان کی بیٹی کے مستقبل کی فکر انہیں بھی اتنی ہی ہوگی جتنی رحیم صاحب کو خود تھی۔ تبھی وہ اس پہلو سے بے فکر تھے۔

"وجہ آپ جانتے ہیں، میرا یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اتنے پسماندہ علاقے میں مارکیٹنگ کا بزنس کھولنا نری بے وقوفی ہے جب کہ اسلام آباد میں مواقع بھی زیادہ ہیں۔ اور دوسری بڑی وجہ یہاں کا ماحول ہے، جہاں میرے لیے اڈجسٹ ہونا مشکل ہے۔" اپنے تمہیں وجوہات وہ بتا چکا تھا۔ لیکن ان وجوہات نے ظفر شاہ کو تلخ ہنسی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

"بہت خوب ضیغ سائیں۔ کل کی اولاد ہمیں بتا رہی ہے کہ ان کا اپنے والدین کے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سن رہے ہو بخش سائیں۔"

رنجیدہ وہ ہوئے تھے، لفظوں میں رنج تھا پر لہجہ تلخ تھا۔ رحیم صاحب نے خاموشی نہ توڑی بس نظریں پھیر لیں۔

اور ضیغ کو اپنے ادا کیے لفظوں پر افسوس ہوا۔

"میں معذرت خواہ ہوں، بابا سائیں۔ پر میرا ہرگز وہ مطلب نہیں تھا۔"

فوراً سے بیشتر وہ معذرت کر گیا تھا۔

ظفر شاہ نے سر ہلا دیا، چہرے پر سخت تاثرات اب بھی باقی تھے۔

"تمہارا جو بھی مطلب تھا، ضیغم سائیں ہم سمجھ چکے ہیں۔"

اب ہم تمہیں کچھ سمجھانا چاہتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ ہماری بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔"

وہ بول کر رکے تھے، ان کے لہجے پر ضیغم نے گہری سانس لی اور احتراماً سر جھکا دیا۔

"ہم شروع سے جانتے ہیں تمہیں مزارعوں کا، گاؤں کے لوگوں کا، تمہارے آگے پیچھے گھومنا پسند نہیں رہا۔ لیکن تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہ تمہاری چاپلوسی کرتے ہیں یا ہمارے ڈر کی وجہ سے ہماری، تمہاری یا حویلی کے کسی بھی فرد کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ سوچ تمہاری سراسر غلط ہے۔ اس میں کچھ غلطی ہماری بھی ہے، اگر بچپن میں ہی تمہاری گاؤں سے دور رہنے والی ضد کو نہ مانتے تو آج تم یوں ہمارے ساتھ بیٹھے، ہمیں ہی یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے کہ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

وہ کہہ کر رکے تھے تو ضیغم نے بھی کچھ کہنے کو لب و لہجہ سے پہلے ہی وہ پھر سے سلسلہ کلام جوڑ چکے تھے۔

"وہ والہانہ پن، وہ محبت، تابعداری، عزت و تقریم یہ سب تمہیں اس گاؤں کے شاہ سائیں یعنی اس گدی کی وجہ سے ملتی ہے۔ وارث ہو تم اس گاؤں کے، ہمیں بھی یہ سب وراثت میں ملا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو؟ گاؤں والے تمہیں اتنی عزت و تقریم صرف اس وجہ سے نہیں دیتے کہ تم گاؤں کے وڈیرے کے بیٹے ہو، وہ اس لیے بھی تمہیں چاہتے ہیں کہ انہیں تم سے امید ہے، تم ان کے لیے امید کی کرن ہو، ان کے نئے وڈیرے جو ان کے اس پسماندہ علاقے کو پسماندگی سے نکال کر ترقی کی طرف لے جائے گا۔ تمہاری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار اتنا مجھے یا تمہاری اماں سائیں کو نہیں تھا جتنا بے صبری سے انتظار ان سب نے کیا ہے۔ جن کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ کیا فائدہ؟

تو ضیغم سائیں، ہر مسئلے کا حل فرار نہیں ہے۔ ہر بار زاد راہ اپنانا درست نہیں ہے۔ ٹھیک ہے مانتا ہوں اس پسماندہ علاقے میں تم جیسے پڑھے لکھے شخص کے رہنے کا فائدہ نہیں ہے۔ لیکن کیا تم جیسا پڑھا لکھا شخص اس پستی میں ڈوبے علاقے کو فائدہ مند نہیں بنا سکتا تو تمہاری اس پڑھائی کا کیا فائدہ؟



کیا فائدہ ضیغم ظفر شاہ؟ کوئی فائدہ نہیں ہے، تو ہم یہی کہیں گے اپنی زندگی کے 15 سال وہاں رہ کر تم نے ضائع کر دیے۔ اور اگر مزید سال یہاں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہ کر ضائع کر دو، تو یہ بھی گھائے کا سودا نہیں ہوگا۔

ان کے سخت اور تلخ الفاظ، ضیغم کو حقیقت کا آئینہ دکھا گئے تھے۔

وہ خود کا سکون ڈھونڈنے والوں میں سے تھا، جہاں خود کو بہتر لگا، وہیں ڈیرا بسا لینے والوں میں سے تھا۔ اور آج جب احساس ہوا تھا کہ اس پر خود کی نہیں بلکہ پورے گاؤں کی ذمہ داری ہے تو سر شرمندگی سے مزید جھک گیا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں پیوست کیے، اور ان پر نظریں لگائے وہ سر جھکائے ان کے لفظوں کی حقیقت کو سن اور سمجھ رہا تھا۔

"ضیغم بیٹا!

میں نے خود زندگی کے کئی سال گھر سے دور گزار دیئے، لیکن اس میں مجھے نقصان کے سوا کچھ نہیں ملا۔ پیسہ کمانے کی دوڑ میں اس قدر آگے نکل گیا کہ جب مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے تھا۔ اسے زندگی کی خوشیوں سے روشناس کروانا چاہیے تھا تب میرے پاس اس کے لیے وقت ہی نہیں تھا اور مجھے اس چیز کا پچھتاوا بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ کاش اپنوں سے دور میں صرف خود کی تسکین کے لیے نہ جاتا تو آج میری عینا بہت مختلف ہوتی۔"

رحیم بخش اب جا کر بولے تھے، نظریں ان کی بھی جھکی ہوئی تھیں جب کہ لہجے میں ملال تھا۔ انہیں یاد آیا تھا جب ظفر شاہ نے انہیں بھی روکنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں بھی ایک راہ دکھائی تھی یہاں کے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کی، لیکن اس وقت وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے لیکن آج انہیں شدت سے ملال نے آگھیرا تھا۔

"اس لیے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ بزنس کے چکر میں اپنی فیملی کو نظر انداز نہ کرنا، جہاں بھی رہو یہ تمہاری چوائس ہے۔ پر ایک بیٹی کے باپ ہونے کی حیثیت سے صرف ایک بات کہوں گا کہ میری بیٹی کو پورے گھر کا پیار اور خیال میسر آنا چاہیے، جس کے لیے وہ بچپن سے ترسی ہے۔"

ضیغم خاموشی سے انہیں بھی سن رہا تھا، وہ بھی صحیح کہہ رہے تھے۔ وہ مانتا تھا، لیکن وہ یہاں رہ کر کرے گا کیا؟ یہی تو وہ کہنا چاہتا تھا۔

"بابا سائیں!

میں آپ کی بات کا احترام کرتا ہوں، اور مجھے احساس ہے کہ گاؤں والوں کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ اگر وڈیرہ ہو کر گاؤں کی کایا پلٹی جاسکتی تو آپ بھی کر سکتے تھے یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ لیکن اس گاؤں

سمیت کئی گاؤں کی اصل دُور ان سیاسی رہنماؤں کے پاس ہے جو چاہیں تو کچھ ہی عرصے میں یہ پسماندگی ختم کر سکتے ہیں اور یہ تو آپ دونوں جانتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں چاہتے۔" کچھ غلط تو ضیغم شاہ بھی نہیں کہہ رہا تھا، رحیم صاحب نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔ جب کہ ظفر شاہ خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔

"میں اپنے آباؤ اجداد کی پگڑی کی لاج رکھنا جانتا ہوں، لیکن اس کے لیے بابا سائیں آپ کو مجھ پر بھروسہ رکھنا ہوگا۔ اور چلو سائیں آپ کو بھی، عینا کی زمہ داری میں بانو بی نبھاؤں گا اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

وہ دونوں سے اجازت مانگ رہا تھا، اب بھی اپنی بات پر ثابت قدم تو تھا لیکن لفظوں کا چناؤ مختلف تھا۔

بابا سائیں اس کا پورا پلان سن کر مسکرائے تھے، انہیں اب ضیغم پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ جس نے اپنی بات تو منوائی ہی تھی بلکہ ان کی بات کی لاج بھی رکھ لی تھی۔

\*\*\*\*\*

اسے گھر آئے کافی وقت ہو چکا تھا، لیکن آپا اور امی نے ضامن والا موضوع نہیں بدلا تھا، وہ بھی خاموش ہی رہی تھی۔ بولتی بھی تو کس نے سننی تھی الثابات بڑھتی چلی جاتی تبھی خاموشی سے کھانا کھا کر انہیں آگے کی پلاننگ کرنے کے لیے چھوڑ کر خود اپنے کمرے میں آئی تھی۔

وہ شاپنگ مکمل کر کے جب گھر لوٹی تھی تو اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ اس بیگ کو تو بھول ہی گئی تھی، اور اب وہ سامنے ہی بیڈ پر باقی خریدی گئی چیزوں کے ساتھ ہی پڑا تھا۔ پہلے تو دماغ نے صاف انکار کیا، اسے کھول کر دیکھنے تک سے، پر یہ تجسس بھی کافی بری شے تھی۔

ناچار اسے شاپنگ بیگ اٹھانا ہی پڑا، جیسے ہی پیکنگ کو ان پیک کیا تھا تو تین مختلف طرز کے جھمکے موجود تھے۔ جنہیں دیکھتے بے خیالی کی کیفیت میں اس کی آنکھیں اور لب بیک وقت مسکرائے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر انہیں نکالا تھا، تینوں خوبصورتی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے کہ نظریں مڑ سی گئیں۔

ایک رنگ برنگ دھاگوں میں قید بالی تھی، تو ایک سنہری رنگ کا درمیانی سائز جھمکا تھا، جسے دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

پھر ایک سلور رنگ کا جھمکا تھا جس کے درمیان میں شیشہ لگا تھا اور تین لڑیاں لٹک رہی تھیں جن میں ستارے پروئے ہوئے تھے۔ ستاروں کو دیکھتے آنکھوں کی چمک بڑھی تھی، قدم خود باخود

سنگھار میز کے آئیے کی طرف بڑھے تھے۔ الگ ہی کیفیت طاری تھی جس کے زیر اثر وہ سلور رنگ کا جھمکہ اپنے کانوں کی زینت بنانے لگی تھی۔ فی الحال کے لیے جھجھک کہیں غائب ہو چکی تھی،

کئی سالوں سے یہ کان کسی بھی قسم کی بالی یا جھمکوں کی آرائش سے محروم رہے تھے تو جھمکا پہننے میں دقت ہوئی تھی۔

کافی دیر کی کوشش کے بعد ابھی آنکھیں میچیں دوسرا جھمکا کان میں پہنا ہی تھا، کہ آنکھیں کھولتے نظریں اپنے عکس پر ٹھہر سی گئی۔ ایک الگ ترنگ میں وہ خود کے عکس کو دیکھے گئی، ہوش میں تب آئی جب فون پر میسج ٹون بجی۔

اس کیفیت سے باہر آئی، تو خود کو الگ روپ میں دیکھ کر شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں پر جا بسی۔ ہونٹ کترتی وہ مسلسل ادٹنے والی مسکان کا گلا گھونٹتی، موبائل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جھکنے پر جھمکے میں پروئے ستارے کی لڑیاں بھی اس کی گردن کو چھو گئی تھیں، جس پر وہ کسمسا کر جھمکے کی اٹکیلیوں پر مسکرائی تھی۔

مسکراہٹ یک دم مدہم ہوتے ہوئے ختم ہوئی تھی، جب نظر موبائل کی سکرین پر چمکتے سیج اور بھیجنے والے کے نام پر پڑی تھی۔

"اچھی لگتی ہو جھمکوں میں، پہنا کرو"

(ساتھ میں دل بنا تھا)

یہ پڑھتے ہی دل کی دھڑکن بڑھی تھی اور نظریں پورے کمرے میں پھیلائی تھیں۔

"اسے کیسے پتہ چلا میں نے یہ پہنے ہیں۔"

جھمکوں کو چھوتی وہ بڑبڑائی تھی۔

تبھی موبائل پر ضامن کی کال آنے لگی تھی، اور ضامن کا نام پڑھتے ہی بدک کر پیچھے ہوئی تھی۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تھا۔

"اس انسان کے پاس جن تو نہیں۔"

تھوک نگلتی وہ پھر سے خوفزدہ نظر پورے کمرے میں ڈال کر آئینے کی طرف پلٹی تھی۔

جہاں اپنے عکس کے عین پیچھے ضامن کا عکس بھی شان سے سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑا، مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اب تو خوف مزید بڑھتا جا رہا تھا چونک کر پیچھے کو پلٹی تو نہ ضامن تھا نہ ہی اس کا سایہ، جان میں جان تو آئی تھی۔ پر نجانے کیسا احساس تھا جو اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ جیسے ضامن اس کے ارد گرد ہی موجود ہو، اسے دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ اس کے حصار میں قید ہو چکی ہو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مجھے، ضرور ان جھمکوں پر جادو کیا ہوگا اس نے تبھی یہ سب ہو رہا ہے۔" جھمکوں کو بے دردی سے ہاتھ میں پکڑتی وہ اس کا بھید جان چکی تھی۔ اور وہاں ضامن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ جھمکے پہنے اسے ہی اپنے آس پاس سمجھ رہی تھی، اسے تو فرصت ہی اب ملی تھی، تبھی ایک میسج چھوڑ دیا تھا۔

"ماشاء اللہ!"

اس سے پہلے کہ جھمکے بے دردی سے اس کے کانوں سے الگ ہوتے، مسرت بیگم کمرے میں داخل ہوتی اسے جھمکوں کے ساتھ الجھے دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھی تھیں۔

وہ خوبصورت لگ رہی تھی، جھمکے تھے بھی خوبصورت اور ان کی بیٹی بھی، جس نے آج تک یہ سب خود سے دور رکھا تھا۔ آج اس پر جھمکوں کا اضافہ ہی نکھار برسا گیا تھا۔ وہ محبت سے نظریں اس پر لگاتیں پاس آئی تھیں، اور بے اختیار اسے خود میں بھینچ لیا۔

"بہت خوبصورت لگ رہے ہیں یہ تم پر۔"

اس کے سر پر بوسہ دیتیں وہ بولیں تو تائشہ کو پھر سے جھجھک نے آن گھیرا۔

"بس اب سے تمہاری ڈھیر ساری جیولری لوں گی، دیکھنا بالکل شہزادی لگو گی۔"

وہ تو بہت خوش ہوئی تھیں، اس کے اس شوق کو دیکھ کر۔ خوش تو تب بھی بہت ہوئی تھیں، جب اس نے دوپٹہ اوڈھنا شروع کیا تھا۔ اور اب تو انہوں نے زبردستی اسے لڑکیوں کی سٹائلنگ والے کپڑے بنوا کر دیے تھے جو کچھ حیل و حجت کے بعد اس نے پہن بھی لیے تھے۔ اور اب اس کا بنار سنگھار کی طرف اٹھتے پہلے قدم پر ہی وہ نہال ہو گئی تھیں۔ ورنہ دس سال سے وہ اسے سمجھائے جا رہی تھیں، پر تائشہ ان کی ہر بات کا لاج رکھ لیتی، کھانا پکانا سے لے کر سلائی کرٹھائی سب سیکھ چکی تھی کیونکہ مسرت بیگم چاہتی تھیں کہ وہ لڑکیوں والے رنگ ڈھنگ سیکھے، بس ایک حلیہ ہی نہیں بدلاتھا۔ اس کے بقول یہ حلیہ اسے مضبوطی دیتا تھا۔



لیکن آج اسے ایک مکمل لڑکی کے حلیے میں دیکھ کر ڈھیروں سکون انہیں میسر ہوا تھا۔

"امی یہ میں نے نہیں۔۔۔۔"

وہ جھینپ کر بتانے ہی لگی تھی کہ وہ تو خوشی میں اتنی غرق تھیں کہ اس کی بات سن ہی نہیں سکیں۔

"دیکھنا! میری بیٹی پر شادی میں بہت روپ آئے گا، پیاری جو بہت ہے میری بیٹی۔"  
اس کی بلائیں لیتی وہ پر کھل اٹھی تھیں، پر تائشہ شادی کے ذکر پر منہ بسورتی ان سے دور ہوئی تھی۔

"میں نہیں کر رہی کوئی شادی وادی۔"

پھر سے اپنی طرف سے جواب دے کر وہ جھمکے اتار رہی تھی۔

مسرت بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا جھمکا اتارتا ہاتھ تھاما، اور اسے لیے بیڈ کی پائینٹی پر جا بیٹھیں اسے بھی ساتھ ہی بٹھایا۔

"کیوں نہیں کرنی شادی؟ آخر کیا خامی ہے ضامن میں؟"

وہ نہ غصہ کر رہی تھیں اور نہ ہی ناراض تھیں وہ بس جواب مانگ رہی تھیں۔  
تائشہ نے سرد سانس ہوا میں خارج کرتے جواب دینے کے لیے خود کو تیار کیا۔

"امی، شادی کرنے میں مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ اس شادی کو نبھانے میں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرا نصیب کیا ہوگا، کیسا ہوگا۔ لیکن آپ کے نصیب کو دیکھ کر اب خود کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے ابو کی وفات کے بعد، آپ نے کن مشکلوں سے میری اسکول اور کالج کی فیس بھری ہے۔ آپ کی جہیز کے لیے کتنی مشکلوں سے پائی پائی جوڑ کر پوری کی ہے۔"

پہلے پہل سب خوبصورت لگتا ہے، لیکن جب آزمائش آتی ہے تو اصل زندگی کی تلخیوں کا اندازہ تب ہوتا ہے۔

میں کیا مانگ رہی ہوں آپ سے؟

صرف کچھ وقت، اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا وقت، میں نہیں چاہتی کہ کل کو اگر میرے در پر آزمائش آکھڑی ہو تو مجھے کپڑے سلائی کر کے گزارا کرنا پڑے۔ مانا کہ محنت میں کیسی شرم، کمانے میں کیسی عار لیکن اگر وہی محنت ہم اب کر لیں اور اپنا ایک مقام بنا لیں تو اس میں کیسی شرم امی۔

میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں پھر چاہے آپ میری شادی کروا دینا مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔"

پرانے وقتوں کو یاد کرتے آنکھ کے گوشے نم ہو گئے تھے، جنہیں انگلی کی پور سے صاف کرتی وہ بات ختم کر گئی تھی۔ اور اب انہیں امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میری جان! سب کا نصیب ایک جیسا نہیں ہوتا، وہ ہماری قسمت میں لکھا تھا تو ہمیں اس آزمائش سے گزرنا تھا لیکن لازمی تو نہیں کہ مسرت کی بیٹی پر بھی وہی آزمائش آئے۔ ضامن بہت اچھا لڑکا ہے، خاندان بھی اچھا ہے۔ دو ہی تو بھائی ہیں۔ اچھا خاصا کاروبار ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے، لیکن پھر بھی میں نے ان سے تمہاری آگے کی پڑھائی کی بات کی تھی، جسے وہ جھٹ سے مان گئے۔ تو اب کوئی وجہ نہیں بنتی انکار کی۔ یا پھر تمہیں ضامن پسند نہیں ہے؟ اچھا لڑکا نہیں ہے کیا؟"

پہلے سوال کا وہ جواب دے چکی تھی، تبھی اسے ساتھ لگائے دوسرے سوال کا جواب مانگا تھا۔ کچھ پل تو وہ خاموش رہی پھر نہ میں سر ہلا دیا۔

اب جب معافی تلافی ہو چکی تھی تو امی کو اس بارے میں بتا کر انہیں پریشان کرنا اسے ٹھیک نہیں لگے، ویسے بھی اس دن جب تائشہ نے ضامن کو تمہیڑ مارا تھا، تبھی ساری کثافت دھل گئی تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے ضامن کی سنگت میں رہ کر میری بچی کا نصیب بھی نکھر جائے گا۔ میں نے اس کی نظروں میں عزت دیکھی ہے، محبت دیکھی ہے۔ واقع ہی بہت عزت کرنے والا بچہ ہے۔ اور ہے بھی اپنی ہی برادری کا، خاندان والوں کے منہ بھی بند ہو جائیگے۔ ایک بار اپنی ماں کی خوشی کا بھی سوچنا، اپنے جیتے جی تمہیں رخصت کردوں تو مجھے سکون آجائے گا۔"

اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں وہ محبت سے بولی تھیں اور پھر غمگین بھی ہوئی کہ تائشہ ان سے لپٹ گئی۔

"ایسا مت کہا کریں امی، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔" وہ بھی زندہ ہی آواز میں کہتی آنسو بہانے لگی۔

"میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں دنیا کی ساری خوشیاں دے۔"

اس کے آنسو صاف کرتیں وہ نم آنکھوں سے مسکرائیں تو تائشہ کی بھی جان میں جان آئی۔

\*\*\*\*\*

"خیر ہے؟"

آج کل بہت پیار آرہا ہے ہم پر، جو خود سے ہی کال ملا دی۔"

ضیغم جب سے بابا سائیں کے ساتھ آگے کی پلاننگ کر کے آیا تھا، تب سے شہریار اور ضامن سے اس معاملے پر بحث کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

اور اب اللہ کا نام لے کر اس نے کال ملا ہی دی، اتنا تو یقین تھا، دوست تھے تو سمجھیں گے بھی اور ساتھ بھی دیں گے۔

"پیار کا تو پتہ نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہینے جان ہو میری تم دونوں۔"

شیری کے طنز پر گہری سانس بھرتا وہ بشاشت اور سچائی سے بولا تھا۔

پر یہ سچ ضامن کو پتہ لگا گیا۔

"لا حول ولا قوۃ، ہم جان ہیں یا وہ نوڈل۔"

ضامن نے حقیقت میں ضیغم کے لیے تھے، جہاں شیری قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ وہیں ضیغم کی بھی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔

"اب کچھ سنجیدہ بات کر لیں۔"

اس کی گل افشانی کو نظر انداز کرتے، ہنسی کو روکنے کی کوشش کرتا سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"آپ سے اس سے زیادہ کچھ امید بھی نہیں ہے شاہ سائیں، کیسے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" شیریں نے بھی سنجیدہ لہجے میں غیر سنجیدگی سے کہتے خاموشی اختیار کی۔

اب دونوں ضیغم کی طرف سے کہے جانے کے انتظار میں تھے۔

اور ضیغم نے من و عن تمام قصہ ان کے گوش گزار کیا تھا، کچھ پل خاموشی کی نظر ہو گئے۔ ضیغم کہہ کر خاموش ہوا تو شیریں اور ضامن نے بھی لب سی لیے۔

"کیا ہوا؟ کچھ کہو گے نہیں؟"

مسلسل خاموشی پا کر ضیغم نے ہی ان سے پوچھا تھا۔

"کیا کہیں؟"

اب تو انکل سائیں کو پیچ میں لائے گا تو ہم کیا کہہ سکیں گے۔"

ساری بات سنتے ضامن نے ہی سنجیدہ جواب دیا تھا۔

وہیں شیریں ابھی خاموش تھا۔ اور ضعیف بھی ماتھا مسلنے لگا، یقیناً اب یہاں ناراضی کا دور چلنے والا ہے۔

"اب تم لوگ ناراض ہو جاؤ گے، ایسا تو نہیں چلے گا نایار۔"  
سکون سے ایک جگہ بیٹھتے وہ لہجے میں بے بسی سموئے کہنے لگا۔

"تجھے ہماری ناراضی سے فرق پڑتا ہے؟"  
شیریں کا انداز جتلاتا اور چڑھتا ہوا تھا کہ ضعیف نے آنکھیں گھمائیں۔

"مجھے تم دونوں کی مدد چاہیے بس! اب چاہے ناراض رہو یا لڑو۔"  
ضعیف بھی ضد کا پکا تھا، اور باتوں کو گول مول کرنا بھی باخوبی جانتا تھا۔

"بول کیا مدد چاہیے، ہم تو ہمیشہ تیار ہیں۔ چاہے لڑے ہوں یا ناراضی ہوں۔"  
شیریں نے بھی سنجیدگی طاری کیے ادھار نہیں رکھا تھا۔

"تو سنو میں چاہتا ہوں، کہ ہماری نئی بننے والی مارکیٹنگ کمپنی تین سال کے اندر اندر کامیابی کی بلندیوں کو چھو جائے کہ جب ہم اپنا پراجیکٹ لانچ کرنے لگیں تو انویسٹرز کی لائن لگ جائے۔" اور یہاں اس نے انہیں حیران کے ساتھ ساتھ خوش بھی کیا تھا، ضیغم کو قسطوں میں بات مکمل کرنے کی بری عادت تھی اور یہ دوست سمجھتے ہوئے بھی بھول جایا کرتے تھے۔

"کیا؟ مطلب ہم ساتھ میں کام کریں گے؟"

دونوں یکباگی حیرانی کا مجسمہ بنے تھے اور پھر چیخے تھے۔ ان کے انداز سے ہی خوشی چھلک رہی تھی۔

ضیغم ہنس دیا۔

"تمہیں کیا لگا، تم دونوں کے بغیر میں کچھ کر سکتا ہوں؟" اب آرام دہ حالت میں بیٹھتا وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

"وہ تو ہے، ہمارے بغیر تم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔"

"you know we are the lucky charms"

شیری جو پہلے سنجیدہ رہنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اب بالکل غیر سنجیدہ تھا۔



"ہسنہ! خوش رہنا اچھا ہے، پر خوش فہمیاں پالنا انتہائی غلط ہے میرے دوست۔"  
ہنکار بھرتے ضیغم نے انہیں حقیقت دکھانی چاہی، پر وہ تو اپنی ہی حقیقت میں جی رہے تھے۔

"الحمد للہ! ہم ایسی خوش فہمیاں نہیں پالتے۔"  
ضامن بھی پیش پیش تھا۔

"اب تم دونوں کا ہو گیا ہو تو، کچھ دیر کے لیے آگے کا پلان ڈسکس کر لیں؟"  
جب کافی وقت تک وہ اسے گولہ باری کی زد میں لیتے رہے تو ناچار ضیغم کو ان کی توجہ اہم مقصد کی طرف کراوائی جسے انہیں مل کر حاصل کرنا تھا۔

اپنے لیے تو پیسہ بہت کمایا جاتا ہے، لیکن لپٹوں کے لیے، وہ بھی وہ اپنے جن سے خون کا رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی عزیز ہوں۔ ان کے لیے کچھ کرنا، بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ اور یہ تینوں بھی کچھ نیا کرنے جارہے تھے، کچھ ایسا جو وہاں کے رہائشیوں کی زندگی بدل دے۔

\*\*\*\*\*

کچھ دنوں سے وقفے وقفے کے ساتھ ایک نمبر سے کال آرہی تھی۔ پہلے پہل تو ضامن نے انجان نمبر سمجھ کر نظر انداز کیا، لیکن اب نجانے کیوں وہ خدشوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔ تبھی آج صبح ہی اپنے دوست کو نمبر بھیجا کر اس کی معلومات لینے چاہی تھی۔ اور جو معلومات ملی تھیں، اس کے اندر اٹھتا شک یقین میں بدلا تھا۔ اور اب نمبر موبائل کی سکرین پر موجود تھا، جس پر کال کر کے اسے ساری حقیقت کا اندازہ ہوتا۔

خوف، خدشے سب دماغ کی نسوں پر سوار تھے، خود کو پرسکون کیا اور گہری سانس بھر کر کال ملا ہی دی۔

فون فوری طور پر اٹھا لیا گیا تھا، جیسے اسی کے فون کا انتظار ہو۔ پہلے دونوں اطراف سے خاموشی ہی تھی، ضامن بھی خاموش ہی رہا جب تک سپیکر کے پار سے کوئی بولا نہیں۔

پھر جو آواز آئی اس نے بچا کچا شک بھی مٹا دیا، اور جو حقیقت کا عکس نظر آیا تھا، وہ پل بھر کے لیے اس کے دل کو مٹھی میں قید کرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ مقابل کی آواز سنتا رہا، اور خود میں سہنے کی ہمت بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ مقابل سب کچھ کہہ کر خاموشی اختیار کر گیا، تو ضامن انہیں تسلی جیسے الفاظ سے نوازنا فون بند کر گیا۔

اسے بہت کچھ کرنا تھا، وقت بھی کم تھا، لیکن اس سے پہلے خود کو سنبھالنا تھا۔ اشک آنکھوں کی زمین کو گھیلا کر گئے تھے، اور اب جب اندازہ ہوا تھا تو آنکھیں مسل کر انہیں آنکھوں کے اندر ہی مدفن کر دیا تھا۔

\*\*\*\*\*

دوستی، ایک ایسا رشتہ جو کسی دوسری شے، یا کسی دوسرے رشتے کا نعم البدل نہیں ہے۔ یہ اپنی اہمیت خود بتلاتا ہے، جیسے پیاس میں پانی کا نعم البدل کوئی شے نہیں، ویسے دنیا میں مخلصانہ رویوں کی پہچان کے لیے دوستوں سے زیادہ ضروری کچھ نہیں۔ یہ پوری زندگی میں کمایا گیا وہ اثاثہ ہیں، جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ شرط یہ ہے کہ دوست مخلص ہوں۔

اور یہاں ضعیف ظفر شاہ، شہریار عالم اور ضامن نواز خان کی آپس میں دوستی کسی قسم کے دکھاوے کی محتاج نہیں تھی۔ مخلص پن تینوں کے رشتے میں بھرا تھا۔ تینوں ایک دوسرے کے لیے بہترین کی دعا کرتے تھے۔ جہاں ضعیف اور شہریار کی زندگی میں ان کی پسند شامل ہونے جارہی تھی، وہیں ضامن کی دور ابھی بھی الجھی ہوئی تھی۔ اور یہ دوست بھی کس کام کہ جب اپنے دوست کی خوشی کو اسکے لیے منانہ سکیں؟ چاہے اس کے لیے انہیں رشتے کروانے والی مائی کا رول ادا کرنے پڑے۔

ہاں یہ کام انہوں نے پہلے کیا نہیں تھا اور نہ ہی اندازہ تھا کہ معاملہ بگڑے گا کہ سنورے گا لیکن ایک کوشش تو ضروری تھی اور وہی یہ دونوں مل کر کرنے والے تھے البتہ ضامن کو اس پلان کی بھنک تک نہیں پڑی تھی، وہ بس اتنا جانتا تھا کہ دوست ہیں اور اس کے حامی ہونے کے ناطے کچھ تو کریں گے، پر کیا اس سے وہ ناواقف تھا۔

اور پھر دونوں نے جو پلان بنایا تھا، اس کے مطابق پہلا قدم ضیغم ظفر شاہ نے اٹھانا تھا، اور اسی چکر میں محترم نے تالشہ کو کال ملا دی۔

وہ جو ابھی کام ختم کر کے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی، موبائل کی چنگاڑتی آواز نے اس کا استقبال کیا تھا۔ موبائل جب دیکھا تو اس پر چمکتے نام کو دیکھ کر وہ کچھ الجھی، ماتھے پر پرسوچ لکیر ابھری اور پھر فون اٹھا لیا۔

"السلام علیکم ضیغم بھائی!"

فون اٹھاتے ہی سلام کیا تو ضیغم نے بھی سوال کا جواب دیتے حال چال پوچھا۔

تائشہ کے جواب دینے کے بعد ضیغم نے اصل مقصد پر آنے کے لیے گلا کھنکارا۔

"میں نے سنا ہے کہ ضامن نے رشتہ بھیجا ہے جب کہ تم نے انکار کر دیا۔"  
 ضیغم کے استفہامیہ لہجے پر تائشہ نے گہری سانس لی، اسے تو یہی لگا کہ اب دوست کے لیے وہ  
 بھی اسے منانے کی کوشش کریں گے۔

"جی، آپ نے صحیح سنا۔"  
 اس نے بھی بغیر کسی لگی لپٹی کے بتلایا۔

"اچھا کیا، ویسے بھی ضامن جیسے لڑکے سے تمہارا شادی کرنا بنتا بھی نہیں ہے۔ آخر کو اس نے  
 تمہیں اس ایک سال میں کتنا تنگ کیا ہے اور پھر وہ تمہیڑ والے واقع کے بعد تمہیں ہرگز نہیں  
 ماننا چاہیے۔"

ضیغم کا لہجہ اور اس کے چنے گئے الفاظ ایسے تھے، کہ وہ صرف اور صرف تائشہ کا ہی خیر خواہ  
 تھا۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔"

تائشہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا، کوئی تھا جو اسے سمجھ رہا تھا۔  
اور وہاں ضیغم مزید جال پھینکنے کی تیاری میں تھا۔ بھرپور طریقے سے پھپھے کٹنے کا کردار ادا کر رہا تھا۔

"ہاں نا، اب دیکھو آج رشتہ بھیج دیا کل کو تم لوگوں کی شادی ہوگی اور پھر سے اس نے تمہارے ساتھ یہ رویہ رکھا تو کیا کر سکو گی تم؟  
ضامن کا تو تمہیں پہلے سے ہی پتہ ہے، ہاں وہ الگ بات ہے کہ اگر کسی اور سے تمہاری شادی ہو جائے اور وہ اس سے بھی زیادہ تشدد کرے یا پھر شرابی، نشاہی کچھ بھی ہو۔ لیکن شروع میں تو تم اس کی حقیقت نہیں جانتی ہو گی۔  
ہو سکتا ہے وہ بہت اچھا ہو، ہو سکتا ہے بہت برا ہو۔ لیکن ضامن، ضامن کا تو تمہیں پہلے سے ہی معلوم ہے کہ وہ کتنا برا ہے۔"

اس کے کسی اور سے شادی کا کہنا، اور پھر اس شخص کا نقشہ کھینچنا، تائشہ نے بے ساختہ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری تھی۔

جب کہ ضیغم نے کچھ دیر خاموش رہ کر تائشہ کی طرف سے رد عمل چاہا تھا، پر وہاں سے خاموشی پا کر وہ مزید بولا۔

"ہاں وہ الگ بات ہے کہ ضامن نے کہا کہ وہ اپنی بات پر شرمندہ ہے، مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ آئندہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کروں گا چاہو تو اسٹامپ پیپر پر لکھوا لو۔ لیکن تم خود بتاؤ بھلا کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو کر دکھانے کی ہوتی ہے۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے بہت اچھا فیصلہ لیا ہے۔"

اور اس کے حق میں لفظوں کو استعمال کرتے وہ دراصل تائید کے لیے سوچوں کا وزن کھول رہا تھا۔ اور یہ سب سنتے اس کے دل سے کسک اٹھی تھی۔

"بھائی وجہ یہ بھی ہے نا کہ مجھے ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، کوئی مقام بنانا ہے۔ شادی وادی، کا ابھی کوئی پلان بھی نہیں ہے نا میرا۔"

اس واقع کو گزرے دو سے زیادہ مہینے ہو چکے تھے، اور جب دل سے معاف کر دیا تھا، تو پھر اس کو بار بار کریدنا اسے صحیح نہیں لگا، تبھی ضیغم کو اپنی طرف سے اصل وجہ بتائی تھی۔ پر آج ضیغم کے پاس جواب ہی جواب تھے۔

"بالکل صحیح کہہ رہی ہو، میں خود چاہتا ہوں کہ لڑکیوں کو اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے، لیکن ضامن کہہ رہا تھا کہ شادی کے بعد بھی وہ تمہیں پڑھنے سے نہیں روکے گا۔ پھر وہی بات آخر کہنے سے ہوتا کیا ہے؟ تمہیں کیا مجھے بھی اس پر یقین نہیں۔"

اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم ضامن کو پسند ہی نہیں کرتی اور ایک بھائی ہونے کے ناطے میں تو تمہاری پسند، ناپسند کو ہی ترجیح دوں گا، ضامن کا تو تمہاری زندگی میں آنا بنتا ہی نہیں ہے۔" وہ تالشہ کے دماغ کو کئی راہیں دے گیا تھا، وہ جو نہ نہ کی رٹ لگائے ہوئے تھی، اب دماغ دو فیصلوں میں بٹ رہا تھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے کہ میں ناپسند کرتی ہوں۔ پر مجھے شادی ہی نہیں کرنی نا۔" اور پھر اسی کشمکش میں زبان کچھ الٹا سیدھا بول ہی گئی۔ وہاں ضیغم کے لبوں پر اسرار سی مسکراہٹ جھلک دکھا گئی۔

"میں بھائی ہونے کے ناطے تمہارے ساتھ ہوں، ضامن چاہے دوست صحیح لیکن جو بھی ہے تم بھی مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہو۔ اس لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نہیں کرنی شادی تو نہ کرو، اب ایسا تھوڑی نہ ہوتا ہے کہ ضامن نہ صحیح تمہارے گھر والے زور زبردستی سے تمہاری شادی کسی بھی کریانہ سٹور چلانے والے راشد یا کسی اسکول ماسٹر نبیل سے کروا دیں گے۔

جب تمہیں شادی کرنی ہی نہیں ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کسی ضامن کا رشتہ آئے رشید، نبیل، کریم کوئی بھی ہو۔



صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟"

رشید، نبیل، کریم کے نقشے جب دماغ میں گھومے تو نجانے ضامن بہتر آپشن لگا تھا، اپنی ہی سوچ پر جھرجھری لیتے، سر جھٹکتی وہ بس ایک لفظ ہی کہہ سکی۔

"جی۔"

ناچار یہی منہ سے نکلا تھا۔

"بس، خوش رہو اور جب بھی ضرورت ہو، بھائی سمجھ کر ایک کال کر دینا، ٹھیک ہے؟" مخلصانہ، اور سچا لہجہ اپنائے وہ خدا حافظ کہتا فون کاٹ گیا۔ اتنی بات کبھی یونی میں رہتے ہوئے بھی ضیغم نے اس سے کیا کسی بھی دوسری لڑکی سے نہیں کی ہوگی، جتنی آج اس سے کی تھی، پر فائدہ یہ ہوا تھا کہ تائشہ کا جو ایک طرفہ دماغ چل رہا تھا۔ اب دونوں راہیں سامنے تھیں، اور اسے کسی ایک چننے تھا اور یہ دکھا اب شہریار عالم کی طرف سے دیا جانا تھا۔

جہاں یہ خالی خالی نظروں اور الجھتی سوچوں کے ساتھ موبائل کو گھور رہی تھی، وہیں ضیغم نے شیرمی سے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کا کہا تھا۔

اور شیریں نے پیغام ملتے ہی بنا کسی توقف کے تالشہ کو فون ملا دیا۔

پہلے ضیغم اور پھر شیریں کی طرف سے فون آتا دیکھ کر وہ ابھی سوچوں کے ساتھ مزید ابھی تھی۔

"السلام علیکم شیریں بھائی۔"

فون کان سے لگا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو، بہت بہت مبارک ہو بھئی۔"

شیریں کی تو ٹون ہی مختلف تھی، ہنستے ہوئے جواب دیتے مبارک باد دی تھی۔

"کس چیز کی مبارک؟"

تالشہ نے بھی ہنستے ہوئے ہی پوچھا تھا۔

"ارے ضامن کے رشتے کو انکار کرنے کی مبارک، بے چارا بڑا اداس تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی فون آیا کہہ رہا تھا کہ تم نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہوئی، بہت اچھا کیا تم نے ایسے انسان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

شیری تو تائشہ کا سب سے بڑا خیر خواہ بن کر سامنے آیا تھا۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے پر میں نے پہلے دن سے ہی انکار کر دیا تھا، مجھے شادی ہی نہیں کرنی جب تو انکار ہی کرنا تھا۔ لیکن کیا امی نے بھی انکار بھیج دیا ہے۔"

شیری کے جواب میں اسے یاد آیا کہ ضامن کو اس کی طرف سے کیے جانے والے انکار کا دکھ ہے، یا پھر اس کی امی نے بھی انکار کر دیا۔ کیونکہ ابھی تک اسے ایسی خوش خبری نہیں ملی تھی۔

"ارے نہیں، وہ تو تمہاری بات کر رہا تھا کہ تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ جو حرکت تم نے کی اس کے بعد وہ تم پر تھو کے بھی نہ شادی تو دور کی بات ہے۔" بات بنانے میں تو شیری کا کوئی ثانی نہیں تھا یہ بات آج ہی شیری کو بھی معلوم ہوئی تھی۔

"اور آنٹی کے اقرار یا انکار سے کیا فرق پڑتا ہے، اصل بات تو تمہارے انکار کی ہی ہے نا۔ وہ ایک الگ ڈسکشن ہے کہ ضامن نہیں تو چلو کسی اور بشیر، شفیق وغیرہ سے کروا دیں گے۔ لیکن ضامن تو ہرگز نہیں ہو سکتا، ہم نے تو خود ضامن کو بہت سمجھایا کہ تمہیں بھول جائے پر وہ بچارا..."

شہریار نے بھی اس کی پہلے سے دکھتی رگ پر پاؤں رکھ دیا تھا، بشیر اور شفیق کے ذکر پر اس نے ناک سکیرٹی تھی۔ اور جب شیریں نے ڈرامائی انداز دیتے بات آدھوری چھوڑی تو تالشہ بے ساختہ بول پڑی۔

"پر وہ کیا؟"

"وہ۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پسند کرتا ہے تمہیں، بہت محبت کرتا ہے تم سے انفیکٹ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تمہارے علاوہ کسی بھی لڑکی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ تو بہت فلمی ہو گیا ہے۔ کہتا ہے ٹومی سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی ہو تم، ٹومی میں تو جان بستی تھی اس کی۔ پھر میں نے بھی کہہ دیا کہ اس کتے کو گھر سے ہی نکال دو۔ اور پتہ ہے وہ تو مان بھی گیا۔"

خیر اس کے کہنے سے کون سا تم نے یا ہم نے یقین کر لینا ہے۔

رہے گا تو وہی ضامن جس نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا، یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اگر تائشہ کہے تو سب کے سامنے معافی مانگنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن معافی مانگنے سے سب ٹھیک ہو سکتا تو پھر جھگڑے باقی ہی نہیں رہتے۔"

شیری کی زبانی ضامن کی کہی باتیں سنتے ہی، دل زور سے دھڑکا تھا۔ جب شیری نے کہا کہ کون سا ہم نے یقین کر لینا ہے تو دل کو نجانے کیوں ضامن کی کہی بات پر یقین آگیا تھا۔

"سن رہی ہو تم؟"

تائشہ کی طرف سے مسلسل خاموشی پا کر شیری کو خدشہ محسوس ہوا کہیں اس کے بولے گئے جھوٹ اور خود ساختہ بنائی گئی باتیں ضائع نہ ہو گئی ہوں۔

"جی، جی سن رہی ہوں۔"

اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا جب کہ اب وہ ذہنی طور پر وہاں موجود نہیں تھی۔

"شکر ہے، اچھا میں رکھتا ہوں، اور اگر تمہیں ضامن پھر کبھی تنگ کرے تو اپنے بھائی کو بھولنا مت اسے سیدھا کر دوں گا میں۔"

یہ یقین نجانے اب کے لیے تھا یا اس لیے کہ وہ ضامن کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دے تو یہ بھائی اس کے ساتھ ہوں گے، کہ ضامن سے جتنے بھی خدشات اسے لاحق ہوں ان کو چین مل جائے۔

\*\*\*\*\*

"مریم تم نے میری بیٹی کے بالوں کا ذرا خیال نہیں رکھا، دیکھو کیسے مرجھا گئے ہیں۔" وہ عینا کے گھنگریالے بال سلجھاتے اور آملہ کے تیل سے سر کا مساج کرتے مریم بیگم سے گویا ہوئی تھیں۔

"بھابھی سائیں، یہ لڑکی میری سنتی کہاں ہے۔ آپ کے سامنے کتنے آرام سے بیٹھی ہے۔ میرے سامنے تو بس اسے رونے کے بہانے چاہیے ہوتے ہیں۔"

مریم بیگم بھی آرام سے بیٹھی عینا کو گھور کر بولی تھیں کہ اماں سائیں ان کی بات پر ہنس دی۔

"ماں کی محبت اور توجہ سے ہی بیٹیوں کے بالوں میں بھی اور ان کے اعتماد میں بھی مضبوطی آتی ہے۔ اور اچھی نیٹیوں کو ماں کی بات ماننی چاہیے، ٹھیک ہے نامیری جان! اب دیکھو! کتنی خوبصورت لگ رہی ہے میری بیٹی۔"

مریم بیگم اور عینا سے بیک وقت کہتیں، گھنگریالے بالوں کی دو چٹیاں بنا کر انہیں آگے کی طرف رکھا کہ عینا کو بے ساختہ اپنا بچپن یاد آیا۔

گول موٹل چشمہ، اس کے اندر چھپیں بڑی بڑی گول آنکھیں، اور بالوں کی دو چٹیاں بنی تھیں کہ دیکھنے والا بے ساختہ اس کی معصوم صورت پر ماشاء اللہ کہہ اٹھے۔

جب کہ وہ تائی سائیں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر جھینپ کر مسکرائی تھی۔

ان کے سامنے کھڑے ہوتے بار بار دونوں چوٹیوں کو آگے رکھتے اشتیاق سے انہیں دیکھتی، اردگرد سے بے گانہ ہو چلی تھی۔

ضیغم جو ابھی بابا سائیں کا ضروری کام کر کے باہر سے آیا تھا، ہال میں قدم رکھتے ہی مسکراہٹ بکھیرتی عینا پر نظر پڑی تو قدم ساکت ہو گئے۔ آنکھیں مہر سی گئیں، وہ مانتا تھا عینا سے جو جذبہ تھا اس کے تحت عینا سادہ روپ میں ہو یا بنی سنوری، ہر رنگ میں وہ اسے عزیز تھی۔ معصوم، بھولی

وہ پہلے بھی تھی، لیکن آج دو چٹیاں بنائے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ کر جھلاتی وہ اسے خود کی جانب مزید کھینچ رہی تھی۔

آنکھوں میں اس کا یہ عکس جیسے رچ بس گیا تھا، جہاں وہ سب سے بے خبر اپنے بالوں پر نظریں الجھائے ہوئے تھی، وہیں ضیغم بھی کچھ پل کے لیے آس پاس موجود ہر شے کو بھلائے، بس اسے دیکھے گیا۔

بالوں کو پیچھے کے جانب جھلا کر جھٹکتی، مسکراتی نظریں جب بالوں سے پلٹ کر اس سے کچھ فاصلے پر سامنے کھڑے ضیغم کو دیکھ کر اپنی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ ابھی تو وہ اپنے بچوں جیسے روپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی، اب ضیغم کو خود کو یوں دیکھتا پا کر وہ شرمندہ سی نظریں جھکا گئی، ساتھ میں بے دردی سے انگلیاں چٹختی، لبوں کو دانت کے نیچے مسلنے لگی تھی۔

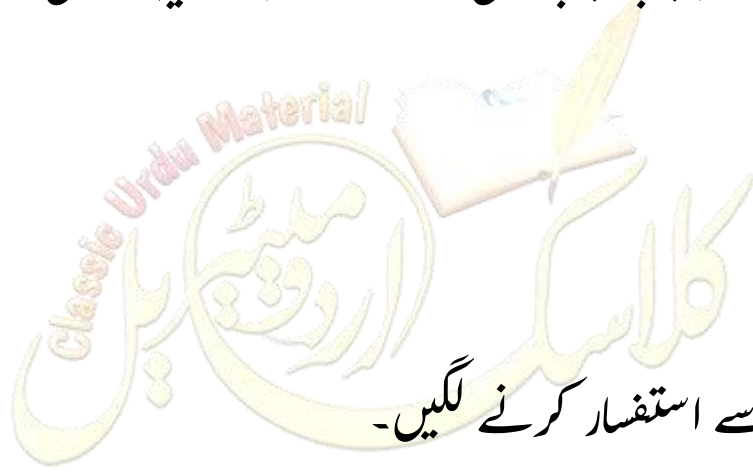
اس کے سر جھکا دینے پر ضیغم کی محویت بھی لڑٹی تو اور مسکراتے ہوئے نظریں ادھر ادھر گھمائیں تھیں، صد شکر تھا کہ کسی نے اس کی یہ بے اختیاری دیکھی نہیں تھی۔

اماں سائیں اور مریم بیگم الگ آپس میں، باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ اسکا آنا محسوس ہی نہیں کر سکیں۔



دھیان جب ہٹا تو رسما اماں سائیں اور مریم بیگم کو سلام کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

عینا بھی وہاں سے جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی یہاں تک کہ ضیغم بھی عین اس کے سامنے آگیا تھا اور اب اماں سائیں کے آگے جھکا سر پر پیار لے رہا تھا۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ قائم تھی، عینا کو تو یہ مسکراہٹ اس کی خاصیت ہی لگتی تھی، بہت کم اس نے اسے بنا مسکان کے دیکھا تھا، ورنہ جب جب اس کے ساتھ ہوتا تھا یہ مسکان اس کے لبوں پر سے ہٹتی ہی نہیں تھی۔



"کر آئے کام؟"

اماں سائیں شفقت سے استفسار کرنے لگیں۔

"جی!"

ایک کپ چائے تو پلوا دیں۔"

ایک نظر عینا کو دیکھا، جو نظریں اس پر مزین کیے بیٹھی تھی، اور اس کے دیکھنے پر فوراً سے پیشتر نظریں پھیر گئی۔

"اچھا تم جا کر فریش ہو جاؤ، میں سنبل سے کہتی ہوں۔"

اسے ہدایت دیتیں، ساتھ میں سنبل کو بھی ہانک لگائی جو کچن میں ہی موجود تھی، اور پھر سے مریم بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"جی اچھا۔"

سر ہلا کر جانے کو پلٹا تھا، عینا منہ کے مختلف ڈیزائن بناتی اس کے جانے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اب کی بار ضیغم نے بہت مشکل سے قہقہہ حلق میں ہی دبایا تھا۔ اس سے بے گانگی ظاہر کرتا، مچلتی مسکراہٹ لب دبا کر روکتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دن پہلے ہی رحیم صاحب اپنے پورشن میں منتقل ہو چکے تھے، ویسے تو زیادہ وقت عینا، سنبل کے ساتھ ہی نیچے ہی ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی عینا اور ضیغم کی آمنے سامنے ملاقات ہو ہی نہیں سکی تھی۔ عینا کی جھجھک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اور وہیں ضیغم اس انتظار میں تھا کہ کب گھر والے عینا کو بھی رشتے کی حقیقت کے بارے میں بتلائیں اور شادی کی تاریخ رکھی جائے۔ لیکن یہاں تو راوی نے چین ہی چین لکھ رکھا تھا، پر ضیغم کی زندگی کا چین اسی انتظار میں روٹھا ہوا تھا۔

"عینا! بات سنو ذرا۔"

چائے کا کپ ٹرے میں رکھے، سنبل عینا کے کان کے پاس جھکی تھی۔

"جی؟"

عینا نے بھی سرگوشی میں ہی پوچھا تھا۔

"یہ چائے بھائی جان کو دے آؤ، پلیز"

چایے اس کے ہاتھوں میں پکڑتی وہ منت کر رہی تھی۔

"میں؟ کیوں؟ میں نہیں جارہی۔"

ٹرے واپس کرتی وہ قطعیت سے بولی تھی۔

"تم اپنے دوست کو ایک چائے نہیں دے کر آ سکتی، مجھے سرمد کی دس کالز آ چکی ہیں۔ پلیز

مجھے ضروری بات کرنی ہے، چلی جاؤ۔"

ٹرے زبردستی اسے پکڑتی وہ سرگوشی میں ہی بولی تھی۔

عینا، اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھیں اماں سائیں اور اپنی ماما کو دیکھتی، تھوک نگلتی ناچار اٹھی تھی۔

"تھینک یو سو مچ!"

اس کے گال کھینچتے وہ چمک کر بولتی، تیزی سے کچن کی طرف گئی تھی۔  
اب اپنے بھائی جان کے لیے اتنا تو وہ کر ہی سکتی تھی۔ فرضی ہاتھ جھاڑتے، وہ اپنے کارنامے پر ہنسی تھی۔

\*\*\*\*\*

وہ کمرے میں داخل ہوا، تو ارادہ فریش ہونے کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

جیب سے فون نکالتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا، اسے لگا تھا کہ شیری یا ضامن کا فون ہوگا، لیکن جیسے ہی نظر چمکتے نام پر پڑی آنکھیں چندھیا کر دوبارہ سے چمکتے نام کو دیکھا، اور پھر کندھے اچکا کر کال اٹھالی۔

رسمی دعا سلام کے بعد منہا نے اسے اسلام آباد آنے کا کہا تھا۔

"میں ضرور آتا، لیکن فل الحال میں اپنے گاؤں آیا ہوں، اور کچھ مصروف بھی ہوں تو یوں ارجنٹ آنا مشکل ہوگا۔"

وہ بہانہ نہیں بنا رہا تھا، سچ ہی تھا۔ جب سے گاؤں کے بارے میں سوچنے لگا تھا چھوٹے موٹے کام وہ اپنی نگرانی میں کروانے لگا تھا۔ تو ابھی کچھ دنوں تک فرصت نہیں تھی، جب کہ منہا نے تو ایرجنسی میں ہی بلایا تھا۔

"Zaigham! I know you have feelings for Aina. But we are friends right? can't you come on my special day?"  
پہلے دوستی نہ صحیح لیکن، منہا کا اعتراف کہ عینا ہی ضیغم کے لیے بنی ہے، تو دوستی بن ہی گئی تھی، وہ بھی منہا کی طرف سے۔

ضیغم اس کی بلیک میلنگ پر بے ساختہ ہنس دیا تھا، اور پھر ہنستے ہنستے ہی اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔

منہا نے سچے دل سے اسے مبارکباد دی تھی، جسے ضیغم نے بھی خوش دلی سے وصول کیا۔

"تو ایسا کرو نا کہ اسے بھی اپنے ساتھ لیتے آؤ۔"

please please! i only want to listen, yes".

منہا بضد تھی جب کہ ضیغم بالوں میں ہاتھ پھیرتا، ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا، یہ لڑکی واقع ہی بہت ضدی تھی۔

"ارے وہ پاگل بھلا وہاں آکر کیا کرے گی۔"

عینا کی دوپٹیاں جب آنکھوں کے سامنے لہرائیں، تو بالوں کو سنوارتا ہاتھ تھم سا گیا اور چہرے پر تبسم بکھر گیا، وہ بالکل جھلی تھی، اس کی پاگل عینا۔

"Minha! try to understand it's not possible for me and

Aina to come on a short notice".

ضیغم نے بھی اب کی بار زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ منہا کی نہ نہ کی تقرر کو سکون آیا تھا۔ ضیغم کو جب اپنی طرف سے سختی کا احساس ہوا تو، ماتھا مسلتا وہ کچھ دھیمے لہجے میں سمجھانے لگا۔

"میں بھی آؤں گا اور اس پاگل کو بھی لے کر آؤں گا، پر ابھی نہیں۔ گرینڈ پارٹی تو رکھو گی تب پہنچ جائیں گے ہم۔ ٹھیک ہے؟"

اور منہا کو کیا چاہیے تھا، وہ بھی مان ہی گئی۔

ضیغم بھی اس کے فون بند کر جانے کے بعد پلٹا ہی تھا کہ عینا کو دروازے پر دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔

وہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی، اور خود کو پاگل کہا جانا اس نے باخوبی سنا تھا، لیکن جب یہ سنا کہ وہ منہا سے اس کے بارے میں بات کر رہے تھے، تو اس کے دل میں شدید ٹھیس اٹھی تھی۔

وہ چھوٹی سی لڑکی جو بات بات پر رو دیتی تھی، اب بھی آشکوں کو آنکھوں میں لبالب بھرا ہوا تھا، لیکن انہیں یہ اجازت نہ دی تھی کہ چھلک کر اس کے دل کا حال بتلا دیں۔ لیکن وہ جھلی یہ بھول گئی تھی، کہ یہی آنکھیں تو سب سے بڑا دھوکہ ہیں، جو راز صاف اگل دیتیں ہیں۔

"عینا!

کیا ہوا ہے؟"

اسے نہ اپنے بے رحمانہ لفظوں کی خبر تھی اور نہ ہی عمل کی جس سے اس کے نھنے سے دل کو درد پہنچایا تھا۔

عینا نے دُبُباتی آنکھوں سے آخری بار اسے دیکھا تھا، ضیغم کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا ان نظروں کا مفہوم جاننا۔

اگر کوئی ناشناس تھی تو وہ تھی عینا، ضیغم تو بہت پہلے سے ہی اس کے دل میں چھپا بھید جان چکا تھا۔ مطمئن بھی تھا، لیکن اب اچانک سے پل بھر میں کیا ہوا تھا کہ ان آنکھوں میں اشک بہہ رہے تھے۔

وہ اس کی طرف تڑپ کر لپکا تھا، پر عینا اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سامنے پڑی میز پر ٹرے دھرتی، مزید خود پر کڑا بندھن نہ باندھ سکی تو منہ پر ہاتھ رکھے کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ جب تک ضیغم اس تک پہنچتا وہ جا چکی تھی، کچھ قدم کمرے سے باہر جا کر بھی دیکھا تھا لیکن وہ سیرٹھیاں چڑھتی اوپر اپنے پورشن کی طرف تیز قدموں سے جارہی تھی۔

پل بھر میں اعصاب کھینچ گئے تھے، وہ نکلین پانی سے بھری آنکھوں میں شکوے، وہ تھے اس نے خود دیکھا تھا، پر کیوں تھے؟

یہ جواب فی الوقت اسے معلوم نہ تھا۔



\*\*\*\*\*

مسافت طے کر کے، دوری برداشت کر کے، جب دنیا کی سچائی کے اژدھے منہ پر پھنکارتے ہیں، تو خوش فہمیوں کے طویل عرصے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور حقیقت کا عکس سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ان کے سامنے بھی جب حقیقت کا روپ آیا تھا، تو والدین کی سنگت، ملک کی محبت اور تحفظ کا ادراک ہوا تھا۔ اس تحفظ کا جو پردیس میں ملنا نہایت مشکل تھا۔

یاسر نواز، اپنی بیوی آمنہ کے اسرار پر ہی ملک سے باہر گیا تھا کہ باہر والے تو جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ وہ کہتے ہیں ناکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، اس کا احساس انہیں وہاں رہتے بہت جلد ہو چکا تھا۔ وہاں کی رنگینیوں، آسائشوں کے جو قصے سنے تھے، وہ محض قصے ہی تھے اس سے زیادہ آرام سکون اور عیش و عشرت تو اپنے ملک میں رہ کر ملا تھا۔

لیکن پھر بھی اپنی خود ساختہ انا کی خاطر پردیس میں رہنے کے لیے دونوں نے کڑی محنت کر کے روز کا گزر بسر چلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

دن گزر رہے تھے، وہ خوشیاں اور سکون دستیاب نہ سہی، لیکن یہ ان کا چنا گیا راستہ تھا، اور اب اس سے پیچھے ہٹنا آمنہ کے لیے ناکامی ہی تھا۔ تبھی وہ دونوں جیسے تیسے کر کے زندگی گزار رہے تھے، جو بھی تھا وہ لوگ پاکستان میں تو اپنا فرضی مقام قائم کیے ہوئے تھے۔

لیکن زندگی بدتر تب ہوئی جب ان کی تمام انوسٹیمنٹ ڈوب گئی، اور جس سے قرض لے کر چھوٹا سا بزنس شروع کیا تھا۔ اور پھر قرض کی ادائیگی نہ کرنے پر یاسر نواز کو جیل جانا پڑا۔

یہ زندگی کا مشکل ترین مرحلہ تھا، پچھلے قرض کی ادائیگی کے لیے مزید قرض لیا گیا، اور یاسر جیل سے باہر تو آگیا لیکن ان کے ویزے کی معیاد بھی ختم ہونے کو آئی تھی۔ یاسر تو شرمندگی کے باعث گھر میں کسی سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا، لیکن اب آمنہ کی خود ساختہ کھڑی کی گئی انا کی دیوار گر چکی تھی۔

اس میں مزید سکت بھی نہیں تھی کسمپرسی کی حالت میں رہنے کی۔ اس سے اچھا تو لپٹوں کی سنگت میں، اپنے ملک میں رہتے ہوئے سنور رہے تھے، یہاں تو ہجر کے ساتھ ساتھ ذرا سٹیٹا گیا اثاثہ بھی بکھرا ہی تھا۔

اور پھر ہمت مجتمع کرتی وہ کئی بار گھر کال کرنے کی کوشش کرتی، یہاں تک کہ ضامن کو بھی کال کرتی، لیکن پھر متوقع رد عمل کا سوچتی ہمت جواب دے جاتی تو فون کاٹ دیتی۔

پر ان کے دن تو تب پھرے، جب ضامن نے خود سے کال کی تھی اور پھر وہ بھی اپنے حالات بتاتی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ وہ تو سوچے ہوئے تھی کہ مقابل کی طرف سے لعن طعن ہوگی یا طنز کے تیر برسیں گے، پر وہاں سے تو صرف تسلی، دلاسا اور امید ہی ملی تھی۔ اور وہ الفاظ اسے خود میں شرمندہ کر گئے تھے، کہاں وہ بھائی کو بھائی سے جدا کر کے لے آئی تھی اور کہاں بھائی، بھائی کے لیے پرانی ہر تلخی کو بھلا کر حاضر ہوا تھا۔

اور پھر ضامن نے کچھ دنوں میں ہی ان کی مالی امداد کر کے انہیں قرضوں سے لکتی دلائی تھی، ایک ہفتے کے اندر اندر وہ اپنے ملک میں قدم رکھ چکے تھے۔

اب دونوں ضامن کہ وجہ سے ہی گھر کے دروازے پر موجود تھے، سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا چھوڑ کر گئے تھے۔

ملاں بھری آنکھوں کے ساتھ یاسر کے دل سے دعا نکلی تھی کہ گھر کے مکین کی محبتوں اور رویے میں بھی فرق نہ آیا ہو۔ پر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماں باپ کی محبت کہاں کم ہوتی ہے بلکہ وہ تو دن بہ دن بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جیسے صلہ بیگم اس کی جدائی میں مزید تڑپ رہی تھیں۔

"یاس۔۔ یاسر!"

کپکپاتی آواز جب صلہ بیگم کے حلق سے نکلی تھی، تو لاونج میں ہی موجود نواز صاحب نے بروقت اخبار اپنے سامنے سے ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ انتظار صرف ماں کو ہی تھوڑی تھا، باپ بھی تو اس دوری کو کاٹ رہا تھا، ہر غم دل کے کونے میں دفن کیے ہوئے تھا۔

ضامن نے ابھی تک نہ نواز صاحب کو کوئی خبر دی تھی، نہ ہی صلہ بیگم کو، وہ یاسر کو ان کے سامنے لا کر ان کے چہروں پر خوشی کے وہ لمحات آنکھوں میں قید کر لینا چاہتا تھا۔ اور راستے میں ہی ان دونوں سے واپس آنے کی اصل وجوہات چھپانے کے لیے بھی کہا تھا، جو ہونا تھا ہو چکا تھا، اب بلاوجہ کی پریشانی انہیں دینا درست نہیں تھا۔

یاسر اور آمنہ کے دل میں اس کی قدر مزید بڑھ گئی تھی۔ ورنہ موقع تو تھا اس کے پاس باتیں سنانے کا، حقیقت کو بار بار منہ پر مارنے کا، لیکن اپنے ایسا کہاں کرتے ہیں۔ اپنے توراں پر پردہ ڈالتے ہیں، ان کا اشتہار نہیں لگاتے۔ کیونکہ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجاتے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اور وہ تو اپنے عمل پر شرمندہ تھے، پھر مزید شرمندہ کرنے کا فعل کچھ اچھا نہ تھا۔

"امی!"

وہ جھاگ کر ان کے سینے سے لپٹا تھا، ماں کا لمس پا کر وہ لمبا چوڑا مرد بھی سسک اٹھا تھا۔

یہاں تک کے گھر کے تمام نفوس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

صلہ بیگم اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھوتیں، تو کبھی بالوں کو سنواری اس کے سچ مچ میں سامنے ہونے کا یقین کر رہی تھیں

کچھ فاصلے پر کھڑے نواز صاحب بھی یاسر کو گلے سے لگانے کے لیے تڑپ رہے تھے، اور پھر ماں کی محبت سمیٹتا وہ باپ کی طرف بڑھا تھا۔ ان کے ڈھیلے پڑتے کندھوں میں یک دم سے جان آگئی تھی۔ دونوں اولادیں زندہ جاوید ان کے سامنے تھیں۔ وہ تو جتنا شکر ادا کرتے کم تھا۔

"امی، بھائی اس لیے تو واپس نہیں آئے کہ آپ روتی رہیں۔ کیوں بھائی؟"

وہ یاسر کا سر اپنی گود میں رکھے مسلسل آنسو بہا رہی تھیں، مانا کہ وہ خوشی کے آنسو پر ضامن کو تو تکلیف دے رہے تھے نا۔

"میں کہاں رو رہی ہوں، میں تو بہت خوش ہوں کہ میرا بیٹا میرے پاس آگیا ہے۔"

آنکھیں صاف کرتیں وہ ضامن کو ڈپٹ کر بولی تھیں، اور یاسر کی پیشانی کو لبوں سے چھوا تھا۔

"اب تو آپ کے پاس ہی رہنا ہے امی، اب کہیں نہیں جاؤں گا میں۔"  
 ان کے کپکپاتے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھتے وہ پورے یقین سے بولا تھا۔ اور  
 پھر احترام ہاتھ کی پشت پر لب رکھ دیے تھے۔  
 وہیں صلہ بیگم تو اپنے جگر کے ٹکڑے کی بات سنتی نہال ہو گئیں۔

آمنہ نے بھی اپنی طرف سے کی گئی نا انصافیوں کی معافی مانگی تھی، جسے صلہ بیگم نے فوراً ہی  
 سینے سے لگا لیا تھا۔ گھر کی رونق جیسے پھر سے بحال ہو گئی تھیں۔  
 نواز صاحب بھی ضامن کو اپنے ساتھ بیٹھائے اپنی زوجہ کو بڑے بیٹے کے لاڈ اٹھاتے دیکھ کر  
 مسکرا رہے تھے۔

"آج کا دن بہت بخت والا ہے، میرا بیٹا بھی گھر آگیا اور ضامن کا رشتہ بھی طے ہو گیا ہے۔"  
 ضامن جو نواز صاحب کی کسی بات پر مسکرا رہا تھا، صلہ بیگم کی یاسر سے کہی بات سن کر  
 خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
 رشتہ پکا ہو گیا؟ یعنی تالشہ مان گئی، یہ خیال آتے ہی خوشی پورے وجود میں خون کی مانند پھیلی  
 تھی۔

نواز صاحب نے بھی اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلاتے شرارتی مسکان کے ساتھ اسے دیکھا تھا تو وہ بھی ڈھیٹوں کی طرح انہیں دیکھ کر ہنس دیا۔

یاسر بھی بھائی کے رشتے کا سن کر خوش تھا، بس ایک آمنہ تھی جس نے اعتراض اٹھایا تھا، وہ کہتے ہیں نا عادت بدل جاتی ہے فطرت نہیں، پر یہاں تو بری حالات کی سنگت سے ہو کر بھی آئی تھی لیکن عادت میں اب بھی سدھار نہیں آیا تھا۔

"ضامن کا رشتہ طے بھی کر دیا اور بتایا ہی نہیں۔"  
آمنہ کے لب و لہجے پر یاسر نے سخت نظروں سے گھورا تھا کہ کہے جملے کا احساس ہوا تو معذرت خواہ لہجے میں بات بنا گئی۔

"کوئی بات نہیں، اب تو ہم آگئے ہیں نا۔  
ویسے لڑکی ہے کون؟ کیا کرتی ہے، خاندان کیا ہے، کچھ تو بتائیں۔"

"ارے سب بتاؤں گی، ابھی تم لوگ تھکے ہو گے آرام کر لو اور ویسے بھی کچھ دنوں میں باقاعدہ رسم کرنے بھی تو جانا ہے۔"

صلہ بیگم اس کی بات پر مسکراتیں بتانے لگی تو ضامن بھی اب جلد سے جلد یہاں سے فرار چاہ رہا تھا تاکہ تالشہ سے بات کر سکے، اب فو حق بھی بنتا تھا۔

\*\*\*\*\*

ضیغم اور شیریں کی باتوں سے وہ واقع گھبرا گئی تھی، ابھی تو امی پیار پیار سے اسے اقرار پر آمادہ کر رہی تھیں۔ لیکن اگر بعد میں ضامن کی بجائے کسی اور سے شادی کروا دیں اور وہ بھی زبردستی تو۔۔۔

بس یہاں آکے سارے بھرم ٹوٹ جاتے تھے۔

ہاں اس نے کبھی اپنے لیے ہمسفر کی کوئی خاصیت نہیں سوچی تھی، نہ ہی اس سمت کبھی خیال گیا تھا لیکن اب جب شادی کی بات چلی ہی تھی، تو اتنا تو اس کو حق حاصل تھا کہ دماغ بھی ایک آئیڈیل سوچ رکھے۔ اور وہ تھا، جو عزت دے، مان دے اس کو بھی اور اس کے کسے لفظوں کو بھی، جب کہ اب تک وہ جتنا ضامن کو سمجھ پائی تھی۔ ضامن ایسا تو نہیں تھا، لیکن کیا کوئی اور جسے وہ ہرگز نہیں جانتی ہوگی کیا وہ ایسا ہوگا؟



اور اس لیکن پر آکر نجانے کیوں ضامن کا پلڑا بھاری ہونے لگا تھا۔ پیار، محبت پر نہ وہ یقین رکھتی تھی، نہ ہی ان خرافات سے اس کا واسطہ تھا۔ پریکٹیکل زندگی گزارنے والوں میں سے تھی، اور ماں بہن کی پسند کو فوقیت دیتی وہ ضامن کے لیے اقرار کا پیغام پہنچا چکی تھی۔

لیکن اقرار کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کی مانگیں نہیں تھیں، ضرور تھیں جسے منوانا اس کا حق تھا۔ اور اسی غرض سے اس نے ضامن کو فون ملایا تھا۔

وہ جو محفل کے درخواست ہو جانے کے انتظار میں تھا، دشمن جاں کا فون کی سکرین پر بلنک ہوتا دیکھ، ایکسکیوز کرتا اپنے کمرے کی طرف آیا تھا۔

"ابھی میں تمہیں ہی کال کرنے کا سوچ رہا تھا۔"

کال اٹھاتے ہی ضامن نے کہا تھا، لہجے سے ہی خوشی جھلک رہی تھی۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہیں۔"

ضامن کی خوشی کو نظر انداز کرتے وہ سنجیگی سے بولی تھی کہ ضامن کی مسکراہٹ مدہم پڑی تھی۔

"ویٹ آ منٹ!"

کہیں تم مجھ سے پھر سے امید تو نہیں رکھ رہی کہ میں رشتے سے انکار کردوں، جب کہ آنٹی نے اقرار بھجوا دیا ہے۔"

ضامن جانچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ تائشہ نے اس کی عقل پر دانت پیسے۔

"آنٹی نے نہیں بلکہ میں نے اقرار بھجوا دیا ہے۔" دانت پیستے، جتلاتے ہوئے کہا تھا کہ ضامن کی بتیسی پھر سے باہر کو آئی تھی۔

"او!"

تو پھر کیا بات کرنی تھی۔"

ہونٹوں کو گول کیے وہ اوپر زور دیتے بولا تھا کہ تائشہ کو اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا۔

"میری کچھ شرطیں ہیں۔"

بنا لگی لیٹی رکھے، وہ اپنے مطلب پر آئی تھی۔

ضامن اسے پسند کرتا تھا تو یقیناً اس کی مانگیں پوری بھی کرے گا، جب کہ کسی اور سے امید رکھنا بے وقوفی ہی تھی۔

"سیریلی!"

کیا تم شرطیں منوانے کی پوزیشن میں ہو؟

ضامن اپنی ٹون میں لوٹا تھا، اس کے مطابق تو رشتہ طے ہو چکا تھا اور کچھ تالشہ کو تنگ کرنے کی نیت سے بھی کہا تھا۔

پر تالشہ نے جواباً جو کہا تھا، وہ سچ مچ ضامن کو مہنگا پڑنا تھا۔

"آپ بھول رہے ہیں، میں نے ابھی کہا ہے کہ رشتے کے لیے اقرار میں نے کیا ہے، اور یہ انکار بھی ہو سکتا ہے۔ کسی بھول میں مت رہیے گا۔

اور ایک بات اور آئندہ آپ مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کریں گے، نہ شادی سے پہلے نہ بعد میں۔"

ٹھر کر اور سرد لہجے میں جتلاتی ہوئی بولی تھی، اور آخر لفظوں میں بلا کا دھونس تھا کہ ضامن کی مہنویں ستالشی انداز میں اٹھی تھیں۔

"جیسا آپ کا حکم۔"

اس کے دھونس بھرے حکم پر سر کو خم دے کر اسے تسلیم کیا تھا۔

"میں آپ سے شادی اس صورت میں کروں گی جب آپ اس بات کا یقین دلائیں گے کہ آپ کا آئندہ مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھے گا۔"

وہ سنجیدہ رہ کر ہی شرطیں منوانا چاہتی تھی، آخر کو اس کی زندگی کا سوال تھا۔ اب جب فیصلہ لیا ہی تھا تو ہر پہلو پر اپنے قدم جمانا بھی ضروری تھا۔

"وہ غلطی اب کبھی نہیں دہراؤں گا، وعدہ کرتا ہوں۔"

ضامن نے بھی سنجیگی سے اس کی پہلی شرط تسلیم کی تھی۔

"وہ کیا ہے نا ضامن نواز خان مجھے آپ کے لفظوں پر نہ ہی یقین ہے اور نہ ہی آپ پر اعتبار۔۔۔"

ابھی اس کی بات جاری ہی تھی کہ ضامن نے سنجیگی سے ٹوکا تھا۔

"حلف نامہ بنوا دوں؟"

اس کے استفسار پر تائشہ نے انکار نہیں کیا تھا، کیوں کرتی وہ تو چاہتی ہی یہی تھی۔

"بالکل"۔

اس کے جواب پر ضامن بھی اپنی بات سے پلٹا نہیں تھا۔

"منظور ہے، تائشہ وسیم خان"۔

پہلی پھانس تو نکلی تھی، لیکن ابھی شرطیں مزید بھی تھیں۔

"اور کچھ؟"

سبخیگی کی جگہ دل فریب لہجے میں سوال آیا تھا، جیسے اس کی مزید شرائط کے لیے منتظر ہو۔

"میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایم بی اے کرنے سے نہ روکیں"۔

اس کے لہجے کے برعکس لفظوں پر دھیان دیتی وہ بولی تھی۔

"میں شادی کے لیے ہاں بھی اسی لیے کر رہی ہوں کہ مجھے اگے پڑھنے سے اور جاب کرنے

سے نہیں روکا جائے گا ورنہ پھر پانچ سال تک انتظار کریں"۔

آج وہ اپنی تمام باتیں منوا کر دم لینے والی تھی۔

ضامن نے آخر میں اس کے بے رحمانہ آپشن پر آنکھیں گھمائیں تھیں۔

"میں کیوں روکوں گا تمہیں پڑھنے سے، جتنا پڑھنا ہو پڑھ لینا لیکن یہ پانچ سال والی شرط نہیں مانوں گا۔"

ضامن بھی آخر میں ضد پر آیا تھا۔

"اب بس؟ یا اور کچھ بھی ہے جو حلف نامے پر لکھوانا باقی ہے۔"

اس کی طرف سے خاموشی پا کر ضامن نے بولنے کے لیے اکسایا تھا، پر تائشہ کے پاس ایک آخری شرط موجود تھی۔

"آخری شرط!"

اگر آپ یہ مان لیتے ہیں تو میں آپ سے خوشی خوشی شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

ایک ہاتھ سے فون پکڑے، دوسرے ہاتھ کے ناخنوں کے ساتھ کھیلتی وہ کچھ اس لہجے میں بولی تھی کہ ضامن کو اس کے لب و لہجے سے ہی خطرے کی بو آنے لگی تھی۔

"کیسی شرط؟"

"آپ کو اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو اس گھر میں آپ کا وہ ٹومی یا کوئی بھی کتا نہیں ہوگا۔"

چہرے پر خاص مسکراہٹ بکھیرے وہ کہہ کر خاموش ہوئی تھی۔  
اس ٹومی سے تو خیر بیر تھا ہی، اور اس کا حل یہی تھا کہ اسے گھر سے ہی نکلوا دیا جائے اور یوں ضامن کی محبت کا امتحان بھی لے لیا جائے گا۔

"ٹومی؟"

کیوں؟ ٹومی کیوں گھر میں نہیں ہوگا؟"

ضامن کو تو اس شرط پر دھچکا لگا تھا، ٹومی کو بچے کی طرح پالا تھا۔ وہ اسے ایسے کیسے گھر سے نکال سکتا تھا۔

"کیوں کہ اس گھر میں، یا تو میں رہوں گا یا پھر وہ کتا۔ فیصلہ آپ کا ہے۔"

یہ شرط واقع خطرناک تھی، تاہم تو پرسکون تھی پر ضامن بے چارا پھنس چکا تھا۔

"تالشہ، ٹومی ہے وہ کتا مت بلاو اسے پلیز، اور وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا آئی پراس تم سے دوستی کروا دوں گا اس کی، لیکن مجھے وہ بہت پیارا ہے، میں اسے گھر سے نہیں نکال سکتا۔" ضامن نے اسے منانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ آخر میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا تھا۔ اور تالشہ تو اس کا ایک کتے کے لیے پیار دیکھ کر ہی جلن کا شکار ہونے لگی تھی۔

"او! تو وہ کتا آپ کو بہت عزیز ہے تو پھر مجھ سے شادی کی کیا ضرورت ہے؟ پیار تو آپ کو اس کتے سے ہے نا۔ میں آخری بار کہہ رہی ہوں مجھے وہ کتا اس گھر میں دکھا تو میں آپ کے ساتھ ہرگز، ہرگز شادی نہیں کروں گی۔" بگڑے تیور کے ساتھ تالشہ نے بھی اپنا فیصلہ سنا کر فون ہی کاٹ ڈیا تھا۔

اور وہاں ضامن سر ہاتھوں میں گرائے اس شرط کا توڑ سوچنے میں مصروف تھا، جس کے دوستوں نے ایک راہ آسان کی تھی دوسری مشکل بھی کھڑی کر دی تھی۔ لیکن فل الحال وہ انجان تھا کہ یہ کارستانی اصل میں ہے کس کی؟ ضامن تو چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، پر یہ مشکل ہی تھا، ایک کو تو کھونا ہی تھا۔



\*\*\*\*\*

آنسوؤں پر کس کا اختیار ہے، جب دل کو ٹھیس پہنچے انہیں تو بہنے کا جیسے بہانہ مل جاتا ہے، اور عینا کے آنسو متواتر بہہ رہے تھے۔

وہ تکیے میں منہ دیے مسلسل روئے جا رہی تھی۔ کمرے میں اکیلے اوندھے منہ لیٹی، نجانے کس کس بات کا غم منا رہی تھی۔

خود کو پاگل کہا جانے کا، ضیغم کا منہا سے بات کرنے کا یا پھر منہا کے سامنے اسے پاگل کہہ دینے کا غم، پر اصل غم تو یہ تھا کہ چوری چپکے وہ دل کے سنگھاسن پر ضیغم ظفر شاہ، اس کا دوست، شان سے براجمان ہو چکا تھا۔

جسے وہ جھٹلانے کے در پر تھی، خود سے بھی اور دوسروں سے بھی۔

نہ وہ تین میں تھی نہ تیرا میں، نہ اس بات کا انکار کر پارہی تھی اور نہ ہی اقرار۔ خیر اقرار کرنا تو اس کے لیے بہت ہی مشکل تھا۔

محبت، پیار جیسے جذبے کی اسے خبر کہاں تھی۔ کچھ دوستوں کی اور کچھ سنبل کی کارستانیاں تھیں، جسے عینا کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اسے تو بس اتنا پتہ تھا کہ جو پسند ہو اس سے شادی کی جاتی

ہے، اور یہاں سنبل نے تو اس سے کہہ ہی دیا تھا کہ دوست کے ساتھ شادی ہو جائے، تو اور کیا چاہیے۔

تمام نشانیاں محبت کے شکاری بن جانے کی ہی تھیں، پر وہی نہ کی تکرار، وہ ماننے سے ہی انکاری تھی۔ یا شاید ضیغم کی طرف سے پیش رفت کی منتظر تھی، پر وہ تو اس سے بے گانہ ہی ہو چلا تھا۔

عجیب بے چینی کی حالت تھی، دل رونے پر اکسا رہا تھا، دماغ آنسو بہائے جانے کی وجہ مانگ رہا تھا۔ اور وہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ اسے دوست کی طرف سے پاگل کسے جانے کا غم ہے۔ اس اصل غم سے انکاری تھی، کہ ضیغم کو کسی اور کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر اسے اچھا نہیں لگا، اسے اچھا نہیں لگا جب اس نے منہا کے سامنے اسے پاگل کہا، اسے تکلیف پہنچی جب اس کے دوست نے منہا سے جا کر ملنے کی بات کی تھی۔ عجیب جلن کا سا احساس ہوا تھا۔ ضد اس کی فطرت میں پہلے سے ہی تھی، پر یہ ضد لپٹوں کے سامنے اور ان کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ کب ضیغم دوست سے بہت اپنے کی فرست میں آیا تھا، اسے نہیں پتہ تھا اور کب دل نے یہ خواہش کی تھی کہ وہ بس اس سے ہی ہنس کر باتیں کیا کرے، اس شرط سے بھی انجان تھی۔

لیکن اب یہ سب وہ ماننے کے در پہ نہیں تھی، پر وجہ بھی تو بتانی تھی۔

اور وہ صرف یہ تھی کہ اسے پاگل کہا گیا تھا، اس بچگانہ سبب بیان کیے جانے پر دماغ نے چاہا قہقہہ لگائے۔

اور وہیں اپنی بے بسی پر اس کے رونے میں شدت آتی گئی۔

"بابا! ہم گھر کب جائیں گے؟"

روئی روئی سو جھی آنکھیں، اس پر گلوگیر لہجہ کے رحیم صاحب جو مریم بیگم کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد کمرے میں موجود تھے، عینا کے کمرے میں آکر بنا تمہید کے سوال پر وہ الجھ گئے۔

"بیٹا ہم گھر پر ہی ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو ادھر آؤ بابا کے پاس، تایا جان کے پاس جانا ہے؟ لے جاؤں نیچے آپ کو؟"

اسے خود کے پاس بٹھاتے، اس کی نم آنکھوں کو دیکھتے وہ پچکارتے ہوئے بولے تھے۔

"نہیں! مجھے گھر جانا ہے، ہم اسلام آباد کب جائیں گے؟"

راہ فرار اس کی اولین ترجیح ہوتی تھی، اب جب دل دکھا تھا، ہتک کا احساس ہوا تھا تو پھر سے وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی، اب بھی حالات سے لڑنا سیکھا نہیں تھا۔

"اسلام آباد کیوں جانا ہے؟ تمہیں نے تو کہا تھا کہ گھر جانا ہے، اب یہاں آ تو گئے ہیں، پھر واپس جانے کی کیا تک؟"

مریم بیگم نے چھبے ہوئے اس کی اس نئی گل افشانی کا جواب مانگا تھا۔

"بابا مجھے نہیں پتہ مجھے یہاں نہیں رہنا، مجھے واپس جانا ہے۔ بابا ہم جائیں گے نا۔"

وہ اب کی بار ان سے لپٹ کر ضد کرتے کہہ رہی تھی، آنسو الگ روانی پکڑ چکے تھے جب کہ آواز رونے کی وجہ سے مزید رندھ گئی تھی۔

"دیکھا آپ نے؟ میں نہ کہتی تھی یہ لڑکی ہے ہی ایسی، پہلے لاہور سے اسلام آباد، پھر اسلام آباد سے حیدرآباد اور اب پھر اسلام آباد، ہم کیا بس اس لڑکی کے لیے شہر ہی بدلتے رہیں گے؟"

مریم بیگم کو تو شدید غصہ آیا تھا جس کا انہوں نے صاف اظہار بھی کیا تھا۔ جب کہ عینا کا رونا بھی شدت اختیار کر گیا کہ رحیم صاحب بھی بوکھلا گئے۔

"کیا ہوا ہے میرا بچہ؟ آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے؟"

اچھا رونا تو بند کرو، میرے بچے کچھ بتاؤ تو صحیح۔"

انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے، مزید رونے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

"رحیم آپ مان لیں، اس لڑکی کا بچپنا کبھی نہیں جائے گا اور یہ سب صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ہے کہ یہ اتنی خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ جب دل کرتا ہے ایک نیا حکم آکر سنا دیتی ہے۔"

مریم بیگم عینا کے بے جا رونے سے چڑتی اب کی بار رحیم صاحب کو لپیٹے میں لے چکی تھیں۔

"بس مریم! میں بات کر رہا ہوں نا؟  
بلاوجہ نہیں رو رہی وہ، کوئی بات ہے تبھی اتنا روئے جا رہی ہے۔  
کیا کچھ دیر کے لیے آپ ہمیں اکیلا چھوڑے گئیں؟"

رحیم صاحب عینا کو پھر سے رونے کی تیار پکڑے دیکھ، مریم بیگم کو جھڑکتے ہوئے بولے تھے۔  
مریم بیگم تو سہمی ہی تھیں، عینا بھی ان کی اونچی آواز پر انہی سے لپٹ کر سسکی بھر گئی۔

مریم بیگم جا چکی تھیں۔ رحیم صاحب کے بہت پوچھنے پر بھی عینا نے انہیں کچھ نہیں بتایا  
تھا، بتاتی بھی کیا ابھی تو خود بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔

یہاں تک کہ باری باری مریم بیگم، سنبل، اور تائی سائیں بھی آکر اسے منانے کے لیے آئی تھیں، پر وہ تھی کہ نہ کچھ بتا رہی تھی اور نہ ہی واپس جانے کے علاوہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اب سب کو ظفر شاہ کا انتظار تھا، جو شہر کام کی غرض سے گئے ہوئے تھے اور دو دن کے بعد ان کی واپسی تھی۔

\*\*\*\*\*

پورا دن گزر چکا تھا لیکن عینا اس وقت کے بعد نیچے نہ آئی تھی۔ کئی دفعہ ضیغم نے کوشش کی کہ اوپر جا کر اس سے بات کر آئے، وہ آنکھیں اسے کسی کل چین آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔ پریوں اوپر جا کر عینا سے بات کرنا بھی اسے معیوب لگا تھا، اس کے اپنے بنائے گئے اصول ہی آڑے آرہے تھے، جنہیں وہ توڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔

آج تو موسم بھی کافی خوشگوار تھا، صبح سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں پر جب اندر کے موسم میں خزا طاری ہو تو باہر کا موسم بھی ویسا روکھا پھیکا ہی لگتا ہے۔

ابھی بھی وہ کمرے سے باہر نکل کر یہی دیکھنے جا رہا تھا کہ عینا نیچے آئی ہے کہ نہیں، اس سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

تیز قدم اٹھاتا وہ دروازہ کھولنے کے لیے لپکا، دل میں شدید خواہش جاگی کہ سامنے عینا ہی ہو، دروازہ کھولنے پر سنبل ہاتھ باندھے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ موجود تھی۔

"آپ نے عینا سے کیا کہا ہے؟"

سنجیدہ رہنے والی وہ تھی نہیں، پر اب تاثرات کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی سنجیدہ تھا۔  
ضیغم تو اس کے لفظوں پر ہی ٹھٹھکا۔

"میں نے؟ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا، بھلا میں اس سے کیا کہوں گا؟ ہوا کیا ہے؟"

خود کو یوں بلاوجہ کا الزام دیا جانا اسے قطعاً پسند نہیں آیا تھا، تبھی سنجیگی سے انکار کے ساتھ ساتھ سوال بھی کیا تھا۔

"جی، آپ نے ہی!"

کیا کہیں گے، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے لیکن کچھ تو ایسا کہا ہے نا کہ وہ کل سے روئے جاری ہے۔ یہاں تک کہ وہ اب یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی۔"

کمرے کی دہلیز پار کرتی وہ عین ضیغم کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اور جو خبر اس نے دی ضیغم خود اپنی غلطی ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"یہاں رہنا نہیں چاہتی؟ پر کیوں؟"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"سنبل جان، میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ کل تو میری اس سے بات ہی نہیں ہوئی۔" اسے یقین دلانا چاہا تھا، پر سنبل نے تو خود اسے ضیغم کے کمرے میں بھیجا تھا، تو اس کا بھائی جھوٹ کیوں بول رہا تھا۔

"جھوٹ مت بولیں بھائی جان، کل میں نے خود عینا کو آپ کے کمرے میں چائے دے کر بھیجا تھا۔ پھر آپ ایسے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ دونوں کے مابین کوئی بات نہیں ہوئی؟ اب سچ سچ بتائیں، آپ نے اس سے کیا کہا ہے؟" استفسار کر کے وہ خاموش ہوئی۔

"ہاں وہ آئی تھی، لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔"



میں تو فون پر بات کر رہا تھا، وہ آئی، چائے رکھی اور چلی گئی۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

بولتے بولتے وہ رکا تھا۔ غلط فہمی، فون، شکوے کرتی نگاہیں، سب سمجھ میں آنے لگا تھا۔

"دیکھو، یہ سب ایک مس انڈر سٹینڈنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ پلیز سنبل جان، اپنے بھائی جان کی مدد کر دو۔"

وہ اس سے التجا کر رہا تھا، معاملہ تو سمجھ چکا تھا اب بس اسے سلجھانا تھا۔

"ہرگز نہیں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ آپ نے میری پیاری سی، چھوٹی سی دوست کو رالیا ہے۔ اگر اماں سائیں یا بابا سائیں میں سے کسی کو پتہ چل گیا نا کہ ان کی گڑیا آپ کی وجہ سے اتنا روئی ہے تو یہ رشتہ تو کینسل سمجھیں۔"

قطعیت سے کہتے وہ آخر میں ضیغ کو خبردار کر گئی۔

"سنبل جان کچھ اچھا بول نہیں سکتی تو زبان کو سکون دے دو۔"

اس کی آخری بات پر وہ رج کر برہم ہوا تھا، برہمی کا اظہار بھی کیا تھا۔ جس پر سنبل نے آنکھیں گھمائیں۔

"اچھا سوری، رکو تو صحیح، پلیز سنبل جان بات تو سنو۔ میں تمہیں دو کی بجائے چار سوٹ لے دوں گا سنو تو۔۔۔۔"

پہلے وہ شاید مان بھی جاتی، پر ضیغم کے برہمی دکھانے پر مکمل نظر انداز کرتی چلی گئی۔ پیچھے ضیغم اسے منانے کے لیے لالچ بھی دیتا رہا، پر وہ بھی سنبل تھی، اپنے نام کی ایک، چار جوڑوں پر تو ہرگز راضی نہیں ہونے والی تھی۔

\*\*\*\*\*

تیز چلتی ٹھنڈی ہوائیں جب اس کے چہرے پر پڑی تھیں، تو طبعیت میں کچھ بہتری محسوس ہوئی۔ لان میں چلتی یہ ہوائیں بھی اسے اپنے سنگ لے جانے کے درپہ تھیں، کہ اب وہ کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

سنبل کئی منتوں کے بعد اسے باہر لان میں لے کر آئی تھی، آب رونا تو بند ہو چکا تھا۔ لیکن ضد ویسے ہی قائم تھی۔ اماں سائیں اور مریم بیگم نے بھی زبردستی سنبل کے ساتھ بھیج دیا کہ باہر کا موسم اچھا ہے دل بہل جائے گا۔

شام کا وقت تھا، آسمان پر بادلوں کا ڈیرا تھا، سورج کے غروب ہونے کا وقت بھی قریب ہی تھا۔ لیکن ان بادلوں کی چادر کی اوٹ میں سورج بھی وقت سے پہلے ہی چھپ گیا تھا۔

"کتنا اچھا موسم ہے نا؟ لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔"  
 بارش کی دیوانی سنبل چمک کر موسم کی خوبصورتی محسوس کرتی بولی تھی۔  
 عینا نے بھی دھیمے سے مسکراتے اثبات میں سر ہلایا۔

آسمان پر ہوا کے زور سے چلتے بادلوں کو دیکھتے اسے ضیغ کا بارش والے دن اسے بے وقوف کہنا بھی یاد آیا تھا۔ ایک بار پھر گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹکنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید رونے کی تیاری پکڑتی، سنبل جو مسلسل کچھ نہ کچھ بولی جا رہی تھی، اسے بازو سے ہلایا تھا کہ عینا چونکی۔

"کہاں گم ہو؟ گیم کھیلتے ہیں۔"

وہ پوچھنے والوں میں سے تھی ہی نہیں، پٹی کو ایک ہاتھ میں پکڑے وہ اسے بتا رہی تھی۔  
 عینا نے ایک نظر پٹی کو دیکھا اور پھر زور و شور سے نہ میں سر ہلانے لگی تھی۔

گیمز وغیرہ سے تو اس کو دلچسپی ہی نہیں تھی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر پکڑنے والے کھیل سے تو دور ہی بھاگتی تھی۔

"نہیں دیدہ پلینز، میں نہیں کھیلوں گی۔"

"کیوں نہیں کھیلو گی؟ شاباش پہلی باری بھی تمہاری ہے، میں آس پاس ہی رہوں گی دیکھنا تم پکڑ لو گی مجھے۔"

اسے پکڑ کر اپنے آگے کھڑا کرتی زبردستی اس کی آنکھوں سے چشمہ اتار کر پٹی باندھ چکی تھی۔

"سنبل دیدہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا میں گر جاؤں گی۔"

دو چکر دے کر جب اسے آگے کو دھکیلا تو وہ ہاتھ خلا میں مارتی اسے تلاش کرنے لگی تھی۔ پر سنبل کھلکھلاہٹ لبوں میں دباتی اسے چھو کر پھر دور ہو جاتی تھی کہ وہ بس چکر کھا کر ہی رہ جاتی۔

سنبل اور ضیغم کی ڈیل ہو چکی تھی وہ الگ بات تھی کہ یہ ڈیل ضیغم کو خاصی مہنگی پڑی تھی۔

وہ لان کی دوسری طرف کھڑا عینا کے بجھے چہرے کو دیکھ رہا تھا، ہوا کے دوش پر ماتھے پر بکھرتے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتا، قدم قدم چلتا ان تک پہنچنے لگا تھا۔

سنبل جو اچھے موسم میں یہ اچھا سا گیم کھیلنے کی خواہش مند تھی، ضیغم کو اپنے پاس آتا دیکھ کر منہ بسور کر اسے انگلیوں سے پندرہ منٹ کا اشارہ کرتی قدم پیچھے کو لے گئی تھی۔

اب لان میں صرف عینا اور ضیغم ہی موجود تھے۔ لان کی پچھلی طرف کا حصہ تھا، جہاں ملازم آیا نہیں کرتے تھے اور شام کا وقت تھا ویسے بھی سب اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ تو ضیغم کے پاس وقت بھی تھا اور موقع بھی کہ فرصت سے اس کی بھولی صورت بنا روک ٹوک کے نہاتا ہی رہے۔

دونوں ہاتھوں کو ٹراؤزر کی جیب میں ڈالے، وہ ہونٹوں پر تبسم بکھیرے اسے ہاتھ پھیلا کر اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔

عینا کی آج بھی ویسی ہی دو چٹیاں کی گئی تھیں، اماں سائیں نے ہی بڑے لاڈ سے چٹیاں بنائی تھیں کہ وہ انکار ہی نہ کر سکی۔ ورنہ کل کے بعد دل تو نہ تھا۔

"پکڑ لیا!"

وہ جو ہاتھ پھیلا کر چلتی آرہی تھی، ہاتھوں کو کسی وجود سے مس ہوتے دیکھ وہ فوراً آگے کو لپکی تھی کہ گرتے گرتے بچی کیونکہ مقابل نے اسے تھام لیا تھا۔

بھاری ہاتھوں کو اپنے بازوؤں پر محسوس کر کے اسے سنبل کے آس پاس نہ ہونے کا گمان گزرا تھا، آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی تو مٹا مٹا سا، ضیغم کا دھندلا عکس آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ پلک جھپک جھپک کر دیکھا تب بھی وہی تھا، دھندلا نظر آتا ضیغم جو اس کی آنکھوں میں خود کا عکس دیکھتا مہبوت سا رہ گیا۔

جب کئی بار دیکھنے پر بھی وہ ضیغم ہی نظر آیا، تو جھٹکا دے کر خود کو اس کی بازوؤں کی گرفت سے نکالنا چاہا تھا جو ضیغم نے اسے گرنے سے بچانے کے لیے پکڑا تھا۔ لیکن گرفت میں نرمی بھی نہ تھی کہ وہ خود کو اس کے حصار سے چھڑوا سکتی۔

"روئی کیوں تھی؟"

اس کی سوچی آنکھوں کو دیکھتے وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

نمی تو اب بھی ہلکی ہلکی نینوں میں تیر رہی تھی، اور خود کو چھڑوانے کی کوشش بھی جاری تھی۔

"مجھے آپ سے بات نہیں کرنی، چھوڑیں مجھے۔"

جواب دینے کی بجائے وہ اپنی بات کہے گئی۔ وہاں کھڑا رہنا ہی محال تھا، تبھی اس کی گرفت سے نکلنے کی خاطر ہاتھ پاؤں تیزی سے چلا رہی تھی۔

"نہیں چھوڑوں گا، پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ اور آرام سے کھڑی رہو۔"

وہ بھی اپنی بات پر بضد رہا، آخر میں کچھ سختی سے کہا کہ عینا کی مزاحمت رک سی گئی اور وہ شانت سی دانت بھینچتی ناک کے ننھنے پھلائے اسے دھنلی آنکھوں کے ساتھ گھورنے لگی۔

"اب بتاؤ، روٹی کیوں تھی؟"

اس کی بار بار جھپکتی پلکوں کو دیکھتے، بہت پیار سے پوچھا تھا کہ عینا نے ناراضی دکھاتے منہ ہی موڈ لیا۔

ضیغم اس کے انداز پر مسکراہٹ لبوں پر ہی دبا گیا۔

"سنبل جان کہہ رہی تھی کہ تمہیں یہاں نہیں رہنا، واپس جانا ہے کیوں؟"

اس نے سوال کے الفاظ بدلے تھے مقصد وہی تھا۔ عینا نے اب بھی خاموشی نہیں توڑی تھی۔

"عینا!

اپنے دوست کو نہیں بتاؤ گی۔"

بڑا دل فریب، نرم سا انداز تھا کہ عینا کا سارا ضبط کہیں کھو سا گیا۔

"نہیں ہیں آپ میرے دوست۔ مجھے نہیں بنانا آپ کو دوست، آپ گندے ہو مجھے کبھی بے وقوف کہتے ہو، کبھی پاگل کہتے ہو۔ اس، مہنا آپی کے سامنے بھی مجھے پاگل کہا۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

پھر بھی آپ مجھے پاگل کہتے ہو۔ سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ سب گندے ہیں، آپ بھی گندے ہو بہت گندے ہو۔ مجھے نہیں رہنا یہاں۔"

وہ چلاتی، بازوؤں کو اس کی گرفت سے رہائی دلوانے کے لیے ہاتھوں کے مکے اس کے چوڑے سینے پر برسارہی تھی۔

پر ضیغم خاموش سا اسے سنے گیا، اس کے دل میں جما غبار لفظوں اور آنسوؤں کی صورت میں باہر نکل رہا تھا۔



ضیغم کے دھندلے عکس پر نظریں جمائے وہ اپنی بھڑاس نکال چکی تھی، اور اب لمبے لمبے سانس لیتی ہچکیاں حلق میں ہی روک رہی تھی۔

"ہاں پاگل کہا، بے وقوف بھی کہا پر پیار سے کہا تھا نا۔ اس میں اتنا ناراض ہونے والی کون سی بات ہے؟"

اس کے مکوں کے حملے جب شانت ہوئے تو گال پر بہتے آنسوؤں کو انگلی کی پوروں سے صاف کرتے شیفتگی سے اقرار کے ساتھ توجہ بھی پیش کی تھی۔

"پیار سے نہیں کہا تھا، آپ پیار کرتے ہی نہیں ہیں۔ آپ نے منہ آپی کے سامنے مجھے پاگل کہا، آپ صرف انہیں سے پیار کرتے ہیں۔"

اب جب جرح ہوئی تھی، تو سچ بھی شکوے کی صورت میں باہر آہی گیا تھا۔

اور وہاں ضیغم اس کے پہلے جملوں پر نہال ہوا تھا تو وہیں اس کے آخری جملے کی قیاس آرائی پر سخت بدمزہ بھی۔

"کرتا ہوں پیار، اور پیار سے ہی کہا تھا۔"

دھیمے سروں میں اس نے اعتراف کیا تھا سرگوشی کی صورت میں نکلی آواز جب عینا کی سماعتوں کا حصہ بنی تو نہ لفظوں کے سحر کا اثر ہوا نہ لہجے کے خمار کا، وہ اب بھی اپنی ہی بات پر اڑی تھی۔

"نہیں کرتے پیار۔"

وہ بھی نروٹھے انداز میں گردن گھماتی سوں سوں کرتی، اس کے اقرار کی نفی کر رہی تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں پیار نہیں کرتا؟" آنکھوں میں خاص چمک لیے، خاص انداز میں اس کی دھندلائے عکس سے بھری آنکھوں میں دیکھے وہ جتلاتا ہوا سوال کر رہا تھا۔

وہیں عینا کو بھی اپنے منہ سے نکلے لفظوں کا احساس ہوا تھا، پلکیں خود بخود لرز گئی تھیں، اس کے دھونس بھرے سوال میں صاف پیار کا خمار چھلک رہا تھا کہ وہ جو آنکھیں پڑھنا نہیں جانتی تھی اس میں موجود سچائی کو جانتے مزید ان دھندلی نظر آتی آنکھوں میں دیکھ ہی نہ سکی۔

بڑی معصوم سی ہو تم جاناں

ہر بات سے انجان ہو تم جاناں

یہی بے خبری تمہاری

میرے دل میں گھر کرتی ہے

یہ جو تمہاری نشیلی آنکھیں

کبھی چھپاتی ہیں راز دل کے

کبھی ہیں یہ دل کی کتاب آنکھیں

پوچھا اس نے مجھ سے کہ

کہہ رہی بستی ہے دنیا تمہاری

یہ دیوانہ کہے گا

مثال تمہاری آنکھیں

یہ جو بھوری ناگن سی خم دار زلفیں

سایہ فگن ہے تمہارے رخ پر

یہ مجھے رقیب رو سیا لگتی ہیں

شہر کثرت میں منفرد دکھائی دیتی ہو

مجھے تم کسی اور جہاں کی لگتی ہو

یہ جو تم لوگوں سے چھپتی ہو



اچھا یہ کام کرتی ہو کہ  
 ہیرا نظروں میں آنے پر  
 نظر لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے  
 مگر آج کے پل کچھ خاص ہے جاناں کہ  
 مجھے میرے دل کی بات عیاں کرنی ہے  
 جذبوں کو لفظوں کی زبان دینی ہے  
 وہ باتیں جو میری آنکھیں کہا کرتی ہے  
 آج وہی باتیں اپنے لبوں سے ادا کرنی ہے  
 کہ تم کو میرے جذبوں تک رسائی دینی ہے  
 بس آج مجھ کو فسانہ دل بیان کرنا ہے

شیخ اقرء نور

لرزتی، جھکی پلکوں پر نظریں جمائے وہ لفظ لفظ میں طلسم پھونک کر اس کی سماعتوں تک پہنچا رہا  
 تھا، ہر جملہ اس کے دل کا حال بیان کر رہا تھا۔

دل کا افسانہ خوبصورت سی شام میں متاع جان کے آگے پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ جو مجسمہ حیرت بنی جہاں تھی وہیں تھم سی گئی جیسے سانس لینا بھی بھول گئی ہو ہر لفظ کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگتی۔ اور دل کی اس قدر تیز چلتی دھڑکنوں سے گھبرا سی گئی۔

آج موقع بھی تھا، وقت بھی اور ضرورت بھی، تو اقرار محبت ہو چکا تھا، وہ خاموش ساکن اپنے سے ایک قدم کی دوری پر کھڑی عینا کو دیکھتا ہی رہا، جو اسی کی گرفت میں موجود تھی۔

یہاں اس کا اقرار تمام ہوا تھا، وہیں بارش کی پہلی بوند عینا کی صاف پیشانی پر گری تھی جو پھسلتی آنکھ پر بہتی رخسار پر پھیل گئی۔ جہاں عینا ٹھنڈی بوند پر جھرجھری لے کر مراقبے سے باہر آئی تھی۔ وہیں ضیغم کی نظروں نے فرصت سے بارش کی پہلی بوند کی گستاخی دیکھی تھی۔

"یہ بارش کی پہلی بوند بھی گواہ ہے عینا رحیم شاہ کہ ضیغم ظفر شاہ تم سے پیار کرتا ہے اور بے شمار کرتا ہے۔ اب سے نہیں بلکہ تب سے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، تب سے یہ گستاخ دل تم جیسی پاگل کے ہی گن گاتے آیا ہے۔ اب بھی پاگل ہی کہوں گا اور قسم کھا کر کہتا ہوں پیار سے کہہ رہا ہوں۔"

چاہ لہجے میں سمائے، کہا اور آخر میں اس کے کان کے پاس جھکتے سرگوشی کی تھی کہ عینا لے ساختہ رخ موڑ گئی۔

بارش کی بوندیں متواتر دونوں کو بھگو رہی تھی، سرمئی چادر بھی دھیرے سے آسمان کو ڈھک چکی تھی، ہلکی سی روشنی میں ضیغم تو صاف اپنے پاس کھڑی عینا کا چہرہ اور اس پر بکھرتے ڈھیروں رنگ دیکھ سکتا تھا لیکن اب عینا کے لیے دھندلا منظر مزید دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ اوپر سے بارش کی پرتی پے در پے بوندوں پر وہ آنکھیں میچ گئی۔

اس کے سامنے وہی تھا جس نے اسے بارش کی خوبصورتی کا احساس دلایا تھا، اب اس کا وہ روپ بند آنکھوں میں سما گیا تھا اور آج بھی وہی تھا اس کے سامنے جس کے ساتھ بنا گھبرائے وہ بارش میں بھیگ رہی تھی بنا چیخے، چلائے سہمے، گھبرائے بس کھڑی تھی۔ آخر کو اس کے حصار میں کھڑی تھی، ڈر کیوں کر محسوس کرتی۔

"اب آیا یقین، کہ پیار کرتا ہوں اور پیار سے کہا تھا۔"

ایک ہاتھ سے اس کے بازوؤں کو نرمی سے جکڑے، اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کے جھکے چہرے کو ٹھوڑی سے اونچا کیا تھا۔

اس کے بار بار پلکیں جھپک کر ضیغم کو دیکھنے کی سعی کرنے، پر ضیغم کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ رینگ گئی۔

وہ اب بھی جواب کا خواہ تھا، پر عینا کے لیے جواب دینا تو دور اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا ہی مشکل تھا وہ تو اچھا تھا کہ ایک ہاتھ سے ضیغم نے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا کہ اس کے سہارے وہ اب تک کھڑی تھی۔

بارش کی بوندیں مسلسل دونوں کو بھگورہی تھیں، اور اسی بارش میں ضیغم کے پیار کے اقرار کی بارش بھی اس پر برسی تھی، جس سے گال گلال ہو چکے تھے پلکوں پر بوجھ سا چھا گیا تھا اور آنکھوں میں حیرت کے ساتھ حیا کے ڈھیروں رنگ سما گئے تھے۔

"اگر نہیں آیا یقین تو کوئی بات نہیں۔ شادی کے بعد میں خود تمہیں یقین دلا دوں گا۔"

ماتھا اس کی سر کی مانگ سے ٹکاتے وہ شدت جزبات سے گویا ہوا تھا۔

شادی کے ذکر پر سنبل کی کہی باتیں یک دم سے دماغ میں گھومنے لگی تھیں، آنکھیں پھیلائے وہ پھر سے ضیغم کو دیکھنے کی سعی کرنے لگی تھی۔ پر جب وہ ایک قدم کا فاصلہ مٹاتا اپنے سر کو اس کے سر کے ساتھ جوڑ چکا تھا، جیسے دونوں کے دل آپس میں جڑ چکے تھے، تو وہ بدک کر ایک قدم پیچھے لینا چاہتی تھی اور یہ کاروائی ضیغم نے ناکام بنائی تھی۔

ہلکی سی برستی بارش میں وہ بھگیتا عینا کو دل کے بے حد قریب محسوس کرنا چاہتا تھا، اتنا حق تو پیار کے جز بے میں وہ رکھتا ہی تھا۔

اور پھر کچھ پل کی بوندا باندی نے زور پکڑا تھا، اور مینہ برسا تھا۔ چھابوں پانی ان دونوں کے اوپر برسا تھا کہ عینا بے ساختہ ٹھنڈی بوندوں کی پھوار پر جھرجھری لے گئی۔  
ضیغم بھی جزبات کی روش سے باہر آیا تھا، ہلکے سے سر کو پیچھے لے جاتا، تھوڑی سی روشنی میں اس کی جھکی پلکوں کو دیکھا، پھر نظریں سرخ ہوتی ناک پر پڑیں اور پھسلتی بھگے کپکپاتے ہونٹوں پر جا ٹھہریں۔

"عینا!

اماں سائیں اور چاچی سائیں پریشان ہو رہی ہیں۔ آجاؤ اندر چلیں۔"  
وہ دور سے ہی بولتی ہوئی ان کے قریب پہنچی تھی، دور سے اندھیرے میں صرف دو ہیولے ہی نظر آئے تھے۔

اور ضیغم سنبل کی پہلی آواز پر ہی عینا سے فاصلہ بنا کر کھڑا ہو چکا تھا۔  
جب تک سنبل ان دونوں تک پہنچی تھی، ضیغم نے عینا کے بازوؤں کو بھی گرفت سے آزاد کر دیا تھا اور اب وہ کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل کھڑی تھی۔



"اف! ساری گیلی ہو گئی ہو تم، یہ لو پہنو اسے۔ اور اندر چلیں۔"  
ضیغم کو مکمل نظر انداز کیے عینا کو مکمل بھیکا دیکھ کر چشمہ پکڑا یا تھا۔

"پندرہ منٹ کا کہا تھا، پر آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے اب ڈیل بھی ڈبل ہو گئی ہے۔"  
جب تک عینا نے چشمہ پہنا تھا سنبل قریب کھڑے ضیغم کے کان میں سرگوشی کرتی چلتی  
ہوئے عینا کا ہاتھ پکڑتی ساتھ لے گئی۔

بیچھے وہ جو ابھی عینا سے بھی اقرار سننے کا خواہا تھا، سنبل کے آجانے پر بدمزہ تو ہوا تھا، لیکن  
اس کے آفر بڑھانے پر تاریکی میں بھی نظر آتے اس کے ہیولے کو دیکھتے دانت پیس گیا۔

"کتنی چالاک ہے یہ۔"

بڑبڑاتے اسے اپنی چالاک اور میسنے پن کا احساس ہوا تو لب بھیج کر مسکراتی آنکھوں کے ساتھ  
نفی میں سر جھٹکا۔

یہ میسنہ پن تو دونوں بہن بھائی کی فطرت میں شامل تھا، ہاں یہ اندازہ مشکل تھا کہ کون بڑا  
چالاک اور میسنہ ہے۔

\*\*\*\*\*

شام سے گرمی رات ہو چکی تھی، باہر بارش ٹوٹ کے برسی تھی کہ گرمی کی لہر کو اپنے ساتھ بھا کر لے گئی، وہیں وہ کمرے میں دہکی اس ٹھنڈے موسم میں چہرے پر جھلستی حیا کی تپش سے گھبرائی ہوئی تھی۔ ضیغم کی پرحدت سانسیں، اپنے چہرے پر وہ اب بھی محسوس کر رہی تھی پر اس سب سے بھی زیادہ گھبراہٹ اس کے اقرار و اظہار سے ہو رہی تھی۔ دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ اقرار سنے، اور دل کا وہ کونا اس اقرار پر خوش و خرم بھی تھا لیکن باقی وجود تو زلزلوں کی زد میں تھا، حیرت بھی تھی خوشی بھی تھی، جسے وہ ناممکن سمجھتی تھی وہ ممکن ہو چکا تھا، تو دنگ بھی تھی۔

"یہ بارش کی پہلی بوند بھی گواہ ہے عینا رحیم شاہ کہ ضیغم ظفر شاہ تم سے پیار کرتا ہے اور بے شمار کرتا ہے۔"

اس کے کانوں میں کسی ساز کی صورت میں یہ جملے بج رہے تھے۔

"اگر نہیں آیا یقین تو کوئی بات نہیں۔ شادی کے بعد میں خود تمہیں یقین دلا دوں گا۔"

اس جملے کو یاد کرتے، تو بے ساختہ ہاتھ دل کے مقام پر گیا تھا، جہاں دھڑکنیں الگ شور مچائے ہوئے تھیں۔

نچلے لب کو دانتوں سے کترتی ادٹنے والی شرمیلی مسکراہٹ کو روکنے کی ناکام سعی کرتی بے بس سی دکھتی تھی۔

ابھی وہ خود کو سنبھالتی اور ضیغ کے محبت کے اقرار کا خود کو یقین دلانے میں مچو جستجو تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بج اٹھا تھا۔

"گڑیا، کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟"

انگلی سے دروازہ بجاتے وہ اندر آنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔

ان کی آواز کو پہچانتی فوراً سے دروازے کے پاس پہنچی تھی، اور تپتے گالوں کو تھپک کر خود کو پرسکون رکھنے کی آخری کوشش کرتے دروازہ کھول دیا تھا۔

"تایا جان! السلام علیکم۔"

ظفر شاہ کو اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑے دیکھ کر ان سے لپٹ کر سلام کیا کہ وہ بھی محبت سے اسے پیار کرتے، اور اسے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

"وعلیکم السلام کیسا ہے میرا بچہ؟ پیچھے آپ کو کسی نے تنگ تو نہیں کیا؟"

رحیم صاحب ان سے بات کر چکے تھے، اور معاملہ انہیں کے حوالے کیا تھا۔ آخر کو جانتے تھے کہ ظفر شاہ اپنے قول و فعل کے پکے ہیں، اور عیناً تو انہیں اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی وہ اس کی خوشی کی خاطر ہر قدم اٹھا جائیں گے۔

اور اب بھی وہ شفقت سے اسے ساتھ بٹھائے سرسری سا پوچھ رہے تھے۔

"ٹھیک تایا جان۔"

دھیمی مسکان اور آنکھوں میں جگنو کی سی بھری روشنی کے ساتھ جواب دیا تو ظفر شاہ کے دل کو بھی ڈھارس پہنچی تھی۔

ورنہ آنے پر جو خبر رحیم صاحب نے انہیں دی تھی اس کے بعد تو ڈر سا لاحق ہو گیا تھا۔

"تو پھر باہر سب کیا کہہ رہے ہیں کہ ہماری گڑیا ہم سے ناراض ہو کر واپس جانا چاہتی ہے، ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا؟"

وہ اس کے مسکراتے چہرے پر نظریں ڈالتے استفسار کر رہے تھے

"نہیں بتایا جان، میں تو ناراض نہیں ہوں۔"  
وہ فوراً جواب دیتی انہیں مسکراتے پر مجبور کر گئی۔

"تو پھر ہماری گڑیا، ہمارے ساتھ ہی رہے گی نا۔"  
اسے خود کے ساتھ لگاتے بولے کہ عینا نے چہرہ اونچا کرتے انہیں دیکھ کر سر اثبات میں ہلایا۔

"ہماری گڑیا، ہماری پیاری سی بیٹی ہے۔ ہماری بات بھی مانے گی؟۔"  
اس کے جھٹ سے ہاں میں سر ہلانے پر مسکراتی آنکھوں کے ساتھ سوال کیا تھا کہ ویسے ہی چہرہ اونچا کیے، انہیں دیکھتی وہ پھر سے معومیت سے سر ہلانے لگی۔

"تو کیا میری بیٹی ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گی؟"  
وہ جانے کیوں اتنے سوال کر رہے تھے، عینا کے ماتھے پر الجھی لکیر ابھری تھی۔ پھر مسکراتے اس سوال پر بھی ہاں میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن اس کے لیے ہمیں ایک کام کرنا ہوگا۔"

وہ پرسوج لہجے میں گویا ہوئے تھے کہ عینا ان سے الگ ہوتی آنکھوں کو بڑا کیے دیکھنے لگی۔

"کون سا کام تایا جان۔"

پھر چشمہ درست کرتی کام بھی جاننا چاہا، کیونکہ اسے اب یہیں رہنا تھا اپنوں کے پاس، اپنوں کے قریب۔ ان اپنوں میں ایک وہ بھی تو تھا۔

"ہماری جان سے پیاری گریا کو، ہمارے بیٹے ضئی سے شادی کرنی ہوگی، کروگی شادی ضئی سے۔"

وہاں جو وہ نا سمجھ تاثر بھری نظروں سے جواب کی منتظر تھی، جواب آنے پر یکبارگی احساسات منجمد سے ہو گئے، جیسے سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر دھیرے سے سکتا ٹوٹا، جو سنا اس کے سچ ہونے کا گمان ہوا تو پلکیں گالوں پر سایہ کر گئیں، حیا کی لالی بھی گالوں پر چھاپ چھوڑ گئی، اور انگلیاں چٹختی آنکھیں ہی میچ گئی۔

"میرا پیارا بچہ، اب ہم اپنی جان کو کہیں جانے نہیں دیں گے۔"

اس کے چہرے پر چھلکتے اقرار کے سامنے کسی لفاظی اقرار کی ضرورت بھی نہ تھی۔

ظفر شاہ اس کے رخ پر آتے رنگوں کو دیکھ کر ہی اس کے اندر کا حال جان گئے تھے، مزید اسے کسی امتحان سے گزارنے کی بجائے، اسے ایک بار پھر خود سے لگائے محبت سے بولے تھے کہ وہ ان کی شفقت میں آتی لمبے لمبے سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی سعی کرنے لگی۔

رحیم صاحب، نے یہ بیڑا بھی ظفر شاہ کے سپرد کیا تھا۔ کیونکہ اگر عینا انکار کر دیتی تو وہ اپنے ظفر بھاسے انکار کیسے کر پاتے، تبھی انہیں ہی بھیجا تھا کہ اپنی گریبا کو یہ خبر بھی دے دیں اور اس کا جواب بھی سن لیں۔

اور اب یہ جواب سن کر ان کے ساتھ ساتھ تمام گھر والے خوشیاں منا رہے تھے۔

\*\*\*\*\*

قسمت کے تو رنگ ہی انوکھے چڑتے ہیں۔ آج سے ایک سال پہلے جہاں ان کی آنکھوں میں اپنے ہمراہی کا عکس خواب و خیال میں نہ تھا، آج آنکھوں میں اور دل میں انکی چھوی صاف اپنی چھاپ چھوڑ چکی تھی۔ اور اب تو انہیں اپنا بنانے کا، ان کی رفاقت میں ساری زندگی گزارنے کا حق حاصل ہونے والا تھا۔

جہاں شہریار، ہیر کی شادی دسمبر کی چھٹیوں کے دنوں میں طے پائی تھی۔ وہیں ضامن اور ضعیف نے بھی شادی کے وہی دن رکھوائے تھے۔

مسرت بیگم نے اعتراض اٹھایا تھا، تو صلہ بیگم نے انہیں تمام کام خوش اسلوبی سے ہو جانے کا یقین دلایا۔ تائشہ کی بھی تمام شرطیں پوری ہو چکی تھیں، شہریار اور ضامن کی موجودگی میں ہی ضامن نے تمام شرطوں پر سائن کیے تھے۔ یہاں تک کہ صرف اور صرف تائشہ کے لیے اپنے ٹومی کو خود سے دور بھی کیا تھا۔

اس میں بھی ضعیف نے دوستی کا حق ادا کیا اور ساتھ میں اپنی ہونے والی بیوی کو خوش بھی کیا تھا۔ ضعیف کو ایک تیر سے دو شکار کرنے آتے تھے، اور اچھے لفظوں میں اپنا خیال دوسروں کے ذہنوں میں چھوڑنا بھی آتا تھا۔

ضعیف نے ٹومی ضامن سے لے کر عینا کے حوالے کیا تھا، جہاں ضامن ٹومی تحفظ کی یقین دہانی پر سکون میں آیا تھا، وہیں عینا بھی ٹومی کے ساتھ بہت خوش تھی، وہ الگ بات تھی کہ ٹومی کے آجانے کے بعد اسے اپنا دوست بھول گیا تھا، فی الحال ضعیف کو تو یہی لگ رہا تھا۔ جلدی شادی پر مریم بیگم نے بھی اعتراض اٹھایا تھا کہ ابھی ان کی بیٹی کی عمر ہی کیا ہے، بلکہ وہ تو ابھی صرف نکاح کرنے کو ہی کہہ رہی تھیں، پر ضعیف نے اپنا پلان جب بتایا کہ وہ عینا کی پڑھائی تک اسلام آباد رہ کر ہی اپنا بزنس چلانا چاہتا ہے، اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ



کے لیے جلی آجائے گا، تو جب تک وہاں رہے عینا بھی اس کے ساتھ ہو۔ تو مریم بیگم کو بھی ماننی ہی پڑی۔

تینوں جوڑوں کی شادی کی تاریخ جیسے جیسے قریب آرہی تھی، تیاریاں زور پکڑ رہی تھیں۔ وہیں قسمت کی ستم ظریفی یہ بھی آن پڑی تھی کہ تینوں دلوں کو ان کی دلوں کی شکل تک دیکھنی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔

عینا اسلام آباد واپس چلی گئی تھی، ضیغم کی طرف سے اس کے آگے پڑھنے کا فیصلہ قرار پایا تھا تو اسے پڑھنا ہی تھا۔ جب کہ تائشہ اور ضامن کے مابین کبھی پیار محبت والی باتیں ہوئی ہی نہیں کہ ضامن کسی آس پر تائشہ کو فون کرتا تو وہ اٹھا لیتی، تبھی وہ سارے ادھار شادی کے بعد چکانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔

بچا شہریار تو، وہ جو ہیر کو یہ یقین دہانی کروا چکا تھا کہ اس کی اماں سے بات کرے گا، تاکہ ہیر مزید کچن کے کاموں سے بچ جائے۔ لیکن شہریار کے بات کرنے پر بھی اماں کی طرف سے سختی تب بھی برقرار تھی۔ اور ناچار ہیر کو کاموں سے جان چھڑوانے کے لیے یونیورسٹی کا سہارا لینا پڑا تھا، اس کا ارادہ تو نہ تھا پڑھنے کا پر باورچی خانے کی آگ سے اچھا تھا کلاس میں بیٹھ کر لیکچر سن لیا جائے۔ آخر کو ایک یہ بھی امید تھی کہ شادی کے بعد تو پڑھائی سے جان چھوٹ ہی

جائے گی، اب یہ ہیر کی خام خیالی تھی کہ حقیقت، اس کا پتہ تو آنے والے وقت نے ہی دینا تھا۔

\*\*\*\*\*

وہ دن بھی آ ہی پہنچا جب محبت کو رفاقت کا ساتھ ملنا تھا، ایک دوسرے کی تا عمر سنگت نصیب ہونا تھی اور ان کی محبت کو تکمیل کا سفر طے کرنا تھا۔

کل مہندی کی رسم کے ساتھ ساتھ دونوں جوڑوں کے نکاح کا فریضہ بھی ادا کیا جا چکا تھا، اور آج بارات تھی۔

ایک بڑے سے ہال میں جہاں خوشیوں بھری کھلکھلاہٹ گونج رہی تھیں، ہنسی کی جھنکاریں سنائی دے رہی تھیں، وہیں ایک طرف بنائے گئے بڑے سے سیٹج پر تین، دو سیٹر صوفے رکھے گئے تھے۔ جن پر تینوں جوڑے براجمان تھے۔

درمیان کے صوفے پر، شربتی رنگے کے بھاری لہنگے میں، زینت سے منور ہوتے چہرے کو گھنوں گھٹ میں چھپائے عینا رحیم، کالی شیروانی میں ملبوس ضیغم ظفر شاہ کے سنگ بیٹھی تھی۔

ان کے دائیں طرف شہریار بھی سفید اور سنہری رنگ کے امتزاج کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھا، جب کہ ہیر گھونگٹ میں خود کا دو آتشی حسن قید کیے، گہرے سنہری رنگ کا عروسی جوڑا پہنے بیٹی تھی۔

اور بائیں طرف مہرون رنگ کے کام دار، پھٹانی انداز میں خوبصورت سے لہنگے میں تائشہ بھی اپنا پھٹانی حسن سب سے چھپائے سکڑی سمٹی سی ضامن کی سنگت میں بیٹھی تھی، جس نے آج کے اس یادگار دن کے لیے بادامی رنگ کی شیروانی کا انتخاب کیا تھا۔

جہاں دلہنوں کے چہرے سے چھلکتے حسن اور ان پر پھیلے حیا کے رنگ دیکھنے سے سب محروم تھے، وہیں سب شہزادہ صفت بیٹھے تینوں دلہوں کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے دلہنوں کے نصیب کو سراہا جا رہا تھا۔ لیکن اگر وہ آج کے دن ان دلہنوں کو دیکھ لیتیں تو ضرور ان دلہوں کی قسمت پر رشک بھی کرتیں۔

ضیغم، ضامن اور شہریار ان تینوں کے لبوں سے مسکراہٹ پل بھر کے لیے بھی غائب نہیں ہوئی تھی۔ ضیغم نے اپنے چہرے پر اترتی خوشی کے اثار چھپانے کی کوشش تو کی تھی، پر سنگت کا اثر تھا کہ مسکراہٹ چھپ ہی نہیں پارہی تھی۔ اور شہریار عالم کے تو دانت تھے، جو

کب سے باہر ہی تھی اور ان کا منہ کے اندر جانے کا فی الوقت کوئی ارادہ بھی نہ تھے، ضامن اور ضیغم کے بقول اس کی آزادی کا آج آخری دن تھا، دانتوں کی نمائش بنتی تھی۔

"کتنے خوش قسمت ہیں نا ہم، جسے چاہا اسے پالیا۔"

وہ تینوں کچھ فاصلے پر کھڑے، سٹیج پر ان سے رخ موڑے بیٹھی اپنی دلسنوں کو دیکھ رہے تھے، کہ شہیار نے خوشی سے تبصرہ کیا تھا۔

کھانے کا دور چل چکا تھا، اب آخری رسومات تھیں جنہیں ادا کرنا تھا، تبھی وہ تینوں بھی ایک ساتھ کھڑے تھے۔

"بہت پاڑ بھی بیلنے پڑے ہیں، انہیں پانے کے لیے۔"

ضامن نے بھی اپنا تبصرہ دیا تھا، کافی رنجیدہ لہجے میں کہ شہیار اس کے دکھ پر برجستہ ہنس دیا۔ اور ضیغم وہ خاموش سا سامنے سٹیج پر بیٹھی اپنی دلسن کے چہرے پر گھونگٹ کو ہی گھور رہا تھا۔

"چل آ، آج تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔"

ضامن کے کندھے پر بازو پھیلاتے شیریں دوستانہ انداز میں اس کے کان کے پاس جھکا تھا۔ جہاں ضامن نا سمجھی سے اسے دیکھ رہا تھا، وہیں ضعیف نے راز کی بات کا مطلب سمجھتے، اندٹی مسکراہٹ کو لب بھینچ کر روکا تھا۔

"وہ کیا ہے ناکہ تیرا راج دلارا ٹومی، جس کو تجھ سے دور کیا گیا ہے دراصل وہ مابدولت کا ہی آغیہ تھا۔"

تفاخر سے اپنا کارنامہ بتایا تھا کہ ضامن نے بھی بنا توقف کے کہنی کا ٹھوکا اس کے پیٹ پر جڑا تھا کہ وہ کراہ اٹھا۔

"کمینے، آج کے دن تو یہ تشدد بند کر دے، کچھ گھنٹوں کا دلہا ہوں یار۔"

شیریں نے دہائی دی۔

"یہ تشدد تو اب ساری عمر ہیر کی صورت میں تجھ پر ہونا ہے، میری دعا ہے۔"

دوست کی اس بے وفائی پر اسے پھر سے ٹومی کا غم کھانے لگا تھا، تبھی کلس کر بدعادی تھی۔

"یہ دعا نہیں، بددعا ہے۔ میں نے تو فقط تائشہ کو منانے کے لیے کہا تھا، اور دیکھا وہ مان بھی گئی۔ میں نے دوستی کے لیے اتنا سب کیا، بجائے شاباشی کے بددعاؤں پر اتر آیا ہے۔ تجھے تو میرا مشکور ہونا چاہیے تھا کہ بلے اور چوہیا کی جنگ کے درمیان اب کوئی کتا نہیں آئے گا۔"۔ شیر کی دہائیاں عروج پر تھیں، لیکن آخری جملے پر ایک بار پھر ضامن کی طرف سے کے گئے تشدد سے وہ بال بال بچا تھا۔

"تیری اور ہیر کی جنگ میں تو، کسی اور ویلن کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ خیر سے ہیر یہ کردار بھی باخوبی نبھا رہی ہے۔"۔  
ضامن نے بھی حساب برابر کیا تھا،

"مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے کہ تو جورو کا غلام کی سٹیٹمنٹ پر پورا اترے گا۔"۔  
ضیغم نے تو ہنستے ہوئے شیر پر تبصرہ کیا تھا، لیکن یہ تبصرہ کلہاڑی اٹھا کر اپنے ہی پیر پر مارنے کے ہی مترادف تھا کیونکہ شیر کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

"تو تجھے بھی تو ایک ننھی کاکلی مل گئی ہے، اسے سٹوری سنائیں، اس کے بال بنائیں، بالکل بچوں کی طرح پالیں۔ اور یہ سب کر کے تو بھی جورو کا غلام ہی بنے گا۔"

شیری کے مستقبل کا نقشہ کھینچنے پر ضامن نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

"اور تو اور وقت سے پہلے ہی ایک اچھا قابل باپ بھی بن جائے گا۔"  
ایک دوسرے کے ہاتھ پر تالی بجاتے، وہ آج ضیغم کو اچھا چڑھا چکے تھے۔  
جب کہ ضیغم نے ان سے دور جانے کو ہی ترجیح دی، اور انہیں ہنستا دیکھ کر دانت پیس کر  
گھورتا سلج کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ جہاں رخصتی کی رسم کی تیاری کی جارہی تھی۔

\*\*\*\*\*

"دھر؟ پہلے ہمیں کلیئرینس چیک دیں، تبھی آپ کو اندر جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔"  
سنبل، اپنی دوسری کزنوں کے ساتھ ضیغم کے کمرے کے دروازے پر اپنا ڈیرا جمائے کھڑی  
تھی۔

اور اب جب تمام رسموں کی ادائیگی کے بعد اسے دلہن کے کمرے میں جانے کی اجازت مل  
گئی تھی۔ تو یہاں اس کی سگی بہن سب سے بڑی دیوار بنی کھڑی تھی۔

"کیسا کلیئرینس چیک؟"

شیروانی کے بٹن کھولتا، وہ سرسری پن اپناتا، انجان بنا۔

"سیدھے لفظوں میں اپنی جیب خالی کریں بھائی جان"۔  
سنبل نے بھی اب کی بار زور دیتے ہوئے ہر لفظ کو کھینچ کر کہا تھا۔

"اور ایسا میں کس خوشی میں کروں؟"  
کنجوس پن تو سنبل کے لیے ہی ضیغم کے اندر اڈتا تھا، ضیغم کو گھورتے ہوئے سوچا تھا۔

"میری پیاری سی کزن پلس دوست سے شادی کرنے کی خوشی میں، جو غالباً آپ کی۔۔۔۔  
بیوی بن چکی ہے"۔

معنی خیز وقفہ لیتی وہ دوست پر زور دے کر، کچھ چتانے لگی تھی کہ ضیغم نے بے ساختہ آنکھیں  
گھمائیں۔

"اور اگر نہ دوں تو؟"

جیب میں بہن کا لاگ ہوتے ہوئے بھی، وہ اس سے بحث کر رہا تھا۔ ایسے کاموں سے اسے  
تسلین پہنچتی تھی، اماں سائیں اس سوچ پر بے اختیار ہنس دیں۔



ضیغم کی شادی کے دن جیسے ہی قریب آئے تھے، حویلی کے تمام مکین اسلام آباد کے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

رحیم صاحب تو پہلے سے ہی اسلام آباد میں ہی موجود تھے، اور دونوں گھروں کے درمیان بس کچھ قدموں کی ہی مسافت تھی۔

شکیل کا کا کو اب بھی نگرانی کے لیے ان کے پاس ہی چھوڑ جانے کا ارادہ تھا، اور ولیمے کی رسم حویلی جا کر کرنی تھی، اس کے بعد ضیغم، عینا اور ان کے جاسوس شکیل کا کا نے اسلام آباد والے گھر میں رہائش اختیار کرنی تھی، جب تک عینا کی پڑھائی مکمل نہیں ہوتی۔

"تو کچھ خاص نہیں، ہم آپ کو آپ کے ہی کمرے سے بے دخل کر دیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل آپ کی دلہن کو اپنے ساتھ لے جائیں اور آپ جناب اپنی تمام تر دولت کو اکٹھا کر کے سونے کا محل بنائیے گا اور پھر اکیلے شان کے ساتھ رہیے گا۔ اتنا بہت ہے؟"

سنبل بھی تنک مزاجی کا مظاہرہ کرتی، لمبی پلاننگ کیے بیٹھی تھی۔

"یہ لو، اور اب رستہ صاف کرو۔"

اس کی بھیانک پلاننگ کو سنتے، جیب سے مخملی کیس کو نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ جو اماں سائیں نے ہی بہن کے لاگ کے لیے اسے دیا تھا۔

"چلو یہ تو ایک جیولری ہوگی، اب نقد بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیں، شاباش۔"  
کیس کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتی، سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی تھی۔  
ضیغم نے اچھنبے سے اس کی نئی مانگ کو سنا تھا، اور پھر دانت پیسے تھے۔  
آج اسے اصل معنوں میں معلوم ہوا تھا کہ یہ بہن اس کے تمام تر چالاک کرتوتوں کی سزا کے طور پر ہی بھیجی گئی تھی۔

\*\*\*\*\*

کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر پہلا قدم رکھا تھا، تو گلاب کی خوشبوؤں ناک کے نتھنوں سے جا ٹکرائی تھی، پورے کمرے میں جا بجا گلاب کی پتیاں بکھیری ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں، موم بتیوں کی مدہم سی روشنی، ماحول کو مزید خواب ناک کر رہی تھیں۔  
مصنوعی پھولوں سے سجے بیڈ کی سچ پر سرخ دوپٹے کی قید میں وہ وجود سکڑے سمٹے بیٹھا تھا۔

اس ماحول کے زیر اثر وہ آہستہ قدم اٹھاتے، چہرے پر خاص مسکراہٹ سجا کر، سچ کی لڑیوں کو ہاتھ کی مدد سے پیچھے کرتے ہوئے مدہم آواز میں سلام کیا۔

مقابل نے سلام کا جواب سر ہلا کر دیا تھا۔ ضامن اس کے سکڑے سمٹے انداز پر ادنیٰ مسکراہٹ لب بھیج کر روکتا، خاموش سادبکے وجود کو دیکھتا رہا، پھر شیروانی کی جیب سے مخملی کیس نکالا تھا۔

کیس میں موجود انگھوٹی کو اس کی انگلی میں پہنانے کی غرض سے تھان بھر کے دوپٹے میں سے ہاتھ تلاشنا چاہا تھا، اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ تک پہنچتا۔ مقابل نے گھونگٹ الٹ دیا، وہیں پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

"آپ؟"

گھونگٹ الٹنے پر ہی وہ چیختا بدک کر اٹھا تھا۔ پورے وجود نے یک باگی جھرجھری لی تھی۔ قہقہوں کی روش تھی جو پھوٹ پڑی تھی، دوپٹے کو اپنے ارد گرد پھیلائے یا سر نواز، خود کو اب دوپٹے کی قید سے رہائی دیتے، اور قہقہہ لگاتے ہوئے بیڈ سے اٹھا تھا، وہیں آمنہ بھا بھی تائشہ کو اپنے ساتھ لیے ڈریسنگ روم سے برآمد ہوئی تھیں۔

لیکن ضامن کا تو دماغ ہی ماؤف ہو چکا تھا، عجیب کراہیت سی ہونے لگی تھی۔

"یہ کیا حرکت تھی بھائی، ایسے کون کرتا ہے۔"  
 ان سے دور کھڑا ہوتا، وہ جھنجھلا کر جرح کر رہا تھا۔  
 آخر کو حسین پل یوں برباد ہوئے تھے۔

"تمہاری اس حرکت سے تو اچھی ہی حرکت تھی، جو تم نے میری شادی والی رات کی تھی۔ پورے  
 کمرے میں موبائل چھپا دیے تھے، اور ہر دو منٹ بعد کال دے دے کر سر میں درد کیا تھا، تم  
 نے اور تمہارے ان دوستوں نے۔ اب خود پر آئی ہے تو یہ کون کرتا ہے پر اتر آئے ہو۔"  
 یاسر بھائی نے بھی صاف آئینہ دکھایا تھا، آخر کو جو بویا جاتا ہے اسے کاٹنا بھی تو تھا۔

"لیکن پھر بھی یہ سب کون کرتا ہے، چھی۔"  
 اسے سوچ کر ہی کراہیت آرہی تھی، لیکن انہیں تو اپنا بدلا لینا تھا اور اس سے اچھا کیا بدلا  
 تھا، خیر ابھی تو یہ شروعات تھی۔

"میں کرتا ہوں، اور اب شاباش میری بیوی کو اس کی منہ مانگی رقم دے، تبھی ہم دونوں اس کمرے سے جائیں گے۔ ورنہ مجھے تو سخت نیند آرہی ہے میں تو یہیں سوؤں گا۔ آمنہ، تائشہ بیٹا کو لے کر تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔"

یاسر بھائی نے جب مانگ رکھی، تو ضامن نواز کی بگڑتی شکل نے انہیں یہ ظالمانہ فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا۔ خود تو بیڈ پر پاؤں پر پھسار کر لیٹ گئے، جب کہ ضامن کی تو اب اپنی دلہن پر نظر پڑی تھی، دو آتشہ حسن گھونگھٹ کی قید سے آزاد تھا، اور اس حسن و جمال کی کرامت ہی تھی کہ ضامن کچھ پلوں کے لیے مہبوت سا طلسم کے اثر میں قید ہو گیا۔

"چلو تائشہ، یہ بہت ضدی انسان ہے، آج رات تم میرے کمرے میں گزار لو۔ پھر سوچتے ہیں کل کیا کرنا ہے۔"

تائشہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلکیں جھکائے، لہجائی سی کھڑی تھی کہ آمنہ بھابھی اسے ساتھ لیے ایک قدم آگے بڑھی تھیں، وہیں اس حرکت پر ضامن بھی سکتے سے باہر آیا تھا۔

"کیا چاہیے؟"

اس کی سمجھ میں اب آیا تھا کہ دروازے پر اسے لوٹنے کے لیے کوئی کھڑا کیوں نہ تھا، ان کا ارادہ اسے کمرے میں رہ کر کنگال کرنا تھا۔

"بھئی جو تمہاری بھابھی کہیں۔"

ضامن کے مانتے یاسر بھی ان کا بیڈ چھوڑ کر ضامن کے سامنے آئے تھے۔  
اور پھر بھابھی کی مانگیں جیسے تیسے پوری کر ہی دی۔

"چل، ہم جاتے ہیں اور کوئی ڈسٹرب کرے تو خود ہی نمٹ لینا، ہاں میرا بچہ۔"  
اسے پچھارتے وہ باتوں کو گول مول کر گئے تھے۔

یاسر بھائی اور بھابھی کے جانے کے بعد وہ ان کی ذومعنی انجھی باتوں کو نظر انداز کرتا، نظریں  
جھکائے کھڑی اپنی دلہن کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

مہرون رنگے کے بھاری کام دار لہنگے کو زیب تن کیے، پیٹھانی حسن کا شاہکار اس کے سامنے  
موجود تھا کہ وہ بنا پلک جھپکے قدم قدم چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ اور تالشہ حیا سے من من  
بھاری ہوتی پلکوں کو جھکاتی، دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ہر بڑھتے قدم پر سانس روک گئی۔

سونے کی ماتھا پٹی، ماتھے پر سجائے، چھوٹی آنکھوں کے پپوٹوں کو خوبصورت رنگ دیئے، چھوٹی ناک  
پر بالی نمائندگی کا حصار جمائے، کانوں میں بڑے بڑے سونے کے آویزے پہنے، گلے میں

سونے کا ہی گلو بند ڈالے اور اس کے ساتھ حنا میں رچے بسے ہاتھوں کی کلائیوں میں بھر بھر کر چوڑیاں، کنگن پہنے وہ مکمل لڑکی لگ رہی تھی۔

اسے تو ہمیشہ سادہ صورت میں دیکھا تھا، تو آج اس کا یہ نیا روپ دل لہانے کے ساتھ ساتھ دل کی دھڑکنوں کو تیزی سے دھڑکنے کی وجہ بھی دے رہا تھا۔

"واورئی، تاسو ڊیر بنن کلي یاست!"

(سنو، بہت خوبصورت ہو تم!)

اس کے مخملی چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی قید میں لیتے وہ بہکا بہکا سا بولا تھا۔  
تالشہ سنتی ہی آنکھیں میچ گئی تھی، جہاں اس نے حرکت کی تھی، وہیں ضامن چنگاڑتی آواز پر ہوش میں آیا تھا۔

موبائل کی تیز بجتی رنگ لٹن، پر تالشہ کو ایک نظر دیکھا جو خود اس اچانک سے آتی تیز آواز پر پریشان سی نظریں ادھر ادھر گھما رہی تھی۔ اور پھر پورے کمرے میں گھوم گھام کر بیڈ کے نیچے سے ایک عدد چھوٹا سا موبائل برآمد ہو ہی گیا، قد چھوٹا تھا پر کارنامہ بڑا۔ ضامن نے غصے سے موبائل پر جگ مگ کرتے نمبر کو دیکھا تھا۔

"تجھے، آج کے دن بھی سکون نہیں ہے کمینے۔"

تائشہ سے کچھ دوری بناتے وہ دبی دبی آواز میں غرایا تھا کہ اسپیکر کے پار سے قہقہے پر قہقہہ برآمد ہوا۔

"پھر کیسی جارہی ہے موصوف کی شادی۔"

شیری کو تو جیسے فرصت ہی فرصت تھی، بڑے آرام و سکون سے سوال کیا گیا تھا۔

"کمینے تیری بھی تو شادی ہے، مجھے کس خوشی میں برباد کرنے پر تلا ہے۔"

ضامن کی غراہٹ اب بھی شہیار سن سکتا تھا، جس پر قہقہہ بھی برجستہ تھا۔

"کیا ہے ناکہ میری بیوی، عورتوں کے جھمگٹے میں قید بیٹھی ہے، فری تھا تو سوچا دوستوں سے ہی

حال چال پوچھ لوں۔ شاہ نے تو فون ہی بند کر دیا۔ اور خیر سے تو بھی اسی کے قدموں پر چلے گا تو

یاسر بھائی سے یہ برینڈ نیو موبائل تیرے روم میں رکھوایا کیسا لگا پھر شادی کا گفٹ؟"

اس کی بات پر ضامن نے قہر برساتی نظروں سے موبائل کو گھورا تھا، اور پھر ایک شرمندہ سی

مصنوعی مسکراہٹ سے تائشہ کو دیکھا۔



"یہ سب کرنے کا مقصد کیا ہے تیرا؟"

آہستہ آواز تھی پر لہجہ حد درجہ تنپا ہوا۔

"ارے اتنا غصہ، دوست ہوں یار کیا تجھے فون گفٹ نہیں کر سکتا؟ خیر یہ تو میں نے اس تشدد کے بدلے دیا ہے جو آج تو نے مجھ پر کیا۔"

لہجہ انتہا کی حد تک مصنوعی رکھے، وہ آخر میں تفاخر سے بولا تھا کہ ضامن کو اپنے تمام پرانے کرم یاد آئے تھے۔

اس سے پہلے کہ مزید کرموں کا بویا کاٹنا پڑتا، کھٹاک سے فون ہی بند کر گیا۔  
اور اب فرصت سے اپنی داسن کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اسکا تو اب خیال گیا تھا کہ وہ اس کے ناک تک آرہی تھی، اس کے سینے تک آنے والی لڑکی اتنی جلدی قد بڑھا گئی تھی۔ وہ حیران ہوتا کچھ قدم پیچھے ہٹا اور ایک ظائرانہ نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

"مہینوں میں قد بڑھا لیا چوسیا؟"

اب وہ کیا جانے ہیل کے کرشمے۔

حیرت کی زیادتی سے منہ سے جو نکلنا تھا، وہ نکل تو گیا پر تائشہ کا رد عمل سنگین تھا۔ خود کو چوہیا کہے جانے پر جھٹکا دے کر ہاتھوں کو اس کی نرم پڑتی گرفت سے نکالا تھا۔

"کیا ہوا؟"

ابھی تک اپنے کہے لفظوں کا احساس نہیں ہوا تھا، تبھی نا سمجھی اور کچھ آنکھوں میں ناگواری کے تاثرات لیے اسے دیکھا تھا۔

"آپ نے مجھے چوہیا کیوں کہا؟"

شادی کی پہلی رات تھی، اور شروعات ہی اس منحوس نام سے ہوئی تھی، وہ ساری شرم ایک طرف رکھتی جواب مانگ رہی تھی۔

"کیا؟ میں نے ایسا کہا؟"

وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"اور اگر کہہ بھی دیا تو کیا ہو گیا؟"

دوبارہ سے اس کے ہاتھوں کو قید میں لیتا ان قدموں کا فاصلہ بھی دھیرے سے مٹایا تھا۔ اب کی بار ہاتھوں پر گرفت کمزور نہ تھی کہ وہ باآسانی چھڑا سکے۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ آئندہ مجھ سے نہیں لڑیں گے۔"  
اس کی قربت سے گھبراتے، خفگی سے ممتنائی تھی کہ ضامن کے ہونٹوں پر جاندار مسکرایٹ  
رقصاں ہوئی۔

"ہاں پر ایسا تو بالکل نہیں کہا تھا کہ چوہیا نہیں کہوں گا۔"  
ضامن نے کندھے اچکائے تھے، اور تائشہ نے اس کی اس قدر چالاکي پر منہ بسورا تھا۔

"کبھی نہیں لڑوں گا یہ وعدہ ہے میرا تم سے، چوہیا جان۔"

ناک کو ہولے سے چھوتے اس نے رات کے آخری پہر میں پیار بھری سرگوشی کی تھی اور وہ  
چوہیا پر جہاں غصے میں بھری تھی، لگے لقب پر سارا خون گالوں پر سمٹ آیا تھا اور بوجھ پلکوں پر  
عود آیا تھا کہ نے ساختہ وہ آنکھوں پر سایہ کر گئیں۔

اب تو یہ تا عمر کا سنگم تھا، پیار بھری سرگوشیاں، چھیڑ چھاڑ کرتے قہقہے، کھٹی میٹھی شرارتیں اور روٹھنا منانا ان سب خالص جزبوں کو اس کمرے کے درو دیوار کی سماعتوں کا حصہ بننا تھا۔ ایک دوسرے کی ہمنوا ہی میں ساتھ چلنا تھا، اور اس رستے میں ایک دوسرے کا ہی سہارا بننا تھا۔

\*\*\*\*\*

آخر کار کافی انتظار کے بعد اور ڈھیروں رسموں کے بعد ہیر کو کمرے میں بھیجا جا چکا تھا۔ شہریار بھی دروازے پر کھڑی عوام کو بھگتا تا، کمرے میں داخل ہوا تو روشنی سے جگماتا کمرے، پھولوں سے سبزی سج اور اس پر عروسی جوڑا پہنے، زندگی کا قرار، اسی کے انتظار میں گھونگٹ گرائے بیٹھی تھی۔

"السلام علیکم"

گلا کھنکھارتے، با آواز سلام کرتا وہ ہیر کے مقابل جا بیٹھا تھا، جو گھٹنے پر رکھے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلتی محض سر ہلا گئی۔

حنائی ہاتھوں، میں سرخ چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بھی اس کے انگلیاں مسلنے پر کمرے کی خاموش فضا میں گونجنے لگی تو اس نے وہ عمل بھی روک دیا۔

باریک دوپٹے کا گرایا گیا گھونگھٹ، اس کا چہرہ نہ مکمل چھپا پا رہا تھا اور نہ ہی مکمل دکھانے کی جسارت کر رہا تھا۔

کننیوں کے سہارے ہیر کے عین سامنے لیٹتے، وہ گھونگھٹ کے پار سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس خواب ناک کی سی خاموشی کو شہریار کی مدہم پرسوج سی آواز نے توڑا تھا۔

"ہیر! ایک بات کہوں، مانو گی؟"

اس کے حنائی ہاتھوں پر نظریں جمائے وہ جواب مانگ رہا تھا۔ وہیں ہیر کا دل مٹھی میں آیا تھا۔ شرم، حیا، لجاجت سب اس پر طاری تھا لیکن ایک خوف بھی تھا جو سب سے بڑھ کر طاری تھا۔

"شہریار!"

میں آگے نہیں پڑھوں گی۔"

بے ساختہ گھونگھٹ الٹ دیا تھا، اور اب مناجت بھرے لہجے میں اس سے منہ بسور کر شادی کی پہلی رات آگے نہ پڑھنے کی منت کر رہی تھی۔

وہ جو اس کے منہ سے اپنا نام ہی سننا چاہتا تھا، وہ اپنے نام کے ساتھ ساتھ اس کا مکھڑا دیکھ کر ہی، الفاظ حلق میں ہی کہیں کھو گئے۔

وہ زیورات سے لدی، خوبصورتی کا ایک نیا نام لگ رہی تھی، اسے دیکھتے اب تو آنکھیں جھپکنا بھی گستاخی لگا تھا۔

اور پھر بے خیالی میں، انگلی کی پوروں سے اسے چھونے کی غرض سے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اس کے چہرے پر اپنا لمس بکھیرنے سے پہلے ہی ہاتھ جالی دار گھونگٹ سے جا ٹکرایا تھا۔

جب اپنے کسے لفظوں اور بے اختیاری کا اندازہ ہوا تو وہ زبان دانتوں میں دبا کر آنکھیں میچ گئی۔

"میری منہ دکھائی؟"

اسے پیش رفت کرتے دیکھ، ہیر نے کچھ پلوں کا فرار چنا تھا، اور گھونگٹ کو پھر سے رخ پر گرا دیا۔

"منہ تو میں دیکھ چکا۔"

شہریار اس کی ادا پر مسکرایا۔

"مجھے پھر بھی منہ دکھائی چاہیے۔"

اس کے شوخ لہجے پر منتشر ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتی، ہمت کر کے بولی اور ہاتھ کی ہتھیلی کو اس کے سامنے ہوا میں لہرایا تھا، جسے موقع پاتے ہی ضامن نے تھام لیا۔

"ہم تو ہیں ہی آپ کے، منہ دکھائی کی کیا ضرورت ہے۔"

ہونٹ کا ایک کونا دانتوں میں دبائے بڑے انداز میں کہا تھا کہ ہیر مہیگی ہتھیلی پر سے اس کے ہاتھوں جھٹکتی، گرفت سے نکلی تھی۔

"ہیرو بننے کو کہا تھا، ہیرو گری دکھانے کو نہیں کہا، سیدھے سی میری منہ دکھائی دیں۔" اب وہ بھی اسے ٹریک سے ہٹتے دیکھ کر پرانی ہیر بنی تھی، وہیں شہریار بھی بھیکا بلا بنا اس کے حکم پر سر کو خم دیتا۔ اس کے لیے آج کی نسبت سے خاص پسند کیا گیا بریلٹ ڈبیا سے نکالا تھا۔

"اجازت ہے؟"

اب کی بار شہریار نے اپنی ہتھیلی پھیلائی، تا عمر اس کا ہاتھ کو تھامنے کے لیے، دنیا کی تلخیوں میں اس کی ڈھال بننے کے لیے اور رنج و غم میں اس کی پرچھائی بن کر رہنے کے لیے۔

ہیر نے بھی بنا تردد اپنے سامنے پھیلی ہتھیلی پر ہاتھ رکھتے، شہریار کے زندگی بھر کے ساتھ کو خوشی خوشی تھام لیا تھا۔

ان کی رفاقت کا سفر اب شروع ہوا تھا، جہاں صرف ایک دو جے کے لیے، عزت، مان اور محبت مقدم تھی۔

\*\*\*\*\*

سنبل کے ساتھ ایک لمبی بحث کے بعد، اسے کمرے میں جانے کا پرمٹ ملا تھا، دھیرے سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھلتا ہی چلا گیا۔ کمرے کے اندر قدم رکھا تو باہر، اندر سکوت اور خاموشی چھا گئی تھی۔

پھر دروازے کو لاگ لگاتا جب پلٹا، تو جو آنکھوں سے دیکھا اس پر ترس اور پیار دونوں بیک وقت محسوس ہوئے تھے۔

اس رشتے کے کچھ تقاضے تھے، جنہیں ادا کرنا تھا اور تو اور اس دن ضیغم نے بھی خبردار کیا تھا کہ اگر پیار پر یقین نہیں تو شادی کے بعد وہ خود یقین دلائے گا۔



گھبراہٹ بے چینی کے اثرات ہی تھے کہ ٹھنڈے موسم میں بھی سبھی سنوری پیشانی پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے، گلا سوکھ کر کانٹے چبھو رہا تھا، جس کی چھبن کو زائل کرنے کی غرض سے گھٹ گھٹ پانی حلق سے اتارنے لگی تھی، لیکن ناک میں پہنی نتھلی اس کے اور پانی کے بچ میں آ رہی تھی جس کے باعث کچھ پانی حلق کو تر کر پایا تھا تو کچھ چھلک کر نیچے گر رہا تھا۔ اور پھر ضیغم کے اندر آتے ہی وہ جہاں تھیں وہیں رک سی گئی۔

وہ مضبوط قدم اٹھاتا، اس کے پاس پہنچا تھا اور بہت احتیاط سے اس کی چھوٹی سی سرخ ہوتی ناک کو قید کیے نتھلی کو نکالا تھا۔ اور پھر پانی پینے کا کہا تھا۔ ایک نظر ضیغم کے چہرے پر پھیلے نرم تاثر کو دیکھا تھا اور پھر اس کے ہاتھ سے گلاس تھام لیا۔

اب تو گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوا تھا، کہ گھٹ گھٹ کرتی وہ ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق کے اندر اتار چکی تھی۔ لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا سب ویسا ہی تھا دھک دھک کر کے پسلیاں توڑنا دل، اٹھتی گرتی پلکیں، کانپتے ہونٹ ساری کیفیات اب بھی ویسی ہی تھیں۔

"شادی مبارک ہو۔"

ساتھ بیٹھتے، اس کا رخ اپنی طرف موڑا اور نثار ہوتے انداز میں کہا کہ عینا سر جھکا گئی۔

"اب تو آگیا یقین کہ پیار کرتا ہوں؟"

اس کے نرم ہاتھوں کی نرمی محسوس کرتے، انہیں سہلاتے ہوئے وہ بڑی چاہ سے پوچھ رہا تھا۔  
عینا اب بھی خاموش تھی، ایسی سنگت میں وہ بولتی بھی تو کیا؟

"عینا!"

پر وہ چاہتا تھا وہ بولے، یہ رشتہ دوستی سے بڑھ کر تھا، جتنا مضبوط تھا اتنا کمزور بھی، وہ نہیں چاہتا تھا زندگی کے اس خوبصورت سفر میں پہلا قدم، دل میں کوئی بدگمانی سمائے رکھا جائے۔ وہ جانتا تھا ایک دوسرے پر یقین بھروسہ ہی ان کی سنگت کو مزید نکھارے گا۔

اس نے جواب میں مشکل سے ہی صحیح پلکوں کی باڑاٹھائی تھی، خود کی کیفیت سے گھبراتے ہی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

"اس دن منہا کا فون آیا تھا، وہ اپنی منگنی پر تمہیں اور مجھے بلا رہی تھی۔ داؤد کو تو جانتی ہی ہوگی تم؟ اسی کے ساتھ منگنی کرنے والی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ میں تب سے ہی صرف تم سے پیار کرتا ہوں، تمہیں اپنے پہلو میں بٹھانا چاہتا ہوں جیسے کہ آج۔"

نظریں اس کے ہاتھ کی پشت پر مہندی سے بنے نقش پر مزین کیے وہ شیفتگی سے ساری غلط  
فہمیاں اس کے دل و دماغ سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب وہ بہت پہلے کر دینا چاہتا  
تھا لیکن اس دن کے بعد ان کا سامنا ہی نہ ہو پایا تھا۔

"اب بھی کہو گی کہ پیار نہیں کرتا۔"

وہ جو ضیغ کی نظریں خود کے چہرے سے ہٹی محسوس کر کے محویت سے اسے دیکھ رہی  
تھی، ضیغ کے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے پر وہ چور سی بنی نظریں مزید جھکا گئی۔

"نہیں۔"

ہاتھ پر ضیغ کا دباؤ بڑھا تھا، وہ جواب چاہ رہا تھا، تو اس کے حلق سے بھی پھنسا سا جواب آیا تھا۔

"عینا، پوری زندگی ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارنی ہے۔ مانتا ہوں کہ زندگی پھولوں کی سیج  
نہیں ہے دکھ سکھ زندگی کا حصہ ہیں لیکن ایک بات کا یقین دلاتا ہوں کہ خود سے پہلے تمہیں  
مقدم رکھوں گا۔"

اور تم سے بھی وعدہ چاہوں گا کہ مجھے بے اعتباری کی مار نہ دینا کیونکہ تم میرے اندر یہاں  
بستی ہوں، اور دل کے ساتھ بے وفائی کرنا یعنی موت کو چننا ہے۔"

وہ نرمی سے ہی کہہ رہا تھا، اور سنجیدہ بھی تھا اپنے لفظوں میں بھی اور عمل میں بھی۔  
اس کا ہاتھ اپنے دل کے مقام پہ رکھتے شدت سے کہا تھا کہ عینا کے دل نے بھی ایک دھڑکن  
چھوڑی تھی۔

اپنی ہتھیلی تلے دھڑکتے ضیغم کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتی، چہرے پر قوس قزاح کے  
رنگ بکھیر گئی تھی۔ ضیغم بھی اس لمحے کی قید میں خود کو جکڑتا ہوا محسوس کرتا اس کے ہاتھ پر  
گرفت کو سخت کرتا گیا تھا۔

دونوں حصار محبت میں قید تھے، اور یہ حصار ان دونوں پر، زندگی میں جب تک سانس باقی تھی  
قائم ہی رہنا تھا، ان کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط ترین قید میں جکڑنے کے لیے!

سات رنگوں کی قسم تو میرا رنگ گل،  
رنگ بہار،  
رنگ خزاں!

سات رنگوں کی قسم تو میرا رنگ بینائی،

رنگ رعنائی،

رنگ آشنائی!

سات رنگوں کی قسم تجھ سنگ نکھر جاوں میں،  
سات رنگوں کی قسم تجھ سنگ بکھر کے بھی نکھر جاوں میں،  
سات رنگوں کی قسم تجھ سنگ بگڑ کے بھی سنور جاوں میں،

سات رنگوں کی قسم تو میرے عکس کی خوشبو،

تو میرے ظاہر کی رونق،

تو میرے باطن کی آواز،

تو میرے چہرے کی رعنائی!

تیرے سنگ بکھر جاوں میں،

تیرے سنگ سمٹ جاوں میں،

تیرے سنگ نکھر جاوں میں!

"شانزے"

\*\*\*\*\*

تین سال بعد

وقت کو تو پیسے لگے تھے۔

خوشی کے لمحات ایک دو بجے کے سنگ گزارے تھے تو تین سال کا لمبا عرصہ بھی کل کی بات لگتی تھی۔

سائس سال، مہینوں اور گھنٹوں کے جو بھی حساب لگاتی ہو لیکن یہ بھی سچ تھا کہ مسرت کے دن بہت تیزی سے گزرنے لگتے ہیں۔

اسی طرح انہیں بھی ایک دوسرے کی سنگت میں رہتے تین سال بیت گئے تھے۔

اور جہاں اپنوں کی سنگت ان سب کے نصیب میں آئی تھی وہیں کچھ لوگوں کو بنا اپنوں کے زندگی گزارنی تھی، چاہے اس کا عرصہ جتنا بھی باقی رہ گیا ہو۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جن کے نصیب میں اپنوں سے دوری لکھ دی جاتی ہے اور پھر یہ قسمت کا لکھا کسی صورت بدلتا نہیں ہے۔ جیسے سلیمان، جس کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ مسرت بیگم کی آنکھیں اس کے انتظار میں خشک ہو کر بند ہو چکی تھیں، لیکن وہ نہیں آیا تھا۔

اس عرصے میں کافی کچھ بدل گیا تھا یا یوں کہا جائے کہ نکھر سا گیا تھا، یہاں تک کہ حیدرآباد کا نواحی گاؤں میں جہاں آج سے تین سال پہلے پستی ہی پستی تھی، آج وہ سنور گیا تھا، پستی سے نکل کر ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ وفاق میں بیٹھے وزیروں کی نظریں بھی اب کی بار اس حلقے میں ہوتے الیکشنز پر تھیں۔

ضیغم، ضامن اور شہیار ان تینوں کی ہی دن رات کی محنت کا ثمر تھا کہ دو سال کے اندر ہی اندر ان کی مارکیٹنگ کمپنی اپنا ایک نام بنا چکی تھی۔ پہلا قدم ان تینوں نے مل کر رکھا تھا، تو پیچھے لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ رحیم صاحب نے بھی عینا کے حصے کی پراپرٹی ان کی کمپنی میں انویسٹ کر دی تھی۔ وہیں یاسر نواز بھی باہر کی مار کھا کر لوٹے تھے، اور کافی مہار ہو چکے تھے، تو انہوں نے بھی کمپنی میں اپنے شیئرز خرید کر کمپنی کو سرو کرنا شروع کیا تھا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ مہنا اور داؤد کا سپورٹ بھی ضیغم کو حاصل تھا۔ ابھی بھی سرد جنگ تو باقی تھی، لیکن ضیغم جس مشن کو لے کر چل رہا تھا اس میں داؤد اور اس کے ڈیڈ کی پارٹی نے مکمل ساتھ دیا تھا۔

ضیغم کا ماننا تھا کہ جب تک حلقے کا نگران ایماندار نہیں ہوگا تب تک انویسٹرز کبھی بھی ایک ایسی جگہ انویسٹ نہیں کریں گے جہاں سے انہیں منافع کی توقع نہ ہو۔ اور اس سال کے

الیکشن میں کئی کاوشوں کے بعد ضیغم نے بابا سائیں کو ناصرف ایک گاؤں کی زمیرداری اٹھانے کے لیے، بلکہ پورے حلقے کی نگرانی کے لیے منا ہی لیا تھا۔

الیکشنز کی تیاری بھی بھرپور طریقے سے جاری تھی، لیکن پچھلے ایک سال سے وہ اپنے بل بوتے پر ہی اپنے گاؤں میں کلینک، اسکول، بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ حکومتی جگہ، جو کبھی ہسپتال کے لیے مختص کی گئی تھی، وہاں ایک سال پہلے تک غاصبوں کا قبضہ تھا۔ لیکن ضیغم، ضامن شہریار کی ان تھک کاوش کا نتیجہ تھا کہ اس کھنڈر نما جگہ پر ہسپتال کی مستطیل عمارت کھڑی کی گئی۔

لمبی زیر تعمیر عمارت کے نیچے کھڑے ضیغم نے سر اٹھا کر عمارت کی اونچائی کو دیکھا تھا، کام ابھی بھی جاری تھا اور الیکشنز تک مکمل ہو جانے کا قوی امکان تھا۔

"ہاں یہاں، سب سیٹل ہے کل اسلام آباد کے لیے نکلتا ہوں، پھر وہاں لگے پراجیکٹ کو ڈسکس کرتے ہیں۔"



فون کان سے لگائے، نظروں کو واپس زمین کی طرف موڑتا وہ ضامن اور شہریار سے بات کر رہا تھا۔

"داؤد، کہہ رہا تھا کہ ہمیں صرف ایک گاؤں پر نہیں ٹھہرنا چاہیے، جہاں جہاں ہاسپٹلز اور کالجز موجود نہیں ہیں، ہمیں کوشش کرنی ہے کہ وہاں بھی اپنی انویسٹمنٹس بھیجیں۔ اس طرح وہاں کے لوگوں کو بھی فائدہ ہو گا اور ہمیں بھی۔ انفیکٹ ان کی پارٹی بھی یہی چاہتی ہے کہ اس طرح پارٹی کو بھی کافی ہائپ ملے گی اور اس بار کے الیکشنز میں بھی ہمارا یہ اسٹیپ کام آئے گا۔"

شہریار کی آواز اسپیکر سے ابھری تھی۔

اس وقت شہریار اور ضامن اپنے اپنے آفس کے کدینز میں موجود تھے۔ ضامن مارکیٹنگ کی کمپنی سنبھال رہا تھا تو شہریار کو بلڈرز کمپنی کا ایم ڈی بنایا گیا تھا۔

ان کا کام انویسٹمنٹ کرنا بھی تھا، اور پراجیکٹس شروع کرنا بھی، جن میں باقی انویسٹرز بھی ملتے جاتے تھے اور اس طرح اس جگہ کے لیے ہسپتال اسکولز اور ایسے کئی مفید مراکز بنائے گئے جن سے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں اور انویسٹرز کا نقصان بھی نہ ہو۔

"بات تو صحیح ہے، لیکن جو پراجیکٹس سٹارٹ کیے ہیں، انہیں ختم کرنا بھی تو ضروری ہے۔ خیر، آتا ہوں تو بات کرتے ہیں۔ داؤد کو بھی بلا لینا میٹنگ میں۔"

آنکھوں پر سن گلاس چڑھاتا، راستے میں پڑی اینٹوں اور پتھروں میں سے احتیاط سے گزرتا وہ پرسوج سا بولا تھا۔

"چل پھر کل ملتے ہیں۔"

ضامن نے گفتگو برخواست کرنے کا عندیہ دیا تھا۔

اور اس طرح تینوں کال بند کرتے، ایک بار پھر سے اپنی مصروفیت میں گم ہوئے تھے۔ شہیار عالم نے اپنی ہیر اور دو گول سوٹ سے بیٹوں کو تصور کرتے مسکراتے ہوئے، کام کی طرف توجہ مبذول کی تھی۔

تو وہیں ضامن نواز خان کے فون رکھتے ہی، تالشہ کی کال آنے لگی تھی۔ جس پر، اپنی شریک حیات کے لیے چمکتی آنکھوں میں ڈھیر سارا پیار سمٹ آیا تھا، جو اسے بہت جلد باپ کے عہدے پر فائز کر رہی تھی۔

ضیغم ظفر شاہ، جو خود کو خوش بخت پاتا، ایک بار پھر اپنے پیچھے کھڑی عمارت کو دیکھتا، اپنے اندر سکون اتارنے لگا، جیسے لوگوں کی دعائیں اسے اپنی محنت میں سرخرو کر رہی تھیں۔ اپنوں کے

لیے کچھ کرتے جو سکون و راحت اسے اس ایک سال میں ملی تھی، وہ اسے بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اور اس سب میں وہ اپنے بابا سائیں کا مشکور تھا، جن کی وجہ سے آج وہ ایک کامیاب بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب انسان بھی تھا کہ راہ چلتے گاؤں کے مکین اسے تعظیم سے سلام کرتے تھے، دعائیں دیتے تھے۔ اور آج وہ تعظیم، وہ محبت اس کی، مزید ان کے لیے کچھ کرنے کی، ہمت بڑھاتا تھا۔

اپنے علاقے کی سادہ سی ہوا کو اپنے اندر اتارتے، وہ گاڑی میں بیٹھا، حویلی کی طرف روانہ تھا۔ جہاں عینا اس کی منتظر تھی، گھنگریالے بالوں والی چوٹی موٹی سی عینا جو اس کی سنگت میں رہ کر کافی سمجھدار ہو چکی تھی، سنبل کے بقول کچھ چالاک بھی۔ عینا کی اب بھی نادانیاں یاد کرتے وہ بند آنکھوں سے اس کا عکس دل میں اتارتا گہرا سانس بھر کر اس کے انتظار کو کچھ لمحوں میں ہی تمام کرنے والا تھا۔

سفر اب چاہے زیست کا

جتنا بھی باقی ہو

میرا ہاتھ ناچھوڑیں

میرے دل کی یہ صدا ہے

کہ اگر بکھروں تو  
تجھ سنگ نکھروں میں

اگر تو ہمراہی ہو

میرا رستہ کٹ جائے گا

سفر آسان ہو جائے گا

اگر جو دُگمگاؤں میں

سنجھال لینا تو

اگر جو پھسلوں میں

پکڑ لینا تو

پھر کیوں نا یہ لب کہیں کہ

میرے دل کی یہ صدا ہے

کہ اگر بکھروں تو

تجھ سنگ نکھروں میں

ہوں گر سوال تو

جواب بن جاتا ہے تو

ہوں گر مسائل تو



حل بن جاتا ہے تو  
 ہوں گر مشکلیں تو  
 آسانیاں بن جاتا ہے تو  
 پھر کیوں نا یہ لب کہیں کہ  
 میرے دل کی یہ صدا ہے  
 کہ اگر بکھروں تو  
 تجھ سنگ نکھروں میں  
 مجھے معلوم ہے جاناں  
 تیری اس زندگی میں  
 تیرے دل کے ایک حصہ میں  
 میں بھی آباد ہوں  
 مگر جب لفظوں میں تو یہ کہتا ہے  
 تو میرا دل دھڑکنا بھول جاتا ہے  
 میری اس ذات کو روشن کرنے میں  
 تیرا جو ساتھ ہے جاناں  
 میری تصحیح میں تیرا ہی ہاتھ ہے جاناں

پھر کیوں نا یہ لب کہیں کہ  
میرے دل کی یہ صدا ہے  
کہ اگر بکھروں تو  
تجھ سنگ نکھروں میں  
تجھ سنگ نکھروں میں

"شیخ اقرء نور"

\*\*\*\*\*

ختم شد

